روزانہ درسِ قرآن پاک

تفسیر

سورۃ المائدۃ

مکمل

جلد ۶

افادات

حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی مدظلہ
خطیب جامع مسجد نور گوجرانوالہ

طبع باراول

نام کتاب: معالم العرفان فی دروس القرآن (سورۃ [illegible] مزمل)

افادات: حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی خطیب جامع مسجد نور گوجرانوالہ

مرتب: الحاج لعل دین۔ ایم اے علوم اسلامیہ

قیمت: ۱۶۵ روپے

تعداد طباعت: پانچ سو (۵۰۰)

سرورق: سید انظار حسین حضرت شاہ نفیس الحسینی مدظلہ

کتابت: محمد امان اللہ قادری گوجرانوالہ

ناشر: مکتبہ دروس القرآن فاروق گنج گوجرانوالہ

ستمبر 2007ء بمطابق شعبان ۱۴۲۸ھ

ملنے کے پتے

(۱) مکتبہ دروس القرآن، محلہ فاروق گنج گوجرانوالہ

(۲) مکتبہ رشیدیہ، سریاب روڈ کوئٹہ

(۳) مکتبہ قاسمیہ، الفضل مارکیٹ اردو بازار، لاہور

(۴) مکتبہ سید احمد شہید، اردو بازار، لاہور

(۵) کتب خانہ رشیدیہ، راجہ بازار راولپنڈی

(۶) کتب خانہ مجیدیہ، بیرون بوہڑ گیٹ ملتان

(۷) مکتبہ حلیمیہ نزد جامعہ بنوریہ سائٹ نمبر ۲ کراچی

(۸) اسلامیہ کتب خانہ اڈا کاکی، ایبٹ آباد

فہرست مضامین

معالم العرفان فی دروس القرآن

سورۃ مائدۃ مکمل جلد ۶

پیش لفظ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَیْنَا مَآئِدَۃً مِّنَ السَّمَآءِ (۵:۱۱۴)

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے سلسلۂ اشاعت "دروس القرآن" اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ بمکمل سورۃ المائدۃ پر مشتمل یہ چھٹی جلد قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے اللہ رب العزت کی بارگاہ میں سرِ نیاز خم ہے۔ احسن مالک الملک کی توفیق و نصرت ہی ہماری کامیابی کی ضامن ہے، وگرنہ بقول شخصے۔ "من آنم کہ من دانم" اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ جلد بالکل قلیل عرصہ میں طبع ہو کر آپ کے مطالعے میں آ رہی ہے۔ سورۃ النساء اور المائدہ کی پے در پے اشاعت مکتبہ دروس القرآن اور جملہ کارکنان کے لیے حوصلہ افزائی کا باعث بنی ہے۔

قرآن پاک سے دلچسپی رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ کسی سورۃ کے مضامین کو اس کے تاریخی پس منظر میں ہی بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ سورۃ المائدہ کے اکثر حصے کا زمانۂ نزول واقعہ حدیبیہ کے متصل بعد کا ہے۔ تاہم بعض آیات سنہ ۸ھ میں بھی نازل ہوئیں۔ جنہیں موضوع کی مناسبت سے مناسب مقام پر رکھ دیا گیا۔ سنہ ۶ھ تک مدینہ طیبہ کا گرد و پیش یہودی سازشوں سے پاک ہو چکا تھا مشرکین مکہ کے مدینہ پر حملہ آور ہونے کے خطرات صلح حدیبیہ کی وجہ سے ٹل گئے تھے اور اہل ایمان کو اسلامی معاشرہ کے قیام اور اس کے استحکام کے لیے قدرے فرصت حاصل ہو گئی تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے وقت کی ضرورت کے مطابق اس سورۃ کے ذریعے اہلِ اسلام کے لیے ضروری احکام نازل فرما دئیے

نسلِ انسانی کی بقاء کے لیے دو چیزوں کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ایک نکاح اور دوسری خوراک۔ سورۃ النساء میں نکاح اور اس کے محرمات کا خصوصی باب تھا۔ اللہ تعالیٰ نے نسلِ انسانی کی عفت کے لیے نکاح کے قوانین نازل فرمائے تھے۔ اور اب اِس سورۃ میں دوسری بنیادی چیز یعنی خوراک کی حلت و حرمت کو خاص طور پر موضوعِ سخن بنایا گیا ہے گویا سورۃ النساء میں محرماتِ نکاح کا بیان تھا تو سورۃ مائدہ میں محرماتِ اکل و شرب کا تذکرہ ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہ سکتے ہیں کہ گذشتہ سورۃ میں انسان کی شرمگاہ کی حفاظت کا قانون تھا اور اس سورۃ میں منہ اور پیٹ کی حفاظت کا قانون دیا گیا ہے

سورۃ کی ابتدا چوپائے جانوروں کی حلت و حرمت سے ہوتی ہے اور پھر اِس کا دائرہ دیگر محرماتِ اکل و شرب تک وسیع ہو جاتا ہے چنانچہ شراب، جوئے، بتوں اور پانسے کے تیروں کی حتمی حرمت اِسی سورۃ مائدہ میں نازل ہوئی۔ اس زمانے میں مدینہ کے اردگرد سینکڑوں میل تک کا علاقہ اسلامی عملداری میں آ چکا تھا۔ اِن علاقوں میں ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے ابتدائی دور میں اہلِ ایمان کو بڑی تکالیف پہنچائی تھیں۔ اُن کے مغلوب ہو جانے کے بعد ان کے خلاف جذبۂ انتقام کا اُبھرنا فطری امر تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ میں اصول کے طور پر یہ بات سمجھا دی کہ کوئی دوست ہو یا دشمن عدل و انصاف کا دامن کسی حالت میں بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹنا چاہیئے

گذشتہ سورتوں کی طرح اس سورۃ میں بھی اہلِ کتاب خصوصاً یہود کا تعاقب کیا گیا ہے، اُن کے عقیدۂ فاسدہ اور محبوبانِ خدا ہونے کے دعویٰ کی تردید کی گئی ہے۔ انہیں اپنی مذموم ریشہ دوانیوں سے باز نہ آنے کی صورت میں سخت وعید بھی سنائی گئی ہے۔ اور نصاریٰ کا عقیدہ تثلیث اور الوہیت کا رد اور عام معاشرتی مسائل میں سے قتل، ڈاکہ اور چوری جیسے جرائم اور ان کی سزا کا ذکر ہے۔ مختلف اعضائے انسانی کے قصاص کا قانون بیان کیا

گیا ہے۔ پھر ارتداد اور اس کی سزا کا تذکرہ بھی ہو گیا ہے۔ غیر مسلموں سے دوستی کی ممانعت کو اس سورۃ میں بھی دہرایا گیا ہے۔ قسم اور اس کے کفارے کے مسائل بیان ہوئے ہیں۔ دورانِ سفر کی گئی وصیت، اس پر عملدرآمد کا طریقہ اور نزاع کی صورت میں متبادل طریق کار کی وضاحت کی گئی ہے۔

عبادات کے ضمن میں وضو اور تیمم کے فرائض اور متعلقہ مسائل بھی آگئے ہیں حج کے مسائل میں سے احرام کی پابندیوں اور حالتِ احرام میں شکار کی ممانعت اور اس سے متعلقہ مسائل کو بیان کیا گیا ہے محرم کے شکار مار لینے کی صورت میں اس کی جزا کے تعین کا طریقہ بھی بتا دیا گیا ہے۔ تکمیلِ دین کی آیت اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ ...الآیۃ بھی اسی سورۃ کا حصہ ہے۔ یہ مژدہ سنا کر اللہ تعالیٰ نے دینِ اسلام میں رخنہ اندازی اور جعلی نبوت کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا ہے۔

حسبِ پروگرام اگلی جلد ان شاء اللہ مکمل سورۃ انعام پر مشتمل ہو گی[1] امید ہے کہ یہ حصہ بھی جلد ہی قارئین کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا قارئین سے درخواست ہے کہ جملہ کارکنانِ سلسلہ دروس القرآن کے لیے توفیق اور استقامت کی دعا کریں۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ۔

احقر العباد

لعل دین

شالامار ٹاؤن لاہور

---

[1] یہ تفسیر الحمد للہ رمضان ۱۴۱۶ھ میں بیس ضخیم جلدوں میں مکمل شائع ہو گئی ہے (فیض)

باسمہٖ سبحانہ وتعالیٰ

نسخہائے گفتنی

از: محمد اشرف فاضل مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ، وفاق المدارس العربیہ پاکستان

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ
عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ خَاتَمِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ :- اَمَّا بَعْدُ

صحیح نقطۂ نظر اور صحیح سوچ کے ساتھ ساتھ باہمت، اچھے، قانع اور باایثار، راہنماؤں کا حاصل ہو جانا تھوڑے ہی عرصہ میں قوموں کو رفعت میں ثریا کے ہمدوش کر دیتا ہے، یہ ترقی اور خوش قسمتی کی علامت ہے۔ اور اگر بدقسمتی سے غلط نقطہ نظر، غلط سوچ کے ساتھ ساتھ راہنمائی کے بجائے، مفاد پرست سامنے آئیں تو قومیں ذلت و رسوائی کی اتھاہ گہرائیوں میں گر جاتی ہیں۔ یہ تنزل و پسماندگی کی نشانی ہے۔

شومئی قسمت جب سے انسانوں نے قرآن حکیم اور ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو چھوڑ کر سرمایہ دارانہ نظام، سوشلزم، کمیونزم، ملوکیت، استبداد، یا ڈکٹیٹر شپ کی طرف جھکاؤ کیا یا اپنایا تو ان کے پاؤں پھسلے اور مسلسل پھسلتے جاتے ہیں، جو کہیں جمنے کا نام نہیں لیتے۔

ہم جس دور سے گزر رہے ہیں، اس میں نظام سرمایہ دارانہ کی مکمل خرابیاں پورے عروج پر ہیں۔ محافظ، راہزن وقاتل ہیں، منصف ظالموں، درندوں کے پشت پناہ اور ان کے معاون و مددگار، انصاف اور حصول انصاف جان جوکھوں کا کام اور مرگ ناگہانی کو دعوت دینا ہے، رفاہی اور قومی خدمت کے اداروں سے قوم کا گلا دبا کر یا اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اسکی جیبیں صاف کر کے قوم ہی کا استحصال کر رہے ہیں، لاقانونیت کا دور دورہ ہے، جان و مال، عزت و عصمت کی حفاظت کا خیال عنقا۔ دینی راہنما حالات سے

سمجھوتہ کیے ہوئے خواب غفلت میں پڑے ہیں یا کاہلی وسستی کو اپنانے ہوئے بعض غیر اہم اور معمولی باتوں پر ایک دوسرے کی تکفیر کے درپے ہو کر اہم بلکہ انتہائی اہم باتوں سے چشم پوشی کیے ہوئے ہیں۔

ایسے حالات میں خالق کائنات کی کتاب قرآن حکیم ہی روشنی کا پیغام اور دکھی انسانوں کے درد کی دوا ہے جب کہ حالات اور تاریخ نے بھی تمام ازموں اور نظاموں کے غلط اور غیر فطری ہونے پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ قرآن حکیم نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام مخلوقات کے لیے امن و استحکام کا ذریعہ ہے، اور صرف قرآنی فکر ہی ایک ایسی فکر ہے جو فطرت کے عین مطابق سب سے بہتر اور آخری حل ہے۔

بحمد اللہ دروس القرآن کا مطالعہ اذہان کو قرآنی فکر سمجھنے میں کافی مواد فراہم کرتا ہے اور اس کا تمام مواد قرآن وحدیث اور سلف صالحین کے مزاج کے مطابق ہے، آپ کو ان دروس میں مسلمانوں میں پیدا ہونے والی خرابیوں کی نشاندہی اور ان کا حل جا بجا نظر آئے گا، ایمانیات، عبادات، اخلاقیات، معاملات اور معاشیات میں پیدا ہونے والے بگاڑ کا تعاقب اور اس کے حل کے لیے مکمل لائحہ عمل بھی انہی صفحات میں ملے گا۔

صاحب درس حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی دام مجدہم ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۹۱۷ء میں پاکستان کے مردم خیز علاقہ صوبہ سرحد کے ضلع ہزارہ کے ایک گاؤں کڑمنگ بالا میں پیدا ہوئے بچپن میں والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا، والدین کی وفات کے بعد سخت اور کٹھن حالات سے نبرد آزما ہوتے ہوئے مختلف مقامات پر متعدد اساتذہ سے علمی تشنگی دور کرنے کے بعد ۱۳۶۱ھ مطابق ۱۹۴۱ء میں مادر علمی دارالعلوم دیوبند سے علوم دینیہ کی تکمیل کی۔ شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ، مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ اور مولانا اعزاز علیؒ جیسے علم وادب کے اکابر و اساطین سے خوشہ چینی کی، مذاہب باطلہ کا رد اور تقابل ادیان کا مطالعہ دارالمبلغین لکھنؤ میں کیا اور مناظر اسلام حضرت مولانا عبدالشکور لکھنویؒ سے تربیت حاصل کی۔ طب یونانی کی تعلیم نظامی طبی کالج حیدر آباد دکن سے حاصل کی۔ ۱۳۷۲ھ مطابق ۱۹۵۲ء سے مدرسہ نصرۃ العلوم اور جامع مسجد نور سے وابستہ

ہو گئے، اور گوجرانوالہ میں علم و حکمت، ہدایت و عرفان کی شمع روشن کی، قرب و جوار اور ملک کے دور دراز کے علاقہ جات اور بیرون ملک سے ہزاروں علم کے پیاسوں نے حضرت اور آپ کے ادارہ سے اکتساب فیض کیا، جو ہنوز جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ اس علمی شمع کو تا قیام قیامت قائم رکھیں اور مزید ترقی عطا فرمائیں۔ شر و فتن سے محفوظ فرمائیں۔

زیر نظر حصہ سورۃ مائدہ مکمل پر مشتمل ہے اس حصہ میں بنیادی عقاید کی اصلاح، شرک، نفاق سے بچنے کی تلقین کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشرہ میں پیش آنے والے روزمرہ کے مسائل اور ان کا حل ہے۔ قسم اور اسلامی شہادت کے قوانین، قیامت، محاسبہ اور جزائے اعمال، حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق تفصیلی بیان، عیسائیوں کے غلط عقائد و نظریات کا انتہائی اچھے اور عام فہم انداز میں رد بالخصوص کھانے پینے کی چیزوں کی حلت و حرمت اور تیمم و غسل وغیرہ کے مسائل کا ذکر ایسے اچھے انداز میں آگیا ہے جو دوسری تفاسیر میں شاید ہی ملے، اسی وجہ سے یہ دروس بہت سی خصوصیات کے حامل ہیں۔ اس سورۃ میں تفسیر کے تمام صحیح طرق کو اپنایا گیا ہے، لیکن زیادہ تر تفسیر القرآن بالقرآن ہی کا طریقہ غالب رہا ہے، معاشرتی مسائل پر بھرپور تنقید کے لیے درس ۴۳ اور ۵۲ کافی اہم ہیں۔

اس جلد کی تیاری کے درمیانی عرصہ ۸ اگست ۱۹۸۹ء کو انجمن محبان اشاعت ________ کے ایک رکن جناب الحاج منیر احمد نارد جو کہ انجمن کے بانیوں میں سے ایک تھے، خالق حقیقی سے جا ملے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ۔ وہ دنیا سے چلے گئے لیکن ان کی دروس کے بارہ میں کوششوں کا حصہ انشاء اللہ تعالیٰ ثواب کی شکل میں قیامت تک ملتا رہے گا، اللہ تعالیٰ مرحوم کی کوتاہیوں اور لغزشوں کو معاف فرمائیں۔ اور انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائیں اور ان کے پسماندگان کو بھی اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

آخر میں دلی دعا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ ان دروس کو صاحب درس حضرت صوفی صاحب انجمن محبانِ اشاعتِ قرآن کے جملہ ارکین، فاضل مرتب جناب حاجی لعل دین سرگرم

ارکان، بلال احمد ناگی، الحاج بابو غلام حیدر، مستری محمد منیر، شیخ محمد یعقوب
اور اس کی اشاعت میں حصہ لینے والے تمام حضرات کی فوز و فلاح اور بخشش کا
ذریعہ بنائے، اور ان کی سعی جمیل کو قبول فرمائے، اور قیامت تک زیادہ سے زیادہ
مسلمانوں کو اس سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

فقط
محمد اشرف فاضل مدرسہ نصرۃ العلوم وفاق المدارس العربیہ پاکستان
۲۵ صفر المظفر ۱۴۱۰ھ مطابق ۲۷ ستمبر ۱۹۸۹ء

سورة المائدة

لا یحب اللہ ٦ — المآئدۃ ۵
درس اول ۱ — آیت ۱

سُوْرَۃُ الْمَآئِدَۃِ مَدَنِیَّۃٌ وَّھِیَ مِائَۃٌ وَّعِشْرُوْنَ اٰیَۃً وَّفِیْھَا سِتَّۃَ عَشَرَ رُکُوْعًا
سورۃ مائدہ مدنی ہے اور یہ ایک سو بیس (۱۲۰) آیتیں اور اس میں سولہ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ اُحِلَّتْ لَکُمْ بَھِیْمَۃُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا یُتْلٰی عَلَیْکُمْ غَیْرَ مُحِلِّی الصَّیْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ اِنَّ اللّٰہَ یَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ ①

ترجمہ: اے ایمان والو! پورا کرو عہدوپیمان کو۔ تمہارے لیے حلال قرار دیے گئے ہیں مویشی مگر وہ جو تم پر پڑھ کر سنائے جائیں گے اس حال میں کہ تم حلال نہ سمجھنے والے ہو شکار کو جب کہ تم احرام کی حالت میں ہو۔ بیشک اللہ تعالیٰ فیصلہ کرتا ہے جو چاہتا ہے ①

نام و کوائف

اس سورت کا نام سورۃ المائدۃ ہے۔ اس کی ایک سو بیس (۱۲۰) آیات اور سولہ رکوع ہیں۔ یہ سورۃ ۲۸۴۴ کلمات اور ۱۲۴۶۴ حروف پر مشتمل ہے۔ سورۃ بقرہ، سورۃ آل عمران اور سورۃ نساء کی طرح یہ بھی مدنی سورۃ ہے اس کا اکثر حصہ مدینہ طیبہ میں نازل ہوا تاہم اس کی تیسری آیت کا حصہ "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا" حجۃ الوداع کے موقع پر مکہ معظمہ میں نازل ہوا۔

مائدۃ کے علاوہ اس سورۃ کے اور بھی کئی نام ہیں۔ اسے سورۃ العقود بھی کہا گیا ہے

کیونکہ اس کی پہلی آیت میں عقود کا لفظ آیا ہے جس کا معنیٰ عہد و پیمان ہے اور جس کی پابندی کا حکم دیا گیا ہے۔ اِس کا نام منجیہ بھی ہے کیونکہ انسانوں کو عذاب الٰہی سے بچانے والی سورۃ ہے۔ تاہم اس کا زیادہ معروف نام مائدہ ہی ہے۔

وجہ تسمیہ

اِس سورۃ کا نام مائدہ دو وجوہات سے ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اس کے پندرھویں رکوع میں حضرت مسیح علیہ السلام کی دعا کا ذکر ہے، جس میں آپ نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی تھی اَللّٰهُمَّ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ "اے اللہ! ہمارے لیے آسمان سے دسترخوان نازل فرمائے" مائدہ اُس دسترخوان کو کہتے ہیں جس پر کھانا چُنا ہوا ہو۔ اگر محض دسترخوان ہو اور اس پر اشیائے اکل و شرب موجود نہ ہوں تو اُسے عربی زبان میں خوان کہتے ہیں ترمذی شریف کی حدیث میں آتا ہے۔ کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کھانا کبھی چھوٹے یا بڑے میز پر نہیں کھایا۔ پوچھنے والا پوچھتا ہے۔ کہ حضور کس چیز پر کھانا تناول فرماتے تھے، تو بتایا گیا کہ آپ چٹائی، کپڑے یا چمڑے کے دسترخوان پر کھانا رکھ کر تناول فرماتے تھے۔

بہرحال سورۃ مائدہ کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے دسترخوان نازل فرمایا اور دوسری وجہ یہ ہے۔ کہ اس سورۃ میں کھانے پینے کی اشیاء سے متعلق حلت و حرمت کے احکام ہیں امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ انسان کے اخلاق کا انحصار اشیائے اکل و شرب پر ہوتا ہے اور اس کا اثر انسان کی طہارت، سماحت، عدالت اور اخبات پر پڑتا ہے۔ اگر کھانا حلال ہو تو انسان میں یہ اخلاقِ حسنہ پیدا ہوتے ہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اکلِ حلال کا پابند کیا ہے۔ اور جو چیزیں اس کے اخلاق کے لیے مضر ہیں انہیں حرام قرار دیکر اُن کے استعمال سے منع فرما دیا ہے۔ چونکہ اس سورۃ

میں حلال وحرام جانوروں کی تفصیل بیان کی گئی ہے، لہٰذا یہ اس سورۃ کی دوسری وجہ تسمیہ ہے۔

مضامین سورۃ

یہ ایک اصولی بات ہے کہ مکی سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے زیادہ تر بنیادی عقائد کی اصلاح کا پروگرام نازل فرمایا ہے۔ ان میں اخلاق اور عقائد کی درستگی کے اصول بیان کیے گئے ہیں۔ مدینہ منورہ پہنچ کر مسلمان ایک اسلامی معاشرہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے لہٰذا وہاں پہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے اجتماعی احکامات نازل فرمائے۔ چنانچہ مدنی سورتوں میں بنیادی عقائد کے علاوہ معاشرے میں پیش آنے والے روزمرہ کے مسائل اور اُن کا حل ہے۔ سورۃ مائدہ میں بھی عہد و پیمان کے مسائل منافقین کی بُری خصلتیں، مثلاً قسم اور شہادت اور شہادت علی الشہادت وغیرہ کے قوانین بیان ہوئے ہیں۔ بنیادی عقیدہ توحید کا ذکر آیا ہے اور شرک سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔ قیامت اور محاسبے کا تذکرہ ہے، اور حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق تفصیلی بیان ہے۔ ایک مسلمان کی روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے مسائل متعلقہ طہارت، تیمم اور غسل وغیرہ کے مسائل بھی بیان ہوئے ہیں اور پھر جیسا کہ سورۃ کے نام سے واضح ہے۔ اس میں ماکولات و مشروبات کی حلت اور حرمت کا قانون بتایا گیا ہے۔

سابقہ سورتوں کے ساتھ ربط

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں۔ کہ سورۃ بقرہ میں روئے سخن یہودیوں کی طرف تھا، اُن کی خرابیاں بیان فرما کر اُن کی اصلاح کا پروگرام دیا گیا تھا۔ چنانچہ یٰبَنِیٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا سے لے کر کئی رکوع تک یہودیوں کا تذکرہ ہے۔ اس کے بعد سورۃ آل عمران میں زیادہ تر روئے سخن نصاریٰ کی طرف ہے۔ اس میں عیسائیوں کے عقیدہ ابنیت کا رد ہے مسیح علیہ السلام کی شخصیت اور اُن کی تعلیمات کا ذکر کر کے نصاریٰ کو

قبولِ حق کی دعوت دی گئی ہے۔ پھر وفد نجران کی آمد اور اُن کے ساتھ مباہلہ کا تذکرہ ہے۔ اس کے علاوہ اہل ایمان کے لیے ضروری احکام بھی نازل فرمائے گئے ہیں۔ اُس سے اگلی سورۃ نساء کا بنیادی موضوع کمزور طبقات کے حقوق کا تحفظ ہے۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ سورۃ نساء اور مائدہ میں تو عرب کے باشندوں کی اصلاح پیش نظر ہے تاہم دوسرے مذاہب کے ساتھ بحث و مباحثہ کا تذکرہ بھی ہے۔ اہل کتاب اور منافقین کا تذکرہ حسبِ سابق اس سورۃ میں بھی موجود ہے۔ کفر اور شرک کی پرایہ مذمت بیان ہو رہی ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے دیگر احکام بھی نازل ہوئے ہیں۔ اس سے اگلی سورۃ انعام میں عرب سے باہر رہنے والے مجوس کا تذکرہ بھی آئے گا۔ اللہ نے اُن کے باطل عقیدہ نور و ظلمت و نیکی اور بدی کے دو خداؤں اہرمن اور یزدان کا رد فرمایا ہے۔

سورۃ نساء کا ایک خصوصی موضوع محرمات نکاح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حرام رشتوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا وَأُحِلَّ لَكُم مَّا وَرَآءَ ذَٰلِكُمْ اِن کے علاوہ باقی تمام عورتوں سے نکاح جائز ہے بشرطیکہ اُن کا مہر اور دیگر حقوق ادا کرو۔ نکاح انسان کی بنیادی ضروریات میں سے ہے۔ اور نسلِ انسانی کی بقا کا انحصار اسی پر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نکاح کے علاوہ شہوت رانی کے تمام ذرائع کو حرام قرار دیا ہے۔ ہاں البتہ لونڈیوں سے استمتاع جائز ہے مگر آج کی دنیا میں یہ ذریعہ بالکل ختم ہو چکا ہے۔

الغرض! گذشتہ سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے نکاح اور محرمات نکاح کا قانون بتلا کر بقائے نوعِ انسانی کا سامان مہیا کیا اور اب اس سورۃ میں انسانی خوراک کے متعلق حلت و حرمت کا اصول بنا کر بقائے شخصی کا انتظام فرما دیا ہے۔ اِن دو صورتوں میں یہ خصوصی ربط پایا جاتا ہے جس طرح انسان کھانے پینے کا محتاج ہے۔ اسی طرح نکاح بھی اُس کی بنیادی ضروریات میں سے

ہے۔ پہلی سورۃ میں اللہ نے محرمات نکاح کا ذکر کیا اور اب اس سورۃ میں محرمات اکل وشرب کا خصوصی بیان ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے کہ ایک انسانی جسم میں دو چیزیں بڑی خطرناک ہیں یعنی منہ اور شرمگاہ۔ سابقہ سورۃ میں شرمگاہ کی حفاظت کا قانون تھا اور اب اس سورۃ میں منہ یعنی اشیائے خورد ونوش کی حفاظت کا قانون ہے۔ اس طرح اِن دو ملحقہ سورتوں میں حفاظت فرج اور حفاظت بطن کے اصول وقوانین بتلائے گئے ہیں۔

اس سورۃ کا ربط اگلی سورۃ انعام کے ساتھ بھی ہے جیسا کہ اُس سورۃ کے نام سے ظاہر ہے، وہاں بھی مویشیوں اور اُن کی حلت وحرمت کا تذکرہ ہے۔ حرام جانوروں کا گوشت اور دودھ وغیرہ استعمال کرنے سے اُس کا منفی اثر انسان کی روحانیت پر پڑتا ہے۔ اس لیے شریعت نے ہر ایسی غذا پہ پابندی لگا دی ہے جو جسمانی، اخلاقی یا روحانی طور پہ مضر ہو۔ اس طرح گویا اس سورۃ کا ربط اگلی سورۃ کے ساتھ بھی ہے۔

درس دوم ۲ — آیت ۱

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ؕ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّى الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ①

ترجمہ: اے ایمان والو پورا کرو عہد و پیمان کو۔ تمہارے لیے حلال قرار دیے گئے ہیں مویشی مگر وہ جو تم پر پڑھ کر سنائے جائیں گے۔ اس حال میں کہ تم حلال نہ سمجھنے والے ہو شکار کو جب کہ تم احرام کی حالت میں ہو۔ بیشک اللہ تعالیٰ فیصلہ کرتا ہے جو چاہتا ہے ①

زمانہ نزول کل عرض کیا تھا کہ یہ سورۃ مدنی ہے کیونکہ یہ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں نازل ہوئی، تاہم تیسری آیت کا ایک حصہ اَلْيَوْمَ ... دِيْنًا حجۃ الوداع کے موقع پر میدان عرفات میں نازل ہوا۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس سورۃ کی تکمیل کئی سالوں میں ہوئی اس کا کچھ حصہ صلح حدیبیہ کے بعد اواخر ۶ھ یا ابتدا ۷ھ میں نازل ہوا۔ اور کچھ حصہ ۹ھ میں نازل ہوا بعض مفسرین پوری سورۃ کے بیک وقت نزول کے بھی قائل ہیں مگر یہ درست نہیں ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ یہ سورۃ ۶ھ اور ۹ھ کے درمیانی عرصہ میں نازل ہوئی، تاہم مذکورہ بالا حصہ آیت ۱۰ھ میں میدان عرفات میں نازل ہوا۔

کیفیت نزول وحی الٰہی بڑی بوجھل ہوتی ہے اس کا ذکر سورۃ مزمل میں موجود ہے "اِنَّا سَنُلْقِىْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا" ہم آپ پر ایک بوجھل بات ڈال رہے ہیں بخاری شریف کی روایت[۱] میں آتا ہے کہ سخت سردی کے موسم میں بھی وحی نازل ہوتی تو اس کی حرارت سے حضور علیہ السلام کی پیشانی مبارک سے پسینے کے قطرے گرنے لگتے۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ نزول وحی کے وقت انخلاع (یا انسلاخ) ہوتا تھا یعنی آپ بشریت سے ملکیت کی طرف

---

[۱] بخاری ص۲ و ترمذی ص۵۲۳ (ثانی)

منتقل ہوجاتے تھے کیونکہ عام انسان وحی کو برداشت نہیں کرسکتا۔ مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے کہ نزول وحی کے وقت حضور علیہ السلام کا چہرہ مبارک سرخ ہوجاتا اور آپ کی سانس تیز چلنے لگتی۔ عام طور پر نزول وحی کی کیفیت ظاہر ہونے پر صحابہ کرامؓ آپ پر چادر تان دیتے جیسا کہ جعرانہ کے مقام پر ہوا تھا۔ بہر حال مذکورہ حصہ آیت کے متعلق آتا ہے۔ کہ نزول وحی کے وقت حضور نبی کریم علیہ السلام بڑی طاقتور اونٹنی عضباء پر سوار تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وحی کے بوجھ سے اونٹنی کی ٹانگیں اور گردن ٹوٹی پڑتی ہے۔ مسند احمد کی روایت میں آتا ہے۔ کہ اونٹنی کی قوت برداشت جواب دے گئی لہٰذا حضور علیہ السلام اونٹنی سے نیچے اُتر آئے۔

ایفائے عہد

سورۃ کی ابتدا ایفائے عہد سے ہوتی ہے یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ۔ اے ایمان والو! عہد و پیمان کو پورا کرو۔ مفسر قرآن مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ سورۃ نساء کی آخری آیت میں اللہ نے فرمایا تھا "یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمْ اَنْ تَضِلُّوْا" اے لوگو! اللہ تعالیٰ تمہارے لیے احکام کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم گمراہی سے بچ جاؤ۔ اَب اُس کے ساتھ ہی اس سورۃ میں فرمایا ہے۔ "اے لوگو! عہد و پیمان کو پورا کرو" دونوں آیات آپس میں مربوط ہیں۔ جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ واضح طور پر بیان کرتا ہے اُن کی تفصیلات آرہی ہے اس لیے شروع میں فرما دیا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تکمیل کے معاملہ میں اپنے عہد و پیمان کو لازماً پورا کرو۔ اور یہ اہل ایمان سے خطاب خاص ہے۔ کیونکہ احکام الٰہی کی تعمیل کے لیے وہ اولین مکلف ہیں۔

عقود، عقد کی جمع ہے جس کا معنیٰ عہد و پیمان کیا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ اور دیگر مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ عہد و پیمان میں ہر قسم کے عہد شامل ہیں۔ عہد و پیمان خواہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہو یا اُس کے نبی کے

ساتھ، عبادت کا عہد ہو یا مخلوق کے ساتھ معاملات کا، اپنی جماعت کے ساتھ کوئی معاہدہ ہو یا کسی بیرونی جماعت کے ساتھ۔ عہد اپنی ملکی رعایا کے ساتھ ہو یا غیر ممالک کے ساتھ، ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اسے ہر صورت میں پورا کیا جائے۔ اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ کا یہی مطلب ہے۔

اجتماعی زندگی میں ایک دوسرے کے ساتھ مختلف معاملات میں اکثر عہد و پیمان ہوتے رہتے ہیں جن کا پورا کرنا نہایت ضروری ہے۔ عہد سے صرف نظر کرنے والوں کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے منافق قرار دیا ہے یعنی منافقوں کی ایک خصلت یہ ہے اِذَا عَاهَدَ غَدَرَ کہ معاہدہ کر کے اُس کی وفا نہیں کرتے بلکہ غداری کے مرتکب ہوتے ہیں۔ بہرحال ایفائے عہد میں دینی، دنیاوی، انفرادی، اجتماعی، ملکی، غیر ملکی ہر قسم کے عہد شامل ہیں۔ جن کو پورا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

قانون کی پابندی

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی مختلف کتابوں میں یہ بات سمجھائی ہے کہ انسان کے لیے ترقی کا زینہ قانون کی پابندی ہے۔ اسی کے ذریعے انسان اعلیٰ مقام حاصل کرتا ہے۔ حظیرۃ القدس کا ممبر بنتا ہے اور علیین یا جنت کے مقام میں پہنچتا ہے۔ قانون کے خلاف کرنا گویا شیطان کی پیروی کرنا ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ" یعنی شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو۔ کیونکہ "اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ" وہ تمہارا کھلا دشمن ہے وہ تمہاری ہلاکت، ناکامی اور شکست پر خوش ہوتا ہے، لہٰذا تم شیطان کے اتباع کے بجائے احکام الٰہی کی تعمیل کرو۔

مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ قانون کی پابندی کے لیے اجتماعیت کا ہونا ضروری ہے کیونکہ فرد واحد کسی پابندی کا مکلف نہیں ہوتا۔ قوانین اسی وقت معرض وجود میں آتے ہیں جب اجتماعیت پیدا

ہو جائے۔ اور پھر اُس اجتماعیت کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل کا حل مطلوب ہو۔ چنانچہ قانون کا ابتدائی درجہ نکاح ہے۔ ایک مرد اور ایک عورت جب اکٹھے زندگی گزارنے کا عہد و پیمان یعنی نکاح کرتے ہیں تو پھر اس عہد کی تکمیل کے لیے انہیں قانون کی ضرورت ہوتی ہے جس کی پابندی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ حضور نبی کریم علیہ السلام کا فرمان بھی ہے کہ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ آپس میں جو بھی عہد و پیمان کریں، اسے بہرصورت پورا کریں اس کے بغیر انسان ترقی نہیں کر سکتے۔ اسی لیے اس قانون کو سب سے پہلے بیان کیا گیا ہے، اس کی باقی جزیات آگے آ رہی ہیں۔ بہرحال شریعت مطہرہ نے ایفائے عہد کی سخت تاکید فرمائی ہے۔ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ ۖ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا
(سورۃ بنی اسرائیل) عہد کو پورا کرو، کہ اس کے متعلق لازماً باز پرس ہوگی۔

بہیمۃ الانعام

ایفائے عہد کی ابتدائی تلقین کے بعد وہ احکام نازل فرمائے گئے ہیں۔ جن پر عمل درآمد ایفائے عہد کا حصہ ہے۔ جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان کا عہد کرتا ہے تو اس کے لیے اس عہد کو پورا کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ حلال و حرام کا امتیاز بھی عہد پیمان کا ایک حصہ ہے۔ چنانچہ بعض جانوروں کی حلت و حرمت کے احکام نازل فرما کر ان کی پابندی کا حکم دیا جا رہا ہے ارشاد ہوتا ہے أُحِلَّتْ لَكُم بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ تمہارے لیے حلال کیے گئے ہیں چرنے والے جانور۔ چوپائے، مویشی۔ بہیمہ چرنے والے جانور کو کہتے ہیں جو گھاس یا پتے وغیرہ کھاتے ہیں اور انعام وہ جانور ہوتے ہیں جو عام طور پر پائے جاتے ہیں۔ یہ چار قسم کے جانور ہیں اونٹ، گائے، بھیڑ، اور بکری۔ فرمایا ان کو بعض شرائط کے ساتھ ذبح کرو تو ان کا گوشت تمہارے لیے حلال ہوگا۔ جو چیز اللہ نے تمہارے لیے حلال قرار دی ہے اُسے کھاؤ پیو اور جو حرام کی ہے اُس سے رُک جاؤ، یہی ایفائے عہد ہے۔

امام شعرانیؒ فرماتے ہیں۔ کہ ان جانوروں کو بہیمہ اس لیے کہتے ہیں کہ انکی عقل بالکل مبہم ہوتی ہے انسانوں کے مقابلے میں مویشیوں کی عقل بالکل معمولی ہوتی ہے اور پھر ان کا تکلم بھی انسان کی سمجھ سے باہر ہے۔ اس لیے انہیں مویشی یا جانور کہتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ان جانوروں میں عقل بالکل نہیں ہوتی۔ تاہم بعض دوسرے مفکرین کا خیال ہے کہ ہر ذی روح میں اپنے اپنے دسیے کے مطابق عقل کا کچھ نہ کچھ حصہ پایا جاتا ہے۔

ان جانوروں کے علاوہ بعض دوسرے جانور بھی حلال جانوروں کی فہرست میں آتے ہیں جو مذکورہ جانوروں کی خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ اِن میں ہرن، گورخر اور شتر مرغ وغیرہ ہیں، وہ بھی چار پائے ہیں اور گھاس چرتے ہیں۔ اِن کا گوشت بھی انسانی ساخت سے مطابقت رکھتا ہے لہذا یہ بھی حلال جانور ہیں۔

حرام جانور

بعض جانور مویشیوں کی طرح چار پائے ہیں مگر اُن میں کسی نہ کسی طرح کی خرابی پائی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اُن کا گوشت انسانوں کے لیے حرام قرار دے دیا ہے۔ گدھا بھی انہی جانوروں میں سے ہے۔ گھاس چرتا ہے، چار پاؤں بھی رکھتا ہے مگر اس کا گوشت حرام ہے امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں بھی سمجھدار لوگ گھریلو گدھے کا گوشت نہیں کھاتے تھے، اس میں یقیناً کوئی ایسی قباحت ہے جو جسمانی یا روحانی لحاظ سے مضر ہے۔ البتہ اس زمانے میں لوگ جنگلی گدھوں کا گوشت کھا لیتے تھے۔ اس کے برخلاف گھوڑا پاکیزہ جانور ہے، اِس کا گوشت مباح ہے مگر گدھا اور خچر جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں ان جانوروں کا ذکر کیا ہے، وہاں اِن کی خدمات کو بھی سراہا ہے جیسے فرمایا وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً اللہ تعال نے گھوڑے گدھے، خچر کو بھی پیدا کیا ہے جو تمہاری سواری کے کام آتے ہیں اور تمہارے

لیے زینت کا باعث بھی ہیں بخلاف اِن کے جہاں مویشیوں کا ذکر فرمایا ہے وہاں انکے تمام جسم سے مستفید ہونے کا ذکر ہے اُنکے گوشت اور دودھ کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے اور ان سواری سے مستفید ہونے کی بھی اجازت دی گئی ہے۔ انکی صفت کو بطور احسان ذکر کیا ہے۔

اب درندے بھی چار پاؤں رکھتے ہیں۔ چونکہ ان میں درندگی کی صفت پائی جاتی ہے اس لیے ان کے گوشت حرام قرار دیے گئے ہیں۔ شیر، چیتا، گیدڑ، لومڑی، سئور، کتا وغیرہ حرام ہیں۔ اِن کا گوشت کھانے سے روحانیت میں فساد آئیگا، جسم میں خرابی پیدا ہوگی، اسی طرح خنزیر کا گوشت کھانے سے بے غیرتی جیسی قبیح خصلت پیدا ہوتی ہے اس لیے اُسے قطعاً حرام قرار دیا گیا ہے۔ غذا کا اثر انسان کے جسم اور ساخت پر براہ راست ہوتا ہے۔ اس لیے حرام جانوروں کا گوشت کھانے سے منع کر دیا گیا ہے اور حلال جانوروں کے گوشت، دودھ، کھال اور اون تک استعمال کرنے کی اجازت ہے۔

حشرات الارض یعنی کیڑے مکوڑے بھی کھانے کے قابل نہیں، اِن میں ایک قسم کی نجاست پائی جاتی ہے۔ انہیں کھانے والوں کے دماغ میں نجاست پیدا ہوتی ہے۔ گدھا بیوقوف جانور ہے اس کا گوشت کھانے سے انسان بلید ہو جاتا ہے۔ بعض ایسے پرندے ہیں جو نوچ کر شکار کھاتے ہیں۔ بعض پنجہ مار کر شکار کرتے ہیں۔ اِن میں چیل، شکرا، گدھ وغیرہ ہیں۔ یہ سب حرام ہیں، مردار کھانے والے پرندے ہیں۔ یہ انسان کے لیے قطعی حرام ہیں۔ اُن کے کھانے سے انسانی جسم و روح میں خرابی آتی ہے۔

احرام کی حالت میں شکار

فرمایا تمہارے لیے چوپائے حلال کیے گئے اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ سوائے اُن جانوروں کے جن کا ذکر آگے آرہا ہے یعنی اس سورۃ کی آیت نمبر۳ میں اور اُس سے آگے۔ وہاں پر مختلف قسم کے حرام جانور اور حرام اشیاء کا تفصیل سے ذکر کر دیا گیا ہے۔ فرمایا ان مذکورہ جانوروں کے علاوہ باقی مویشی تم پر حلال ہیں غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ البتہ

احرام کی حالت میں تم خشکی کے شکار حلال سمجھنے والے نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ جب تم نے حج یا عمرہ کا احرام باندھ لیا ہو تو پھر خشکی کا ہر قسم کا حلال شکار بھی حرام ہو جاتا ہے۔ یہ وقتی حرمت ہے، دائمی نہیں۔ جونہی کوئی شخص احرام سے باہر آجاتا ہے، اُس سے شکار کی پابندی دور ہو جاتی ہے۔ احرام کی حالت میں نہ خود شکار کر سکتا ہے اور نہ جانور ذبح کر سکتا ہے۔ البتہ پانی کا شکار احرام میں بھی جائز ہے۔

فرمایا اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ بیشک اللہ تعالیٰ فیصلہ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ اللہ نے احرام کی حالت میں خشکی کے شکار کی ممانعت کر دی ہے اور تری کا شکار حلال قرار دیا ہے۔ یہ اس کا حکم ہے اور اسمیں کسی چون و چرا کی گنجائش نہیں، انسان کا کام محض تعمیل حکم ہے۔ اس قسم کے احکام میں ضرور کوئی مصلحت ہے جسے مالک الملک ہی جانتا ہے۔ یہاں پر یہ اشارہ بھی ملتا ہے۔ کہ مومن کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ ہر وقت علت کی تلاش میں رہے بلکہ اُسے ہر حکم الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا چاہیئے۔ اگرچہ بہت سے اہل علم کو اللہ نے یہ بصیرت عطا فرمائی ہے کہ وہ حلت و حرمت کی علت کو بھی سمجھتے ہیں، تاہم یہ ہر شخص کے لیے ضروری بھی نہیں ہے عام انسان کے لیے مالک علی الاطلاق کے حکم کی تعمیل ضروری ہے۔ اِسی میں اُس کی ترقی اور فلاح کا راز ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ وَلَآ اٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ؕ وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ؕ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۪ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! نہ بے حرمتی کرو اللہ کے شعائر کی اور نہ حرمت کے مہینے کی اور نہ اُن جانوروں کی جو اللہ کی نیاز کے طور پر کعبے شریف کی طرف لے جائے جاتے ہیں اور نہ اُن جانوروں کی جن کے گلے میں پٹہ ڈالا جاتا ہے (اور اُن کو قربانی کے لیے لے جاتے ہیں) اور نہ اُن لوگوں سے تعرض کرو جو بیت الحرام کا قصد کرتے ہیں تلاش کرتے ہیں اپنے رب کا فضل اور اسکی خوشنودی۔ جس وقت تم احرام سے نکل جاؤ پس تم شکار کرلو اور نہ آمادہ کرے تم کو کسی قوم کی دشمنی جنہوں نے تمہیں مسجد حرام سے روکا۔ کہ تم زیادتی کرنے لگو۔ اور تعاون کرو آپس میں نیکی اور تقوے کی بات پر اور نہ تعاون کرو گناہ اور زیادتی کی بات پر۔ اور اللہ سے ڈرو بیشک اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے ﴿۲﴾

ربطِ آیات

سورۃ کی ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے ایفائے عہد کا ذکر فرمایا ہے کیونکہ اجتماعی زندگی میں

تفصلِ ذم

ربع

انسانیت کی فلاح کا مدار اسی پر ہے۔ شریعت کے تمام احکام اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد و پیمان ہیں جن کی پابندی لازمی ہے۔ چنانچہ اللہ نے حلت و حرمت کے مسائل بیان فرمائے ہیں کہ تمہارے لیے بہیمۃ الانعام کو حلال قرار دیا گیا ہے اور ان کے علاوہ وہ جانور حرام ہیں جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ البتہ احرام کی حالت میں حلال جانور کا شکار بھی نہیں کر سکتے جب تک احرام سے باہر نہ نکل جاؤ۔ اس تمہید کے بعد آگے حرام جانوروں اور اشیاء کا ترتیب وار بیان آ رہا ہے۔ اہل ایمان کے لیے حلت و حرمت کی پابندی نہایت ضروری ہے اور اسی کو ایفائے عہد سے تعبیر کیا گیا ہے۔

شعائر اللہ کی تعظیم

ارشاد ہوتا ہے یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اے ایمان والو! لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ اللہ کے شعائر کی بے حرمتی نہ کرو۔ شعائر، شعیرہ کی جمع ہے اور اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عظمت اور معبودیت کا نشان ہیں۔ فرمایا ان کی بے حرمتی نہ کرو، شعائر اللہ کا احترام ملتِ ابراہیمی کا ایک ضروری حکم اور ہمارے دین کا ضروری جزو ہے۔ دین کے دیگر اہم اصولوں مثلاً اللہ کی وحدانیت پر ایمان، اقامتِ صلوٰۃ، مصیبت میں صبر، اللہ کی نعمتوں کا شکر وغیرہ کی طرح تعظیم شعائر اللہ بھی ایک اہم اصول ہے۔ شعائر اللہ میں حرم شریف، بیت اللہ شریف، جمرات، صفا و مروہ، قربانی، احرام، اذان نماز اور تمام احکام شریعت داخل ہیں۔ صفا و مروہ کے متعلق خصوصاً فرمایا اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ "یعنی صفا و مروہ پہاڑیاں اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان سب کی تعظیم کا حکم دیا ہے۔ امام شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ یہ چار چیزیں اعظم شعائر اللہ میں ہیں یعنی حضور علیہ السلام کی ذات مبارکہ، قرآن کریم، بیت اللہ شریف اور نماز، یہ سب سے بڑے نشاناتِ قدرت ہیں۔ ان کی تعظیم بہت ضروری ہے۔ سورۃ حج میں اللہ کا فرمان ہے وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ"

جو شخص شعائر اللہ کی تعظیم کرے گا تو اس کا مطلب ہے کہ اُس کے دل میں تقویٰ موجود ہے جو آدمی تقویٰ سے خالی ہے اُس سے تعظیم شعائر اللہ کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

حرمت والے مہینے

فرمایا اللہ کے شعائر کی بے حرمتی نہ کرو وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ اور نہ حرمت والے مہینوں کی بے حرمتی کرو۔ حرمت یا ادب والے مہینے چار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ توبہ میں فرمایا ہے کہ جس دن سے اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے "اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا" اس کے نزدیک مہینوں کی تعداد بارہ ہے "مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ" جن میں سے چار حرمت والے ہیں، جن میں لڑائی کرنا جائز نہیں۔ محترم مہینوں کے نام تو قرآن پاک میں موجود نہیں ہیں تاہم حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اِن کی وضاحت فرمائی ہے کہ اِن میں سے ایک علیحدہ ہے اور تین اکٹھے یعنی رجب، ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرم۔ ملت ابراہیمی میں بھی یہی حکم ہے کہ ان متبرک مہینوں میں لڑائی کی ابتدا نہیں کرنی چاہیئے اگر کفار کی طرف سے ابتدا ہو تو پھر دفاع کی اجازت ہے۔ اس کے متعلق سورۃ بقرہ میں موجود ہے۔ "يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ" آپ سے حرمت والے مہینوں میں لڑائی سے متعلق پوچھتے ہیں "قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ" آپ کہہ دیجئے کہ اِن مہینوں میں لڑائی کرنا سخت گناہ کی بات ہے۔ مگر کافروں نے چونکہ اس سے بھی بڑے گناہ کا ارتکاب کیا لہٰذا اُن سے لڑائی کی اجازت ہے۔ تاہم حتی الامکان اِن مہینوں میں جنگ سے گریز کی جائیگی۔ زمانۂ جاہلیت میں اِن مہینوں کا احترام خود کفار بھی کرتے تھے، ہتھیار اتار کر رکھ دیتے تھے، کسی سے تعرض یا چھیڑ چھاڑ نہیں کرتے تھے۔ البتہ بعض اوقات ایک اور قباحت کا ارتکاب کرتے تھے جسے نسیٔ کہا گیا ہے اور جس کا ذکر سورۃ توبہ میں موجود ہے "اِنَّمَا النَّسِيْٓءُ

زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ کفار کے لیے نسی کا ارتکاب بہت بری بات ہے۔ وہ کرتے یہ تھے کہ اگر جنگ کے دوران کوئی حرمت والا مہینہ آ جاتا تو جنگ بند کرنے کی بجائے جاری رکھتے اور اُس مہینہ کی بجائے کوئی دوسرا مہینہ از خود حرمت والا مقرر کر لیتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بات کی مذمت بیان فرمائی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ ادب والے مہینوں کا احترام ضروری ہے۔

قربانی کے جانور

فرمایا بے حرمتی نہ کرو اللہ کے شعائر کی اور حرمت والے مہینوں کی وَلَا الْهَدْيَ اور نہ قربانی کے جانوروں کی۔ عام قربانی کے جانوروں کو اضحیہ کہا جاتا ہے مگر جو جانور اللہ تعالیٰ کی نیاز کے لیے حرم شریف کی طرف لے جائے جاتے ہیں اُن کو ہدی کہتے ہیں۔ فرمایا اللہ کے ہاں یہ بھی محترم ہیں، اِن کی بے حرمتی بھی نہ کرو۔ پھر یہ ہے کہ قربانی کے لیے جانوروں کے گلے میں پٹہ یا ہار ڈال دیا جاتا تھا جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا تھا کہ یہ قربانی کے جانور ہیں جو حرم شریف جا رہے ہیں، لہذا راستے میں کوئی اِن سے تعرض نہ کرے۔ فرمایا وَلَا الْقَلَآئِدَ اور پٹے والے جانوروں کی بھی بے حرمتی نہ کرو، کیونکہ یہ اللہ کے راستے میں قربانی کے لیے جا رہے ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں بھی عام طور پر ایسے جانوروں کا احترام کیا جاتا تھا۔

عازمین حج و عمرہ

فرمایا وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ بیت اللہ شریف کی طرف قصد کر کے جانے والے لوگ بھی محترم ہیں۔ جو لوگ حج یا عمرہ کے ارادے سے سفر کر رہے ہیں اُن سے کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ یا لڑائی جھگڑا نہیں ہونی چاہیئے۔ وہ اللہ کے مہمان ہیں اور اُس کے گھر کی طرف جا رہے ہیں۔ ہو سکے تو اُن کی خدمت کرو، ورنہ انہیں ایذا نہ پہنچاؤ۔

حضور علیہ السلام اپنے چودہ سو صحابہؓ کے ہمراہ ۶ھ میں عمرہ کے ارادہ

سے نکلے تھے مگر مشرکین نے اُن کو حدیبیہ کے مقام پر روک دیا۔ قربانی کے جانور اُن کے ہمراہ تھے مگر کفار نے انہیں عمرہ کرنے کی اجازت نہ دی اور اس بات پر صلح ہو گئی کہ اُس سال مسلمان عمرہ کیے بغیر واپس چلے جائیں گے البتہ اگلے سال عمرہ ادا کر سکیں گے۔ چنانچہ صلح کی شرائط کے مطابق صحابہ کرامؓ نے جانور وہیں ذبح کر دیئے اور مدینہ طیبہ واپس آ گئے پھر آپ نے ۷ھ میں عمرہ قضا کیا۔ اس قسم کے واقعات کے سدباب کے لیے فرمایا کہ حج و عمرہ کے ارادہ سے حرم شریف جانے والے لوگوں کے ساتھ بھی کسی قسم کا تعرض نہیں کرنا چاہیئے، اُن کی بے حرمتی مت کرو بلکہ اُن کا ادب و احترام ملحوظ رکھو۔

فضل اور رضوان

یہ ایسے لوگ ہیں جو یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا اپنے رب کا فضل اور اس کی خوشنودی تلاش کرتے ہیں۔ سورۃ فتح میں اللہ تعالیٰ نے یہی دو صفات حضور علیہ السلام کے صحابہ کی بیان فرمائی ہیں۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ یعنی حضور علیہ السلام اور آپ کے صحابہؓ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا آپ ان کو رکوع و سجود کرتے ہوئے اور اللہ کے فضل اور خوشنودی کی تلاش میں دیکھتے ہیں۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ فضل سے مراد ارتفاق ہے اور رضوان سے مراد اقتراب ہے۔ آپ نے اپنی حکمت میں یہ دو الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ارتفاق زندگی خوش اسلوبی سے بسر کرنے کو کہتے ہیں اور اس کا دارومدار رزق حلال پر ہے۔ لہٰذا فضل کو رزقِ حلال سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ سورۃ جمعہ میں آتا ہے کہ جب نماز جمعہ ادا کر لو تو زمین میں پھیل جاؤ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ اور اللہ کا فضل یعنی رزق تلاش کرو۔ رزقِ حلال فضل میں سرفہرست ہے اور اسلام میں اس کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جائز ذرائع سے روزی تلاش کرو، اس پر کوئی پابندی نہیں۔ آپ جمعہ کو بھی کاروبار کر سکتے ہیں۔ اس دن

مکمل طور پر کام کاج بند کر دینا ضروری نہیں، ہاں اگر مصلحت کی خاطر مکمل تعطیل بھی کر دی جائے تو کوئی حرج نہیں۔ غرضیکہ فضل سے مراد یہ ہے۔ کہ زندگی کو خوش اسلوبی سے بسر کرنے کے لیے اپنے اور اپنے لواحقین کے لیے رزقِ حلال حاصل کیا جائے۔

حضرت امام شاہ ولی اللہ نے رضوان کا معنی اقتراب کیا ہے۔ یعنی اللہ کا قرب۔ اور یہ چیز نیکی، عبادت اور احکامِ الٰہی کی تعمیل سے حاصل ہوتی ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں فرمایا شعائر اللہ کی تعظیم بھی اقترابِ الٰہی کا ایک ذریعہ ہے۔ بہرحال فرمایا کہ اُن عازمین حج و عمرہ کا بھی احترام کرو جو اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی کی تلاش میں نکلے ہیں۔

حج اور تجارت

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ سفرِ حج یا عمرہ کے دوران اگر جائز ذرائع سے اکتسابِ رزق کیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے بشرطیکہ نیت محض تجارت کی نہ ہو۔ نیت خالص حج کے لیے کر کے اگر تجارت یعنی اللہ کا فضل بھی تلاش کرتا ہے، تو اس کی ممانعت نہیں ہے۔ سورۃ بقرہ میں بھی موجود ہے۔ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ تم پر کوئی حرج نہیں ہے۔ کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو یعنی تجارت وغیرہ کرو۔ بعض لوگوں کی ابتداً نیت ہی محض مال لے جانے اور وہاں سے مال لانے کی ہوتی ہے، اس قسم کا حج درست نہیں ہوتا، بلکہ یہ تجارت ہوتی ہے۔ بعض لوگ صرف سیر و تفریح کے لیے حج کا سفر اختیار کرتے ہیں، یورپ اور امریکہ کی سیر نہ کی، مکہ اور مدینہ کی کر لی۔ یہ بھی درست نہیں ہے۔ نیت خالص حج یا عمرہ کی ہونی چاہیئے کیونکہ یہ بہت بڑی عبادت ہے اس سفر میں مال خرچ کرنے کے علاوہ جسمانی مشقت بھی اٹھانی پڑتی ہے اس میں بڑی پابندیاں ہیں اور یہ اعلیٰ درجے کی عبادت ہے۔ جسے خلوص

کے ساتھ ہی ادا کرنا چاہیئے۔ تاہم ضمناً تجارت بھی مباح ہے۔

شکار کی اباحت

اس سورۃ کی پہلی آیت میں فرمایا تھا کہ بعض جانوروں کو چھوڑ کر تم پر مویشی حلال کیے گئے ہیں غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَأَنتُمْ حُرُمٌ البتہ احرام کی حالت میں شکار کرنے کی ممانعت ہے۔ جب کوئی شخص حج یا عمرہ کی ادائیگی کے لیے میقات سے احرام باندھ لیتا ہے، تو اس پر بعض پابندیاں عاید ہو جاتی ہیں۔ مثلاً مرد سلا ہوا کپڑا نہیں پہن سکتا، پورا جوتا اور جراب نہیں پہن سکتا، خوشبو استعمال نہیں کر سکتا، چہرہ نہیں ڈھانپ سکتا، بیوی کے قریب نہیں جا سکتا، کسی سے لڑائی جھگڑا گالی گلوچ نہیں کر سکتا، خشکی کا شکار نہیں کر سکتا حتیٰ کہ کسی جاندار کو ایذا نہیں پہنچا سکتا۔ یہ سب عارضی پابندیاں ہوتی ہیں جو احرام کھلنے کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہیں۔ پہلی آیت میں شکار پر جو پابندی عائد کی تھی، یہاں اس کے متعلق فرمایا وَإِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوا جب تم حلال ہو جاؤ یعنی احرام کھول دو تو تمہیں شکار کی اجازت ہے۔ احرام کی حالت میں ممنوع ہو گیا تھا، اب یہ تمہارے لیے مباح ہے۔

تعدی کی ممانعت

فتح مکہ سے پہلے مسلمانوں کو حج، عمرہ اور طواف یعنی زیارت بیت اللہ کی اجازت نہیں تھی۔ کفار مکہ نے مسلمانوں کا یہ حق سلب کر لیا تھا۔ چنانچہ ۶ھ میں جب صحابہؓ کی ایک جماعت حضور علیہ السلام کی معیت میں عمرہ کے لیے آئی تو مشرکین نے اُن کو ایسا کرنے سے روک دیا تھا، لہٰذا مسلمانوں کو عمرہ کیے بغیر واپس لوٹنا پڑا۔ آیت کے اگلے حصہ میں کفار کی طرف سے اسی قسم کی اسلام دشمنی کی طرف اشارہ ہے ارشاد ہے وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ أَن صَدُّوكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ جس قوم نے تمہیں مسجد حرام سے روکا، اُس قوم کی دشمنی تمہیں آمادہ نہ کر دے۔ أَن تَعْتَدُوا کہ تم بھی اُن پر تعدی کرو۔ اسلام کی کمزوری کے دوران جو کچھ ہو گیا، اس پر درگزر کرو اور اب جب کہ اللہ نے تمہیں غلبہ

دے دیا ہے۔ تو اب تم بھی اُن پر اُسی طرح زیادتی نہ شروع کر دو جس طرح مشرکین تم پر کرتے رہے ہیں۔ مقصد یہ ہے۔ کہ یہ مسلمان کی شان کے خلاف ہے کہ وہ بُرائی کا بدلہ بُرائی سے دے۔ مفسر قرآن مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ جس طرح اَلْحُبُّ فِی اللّٰہِ میں حد سے بڑھنا خرابی کا باعث ہے، اسی طرح اَلْبُغْضُ فِی اللّٰہِ بھی ایک حد تک ہونا چاہیئے مشرکین سے نفرت ضرور ہے اور یہ ہے بھی محض رضائے الٰہی کی خاطر مگر یہ نفرت اُن کے خلاف دشمنی کا رنگ نہ اختیار کر جائے۔ انہوں نے بلاشبہ تم پر زیادتی کی، تمہیں تکالیف پہنچائیں مگر تمہیں اُن پر زیادتی کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

تعاون اور عدم تعاون

اور دوسری بات یہ فرمائی وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ نیز گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون نہ کرو۔ اچھائی سے تعاون اور بُرائی سے عدم تعاون ایک اہم اصول ہے جو اللہ تعالیٰ نے یہاں پر بیان فرمایا ہے۔ یہ قرآن اور اسلام کا موضوع ہے کہ اقوام عالم میں جہاں بھی کوئی مسلمان موجود ہے، نیکی میں اُس کے لیے دستِ تعاون بڑھایا جائے۔ مگر اس زمانے میں اسی چیز کا فقدان ہے۔ اب نیکی کی بجائے بُرائی کے کام میں تعاون کیا جاتا ہے، اب موضوع ہی بدل گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے نتائج بھی ایسے ہی نکلیں گے۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں کہ عدل و انصاف تقویٰ کی روح ہے اور مومنوں کا عالمی پروگرام ہے اللہ نے یہی حکم دیا ہے "اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ" یعنی عدل و انصاف پر قائم رہو اور احسان کرو۔ مگر اب انصاف کی جگہ ظلم نے لے لی ہے۔ اسی لیے قرآن پاک نے اس مقام پر یاد دلایا ہے کہ نیکی اور تقویٰ کے معاملات میں تعاون کرو، اور برائی خواہ عقیدے میں ہو یا عمل میں، اُس کے ساتھ ہرگز تعاون نہ کرو۔

خوفِ خدا

فرمایا وَاتَّقُوا اللّٰهَ اللہ سے ڈر جاؤ۔ اللہ نے ایفائے عہد کا حکم دیا ہے اُس کو پورا کرو۔ اگر اُس کے حکم کی خلاف ورزی کروگے تو یاد رکھو اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ بیشک اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے۔ جب وہ مجرمین کی گرفت کریگا، تو پھر اُن کو چھوڑے گا نہیں اُسکی پکڑ بڑی سخت ہے۔ کوئی شخص جو اللہ کے قوانین کے خلاف کرتا ہے حلال وحرام سے بے نیاز ہے۔ شعائر اللہ کی بے حرمتی کرتا ہے، برائی میں تعاون کرنے والا ہے، وہ اسکی گرفت سے بچ نہیں سکتا۔ اسی لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈر جاؤ۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهِ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَزْلَامِ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ

ترجمہ: حرام قرار دیا گیا ہے تم پر مردار جانور اور خون اور خنزیر کا گوشت اور وہ چیز جس پر غیر اللہ کا نام پکارا گیا۔ اور جو گلا گھٹنے سے مر گیا ہو اور چوٹ لگنے سے ہلاک ہو گیا ہو، اور جو اونچی جگہ سے گر کر ہلاک ہو گیا ہو، اور جس کو دوسرے جانور نے سینگ مار کر ہلاک کر دیا ہو، اور جس کو درندوں نے کھا لیا ہو مگر وہ جسے تم نے ذبح کر لیا ہو، اور جو ذبح کیا گیا ہو کسی استھان پر۔ اور یہ کہ تم تقسیم کرو جوئے کے تیروں کے ساتھ، یہ نافرمانی اور گناہ کی بات ہے۔

ربط آیات

ایفائے عہد کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حلال و حرام کا قانون بیان فرمایا کہ تمہارے لیے مویشی حلال کیے گئے ہیں سوائے ان کے جو آپ کو پڑھ کر سنائے جائیں گے اب آج کے درس میں انہی جانوروں اور اشیا کا ذکر ہے جو اللہ نے حرام قرار دی ہیں۔ قانون حلت و حرمت کو انسانی زندگی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ انسانی ترقی کے لیے اس قانون پر عمل درآمد نہایت ضروری ہے، کیونکہ انسان قانون کا پابند ہے اور یہی پابندی اُس کے لیے ترقی کا زینہ ہے۔ قانون کی خلاف ورزی اتباع ہوا، اور شیطان کے نقش قدم پر چلنا ہے۔

یہ قانون اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے سورۃ بقرہ میں بھی بیان فرمایا ہے۔ اس سورۃ میں بھی آگیا ہے اور پھر آگے سورۃ انعام اور نحل اور بعض دوسرے مواقع پر بھی آئے گا۔ جیسا کہ گذشتہ درس میں عرض کیا تھا۔ سورۃ نساء میں محرمات نکاح کا ذکر تھا اور اس سورۃ میں محرمات اکل و شرب کا بیان ہے۔

حرمت مردار

امام ابن کثیرؒ اور دوسرے مفسرین بیان فرماتے ہیں کہ جن جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، ان میں کوئی نہ کوئی خرابی ضرور موجود ہے۔ وہ یا تو انسانی جسم کے لیے مضر ہیں یا رُوح کے لیے نقصان دہ ہیں۔ اور جو چیزیں حلال قرار دی گئی ہیں وہ یقیناً انسان کے لیے جسمانی یا روحانی لحاظ سے سود مند ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ تم پر مردہ جانور حرام قرار دیا گیا ہے۔ امام بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ شرعی طریقے سے ذبح کیے بغیر جو جانور ہلاک ہو جائے، وہ مردار ہے۔ عام طور پر مرنے والے جانور کے جسم میں خون منجمد ہو کر رہ جاتا ہے جس کی وجہ سے جسم میں کئی قسم کے جراثیم اور دیگر خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو انسانی جسم کے لیے ضرر رساں ہوتی ہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے مردار کا گوشت انسانوں کے لیے حرام قرار دیا ہے۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ پوری متمدن دنیا میں تمام لوگ خواہ ان کا تعلق کسی مذہب سے ہو، مردار کھانا بُرا سمجھتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ وہ عقل و شعور سے عاری نہ ہوں بعض لوگ ایسے بھی ہیں، جن کا انسلاخ ہو جاتا ہے اور وہ انسانی فطرت سے باہر نکل جاتے ہیں، تاہم کوئی بھی صاحبِ فطرتِ سلیمہ مردار کھانے کو پسند نہیں کرتا۔ مردار میں موجود جراثیم اور تعفن کی وجہ سے انسانی جسم میں سستی پیدا ہوتی ہے اور اس کی صحت بگڑ جاتی ہے، طرح طرح کی بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں، لہٰذا مردار کا گوشت کھانے سے منع کر دیا گیا ہے، یہ قطعی حرام ہے۔

حلت مچھلی و ٹڈی

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد مبارک ہے۔ کہ اگرچہ ہمارے لیے مردار کو حرام قرار دیا گیا مگر اُحِلَّتْ لَنَا مَيْتَتَانِ دو مردار ہمارے لیے حلال قرار

دیے گئے ہیں اَلسَّمَکُ وَالْجَرَادُ یعنی مچھلی اور ٹڈی ان کو بغیر ذبح کیے کھانا جائز ہے۔ صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں کہ بعض جنگوں کے موقع پر ہم نے ٹڈی کو بطور غذا استعمال کیا۔ مچھلی پانی کا جانور ہے اور اسے بھی ذبح کرنے کی ضرورت نہیں۔ دراصل ان دو جانوروں میں کوئی زیادہ خون نہیں ہوتا جو ان کے جسم میں بند ہو کر رہ جائے۔ مچھلی کا خون تو ویسے ہی خشکی کے جانوروں سے مختلف ہوتا ہے جو جسم میں رہ جانے سے بھی تعفن کا باعث نہیں بنتا اور ٹڈی میں بھی اس قسم کی خاصیت موجود ہے، لہٰذا ان دو جانوروں کو بغیر ذبح کیے کھانے کی اجازت ہے۔

حرمتِ خون فرمایا تم پر مردار حرام قرار دیا گیا ہے وَالدَّمُ اور خون بھی حرام ہے سورۃ انعام میں اسے دَمًا مَّسْفُوْحًا کہا گیا ہے یعنی بہتا ہوا خون جسے جسم سے نکال دیا جائے۔ ذبح کرتے وقت یا جسم میں زخم کرنے سے جو خون نکلتا ہے، وہ دمِ مسفوح ہے اور حرام ہے۔ البتہ ذبح کرنے کے بعد جو تھوڑا بہت خون گوشت کے ساتھ رہ جاتا ہے، وہ حرام نہیں ہے کیونکہ وہ صحت کے لیے نقصان دہ نہیں ہوتا اسے اگر بغیر صاف کیے پکا لیا جائے، تو کھانا درست ہے تاہم نظافت کے تقاضا کے تحت اس خون کو بھی صاف کر لیا جائے تو بہتر ہے۔ جو شخص دمِ مسفوح کو بطور خوراک استعمال کرے گا، اس میں درندگی کے خواص پیدا ہو جائیں گے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے خون کو حرام قرار دیا ہے۔

انتقالِ خون موجودہ زمانے میں انتقالِ خون (BLOOD TRANSFUSION) عام ہو رہا ہے۔ جب کسی مریض کے جسم میں خون کی کمی واقع ہو جاتی ہے تو اس سے مطابقت رکھنے والا دوسرا انسانی خون اس کے جسم میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ اس کا عام حکم تو یہی ہے ______________ کہ خون حرام ہے۔ اس کا بیچنا اور

دوسرے جسم میں منتقل کرنا اسی حکم میں آتے ہیں، تاہم اضطراری حالت میں اس کا استعمال جائز ہے۔ یہ ماہر ڈاکٹر پہ منحصر ہے کہ وہ مریض کے لیے بیرونی خون کو کس حد تک ضروری سمجھتا ہے۔ اگر کوئی دوسری دوائی اس کا نعم البدل نہ ہو اور مریض کی جان خون کی منتقلی سے ہی بچائی جاسکتی ہو تو پھر ایسا کرنا جائز ہوگا۔ تاہم معمولی نوعیت کے امراض میں جہاں دیگر ادویات بھی کارگر ہوں، وہاں خون کی منتقلی درست نہیں ہوگی کیونکہ یہ بہتا ہوا خون ہے جو حرام ہے۔

لحم الخنزیر

تیسری حرام چیز فرمایا وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ یعنی خنزیر کا گوشت بھی حرام ہے خنزیر کے گوشت کی تخصیص اس کے عام استعمال کی بنا پہ کی گئی ہے ورنہ اس کے جسم کا ہر حصہ حرام اور ناقابل استعمال ہے۔ سورۃ انعام میں سؤر کو "اِنَّهٗ رِجْسٌ" کہا گیا ہے۔ یہ بالکل ناپاک ہے، لہذا اسکی ہڈیاں، بال، چربی اور لعاب وغیرہ ہر چیز حرام ہے۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ جس جانور میں انسانی فطرت کے منافی خصلتیں پائی جائیں۔ اُس جانور کا گوشت کھانے والوں میں بھی وہی قبیح خصلتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ خود گندگی کھانے والا جانور ہے لہذا اس کا گوشت کھانے والے کی طبیعت میں بھی نجاست پیدا ہوگی۔ اس کے علاوہ یہ جانور سخت بے غیرت بھی ہے۔ عام نر جانور کسی دوسرے نر کی موجودگی میں مادہ سے جفتی نہیں کرتا مگر خنزیر ایسا بے غیرت جانور ہے کہ بیک وقت کئی کئی نر ایک مادہ سے استفادہ حاصل کرتے ہیں۔ اس کا گوشت استعمال کرنے والی قوموں میں یہی بے غیرتی پیدا ہو جانا عین ممکن ہے۔ سکھ اور انگریز وغیرہ خنزیر کا گوشت کھاتے ہیں اور وہ اس قبیح مرض میں مبتلا ہیں۔

مسیح علیہ السلام کے متعلق آتا ہے کہ قربِ قیامت میں جب دوبارہ نزول فرمائیں گے تو يَقْتُلُ الْخِنْزِيْرَ خنزیر کو قتل کریں گے اور عیسائیوں کو ذلیل کرنے کے لیے صلیب کو توڑیں گے کیونکہ یہ باطل عقیدہ کی نشانی ہے۔ امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد جتنے نبی

مبعوث ہوئے ہیں سب کے شرائع میں خنزیر حرام رہا ہے مگر عیسائی ایسی بدبخت قوم ہے کہ اسے بھیڑ بکری کی طرح کھا جاتے ہیں لہٰذا کسر صلیب اور قتل خنزیر سے عیسائیوں کی تذلیل مقصود ہوگی

نامزدگی بنام غیر اللہ

حرام چیزوں سے چوتھی چیز فرمایا وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وہ چیز بھی حرام ہے جس پر اللہ کے سوا کسی غیر کا نام پکارا گیا ہو۔ اہلال کا معنیٰ ہے۔ رفع الصوت یعنی آواز کو بلند کرنا۔ چنانچہ حاجی کے احرام باندھنے کے بعد لبیک لبیک پکارنے کو اہلال التلبیہ کہتے ہیں مقصد یہ کہ جس جانور کو غیر اللہ کے نام پر پکارا گیا ہو، نامزد کیا گیا ہو، وہ حرام ہے۔ مثلاً یوں کہا جائے کہ یہ جانور یا چیز فلاں بت، قبر یا بزرگ کی نیاز ہے، تو وہ چیز حرام ہو جائیگی۔ اور غیر اللہ کی نیاز دینے سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ وہ بزرگ ہم سے راضی ہو کر ہماری مرادیں پوری کریں گے۔ یا کم از کم اللہ کے ہاں ہماری سفارش ہی کر دیں گے۔ یہ شرکیہ عقائد ہیں لہٰذا غیر اللہ کے نام سے منسوب کی جانے والی چیز کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے۔

بعض لوگوں کو اس مسئلہ میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ بعض تفسیروں میں بھی لکھا ہے کہ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ کا مطلب یہ ہے۔ کہ جانور کو ذبح کرتے وقت اگر اللہ کے علاوہ غیر کا نام لیا جائے تو جانور حرام ہوگا اور اگر بوقت ذبح بسم اللہ کہا جائے تو ذبح حرام نہیں ہوگا۔ زمانہ جاہلیت میں لوگ لات، منات عزیٰ وغیرہ کے نام پر جانور ذبح کرتے تھے اور اللہ کا نام نہ لیتے تھے لہٰذا وہ حرام ہیں۔ اس مسئلہ میں حقیقت حال یہ ہے۔ کہ وہ جانور بدعقیدگی کی وجہ سے حرام قرار دیا گیا ہے۔ جب وہ غیر اللہ کی طرف منسوب ہوگیا کہ یہ فلاں پیر یا بزرگ کا بکرا ہے تو وہ بسم اللہ کہہ کر ذبح کرنے سے بھی حرام ہی رہیگا۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص خنزیر کو بسم اللہ پڑھ کر ذبح کرے اور پھر اُسے حلال سمجھنے لگے۔ جو چیز بنیادی طور پر حرام ہے وہ اللہ کا نام لینے سے حلال نہیں ہو جاتی ہاں اگر متعلقہ شخص اس غلط عقیدے سے تائب ہو جائے تو پھر شرعی طریقہ سے

ذبح کرنے پر جانور حلال شمار ہوگا۔ جانوروں کے علاوہ دوسری اشیاء کھانا، دودھ، مٹھائی وغیرہ بھی اگر غیر اللہ کی نیاز ہے تو وہ حرام ہے۔ اور ان کی حرمت بھی غیر اللہ کے نام پر نامزدگی کی وجہ سے ہے وَمَآ اُهِلَّ کا یہی مطلب ہے۔

مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ تمام انبیائے کرام اور ائمہ ملت حنیفیہ اس بات پر متفق ہیں کہ غیر اللہ کے نام پر کسی چیز کی نامزدگی سے اُس چیز میں معانی نجاست پیدا ہو جاتی ہے۔ مشرکین جانوروں کے متعلق اہل اسلام پر اعتراض کرتے تھے کہ تمہارا مذہب بھی عجیب ہے۔ جس جانور کو خدا تعالیٰ مار دیتا ہے اُسے مُردار سمجھ کر حرام قرار دیتے ہو، اور جسے خود ذبح کر کے مارتے ہو وہ تمہارے لیے حلال ہے فرمایا مشرک لوگ اس قسم کی تاویلات سے دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں حقیقت میں موت تو ہر حال میں من جانب اللہ ہی ہوتی ہے خواہ کوئی جانور طبعی موت مر جائے یا اُسے ذبح کر دیا جائے مگر اللہ کا نام لے کر ذبح کرنے سے اس میں پاکیزگی آتی ہے جب کہ غیر اللہ کے نام سے اس میں نجاست آتی ہے۔ اگرچہ وہ نظر نہیں آتی۔ اس کی مثال خود مشرک ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ" یعنی مشرک لوگ ناپاک ہیں اگرچہ وہ نہا دھو کر اچھے کپڑے پہن لیں اور خوشبو لگا لیں۔ وہ بظاہر تو پاک صاف ہیں مگر اُن کی بدعقیدگی کی وجہ سے اُن میں روحانی نجاست پیدا ہو چکی ہے جو نظر نہیں آتی۔ اسی طرح غیر اللہ کے نام پر ذبح اور بغیر ذبح کے مرنے والا جانور بہر حال حرام ہوگا اگرچہ اس کی نجاست نظر نہیں آتی۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے اپنی تفسیر میں اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اس سلسلہ میں ایک نہایت اہم مکتوب لکھا ہے۔ فرماتے ہیں جو جانور غیر اللہ کے نام پر اس لیے نامزد کر دیا جائے کہ وہ راضی ہو کر ہماری مرادیں پوری کریں گے، تو وہ جانور حرام ہی رہیگا۔ خواہ بوقت ذبح اُس پر اللہ کا نام لے لیا گیا ہو۔

دیگر حرام جانور

فرمایا تمہارے لیے مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور غیر اللہ کی نذر حرام قرار دیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ وَالْمُنْخَنِقَةُ وہ جانور بھی حرام ہے جو گلا گھٹ جانے سے مر گیا ہو۔ نیز وَالْمَوْقُوْذَةُ جو جانور چوٹ لگنے سے مر جائے وہ بھی حرام ہے

اینٹ، پتھر یا لکڑی وغیرہ کی ضرب سے ہلاک ہوگیا تو بھی حرام کی فہرست میں آئیگا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ جس جانور کو تیر سیدھا لگے اور وہ ہلاک ہو جائے وہ تو حلال ہوگا کیونکہ تیر کی نوک لگنے سے اس کا خون بہہ گیا، مگر جس کو چپٹا تیر لگے اور وہ اس کے دباؤ (FORCE) سے ہلاک ہو جائے۔ وہ حلال تصور نہیں ہوگا۔ غلیل اور بندوق کی گولی سے ہلاک ہونے والے جانور کا بھی یہی حکم ہے۔ کسی جانور کو مکہ مار کر یا کسی لکڑی وغیرہ کی ضرب سے ہلاک کر دیا جائے تو وہ بھی حرام ہوگا۔ البتہ اگر مرنے سے قبل شرعی طریقے سے ذبح کر لیا جائے، تو وہ حلال ہوگا۔

فرمایا وَالْمُتَرَدِّيَةُ اور وہ جانور بھی حرام ہے جو کسی اونچی جگہ ٹیلے، دیوار یا چھت سے گر کر مر جائے وَالنَّطِيحَةُ اور وہ بھی جو دوسرے جانور کے سینگ لگنے سے ہلاک ہو جائے۔ اس کے علاوہ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ جسے درندے پھاڑ کھائیں۔ درندوں کا شکار ہو کر مر گیا تو حرام ہوگا إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ سوائے اس کے کہ اُسے ذبح کر لیا جائے۔ کسی درندے نے زخمی کر دیا ہو مگر مرنے سے پہلے اُسے باقاعدہ ذبح کر لیا جائے تو وہ حلال ہوگا اگرچہ درندہ اس میں سے کچھ کھا گیا ہو۔

استھان پہ ذبح شدہ

فرمایا ان محرمات کے علاوہ وہ جانور بھی حرام ہوگا وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ جسے کسی استھان پر ذبح کیا گیا ہو۔ نصب بت کو بھی کہتے ہیں اور یہ لفظ ہر اُس تکیہ، بیٹھک یا مکان وغیرہ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جو غیر اللہ کی طرف منسوب ہو۔ اگر اُس خاص مقام یا استھان پہ ذبح سے مقصود منسوب الیہ کی رضا اور خوشنودی ہو تو ایسا ذبیحہ بھی حرام ہوگا۔ ایک شخص نے حضور علیہ السلام سے دریافت کیا کہ میں فلاں مقام پر اللہ کے نام پر جانور ذبح کرنا چاہتا ہوں، کیا مجھے اجازت ہے؟ فرمایا، وہاں کوئی بُت یا استھان وغیرہ تو نہیں؟ عرض کیا، ایسی کوئی چیز نہیں۔ اس پر آپ نے اجازت دیدی۔ یاد رہے کہ حج و عمرہ کے موقع پر جو ہدی یعنی قربانی کے جانور لے جائے جاتے ہیں اُن کی نسبت بیت اللہ یعنی اللہ کے گھر کی طرف ہوتی

ہے۔ اور یہ اس لیے جائز ہیں کہ وہاں تقرب الی اللہ مقصود ہوتا ہے، نہ کہ غیر اللہ کی خوشنودی۔ جو جانور کسی تھیہ، درخت، قبر یا دیگر غیر اللہ کی طرف منسوب جگہ پر ذبح کیا جائے، اس حکم کی رو سے قطعاً حرام ہو گا۔

تیروں کے ذریعے تقسیم

اس آیت کریمہ میں آخری حرام چیز فرمایا وَ اَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ یہ کہ تم تیروں کے ذریعے تقسیم کرو۔ اس تقسیم سے مراد فال نکالنا یا قسمت کا حال معلوم کرنا ہے۔ زمانہ جاہلیت کے دوران عربوں میں یہ دستور تھا کہ جب کسی اہم کام سفر، شادی وغیرہ کا ارادہ کرتے تو شگون کے لیے عبادت خانے کے مہنت کے پاس جاتے۔ اس کے تھیلے میں تین تیر ہوتے تھے۔ ایک پر لکھا ہوتا۔ اَمَرَنِیْ رَبِّیْ، دوسرے پر نَھَانِیْ رَبِّیْ اور تیسرا تیر خالی ہوتا۔ مقررہ نذرانہ وصول کر کے مجاور تھیلے سے ایک تیر نکالتا۔ اگر اَمَرَنِیْ رَبِّیْ والا تیر نکلتا، تو اسے نیک شگون خیال کر کے مطلوبہ کام کر گزرتے۔ اگر نَھَانِیْ رَبِّیْ والا تیر نکلتا، تو اُس ارادے سے باز آجاتے اور اگر خالی تیر نکلتا تو کام کو مؤخر کر دیتے اور کسی دیگر موقع پر قسمت آزمائی کے لیے چھوڑ دیتے۔ یہ چیز اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنے کے مترادف تھی۔ اللہ نے انہیں ایسا کرنے یا نہ کرنے کا بالکل حکم نہیں دیا تھا بلکہ یہ اُن کی اپنی اختراع ہوتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس طرح کی تقسیم کو حرام قرار دے دیا۔

تیروں کے ذریعے تقسیم کا ایک اور طریقہ بھی عربوں میں رائج تھا جسے خالص قمار بازی یا جوئے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ عجیب و غریب طریقہ یہ تھا۔ کہ کوئی دس آدمی مل کر ایک اونٹ خریدتے اور اُسے ذبح کر کے اس کا گوشت دس برابر برابر حصوں میں تقسیم کرتے۔ پھر وہ دس تیر جن میں سے سات پر نمبر لگے ہوتے تھے اور تین خالی ہوتے تھے۔ ایک ایک حصہ دار ایک ایک تیر نکالتا۔ جس حصہ دار کے ہاتھ میں جتنے نمبر کا تیر آجاتا۔ وہ اونٹ کے گوشت کے اتنے حصے اٹھا لیتا۔ مثال کے طور پر اگر کسی آدمی کا سات نمبر تیر نکل آیا ہے

تو سات حصے وہ لے جاتا اسی طرح باقی تین حصے وہ شخص لے جاتا جس کا تیر تین نمبر والا نکلا ہے اس طریقہ سے سارا گوشت چند حصہ داروں میں تقسیم ہو جاتا اور باقی برابر کے حصہ دار محروم رہ جاتے تھے۔ اس غیر منصفانہ تقسیم کو بھی اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے۔

عربوں میں یہ بھی رواج تھا کہ اونٹ ذبح کرتے تو اس کے گوشت میں سے غربا کو بھی کچھ دے دیتے۔ اس طرح گوشت کا وافر حصہ وصول کرنے والا حصہ دار سارا گوشت خود نہیں کھا جاتا تھا بلکہ اس میں اپنی برادری اور غرباء کو بھی شریک کر لیتا تھا۔ اس طرح وہ اس قسم کی قمار بازی کو احسن تصور کرتے تھے اور جو شخص اس طرح کا جوا نہیں کھیلتا تھا۔ اُسے بُرا اور کنجوس خیال کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے اسے خالص جوا قرار دیا جو کہ قطعاً حرام ہے۔

اِس قسم کی وبا اس زمانے میں بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً نجیب آباد کے سلطانہ ڈاکو کے متعلق مشہور ہے کہ وہ امیروں پہ ڈاکے ڈالتا تھا اور پھر حاصل شدہ مال سے غرباء کی بچیوں کی شادی میں اعانت کرتا تھا۔ یہ بھی غلط ہے۔ ڈاکہ ڈالنا، کسی کا مال ناجائز طریقے سے حاصل کرنا ویسے ہی حرام ہے، اس سے غرباء کی امداد کا کیا معنیٰ؟ اسی طرح عرب بھی قمار بازی کو جائز بلکہ مستحسن خیال کرتے تھے اور اس میں حصہ نہ لینے والے کو ناپسندیدہ شخص قرار دیتے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہارے لیے جوئے کے تیروں کے ذریعے تقسیم شدہ چیز حرام قرار دی گئی ہے

فقہائے کرام اسی بات سے استدلال کرتے ہیں کہ دست شناسی یا قسمت کا حال معلوم کرنا ناجائز ہے۔ یہ بھی جوئے کے تیروں سے تقسیم کے مترادف ہے۔ آج کل کے زمانے کی لاٹری بھی اسی قبیل سے ہے سب لوگ برابر حصہ دار ہوتے ہیں مگر جس کے نام کی لاٹری نکل آتی ہے وہ سب کچھ لے جاتا ہے اور باقی لوگ محروم رہ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ سب صورتیں ذٰلِكُمْ فِسْقٌ معصیت اور گناہ ہیں۔ یہ نافرمانی کی باتیں اور اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے محرمات کا یہ قانون بتلا دیا ہے۔ اگلی آیات میں بعض دوسری چیزوں کا تذکرہ آئیگا۔

اَلۡیَوۡمَ یَئِسَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ دِیۡنِکُمۡ فَلَا تَخۡشَوۡہُمۡ وَاخۡشَوۡنِ ؕ اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَرَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا ؕ فَمَنِ اضۡطُرَّ فِیۡ مَخۡمَصَۃٍ غَیۡرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثۡمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۳﴾

ترجمہ:۔ آج کے دن نا اُمید ہو گئے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تمہارے دین سے پس اُن سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو آج میں نے کامل کر دیا تمہارے لیے تمہارے دین کو اور پوری کر دی ہے میں نے تم پر اپنی نعمت اور پسند کیا ہے میں نے تمہارے لیے اسلام کو دین پس جو شخص مجبور ہو گیا بھوک سے اس حال میں کہ وہ نہیں مائل ہونے والا گناہ کی طرف۔ پس بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ ﴿۳﴾

ربط — سورۃ کی ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے ایفائے عہد کا حکم دیا۔ عہد میں اللہ تعالیٰ اور مخلوق کے ساتھ کیے گئے تمام عہد شامل ہیں۔ جب کوئی انسان کلمہ توحید پڑھتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کی توحید اور رسالت پہ ایمان کا عہد کرتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ تمام قوانین کی پابندی کا عہد کرتا ہے ہر انسان پر قانون کی پابندی لازم ہے۔ اسی کے ذریعے وہ حظیرۃ القدس کا ممبر بن سکتا ہے اور پھر جنت میں اعلیٰ مقام حاصل کر سکتا ہے دیگر قوانین میں کھانے پینے سے متعلق حلت و حرمت کا ایک اہم قانون ہے۔ جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے اُن کو استعمال کرنا چاہیئے۔ وہ یقیناً انسانی فطرت کے مطابق ہیں اور جن چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے، اُن میں یقیناً کوئی خرابی ہے جو انسانی جسم یا روح کے

لیے مضر ہے، لہٰذا اُن چیزوں سے اجتناب ہی انسان کے لیے بہتر ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ حرام چیز کے استعمال سے اُس کا بُرا نتیجہ فوراً ظاہر ہو جائے، بلکہ بعض اشیاء کے اثرات آہستہ آہستہ نمودار ہوتے ہیں۔ البتہ بعض چیزیں ایسی ہیں جن کی خباثت بالکل واضح ہوتی ہے۔ مثلاً مردار اور دمِ مسفوح کو کوئی سلیم الفطرت انسان کھانے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ جن چیزوں کے اثرات بتدریج ظاہر ہوتے ہیں اُن میں خنزیر کا گوشت ہے جس کے استعمال سے انسان بے غیرت ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح نذر لغیر اللہ میں روحانی خباثت پائی جاتی ہے اگرچہ وہ ظاہراً نظر نہیں آتی۔ مگر انسان کا دِل، دماغ اور روح ناپاک ہو جاتی ہے تمام انبیائے کرام اور ملتِ حنیفیہ کے ائمہ نے اسے حرام ہی قرار دیا ہے

کفار کی مایوسی سورۃ کی آیت نمبر ۳ میں حلت و حرمت کے احکام بیان ہوئے ہیں۔ اور یہ سلسلہ آیت ۴ میں بھی جاری رہیگا۔ البتہ درمیان میں یعنی آیت نمبر ۳ کے دوسرے حصے میں اللہ تعالیٰ نے اہل اسلام اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کیے گیے احسان کا ذکر فرمایا ہے جس کے ذریعے اُس نے اہل ایمان کو کفار پر مکمل غلبہ عطا کیا، اور کفار دینِ اسلام سے مکمل طور پر مایوس ہو گئے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ آج کے دن کفار تمہارے دین سے مایوس ہو چکے ہیں۔ امام بیضاویؒ مفسر قرآن فرماتے ہیں کہ یہاں پر اَلْيَوْمَ سے مراد کوئی خاص معین دِن نہیں بلکہ یہ ۹ ذی الحج ۱۰ھ کا دِن ہے جس روز یہ آیت نازل ہوئی اور آنے والا سارا زمانہ مراد ہے۔ اُس وقت فتح مکہ ہو چکی تھی اور پورا خطہ عرب اسلام کے زیرِ نگیں آ چکا تھا۔ عربوں کی اکثریت اسلام لا چکی تھی تاہم جو اقلیت باقی رہ گئی تھی اُس میں اسلام سے مقابلہ کے لیے دم خم نہیں تھا۔ فتح مکہ سے قبل عربوں نے ہر چند کوشش کی کہ اسلام کے پودے کو پنپنے سے روک دیا جائے۔ اس کے لیے انہوں نے کئی جنگیں بھی لڑیں مگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ مسلمان مختلف

محاذوں پر کامیابیاں حاصل کرتے رہے حتیٰ کہ ۸ھ میں مکہ بھی فتح ہو گیا جس سے قریش کی رہی سہی قوت بھی ختم ہو گئی۔ اب صرف حنین والوں میں کچھ سکت باقی تھی، فتح مکہ کے بعد انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اب بھی موقع ہے کہ کسی طرح مسلمانوں کا راستہ روک دیا جائے، ورنہ ہم ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گے۔ انہوں نے آخری کوشش کی اور درید بن الصمہ نے چوبیس[24] ہزار کے قریب فوج جمع کی، دیگر جنگی ساز و سامان بھی اکٹھا کیا اور مسلمانوں سے ٹکرا گئے مگر انہیں بھی شکست فاش ہوئی اور پورے عرب میں مسلمانوں کو کسی طرف سے خطرہ باقی نہ رہا۔

اس پس منظر میں ۱۰ھ میں یوم عرفہ کے دن آیت کا یہ حصہ نازل ہوا، جس میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو خوشخبری سنائی کہ اب کفار تمہارے دین سے مکمل طور پر مایوس ہو چکے ہیں، اب اسلام کے خلاف اُن میں کوئی دم خم باقی نہیں رہا۔ اور اسلام غالب آچکا ہے ایک موقع پر حضور نبی کریم علیہ السلام نے بھی فرمایا تھا اَلشَّیْطٰنُ یَئِسَ اَنْ یَعْبُدَہُ الْمُصَلُّوْنَ وَلٰکِنْ فِی التَّحْرِیْشِ بَیْنَھُمْ یعنی عرب کے خطے میں شیطان اس بات سے مایوس ہو گیا ہے کہ نمازی اب اس کی پرستش کرنے لگیں۔ البتہ شیطان آپس کی لڑائی بھڑائی میں ضرور کامیاب ہوگا تحریش کے معنی ابھارنا ہے جیسے جانوروں کو لڑانے کے لیے اُن کے مالک انہیں مختلف طریقوں سے ابھارتے ہیں مقصد یہ کہ اب اس خطہ ارض میں کفر اور شرک کا قلع قمع ہو چکا ہے۔ البتہ مسلمانوں کا آپس میں لڑائی جھگڑا ہوتا رہے گا۔ بہرحال فرمایا کہ اب کافر لوگ مکمل طور پر مایوس ہو گئے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو دوبارہ کفر کی طرف لا سکیں گے۔

نزولِ آیت

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ آیت کا یہ حصہ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا تک ۱۰ھ بتاریخ ۹ ذی الحج عرفہ کے دن بروز جمعہ نازل ہوئی اس دن حضور علیہ السلام مسجد نمرہ میں ظہر و عصر کی نمازیں ادا کرنے کے بعد جبل رحمت

کے سامنے اونٹنی پر سوار وقوف فرما رہے تھے کہ آیت کا یہ ٹکڑا نازل ہوا۔ مختلف روایات کے مطابق اُس دن ایک لاکھ چودہ ہزار، ایک لاکھ چوبیس ہزار، ایک لاکھ تیس ہزار، ایک لاکھ چالیس ہزار یا ڈیڑھ لاکھ افراد میدانِ عرفات میں موجود تھے۔ حضور علیہ السلام اور صحابہ کرامؓ قبلہ رُو ہو کر دُعائیں کر رہے تھے کہ آیت کا یہ حصہ نازل ہوا۔ اس کے بعد نبی علیہ السلام اکیاسی دن تک اس دنیا میں تشریف فرما رہے۔ اس دوران فرائض یا احکام کے متعلق مزید کوئی آیت نازل نہیں ہوئی، بلکہ اس لحاظ سے یہ آخری آیت کریمہ تھی۔ البتہ اس آیت کے بعد سورۃ بقرہ کی صرف یہ آیت نازل ہوئی وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ اس میں اہلِ ایمان کو اُن کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا گیا ہے کہ قیامت کے محاسبے والے دن سے ڈر جاؤ، اُس دن ہر ایک کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور کسی کے ساتھ زیادتی نہیں ہو گی۔

دن منانے کی وبا

حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں ایک یہودی نے آپ سے کہا کہ تکمیلِ دین کی آیت اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ۔ بڑی اتنی عظیم آیت ہے کہ اگر یہ ہم پر نازل ہوتی تو ہم اس کے نزول کے دن کو یومِ عید مناتے اور اس پر خوشی کا اظہار کرتے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، تمہیں کیا پتہ ہے جس دن یہ آیت نازل ہوئی اُس دن ہماری دو عیدیں تھیں، ایک جمعہ تھا اور دوسرے عرفہ کا دن یہ دونوں دن اللہ کی بارگاہ میں قبولیتِ دُعا کے دن ہیں۔ آپ نے اشارتاً یہ بات بھی بتا دی کہ اسلام میں دن منانے کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہودی، عیسائی، ہندو وغیرہ اپنے اپنے دن مناتے ہیں مگر اسلام نے ایسا حکم نہیں دیا۔ تکمیلِ دین کا دن بلاشبہ اہلِ اسلام کے لیے خوشی و مسرت کا دن ہے۔ جمعہ ——— تو ویسے ہی سید الایام ہے اور عرفہ کا دن سال بھر میں سب سے زیادہ مقبولیت کا دن ہے اس دن اللہ تعالیٰ کی رحمت بارش کی طرح نازل ہوتی ہے اور اسی دن شیطان

سب سے زیادہ ذلیل ہوتا ہے۔ مگر حضور علیہ السلام آپ کے صحابہ کرامؓ، تابعین اور تبع تابعین اور سلف صالحین میں سے کسی نے کوئی دِن نہیں منایا۔ دِن منانے کی بیماری چھٹی ساتویں ہجری میں شروع ہوئی جب دین کی اصلیت ختم ہوئی۔ تو فاسق فاجر لوگوں نے میلاد اور دیگر دِن منانے شروع کر دیے۔ بزرگوں کے عرس تو روزمرہ کا معمول بن گیا ہے۔ کوئی دِن ایسا نہیں جس دِن کوئی بزرگ پیدا نہ ہوا یا فوت نہ ہوا ہو۔ تو اب کِس کِس کا دِن منائیں گے، یہ تو فطرت کے خلاف بات ہے محض دِن منا کر سمجھتے ہیں کہ ہم نے دین کا حق ادا کر دیا، حالانکہ یہ تو دین سے گریز ہے۔ دین کا تقاضا تو یہ ہے کہ قانون کی پابندی کی جائے۔ تمام احکام کو بجا لایا جائے مگر فرائض، واجبات کو تو کوئی پوچھتا نہیں اور یہ کسر دِن منا کر پوری کی جاتی ہے۔

دین پر ثابت قدمی

فرمایا آج کے دِن کافر تمہارے دین سے مایوس ہو چکے ہیں فَلَا تَخْشَوْهُمْ پس اُن سے مت ڈرو۔ اُن کی کمر ٹوٹ چکی ہے، وہ اب تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، لہٰذا اُن سے ڈرنے کی بجائے وَاخْشَوْنِ مجھ سے ڈرو کہ میری نافرمانی نہ ہو جائے۔ اہل ایمان کو ترغیب دی گئی ہے کہ اپنے دین پر قائم رہو اور اِس کے پروگرام کو بلا خوف و خطر دوسروں تک پہنچا دو۔ ایسے ہی سر دور میں ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ پورے اطمینان کے ساتھ اپنے دین پر عمل پیرا ہو اور اس سلسلے میں اغیار کی کسی بات کو خاطر میں نہ لائے۔ وہ لوگ بے شک آپ پر طعن و ملامت کریں گے، شکوک و شبہات کا اظہار کریں گے، طرح طرح کے اعتراضات اٹھائیں گے، مگر اُن کی کچھ پروا نہ کریں اور اپنے دین پر ڈٹے رہو۔ اُن کی تو ہمیشہ سے یہی خواہش رہی ہے کہ اسلام کو غلبہ حاصل نہ ہو۔ یہود و نصاریٰ کے متعلق تو واضح طور پر آ چکا ہے وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ کہ وہ تم پر ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک کہ آپ اُنکی ملت کی پیروی نہ کریں۔ کافر بھی تمہیں پلٹا کر کفر کی طرف لے جانا چاہتے ہیں مگر تمہیں جرأت کے ساتھ اپنے دین پر عمل کرنا ہوگا۔ آپ سنت کی بجائے بدعت کو

اختیار نہ کریں، فضول رسومات محض اغیار کی دیکھا دیکھی اختیار نہ کریں، یہ نہ سوچیں کہ اللہ کے احکام پر عمل کرنے سے وہ کیا کہیں گے، ان کا خوف دل سے نکال دیں، بلکہ میرے احکام کی عدولی سے ڈریں۔

اہل ایمان میں یہ کمزوری پیدا ہو چکی ہے۔ کہ وہ دنیا کے لوگوں سے ڈرتے ہیں کہ فلاں کام اسلام کے مطابق شروع کر دیا تو متمدن قومیں کیا کہیں گی کہ انہوں نے چودہ صدیاں پرانا نظام اپنایا ہے۔ اسلامی قانون کے نفاذ میں یہی چیز حائل ہے۔ جو ملک اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا، وہاں اسلامی قانون اس لیے نافذ نہیں ہو رہا کہ یورپ اور امریکہ والے اسے پسند نہیں کرتے اسلام کے نظامِ عدل کی بجائے انگریزوں کا قانون نافذ ہے۔ کیا انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ کوئی حقدار اپنے حق کے دعویٰ کے لیے ہزاروں روپے کے سٹمپ لگائے تو پھر اس کا دعویٰ سماعت کے لیے قبول ہوگا۔ اس قسم کی بے شمار رکاوٹیں انگریزی قانون میں موجود ہیں جو حصول انصاف کے راستے میں حائل ہیں۔ اس کے باوجود تمام مشرقی اسلامی ممالک ہر کام کے لیے مغربی ممالک کی طرف رخ کرتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ خدا کے دین پر کیسے عمل درآمد ہوگا۔ ہم تو دین کے دشمنوں کی طعن سے ڈر کر اسلامی قانون کو نافذ کرنے کے لیے تیار نہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اُن سے مت ڈرو، بلکہ مجھ سے ڈرو کہ اسی میں تمہارے لیے دنیا کی کامیابی اور آخرت کی فلاح ہے۔

تکمیلِ دین

فرمایا اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے۔ دین کی تحریک حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوئی تھی۔ تمام انبیاء پہ اللہ کی طرف سے وحی نازل ہوتی رہی مگر کسی نبی پہ تکمیلِ دین کا اعلان نہیں ہوا۔ اب اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی پر تمام احکام قطعی طور پہ نازل فرما دیے ہیں اور تکمیلِ دین کا اعلان کر دیا ہے۔ دین کے تمام اصول اور فرائض مکمل ہو چکے ہیں۔ اب قیامت تک کوئی نیا اصول یا فرض نہیں آئیگا۔

تکمیلِ دین کا یہی معنیٰ ہے۔ البتہ فروعات میں بعض چیزیں قرآن پاک میں آئی ہیں اور بعض چیزیں پیغمبر علیہ السلام کے سپرد کر دیں کہ آپ ان کی وضاحت فرما دیں۔ چنانچہ حضرت مولانا گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ جو چیز صحیح حدیث سے صحیح سند کے ساتھ صحیح طریقے سے ثابت ہے، وہ قرآن پاک کی شرح ہے۔ امام ابن تیمیہؒ نے اپنے فتاویٰ میں لکھا ہے والسنۃ تفسیر القرآن وتعبیرہ یعنی سنتِ رسول قرآنِ پاک کی تفسیر اور تعبیر ہے۔ اور بعض مقامات پر صرف اصول بیان کر دیئے گئے ہیں جن کی جزئیات غیر محصور ہوتی ہیں۔ نئے نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ جن کے حل مجتہدین کرام اصولوں کی روشنی میں پیش کرتے ہیں سورۃ نساء میں یَسْتَنْبِطُوْنَهٗ کا لفظ آچکا ہے۔ مسائل کا استنباط کرنا مجتہدین کا کام ہے لہٰذا مجتہدین کا اتباع قرآن پاک ہی کا اتباع ہے کیونکہ مجتہد اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہتا بلکہ وہ صرف قرآن و سنت کے احکام کو ظاہر کرتا ہے اسی لیے مجتہدین کے اجتہاد کو مُظہر کہتے ہیں اور یہ چیز بھی تکمیلِ دین میں شامل ہے۔

تمامِ نعمت

فرمایا ایک تو دین کو مکمل کر دیا اور دوسرا وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ میں نے اپنی نعمت تم پر پوری کر دی یعنی دین کے تمام کے تمام احکام ضوابط اور فرائض وغیرہ بیان کر دیئے ہیں۔ اب کسی چیز کی کمی باقی نہیں رہی۔ اور نعمت کا معنیٰ غلبہ بھی ہے یعنی اسلام اور مسلمانوں کا غلبہ بھی عطا کر دیا ہے۔ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ تاکہ یہ دین تمام ادیانِ عالم پر غالب آجائے۔ چنانچہ نزولِ قرآن سے لے کر واقعہ صفین تک پچاس سال کے عرصہ میں اسلام آدھی دنیا پر چھا چکا تھا اور باقی نصف دنیا میں کوئی قوم سیاسی طور پر مسلمانوں کے مدِمقابل نہ رہی تھی۔ یہی اتمامِ نعمت ہے۔ سورۃ نور میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد موجود ہے۔ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا جب تک لوگ میری خاص عبادت کرتے رہیں گے اور میرے ساتھ شرک نہیں کریں گے، اُن کو ہمیشہ غلبہ حاصل رہیگا۔ اور جب اس معاملہ میں کوتاہی آجائیگی تو سارا معاملہ ہی درہم برہم

ہو جائیگا۔ چنانچہ مسلمانوں کے آپس کے لڑائی جھگڑے کی وجہ سے اِن کی ہوا اکھڑ گئی اور خلافتِ اسلامیہ کو ملوکیت میں تبدیل کر دیا گیا۔ چوہدری افضل حق مرحوم نے اپنی کتاب میں بڑا عجیب فقرہ لکھا ہے کہتے ہیں کہ افسوس کا مقام ہے کہ اسلام کے تختِ شاہی کی بجائے ملوکیت کا ٹاٹ بچھا دیا گیا۔ شوریٰ والی خلافت ختم ہو گئی اور وہی ملوکیت آگئی جسے خود اسلام ختم کرنا چاہتا ہے۔ اب بادشاہ اور ڈکٹیٹر بن گئے اور اپنی من مانی کارروائیاں کرنے لگے۔ بیت المال کو ذاتی جاگیر سمجھ کر بے دریغ خرچ کرنے لگے۔ کچھ اپنے عیش و راحت پر خرچ کیا، کچھ دوسرے حواریوں میں تقسیم کر دیا۔ اللہ نے فرمایا" وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ" جس نے کفرانِ نعمت کیا، تو پھر اللہ تعالیٰ ظالموں کو معاف نہیں کریگا۔ اور پھر ایسا ہو گا، دین میں بگاڑ آئیگا، شکست اور غلامی کا دَور دورہ ہو گا۔ چنانچہ مسلمانوں کا یہ ابتلا شروع ہو چکا ہے۔ تاتاریوں کے دور سے کہ جب قدم پھسلا ہے تو پھر سنبھل نہیں سکا۔ اب قربِ قیامت میں مسیح علیہ السلام کے نزول پر دوبارہ قدم جمنے کی اُمید کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ فرمایا میں نے تم پر دین کو مکمل کیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا اور تمہارے لیے اسلام کو بطور دین پسند کیا۔ دوسرے مقام پر موجود ہے" اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ" اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے اور یہی اس نے تمہارے لیے پسند فرمایا ہے سارے نبیوں کا دین اسلام ہی رہا ہے۔

اضطراری حالت

اسی آیت کے پہلے حصے میں حلت و حرمت کا قانون بیان ہوا تھا اور بعض حرام جانوروں کی تفصیل بتائی گئی تھی۔ اب اسی سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے ارشاد ہے فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ جو کوئی بھوک کی وجہ سے مجبور ہو جائے بشرطیکہ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ گناہ کی طرف مائل ہونے والا نہ ہو، اس کو اجازت ہے کہ وہ اللہ کی حرام کردہ اشیاء میں سے بقدر ضرورت کھا پی سکتا

ہے مطلب یہ کہ جان بچانے کے لیے اگر مردار، خنزیر یا شراب ہی میسر ہے تو پھر اسکی کم از کم مقدار استعمال کر سکتا ہے۔ یعنی اگر ایک پاؤ چیز سے جان بچ سکتی ہے تو پھر ایک سیر استعمال نہیں کر سکتا، یہ امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے۔ برخلاف اس کے امام مالکؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی گناہ کے کام کی وجہ سے مضطر ہوا ہو اُسے کھانے کی بالکل اجازت نہیں۔ ہاں اگر کسی جائز کام یا سفر پر اضطراری حالت پیدا ہوگئی تو ضرورت کے مطابق کھا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص چوری یا ڈاکہ کی نیت سے گیا ہے اور اسے اضطراری حالت پیدا ہوگئی ہے۔ تو امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک نہ وہ نماز قصر کر سکتا ہے اور نہ حرام چیز کھا پی سکتا ہے۔ البتہ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ بیشک وہ گناہ کے کام پر نکلا ہے۔ مگر وہ شرعی سفر میں نماز بھی قصر کرے گا اور اضطراری حالت میں حرام اشیا بھی استعمال کر سکتا ہے۔ البتہ جس جرم کی نیت سے کوئی نکلا ہے، وہ اس کے لیے علیحدہ قابلِ مؤاخذہ اور قابلِ سزا ہوگا۔ فرمایا اضطراری حالت میں یہ رخصت دے دی گئی ہے۔ <u>اور اگر کوئی شخص گناہ کی طرف</u> مائل ہوئے بغیر حرام چیز استعمال کریگا فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور مہربان ہے وہ چھوٹی موٹی لغزش کو معاف فرما دیگا۔ تاہم قانون اور ضابطہ کی وضاحت فرما دی کہ یہ یہ چیزیں حلال ہیں اور فلاں فلاں حرام ہیں۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ۭ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۡ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ④

ترجمہ: لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ اُن کے لیے کیا چیز حلال قرار دی گئی آپ کہہ دیجئے کہ حلال قرار دی گئی ہیں تمہارے لیے پاکیزہ چیزیں۔ اور جو سکھایا تم نے شکاری جانوروں کو کہ تم اُن کو چھوڑتے ہو شکار پر۔ تم اُن کو سکھلاتے ہو وہ چیز جو اللہ نے تم کو سکھلائی ہے۔ پس کھاؤ جو روک رکھیں تمہارے لیے۔ اور اس پر اللہ کا نام لو۔ اور اللہ سے ڈرو بیشک اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے ④

ربطِ آیات — پہلے اللہ تعالیٰ نے حلت و حرمت کا قانون بیان فرمایا اور واضح کیا کہ حرام کردہ چیزیں ان کے لیے جسمانی یا روحانی طور پر مضر ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے دین اور شریعت کی تکمیل کا اعلان فرمایا جو کہ قیامت تک کے لیے قابلِ عمل ہے۔ اللہ جل شانہٗ نے اتمامِ نعمت کا ذکر بھی کیا کہ اس نے دین کے تمام فرائض اور قوانین پورے کر دیئے ہیں۔ نیز یہ کہ مسلمانوں کو سیاسی طور پر بھی دنیا میں غلبہ حاصل ہو گیا ہے۔ پھر حلت و حرمت کے قانون میں ہی فرمایا کہ اُس نے اپنی کمال مہربانی سے اضطراری حالت میں حرام چیزوں کے استعمال کی اجازت بھی دے دی ہے۔ گویا مجبوری کی حالت میں جان بچانے کے لیے اگر ممنوع چیز بھی کھا پی لی جائے تو

کوئی حرج نہیں، تاہم اس اجازت کو دو شرائط کے ساتھ مشروط کر دیا کہ ایسا شخص نہ تو حد سے بڑھنے والا ہو اور نہ لذت کا طالب ہو بلکہ بھوک پیاس سے جان بچانا مقصود ہو۔

شانِ نزول

ابتدائے سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے مویشیوں کی حلت کے متعلق فرمایا اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ یعنی تمہارے لیے مویشی حلال قرار دیے گئے ہیں، بشرطیکہ ان کو صحیح طریقے سے ذبح کیا جائے إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ کا ذکر بھی پہلے گزر چکا ہے۔ مگر شکار کا مسئلہ ابھی تک حل طلب تھا جس کے متعلق صحابہ کرامؓ میں کئی سوال پیدا ہوتے تھے چنانچہ حضرت ابو ثعلبہ خشنیؓ اور عدی بن حاتم طائیؓ نے شکار سے متعلق حضور علیہ السلام سے دریافت کیا جس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما کر شکار کی حلت و حرمت کا مسئلہ بھی بیان فرما دیا۔ یاد رہے کہ حاتم طائی بڑا مشہور و معروف آدمی گزرا ہے، اس کی موت تو عیسائیت پر آئی، تاہم اس کے بیٹے عدیؓ اور بیٹی کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کی دولت نصیب فرمائی۔ ان کی روایت میں آتا ہے کہ انہوں نے خود یہ مسئلہ حضور علیہ السلام سے دریافت کیا تھا۔

پاکیزہ چیزیں

شکار کا مسئلہ بیان کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے پاکیزہ چیزوں کی حلت کا قانون بتلایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے يَسْأَلُونَكَ مَاذَا أُحِلَّ لَهُمْ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ ان کے لیے کیا چیز حلال قرار دی گئی ہے۔ قُلْ أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ آپ کہہ دیجئے کہ تمہارے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کی گئی ہیں۔ امام ابوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں کہ طیبات میں دو انواع کی اشیاء آتی ہیں۔ پاکیزہ اشیاء کی پہلی قسم وہ ہے جو محرمات کے مقابلے میں آتی ہے یعنی کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ یا اجماعِ امت نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، ان کے علاوہ باقی تمام چیزیں حلال ہیں اور وہ طیبات میں آتی ہیں طیبات کی دوسری قسم میں وہ چیزیں آتی ہیں جو انسانی فطرت اور

مزاج میں خبیث نہیں سمجھی جاتیں۔ ظاہر ہے کہ جس چیز کو طبیعت پسند نہ کرے وہ کیسے استعمال کے قابل ہو سکتی ہے۔ سورۂ اعراف میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی یہ صفت بھی بیان فرمائی ہے۔ کہ اللہ کا وہ امی نبی جس کا ذکر سابقہ کتب تورات وانجیل میں موجود ہے، وہ نیکی کا حکم کرتا ہے اور برائی سے روکتا ہے وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ اُن کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کرتا ہے اور خبیث چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے۔ مقصد یہ کہ جو چیزیں انسانی طبیعت کے مطابق صاف ستھری ہیں۔ وہ حلال ہیں اور جو چیزیں انسانی فطرت سے مطابقت نہیں رکھتیں، وہ حرام ہیں کیونکہ وہ ضرور جسمانی یا روحانی طور پر انسان کے لیے مُضر ہیں بہر حال فرمایا کہ تمہارے لیے پاکیزہ چیزیں حلال قرار دی گئی ہیں۔

شکار کا مسئلہ

شکار کا مسئلہ بھی حلت وحرمت ہی کا ضمنی مسئلہ ہے۔ بعض علاقوں کے لوگوں کی معیشت کا انحصار شکار پر ہوتا ہے اس کے علاوہ اُن کا کوئی دوسرا کاروبار نہیں ہوتا۔ مثلاً ساحلی علاقوں کے لوگوں کی گزر اوقات مچھلی کے شکار پر ہوتی ہے نیز صحراؤں یا جنگلوں میں رہنے والے لوگ جنگلی جانوروں یا پرندوں کے شکار سے وابستہ ہوتے ہیں چنانچہ شکار کی وسیع کاروباری حیثیت کے پیش نظر اس کی حلت وحرمت کی قانون سازی ضروری تھی جس کے لیے صحابہ کرامؓ کے دریافت کرنے پر اللہ تعالیٰ نے یہ احکام نازل فرمائے۔ ارشاد ہوتا ہے، تمہارے لیے وہ چیزیں بھی حلال قرار دی گئی ہیں وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ جو تم نے سکھایا ہے شکاری جانوروں کو۔ جوارح جمع ہے۔ جارح کی اور اس کا لغوی معنیٰ زخمی کرنے والا ہے۔ شکاری جانور چونکہ شکار کو زخمی کر کے پکڑ لیتے ہیں۔ اس لیے انہیں جوارح کہا گیا ہے۔ مُكَلِّبِيْنَ جبکہ تم انہیں شکار پر چھوڑتے ہو۔ یعنی شکاری جانور از خود شکار کے پیچھے نہیں جاتے بلکہ تم انہیں شکار کرنے کے لیے چھوڑتے ہو۔ اور شکار پر مامور کرنے سے پہلے تُعَلِّمُوْنَهُنَّ

مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ تم ان کو سکھاتے ہو وہ چیز جو اللہ نے تمہیں سکھائی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ تمہارے لیے اُن شکاری جانوروں کا شکار حلال ہے جنہیں تم شکار پر بھیجنے سے پہلے زیرِ تربیت رکھتے ہو۔ جب وہ اچھی طرح تربیت یافتہ ہو جائیں تو پھر اُن کا کیا ہوا شکار تمہارے لیے جائز ہے۔ چنانچہ فرمایا فَكُلُوا مِمَّا أَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ پس کھاؤ جو وہ شکاری جانور تمہارے لیے روک رکھیں۔ مگر اس کے ساتھ یہ شرط ہے وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ کہ اُس شکار پر اللہ کا نام بھی لے لو۔ اب شکاری جانور جو شکار پکڑ کر لائے گا، وہ تمہارے لیے حلال ہے۔

درندے شکاری کا شکار

شکار عموماً دو قسم کے جانوروں سے ہوتا ہے یعنی درندہ شکاری جانور اور پرندہ شکاری جانور۔ درندوں میں عام طور پر کتے کے ذریعے شکار کیا جاتا ہے جسے اس مقصد کے لیے خصوصی تربیت دی جاتی ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشادِ مبارک ہے إِذَا أَرْسَلْتَ كَلْبَكَ الْمُعَلَّمَ جب تم اپنے سدھائے ہوئے کتے کو شکار کے لیے بھیجو وَاذْكُرِ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ تو اس پر اللہ کا نام لیا کرو۔ اگر شکاری نے جانور چھوڑتے وقت بسم اللہ پڑھ دیا تو جو شکار وہ پکڑ کر لائے گا وہ تمہارے لیے حلال ہوگا۔ اس کے ساتھ شرط یہ ہے کہ اگر شکار تمہارے پاس زندہ پہنچ گیا ہے تو اُسے شرعی طریقے سے ذبح کر لو اور اگر راستے میں مر گیا ہے، تو بھی وہ تمہارے لیے جائز ہے، تم اُسے کھا سکتے ہو۔ البتہ اس میں ایک ضروری شرط یہ ہے کہ شکاری جانور نے شکار میں سے خود کچھ نہ کھایا ہو۔ اگر شکاری جانور نے شکار کا کچھ حصہ خود کھا لیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ شکار اُس نے خود اپنے لیے کیا ہے، نہ کہ تمہارے لیے۔ لہٰذا اس صورت میں یہ تمہارے لیے حلال نہیں ہے۔

شکاری جانور کتے کے ضمن میں ایسی صورت بھی پیش آ سکتی ہے کہ سدھائے ہوئے کتے کے ساتھ کوئی غیر تربیت یافتہ کتا بھی شامل ہو جائے

اور وہ علاوہ شکار کو اکٹھا شکار کریں۔ ایسی صورت میں کیا گیا شکار حلال نہیں ہوگا جبکہ یہ علم نہ ہو سکے کہ کون سے کتے نے درحقیقت شکار کو پکڑا ہے۔ ہو سکتا ہے۔ کہ شکار غیر تربیت یافتہ کتے نے پکڑا ہو جس پر اللہ کا نام بھی نہیں لیا گیا، لہذا ایسا مشکوک شکار حلال نہیں ہوگا۔

امام ابو حنیفہؒ جوارح کے لفظ سے یہ مسئلہ بھی نکالتے ہیں کہ شکاری کتے نے جس شکار کو پکڑا ہے اُس کا زخمی ہونا بھی ضروری ہے۔ اگر شکار زخمی نہیں ہوا تو پھر بھی وہ جائز نہیں ہوگا۔ بہرحال اُن کے نزدیک شکار کے حلال ہونے کے لیے ضروری ہے۔ کہ کتا تربیت یافتہ ہو، اُسے چھوڑتے وقت بسم اللہ پڑھی جائے، شکاری جانور شکار میں سے خود کچھ نہ کھائے اور شکار زخمی بھی ہو۔ اگر شکار ان شرائط کے ساتھ ہوا ہے تو حلال ہوگا، ورنہ نہیں۔

پرندے شکاری کا شکار

پرندے شکاری جانور باز یا شکرا وغیرہ ہوتے ہیں۔ جن کے ذریعے لوگ عموماً پرندوں کا شکار کرتے ہیں۔ ایسے شکار کے لیے بھی ضروری ہے کہ شکاری پرندہ تربیت یافتہ ہو اور اُسے شکار پر چھوڑتے ہوئے بسم اللہ پڑھی جائے۔ شکاری پرندے کی تربیت کی تکمیل کا اندازہ اس بات سے لگایا جائے گا کہ اُسے شکار کے لیے چھوڑنے کے بعد اگر واپس بلایا جائے تو وہ فوراً واپس آجائے۔ اگر اُس میں یہ خاصیت پیدا نہیں ہوئی تو وہ پرندہ تربیت یافتہ شمار نہیں ہوگا اور نہ اُس کا شکار کردہ پرندہ جائز ہوگا۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ پرندے شکاری جانور کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ وہ شکار میں سے خود کچھ نہ کھائے۔ اگر شکاری جانور نے شکار میں سے خود بھی کچھ کھا لیا ہے تب بھی وہ مالک کے لیے حلال ہوگا۔ بہرحال اگر شکار زندہ مِل گیا ہے تو اُسے ذبح کیا جائیگا۔ ورنہ وہ ویسے ہی حلال ہے

قانون کی پابندی

اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے شکار کے حدود و شرائط بیان کرنے کے بعد فرمایا، وَاتَّقُوا اللّٰهَ اللہ سے ڈرتے رہو، اُس کے قانون پر عمل کرو

اس کی خلاف ورزی نہ کرو، ورنہ دنیا و آخرت ہر دو مقامات پر نقصان اٹھاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ طرزِ تخاطب ہے کہ جہاں بھی قوانین و شرائع بیان کیے جاتے ہیں اس کے ساتھ یا تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ یا تقویٰ اختیار کرنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ یہاں بھی فرمایا۔ اللہ سے ڈرو اور اس کے قوانین کی خلاف ورزی نہ کرو کیونکہ اِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ وہ یک لخت جلد حساب لینے والا ہے۔ وہ تمہارے ہر فعل کا محاسبہ کرے گا اور اگر اس کے کسی قانون کی خلاف ورزی ہوئی گئی۔ تو پھر ایسا کرنے والے اس کی گرفت سے بچ نہیں سکیں گے وہ پورا پورا حساب لے گا اور سزا دیگا۔

اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ حِلٌّ لَّکُمْ ۪ وَطَعَامُکُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۫ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ اِذَاۤ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ وَلَا مُتَّخِذِیْۤ اَخْدَانٍ ؕ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِالْاِیْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۫ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۵﴾ ع

ترجمہ: آج حلال قرار دی گئی ہیں تمہارے لیے پاکیزہ چیزیں اور طعام اُن لوگوں کا جن کو کتاب دی گئی تمہارے لیے حلال قرار دیا گیا ہے اور تمہارا طعام اُن کے لیے حلال ہے۔ اور پاکدامن عورتیں ایمان والیوں میں سے اور پاکدامن عورتیں اُن لوگوں میں سے جنہیں کتاب دی گئی تم سے پہلے (وہ بھی تمہارے لیے حلال قرار دی گئی ہیں) جب کہ تم اُن کو اُن کے مہر دے دو اس حال میں کہ تم قید نکاح میں لانے والے ہو نہ صرف مستی نکالنے والے اور نہ پوشیدہ طور پر دوستی کرنے والے اور جو شخص کفر کرے گا ایمان کے ساتھ، پس بیشک اس کا عمل ضائع ہو گیا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گا ﴿۵﴾

ربطِ آیات

گذشتہ دروس میں اہلِ ایمان کے لیے حرام شدہ اشیاء کا ذکر ہوا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے تکمیلِ دین اور اتمامِ نعمت کا مژدہ سُنایا۔ اس کے ساتھ اپنی خاص مہربانی کا ذکر فرمایا

جس کے تحت اُس نے حالتِ اضطراری میں حرام چیزوں کو بھی بقدر ضرورت استعمال کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اللہ نے پاکیزہ چیزوں کی حلت کا حکم دیا، اور شکار سے متعلق جو سوالات تھے اُن کا جواب دیا، اور واضح کیا کہ مقررہ شرائط کے تحت کیا گیا شکار تمہارے لیے حلال ہوگا۔

حلال اور پاک چیزیں

اب آج کے درس میں اس بات کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بطور ضابطہ اور قانون ارشاد فرمایا ہے۔ اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ آج تم پر پاکیزہ چیزیں حلال قرار دے دی گئی ہیں۔ اَلْیَوْمَ سے مراد نزول آیت کا دن اور اس کے مابعد کا زمانہ ہے۔ گذشتہ درس میں لوگوں نے سوال کیا تھا "مَاذَآ اُحِلَّ لَھُمْ" کہ اُن کے لیے کون سی چیزیں حلال ہیں تو اللہ نے فرمایا تھا کہ تمہارے لیے تمام پاکیزہ اشیاء اور مقررہ شرائط کے ساتھ کیا گیا شکار حلال ہے۔ اِس درس میں اُسی چیز کو دہرایا گیا ہے کہ سب پاکیزہ اشیاء حلال ہیں۔ البتہ حرام وہ چیزیں ہیں جن میں کوئی نہ کوئی ظاہری یا باطنی خباثت پائی جاتی ہے البتہ حلت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ محرمات کو چھوڑ کر باقی سب پاک چیزیں حلال قرار دے دی گئی ہیں۔

طیبات میں دو قسم کی پاکیزہ چیزیں شامل ہیں ایک قسم تو اِن چیزوں کی ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے محرمات کے مقابلے میں صراحتاً حلال فرمایا ہے اور دوسری قسم کی طیبات وہ اشیاء ہیں جن میں کسی قسم کی خباثت یا نجاست موجود نہ ہو۔ سورۃ بقرہ میں حلال اور طیب دونوں الفاظ اکھٹے استعمال ہوئے ہیں "کُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلاً طَیِّبًا" زمین میں سے حلال اور پاکیزہ چیزیں کھاؤ۔ بظاہر تو ہر حلال چیز پاکیزہ ہی ہوگی مگر اس میں بھی ایک درجے کا فرق ہے۔ بعض چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے مگر وہ اپنی اندرونی خباثت کی بنا پر ایک مسلمان کے لیے روا نہیں ہوتیں۔ مثلاً ایک شخص نے اپنی بکری کو شرعی طریقے سے ذبح کیا ہے، اب اُس کے لیے

تو یہ قطعاً حلال ہے، مگر جو شخص وہی گوشت چوری کرکے لے جائے۔ اُس کے لیے وہ طیب چیز بھی حرام ہو جائے گی کیونکہ اس میں غیر کا حق غصب کیا گیا ہے اور ارتکاب سرقہ کی وجہ سے اس میں باطنی خباثت پیدا ہو گئی ہے۔ اسی پر قیاس کرتے ہوئے ناجائز طریقے سے حاصل کی گئی ہر قسم کی چیز حرام ہوگی۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اسے حلال قرار دے رکھا ہو۔ بعض اوقات سالن یا کوئی دوسری چیز باسی ہو جاتی ہے۔ اُس سے بدبو آنے لگتی ہے۔ اگرچہ ایسی چیز فی نفسہٖ حلال ہوتی ہے مگر اپنے اندر پیدا شدہ خرابی کی بنا پر مکروہ تحریمی میں داخل ہو جاتی گویا حلال اور طیب میں یہ خفیف سا فرق ہے۔

اہل کتاب کا ذبیحہ

فرمایا تمام پاکیزہ چیزیں حلال ہیں اور ان کے علاوہ وَطَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ اہل کتاب کا طعام بھی تمہارے لیے حلال کیا گیا ہے۔ صحابہ کرامؓ اور مفسرین عظام سے منقول ہے کہ یہاں پر طعام سے مراد عام کھانا نہیں، کیونکہ عام کھانا تو غیر مسلم کے ہاتھ کا بھی جائز ہے، اس میں اہل کتاب کی تخصیص کی کوئی ضرورت نہیں، چنانچہ یہاں پر طعام سے مراد ذبیحہ ہے۔ یعنی اہل کتاب کا ذبیحہ جانور بھی اہل ایمان پر حلال ہے بشرطیکہ ذبح کرتے وقت اُس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو کیونکہ "وَاذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهِ" کا قانون بنیادی قانون ہے۔ اور اگر اہل کتاب نے بوقت ذبح حضرت مسیح علیہ السلام یا عزیر علیہ السلام یا کسی بھی غیر اللہ کا نام لیا ہے تو ایسا ذبیحہ حرام ہوگا۔

اہل کتاب ہی سے متعلق ایک مزید شرط یہ ہے کہ ذبح کرنیوالا شخص یا تو نسلی طور پر یہودی یا عیسائی ہو یا وہ کسی دوسرے مذہب ہندو، سکھ وغیرہ سے عیسائی یا یہودی ہوا ہو۔ البتہ اگر ذبح کرنے والا شخص اسلام کو ترک کرکے یہودی یا عیسائی ہوا ہے تو وہ مرتد شمار ہوگا اور مرتد کا ذبیحہ حلال نہیں ہو سکتا۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نے بھی اس آیت میں طعام سے مراد ذبیحہ لیا ہے بشرطیکہ وہ کسی مرتد شدہ کتابی کا ذبیحہ نہ ہو۔

کتابیہ سے نکاح

اہلِ کتاب کے ذبیحہ کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو ایک اور خصوصیت بھی دی ہے کہ اُن کی عورتوں سے اہلِ ایمان کا نکاح بھی حلال ہے۔ چنانچہ آیت کے اگلے حصے میں ارشاد ہے: وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ اُن لوگوں کی پاکدامن عورتیں بھی تم پر حلال ہیں جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی۔ اہلِ کتاب میں یہود و نصاریٰ دونوں گروہ شامل ہیں۔ البتہ مشرک عورت سے مومن کا نکاح جائز نہیں جیسا کہ سورۃ البقرہ میں صریح حکم موجود ہے وَلَا تَنْکِحُوا الْمُشْرِکٰتِ حَتّٰی یُؤْمِنَّ یعنی مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔ حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ ایک مسلمان یہودیہ یا نصرانیہ سے نکاح کر سکتا ہے مگر کوئی یہودی یا نصرانی مسلمان عورت کو نکاح میں نہیں لا سکتا۔

بعض معترضین اعتراض کرتے ہیں کہ ایک وسیع تر مذہب ہونے کے باوجود اسلام نے اہلِ کتاب سے نکاح کے سلسلہ میں یکطرفہ رستہ اختیار کیا ہے۔ اگر مومن آدمی کتابیہ سے نکاح کر سکتا ہے تو کتابی آدمی مومنہ عورت سے کیوں نہیں کر سکتا۔ اس ضمن میں جرمن یہودی لیوپولڈ کا واقعہ کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے دولتِ ایمان نصیب فرمائی اور محمد اسد نام رکھا۔ بڑا پکا مسلمان ہے اور ابھی تک زندہ ہے۔ بہت بڑا مصنف بھی ہے۔ اُس نے پہلی جنگِ عظیم کے بعد کا خود اپنا واقعہ نقل کیا ہے کہ وہ فلسطین اور شام کے علاقہ میں ایک مرتبہ سفر کر رہا تھا۔ دورانِ سفر اُس کا ایک بدو مسلمان ہمسفر تھا ناشتہ کرنے لگا اور مجھے بھی شرکت کی دعوت دی تفضل یعنی تم بھی کھاؤ۔ محمد اسد خود بیان کرتا ہے کہ میں نے کھانے میں شریک ہونے سے ہچکچاہٹ ظاہر کی مگر اُس نے کہا کہ جب تم بھی میری طرح مسافر ہو، کھانا کھانے میں کیا حرج ہے۔ الغرض اُس نے ایک

روٹی مجھے دی اور ایک خود اور ہم نے کھانا شروع کر دیا۔ کہتا ہے کہ پہلے تو میں اُس بدو مسلمان کی سادہ معاشرت اور بے تکلفی سے متاثر ہوا، پھر دوران گفتگو میں نے اُس سے سوال کیا کہ جب ایک مسلمان کتابی عورت سے شادی کر سکتا ہے تو کتابی مرد کسی مسلمان عورت سے نکاح کیوں نہیں کر سکتا۔ وہ دیہاتی آدمی اسلام کا گہرا شعور رکھتا تھا، کہنے لگا اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل اسلام اللہ کے تمام نبیوں حتیٰ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بھی اُسی طرح ایمان رکھتے ہیں جس طرح وہ نبی آخر الزمان حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ سابقہ انبیا علیہم السلام کی اُسی طرح تعظیم و تکریم کرتے ہیں جس طرح اپنے نبی کی۔ چنانچہ جب یہودیہ یا نصرانیہ عورت مسلمان کے گھر میں آئیگی تو وہ وہاں اپنے نبی کی تعظیم و تکریم ہی پائیگی اور اُسے کسی قسم کی ذہنی کوفت نہیں ہوگی۔ برخلاف اس کے یہودی نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں اور نہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ اسی طرح عیسائی نبی آخر الزمان پر ایمان نہیں رکھتے۔ لہذا جب مسلمان عورت یہودی یا عیسائی کے گھر میں جائے گی تو وہ ہر وقت ذہنی کوفت میں مبتلا رہیگی کیونکہ اُس کے سامنے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کی بجائے توہین کی جائیگی، چنانچہ مسلمان عورت کے لیے کتابی مرد کے نکاح میں جانا جائز قرار نہیں دیا گیا۔

موجودہ زمانے کے نصاریٰ

یہ بات قابل ذکر ہے کہ موجودہ زمانے کے نصاریٰ برائے نام نصاریٰ ہیں۔ ان کی اکثریت نہ کسی مذہب کی قائل ہے۔ نہ آسمانی کتاب کی اور نہ اللہ تعالیٰ کی ہیں دہریہ قسم کے لوگ ہیں۔ لہذا یہ صحیح معنوں میں اہل کتاب کی تعریف میں نہیں آتے۔ اسی لیے نہ تو ان کا ذبیحہ مسلمانوں کے لیے حلال ہے اور نہ ان کی عورتوں سے نکاح جائز ہے۔ اہل اسلام کو اس معاملہ میں محتاط رہنا چاہیئے ہاں اگر یقین ہو جائے کہ کوئی شخص واقعی کتابی ہے۔ اُس کا توراۃ یا انجیل پر ایمان ہے تو اُس کی دونوں چیزیں اہل اسلام کے لیے روا ہیں۔ حضرت

مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ نے بھی بیان القرآن میں یہی لکھا ہے کہ موجودہ زمانے کے نصاریٰ کا کچھ اعتبار نہیں کیونکہ یہ اہل کتاب نہیں بلکہ ملحد ہیں۔
حضرت مولانا شیخ الہندؒ نے بھی سورۃ بقرہ کی تفسیر میں یہی بات لکھی ہے جب وہ مالٹا میں انگریزوں کے قیدی تھے تو انہوں نے عیسائیوں کا ذبیحہ کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ انہوں نے زندہ جانور کا مطالبہ کیا تاکہ وہ خود ذبح کر کے کھا سکیں۔ پانچ چھ ماہ تک معاملہ لٹکتا رہا، آخر برطانوی حکومت کو آپ کا مطالبہ تسلیم کرنا پڑا۔ مقصد یہ ہے کہ آپ نے عملی طور پر ثابت کر دیا کہ ان عیسائیوں کا ذبیحہ مسلمانوں کے لیے حلال نہیں ہے۔

کتابی کے لیے پاکیزہ کھانا

پہلے فرمایا کہ تمہارے لیے اہل کتاب کا طعام (ذبیحہ) حلال ہے، اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ یعنی تمہارا طعام ان کے لیے حلال ہے، تمہارا طعام تو ویسے ہی پاک ہے، تم حرام سے بچتے ہو، پاکیزہ چیزوں کو اختیار کرتے ہو اور اللہ کا نام لے کر ذبح کرتے ہو، لہٰذا اس کی حلت بیان کرنے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد مبارک ترمذی شریف میں موجود ہے لَا يَأْكُلْ طَعَامَكَ إِلَّا تَقِيٌّ یعنی تمہارا کھانا صرف متقی لوگ ہی کھائیں، کیونکہ اگر تم نے فاسق فاجر کو کھانا کھلایا اور اس نے گناہ کا ارتکاب کیا تو اس گناہ میں تمہارا حصہ بھی شامل ہوگا۔ برخلاف اس کے اگر تمہارا کھانا متقی اور نیک لوگ کھائیں گے، پھر وہ اللہ کی اطاعت کریں گے اور اس کی عبادت کریں گے تو اس نیکی سے تمہیں بھی فائدہ حاصل ہوگا۔
حضور علیہ السلام کے اس فرمان کے پیش نظر مناسب تو یہ تھا کہ اہل کتاب کو کھانا نہ کھلایا جاتا مگر اللہ تعالیٰ نے اسے حلال قرار دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام کے فرمان کا مطلب یہ ہے۔ کہ تمہاری محبت کا کھانا صرف متقی لوگ کھائیں۔ تم محبت کے ساتھ کسی کی دعوت کرتے تو اچھے نیک، دیندار اور متقی لوگوں کی کیا کرو۔ ہاں اگر غیر مسلم مجبور ہو گیا ہے، بھوک سے مر رہا ہے تو پھر حسب ضرورت

اُس کو بھی کھلا سکتے ہو مگر خلوص و محبت کی دعوت مومن کے لیے ہی ہونی چاہیے۔

پاکدامن عورتوں سے نکاح

اس کے بعد فرمایا وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ پاکدامن مومن عورتیں بھی تمہارے لیے حلال ہیں۔ محصنہ سے مراد کبھی خاوند والی عورت ہوتی ہے، اور کبھی پاکدامن۔ یہاں عفت شعار عورت مراد ہے جو کہ بدکار نہ ہو۔ شرم و حیا اور پاکدامنی ہی کسی عورت کا اصل زیور ہے۔ اس لیے ایک مومن کو ترغیب دی گئی ہے کہ نکاح کے معاملہ میں حسن و جمال یا مال و دولت پر پاکدامنی کو ترجیح دے جو عورت فسق و فجور میں مبتلا ہے۔ وہ پاکدامن نہیں ہو سکتی اسی وجہ سے فاجرہ عورت سے نکاح کرنا درست نہیں۔ نظر ہمیشہ پاکدامنی پر ہونی چاہیئے۔

کھانا اور نکاح دونوں انسان کی لازمی ضروریات ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انکی حلت و حرمت کا قانون بتا دیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اہل کتاب کا کھانا بھی حلال قرار دیا ہے اور غیر مومنہ پاکدامنہ اور اہل کتاب کی عورت سے نکاح کی اجازت بھی دے دی ہے اور نکاح کے معاملہ میں یہ شرائط لگائی ہیں اِذَآ اٰتَیْتُمُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ کہ جب تم ان کے مہر ادا کر دو۔ مُحْصِنِیْنَ نکاح میں لانے والے ہو یعنی تمہارا مقصد نکاح کر کے پوری ذمہ داری کا بوجھ اٹھانا ہو، انسان نکاح کے ذریعے ایک بہت بڑا عہد کرتا ہے، ذمہ داری سر پر لیتا ہے، خاندان کی بنیاد ڈالتا ہے، فرائض کی ادائیگی کا ذمہ لیتا ہے۔ یہ سب کچھ محصنین میں شامل ہے۔ فرمایا پہلی شرط یہ ہے کہ تم ان کے مہر ادا کر دو اور دوسری بات یہ کہ تم نکاح کرنے والے ہو غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ صرف شہوت رانی مقصود نہ ہو کیونکہ یہ چیز تو حیوانات میں بھی پائی جاتی ہے نکاح سے تمہارا مقصود محض مستی نکالنا نہ ہو بلکہ تمام قانونی اور اخلاقی تقاضے پورا کرنا ہو وَلَا مُتَّخِذِیْٓ اَخْدَانٍ اور نہ خفیہ طور پر دوستانہ مقصود ہو مطلب یہ کہ تم نکاح کے ذریعے گھر آباد کرنا چاہتے ہو نہ کہ محض وقتی دوستانہ (FRIEND SHIP) کہ جب چاہا کسی سے دوستی کر لی اور جب چاہا اُس سے

دست بردار ہو گئے۔ فرمایا ایسا نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اگر تمہارا مقصد نیک نیتی کے ساتھ نکاح کرنا ہے تو پھر تمہارے لیے پاکدامن مومنہ بھی حلال ہے اور اہل کتاب کی عورت بھی جائز ہے۔

مرتد کے لیے وعید

فرمایا وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ جو کوئی ایمان کا انکار کرے گا۔ یعنی ایمان کو ترک کر کے مرتد ہو جائے گا فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ تو اسکا سارا عمل ضائع ہو گیا۔ اس نے ایمان کی حالت میں بھی جو نیکی کی تھی وہ بھی برباد ہو گئی وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ اور ایسا شخص آخرت میں سخت نقصان اٹھانے والا ہو گا۔ اہل ایمان اپنے ایمان اور نیک اعمال کا دفتر لے کر آئیں گے اور انہیں کامیابی حاصل ہو گی۔ مگر مرتد کے پاس کچھ نہیں ہو گا۔ وہ خالی دامن اللہ کے حضور پیش ہو گا، اُس دن حقیقی نقصان زدہ مرتد آدمی ہو گا۔ جو بالکل خالی ہاتھ ہو گا۔

جب کوئی شخص اسلام کو چھوڑ کر مرتد ہو جاتا ہے، تو پھر خواہ وہ یہودی کہلائے یا نصرانی، اس کا نہ تو ذبیحہ حلال ہو گا اور نہ اُن کی عورتوں سے نکاح درست ہو گا۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے کتابی کے ذبیحہ اور ان کی عورتوں سے نکاح کو مباح قرار دیا ہے۔ تاہم احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ اگر کوئی صحیح کتابی بھی ہو تو اس کے ساتھ ایسے مراسم قائم نہیں کرنا چاہیئں حضرت حذیفہؓ نے یہودیہ سے نکاح کر لیا تو حضرت عمرؓ نے اُن کو ڈانٹ دیا تھا۔ عرض کیا، کیا اللہ تعالیٰ نے کتابیہ سے نکاح کی اجازت نہیں دی، فرمایا بیشک دی ہے مگر اس میں خطرہ ہے کہ کہیں مسلمان بدکار عورتوں کے دام میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ تمہارے پاس کسی عورت کی عصمت کا کیا ثبوت ہے۔ ہو سکتا ہے وہ بدکار ہو اور تمہارے اخلاق کو بھی تباہ کر کے رکھ دے۔ لہٰذا میں اسے پسند نہیں کرتا۔

الغرض! اللہ تعالیٰ نے اشارۃً یہ بھی بتلا دیا کہ ایمان بہت بڑی دولت ہے۔ اسے ہمیشہ محفوظ رکھنے کی کوشش کرو کیونکہ نجات کا دارومدار ایمان پر ہی ہے۔ دنیا میں نیکیاں وہی کام آئیں گی جو ایمان کے ساتھ مشروط ہوں

اور آخرت کی فلاح و کامیابی بھی ایمان پر ہی موقوف ہے۔ لہٰذا اس
دولت کو برباد ہونے سے بچانا ضروری ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَیْدِیَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَیْنِؕ

ترجمہ :- اے ایمان والو ! جب تم کھڑے ہو نماز کی طرف پس دھوو اپنے چہروں کو اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں تک اور مسح کرو اپنے سروں پر اور اپنے پاؤں کو بھی ٹخنوں تک دھو لو

ظاہری اور باطنی طہارت

گذشتہ درس میں اللہ تعالیٰ نے حلت و حرمت کا قانون بیان کیا خصوصاً محرماتِ اکل و شرب کا ذکر کیا۔ اس کے ساتھ نکاح کے لیے پاکدامن عورتوں کا بھی تذکرہ ہوا۔ ان دونوں چیزوں سے مقصود پاکیزگی کا حصول ہے جب انسان محرمات سے اجتناب کرتے ہوئے پاکیزہ چیزیں کھائے گا تو اس کا پیٹ پاک رہیگا۔ اور اگر نکاح کے سلسلے میں محرمات سے بچ گیا تو اُسے باطنی طہارت حاصل ہوگئی اور اس کے اخلاق میں صفائی آگئی۔ اور اگر دونوں چیزوں میں محرمات کا ارتکاب کریگا، تو اُسے نجاست کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا نجس غذا کھانے سے اُس کے بُرے اثرات پورے جسم پر ظاہر ہوں گے اور تمام اعضاء حتیٰ کہ خون بھی پلید ہو جائیگا، اسی طرح نکاح کے معاملہ میں اگر حدود کو توڑے گا تو قلب اور روح پلید ہو جائیں گے۔ انسان کو باطنی طہارت عبادت کرنے سے بھی حاصل ہوتی ہے مگر عبادت خصوصاً نماز بھی اُس وقت تک ادا نہیں ہو سکتی جب تک وہ ہر قسم کی ظاہری نجاست سے پاک نہ ہو۔ چنانچہ جنبی آدمی نماز ادا ہی نہیں کر سکتا۔ جب تک وہ پاک صاف نہ ہو جائے۔ حیض و نفاس والی عورت نجاست کی وجہ سے نماز ادا نہیں کر سکتی۔ امام ترمذیؒ نے حضور علیہ السلام کے اس فرمان کو سب سے پہلے بیان کیا ہے

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَقْبَلُ صَلٰوۃً بِغَیْرِ طُھُوْرٍ یعنی اللہ تعالیٰ طہارت کے بغیر نماز کو قبول نہیں فرماتا۔ اور طہارت میں جسم، لباس، مکان اور غذا وغیرہ سب کی طہارت ضروری ہے۔ باطنی نجاست یعنی کفر، شرک اور نفاق وغیرہ سے پاک ہونا بھی ضروری ہے اس کے بغیر نماز یا دیگر عبادات سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ چار بنیادی اخلاق تمام انبیاء کی شرائع میں پائے گئے ہیں اور یہی اخلاق ہماری شریعت میں بھی قیامت تک موجود رہیں گے۔ فرماتے ہیں ان میں سب سے پہلا نمبر طہارت کا ہے اس کے بعد اخبات یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے اظہارِ عاجزی ہے۔ تیسرا خلق سماحت ہے کہ انسان خسیس اشیاء مثلاً خود غرضی اور لالچ وغیرہ سے بچتا ہے اور چوتھا خلق عدالت ہے۔ یعنی انسان عدل و انصاف کو قائم رکھے اور ظلم و زیادتی کے قریب نہ جائے بہرحال شاہ صاحبؒ نے بھی طہارت کو پہلے نمبر پر رکھا ہے اور طہارت سے مراد ظاہری اور باطنی پاکیزگی ہے جس کے بغیر نماز بھی ادا نہیں ہو سکتی۔ نماز اُمّ[2] العبادات المقربۃ ہے۔ اللہ کے قریب کرنے والی عبادات کی بنیاد نماز ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں ہر قسم کی طہارت کا ذکر فرمایا ہے حتیٰ کہ پیٹ کی طہارت اور اعضائے تناسلیہ کی طہارت کو بھی بیان فرمایا ہے۔ طہارت ہی کے ضمن میں طہارتِ صغریٰ اور طہارتِ کبریٰ، غسل اور وضو کے مسائل بیان فرمائے ہیں اور پھر پانی کی عدم موجودگی میں اس کے نعم البدل تیمم کا قانون بھی بیان فرمایا ہے۔ بہرحال طہارت کے کچھ مسائل سورۃ نساء میں بیان ہو چکے تھے اور اب اُن کی مزید تفصیل یہاں آ رہی ہے۔ چنانچہ آج کے درس میں سب سے پہلے وضو کا مسئلہ بیان ہو رہا ہے۔

نماز کی اہمیت

جیسا کہ عرض کیا وضو کے بغیر انسان نماز ادا نہیں کر سکتا۔ اور نماز ہی انسان کی تکمیل اور تعلق باللہ کی استواری کا ذریعہ ہے۔ انسان نماز ہی کے ذریعے اپنے مالک کے سامنے عجز و نیازمندی کا اظہار کرتا ہے پہلے بیان کردہ چار

[1] ہمعات ص۸۹ و حجۃ اللہ البالغہ ص۵۳ [2] حجۃ اللہ البالغہ ص۷۳ و [illegible] الیاس ،

اصولوں میں سے دو یعنی طہارت اور اخبات نماز ہی کا حصہ ہیں۔ نماز جامع العبادات ہے اسی کے ذریعے انسانی قلب و روح کی نیازمندی پائی جاتی ہے، زبان سے رب العزت کی ثنا بیان ہوتی ہے اور جوارح سے اُس کی تعظیم بجا لائی جاتی ہے۔ نماز کے ذریعے انسان کے دل میں خدا تعالیٰ کی عظمت جلوہ گر ہوتی ہے اور انسان تعلق باللہ کے لیے آمادہ رہتا ہے۔

وضو قبل از نماز

ارشاد ہوتا ہے يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اے ایمان والو! اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ جب تم کھڑے ہو نماز کی طرف، تو پھر آگے بیان کردہ طریقے کے مطابق وضو کر لو۔ اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے وضو کے چار فرائض بیان کر دیے ہیں۔ وضو کی مزید تفصیلات اور تشریحات حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اقوال و اعمال میں موجود ہیں۔ وضو کی سنن اور مستحبات وغیرہ سب نبی علیہ السلام نے بیان فرما دی ہیں۔ تاہم مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ نماز کے لیے وضو کی ضرورت اس وقت پیش آئے گی وَاَنْتُمْ مُحْدِثُوْنَ جب کہ تم بے وضو ہو۔ اگر پہلے سے طہارت اور وضو موجود ہے تو نماز کے لیے دوبارہ وضو کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ نماز کے لیے کھڑے ہونے سے مراد یہ ہے۔ کہ جب تم نماز کا ارادہ کرو، تو مذکورہ طریقے سے وضو کر لو کیونکہ طہارت کے بغیر نماز ادا نہیں ہو سکتی۔ اور کھڑے ہونے سے یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ تم سوتے تھے، اب بیدار ہوئے ہو تو وضو کے ذریعے طہارت حاصل کر لو۔ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر تم کسی کام میں مصروف ہو اور نماز کا وقت ہو گیا ہے اور اب اگر اس کے لیے کھڑے ہوتے ہو تو پہلے طہارت حاصل کر لو حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق روایات میں آتا ہے کہ جب آپ کسی کام میں مشغول ہوتے اور نماز کے لیے اذان ہو جاتی تو سب کام چھوڑ کر نماز کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ آپ کے لیے نماز کی فکر سب سے مقدم

ہوتی۔ بہر حال فرمایا کہ جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو تو پہلے طہارت حاصل کر لو۔

وضو بطور شرط نماز

وضو نماز کے علاوہ اور کسی چیز کے لیے بطورِ شرط نہیں ہے ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے۔ کہ حضور علیہ السلام قضائے حاجت سے تشریف لائے اور صحابہؓ نے آپ کو کھانا پیش کیا، تو آپ نے قبول فرمایا ایک صحابی نے عرض کیا حضور! آپ نے وضو نہیں فرمایا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کیا میں نماز کا ارادہ کر رہا ہوں کہ وضو کروں۔ وضو تو نماز کی ادائیگی کے لیے ضروری ہے نہ کہ کھانا کھانے کے لیے۔ کھانے سے پہلے اور بعد صرف ہاتھ دھولینا کافی ہے۔ مکمل وضو کی ضرورت نہیں۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ ہمیشہ باوضو رہنا ایک اچھی صفت ہے۔ لَا یُحَافِظُ عَلَی الْوُضُوْءِ اِلَّا مُؤْمِنٌ یعنی مومن آدمی ہی محافظت کرتا ہے یہ مومن کی خصوصی صفت ہے کہ وہ ہمیشہ باوضو رہتا ہے تاہم یہ ضروری نہیں۔ البتہ قرآن پاک کو ہاتھ لگانے سے پہلے طہارت ضروری ہے۔ کیونکہ خود قرآن پاک میں موجود ہے۔ لَا یَمَسُّہٗ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ یعنی اُسے صرف پاک لوگ ہی چھوتے ہیں۔ ایک دوسری حدیث میں یہ بھی آتا ہے۔ کہ جس نے طہارت پہ طہارت کی یعنی وضو ہوتے ہوئے پھر وضو کیا، اُس کے نامۂ اعمال میں دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ البتہ اس کے لیے شرط یہ ہے۔ کہ پہلے وضو کے ساتھ کوئی فرضی یا نفلی عبادت کر چکا ہو۔ اگر پہلے وضو کے ساتھ ابھی تک کوئی عبادت نہیں کی تو پھر دوبارہ وضو کرنے سے زائد فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ بہر حال یہ ایک ثواب کی بات ہے۔ وضو پہ وضو ایک اچھی صفت ہے۔

فرائض وضو

فرمایا جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو تو وضو کے چار فرض پورے کرو۔ اِن فرائض میں چہرہ دھونا، کہنیوں تک ہاتھ دھونا، سر کا مسح کرنا، اور ٹخنوں تک پاؤں دھونا شامل ہیں۔ باقی تشریحات حضور علیہ السلام کے قول

اور عمل میں ملتی ہیں۔ جن میں نیت کرنا، ابتدا میں بسم اللہ پڑھنا وغیرہ۔ اعضائے فرائض میں
مذکورہ ترتیب کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے مثلاً سر کا مسح پہلے ہوگا اور پاؤں اُس
کے بعد دھوئے جائیں گے، ان میں سے کسی عضو کی از خود تقدیم تاخیر نہیں ہو
سکتی۔ پھر یہ بھی ہے کہ ہر عضو کو کم از کم ایک دفعہ دھونا اتمام وضو کا ادنیٰ درجہ ہے
حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہر عضو کو دو دو دفعہ بھی دھویا ہے اور تین تین
مرتبہ بھی۔ یہ کمال درجہ ہے۔ البتہ سر کے مسح میں تثلیث نہیں بلکہ ایک ہی دفعہ
سر پر ہاتھ پھیر لینا کافی ہے۔ بہرحال ایک، دو، یا تین دفعہ موقع کی مناسبت
سے اعضاء کو دھویا جاسکتا ہے۔ بعض اوقات پانی کی قلت ہوتی ہے تو
ایک یا دو دفعہ دھو لینا بھی کافی ہوگا، اسی طرح جلدی ہے، کسی سواری کے
نکل جانے کا خطرہ ہے تو کم از کم ایک دفعہ پانی بہا لینا بھی مکمل وضو ہے،
اس میں کوئی نقص نہیں رہتا۔ البتہ شرط یہ ہے کہ کوئی جگہ خشک نہیں رہنی چاہیے
ورنہ وضو مکمل نہیں ہوگا۔ اور نہ اس کے بعد کی گئی عبادت صحیح ہوگی۔

منہ اور ہاتھ دھونا

ارشاد ہوتا ہے۔ اے ایمان والو! جب تم نماز پڑھنے کا ارادہ کرو
فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ اپنے چہروں کو دھولو۔ یہ وضو کا پہلا فرض ہے
اس سے پہلے بسم اللہ پڑھنا اور دونوں ہاتھوں کو دھونا سنت ہے۔
حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ فرمان بھی ہے کہ جب تم میں سے کوئی نیند
سے بیدار ہو، تو اس وقت تک برتن میں ہاتھ نہ ڈالے جب تک ہاتھوں کو
تین دفعہ دھو نہ لے۔ پھر ان ہاتھوں سے پانی لے کر چہرہ دھولو۔ چہرے کے
حدود دونوں کانوں کے درمیان اور سر کے بالوں سے لے کر ٹھوڑی تک ہیں۔
اس کے علاوہ اگر داڑھی گھنی ہے تو اس کا مسح کرنا مستحب ہے۔ سارے
بالوں کو بھگونا ضروری نہیں ہے۔ اور اگر داڑھی گھنی نہیں ہے، تو اس میں پانی
ڈالنا چاہیے۔

اس کے بعد فرمایا وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ اپنے ہاتھوں کو کہنیوں

تک دھوو۔ بعض فقہائے کا اس بات میں اختلاف ہے کہ آیا کہنیاں ہاتھوں میں داخل ہیں یا نہیں۔ تاہم صحیح بات یہ ہے کہ کہنیاں ہاتھوں میں داخل ہیں اور دونوں ہاتھ کہنیوں سمیت دھونا چاہیئے ورنہ وضو مکمل نہیں ہوگا۔ ہاتھ دھوتے وقت انگلیوں کا خلال بھی ضروری ہے تاکہ کوئی جگہ خشک نہ رہ جائے دارقطنی کی روایت میں آتا ہے کہ جب تم وضو کرو تو خَلِّلُوا بَيْنَ اَصَابِعِكُمْ انگلیوں کے درمیان خلال کرو لَا يُخَلِّلُ اللّٰهُ تَعَالٰى بَيْنَهَا بِالنَّارِ ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اُن کے درمیان آگ کے ساتھ خلال کرے۔ حضور علیہ السلام کا یہ بھی ارشاد ہے وَيْلٌ لِّلْاَعْقَابِ مِنَ النَّارِ اَسْبِغُوا الْوُضُوْءَ ہلاکت ایڑیوں کے لیے دوزخ کی آگ سے، وضو مکمل بناؤ مقصد یہ ہے کہ ایڑیوں کی کوئی جگہ خشک نہ رہنے پائے۔ کامل وضو کے متعلق حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جب وضو کے پانی کا آخری قطرہ انسان کے اعضاء سے گرتا ہے تو اُس کے تمام صغیرہ گناہ معاف ہو چکے ہوتے ہیں۔

سر کا مسح

منہ اور ہاتھ دھونے کے بعد وضو کا تیسرا فرض مسح ہے۔ فرمایا وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ اور اپنے سروں پر مسح کرو۔ اس بارے میں فقہائے کرام کا اختلاف ہے کہ سر کے کتنے حصے کا مسح کرنا ضروری ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ سر کے تھوڑے سے حصے یعنی دو چار بالوں پر بھی ہاتھ پھیر دیا تو مسح ہو جائے گا۔ امام مالکؒ سارے سر کے مسح کے قائل ہیں اور امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ سر کے چوتھے حصے کا مسح فرض ہے اور پورے سر کا مستحب یہی مذہب زیادہ اوفق ہے۔ اور یہ حکم مرد و زن ہر ایک کے لیے ہے۔ مرد اپنی ٹوپی یا پگڑی اور عورت اپنی اوڑھنی کم از کم چوتھے حصہ سر تک ہٹا کر مسح کرے، اس سے آگے۔ اگر ٹوپی یا دوپٹہ پر بھی ہاتھ پھیر لیا تو کافی ہے تاہم اگر پورے سر پر مسح کرے تو زیادہ بہتر ہے۔ حضور علیہ السلام اپنے ہاتھ مبارک پیشانی سے شروع کر کے پیچھے گدی تک لے جاتے تھے اور پھر

اُسی جگہ واپس لاتے جہاں سے مسح شروع کیا تھا۔ بہرحال سارے سر کا مسح مستحب ہے، ضروری نہیں کیونکہ حضرت مغیرہ ابن شعبہؓ کی روایت میں ناصیہ کا ذکر ہے یعنی نبی علیہ السلام نے چوتھے حصے سر کا مسح فرمایا اور اس کے ساتھ گدی تک گردن کا بھی۔ بعض لوگ گردن کے مسح کو ناپسند کرتے ہیں۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں۔ مزید پانی لیے بغیر سر کے ساتھ گردن کا مسح بھی کرے۔ البتہ حلقوم کے مسح کو فقہائے کرام مکروہ بتاتے ہیں۔ — صرف گردن کا مسح پیچھے تک جیسا کہ ابوداؤد شریف اور مسلم شریف میں بَلَغَ اِلیٰ قَفَاہُ کے الفاظ آتے ہیں۔ پھر سر کے ساتھ کانوں کا مسح بھی ہے۔ شہادت کی انگلیاں کانوں کے اندر پھیرے اور انگوٹھے باہر پھیرے۔ یہ بھی مستحب ہے۔

پاؤں دھونا

چوتھے فرض کے متعلق فرمایا وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ یہ اُسی فَاغْسِلُوْا کے ساتھ ملحق ہے یعنی اپنے پاؤں کو ٹخنوں تک دھو ارجلکم کی قرأت ل کی زیر کے ساتھ بھی پڑھی گئی ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ قرأت تو یہ بھی درست ہے مگر صحابہ کرامؓ نے ہمیشہ پاؤں کو دھویا ہے صرف مسح پر اکتفا نہیں کیا۔ حضور علیہ السلام کا عمل مبارک بھی یہی ہے۔ ہاں اگر کسی شخص نے موزے پہن رکھے ہیں تو ان پر مسح تمام اہل حق کے نزدیک درست ہے۔ بعض رافضی اس کو جائز نہیں سمجھتے، مگر حضور علیہ السلام کے تقریباً ستر صحابہؓ سے موزوں پر مسح ثابت ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ گرمی سردی میں ضرورت کے علاوہ بغیر ضرورت بھی موزے پہنے جا سکتے ہیں۔ اور ان پر مسح کیا جا سکتا ہے۔ مقیم آدمی ایک دن رات اور مسافر تین دن رات تک موزوں پر مسح کر سکتا ہے۔ بول و براز کرتا ہے، باقی وضو کرے گا مگر موزوں پر مسح کافی ہے۔ البتہ اگر جنابت لاحق ہو جائے تو پھر موزے اتار کر مکمل طہارت

ضروری ہوگی

دُعا بعد از وضو

وضو کے بعد یہ دُعا بھی حضور علیہ السلام سے منقول ہے[1] اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْکَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ۔ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ التَّوَّابِیْنَ وَاجْعَلْنِیْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِیْنَ[2] اِس دُعا میں بڑی حکمت ہے۔ شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ بھی لکھتے ہیں کہ وضو کے بعد یہ دُعا پڑھ لینی چاہیئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے پروردگار! ہم نے ظاہری طور پر تو تیرے فرمان کے مطابق عمل کر لیا، اب باطنی طہارت بھی تو ہی عطا فرما اور مجھے طہارت والوں میں سے بنا دے یعنی ہمارے باطن کو بھی پاک فرما دے۔

آیت کے اگلے حصے میں طہارتِ کبریٰ یعنی جنابت کی حالت میں غسل کا بیان اور طہارتِ ضروریہ یعنی تیمم کی حکمت اور فلسفہ بھی آئے گا۔

---

[1] مسلم ص ۱۲۳ ج ۱ [2] ترمذی ص ۳۴ (نیاض)

وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى
اَوْ عَلٰي سَفَرٍ اَوْ جَاۗءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَاۗىِٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ
النِّسَاۗءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَاۗءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا
فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ۭ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ
لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ
وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۶
وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ
وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ
اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۷

ترجمہ: اور اگر جنابت کی حالت میں ہو تو اچھی طرح طہارت حاصل کرو اور اگر تم بیمار ہو یا سفر پہ ہو یا تم میں سے کوئی جائے ضرورت سے آئے یا تم عورتوں کے پاس گئے ہو، پھر تم نے پانی نہیں پایا، پس قصد کرو پاک مٹی کا اور مل لو اپنے چہروں اور ہاتھوں پہ اس مٹی سے۔ اللہ نہیں چاہتا کہ تم پر تنگی ڈال دے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ تم کو پاک کر دے اور تاکہ تم پہ اپنی نعمت پوری کر دے۔ تاکہ تم شکر ادا کرو ۝۶ اور یاد کرو اللہ کے احسان کو اور اس کے عہد کو جو اُسنے تم سے پختہ طریقے پہ ٹھہرایا ہے۔ جب تم نے کہا کہ ہم نے سُنا اور اطاعت کی۔ اور ڈرتے رہو اللہ سے۔ بیشک اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے دلوں کے راز ۝۷

ربط آیات

گذشتہ درو س میں اللہ تعالیٰ نے حلت وحرمت کا قانون بتایا۔ نکاح اور اکل وشرب میں حلال وحرام کو واضح کیا۔ یہ دراصل طہارت ہی کا بیان ہے۔ انسان کے لیے ظاہری اور باطنی طہارت ضروری ہے۔ عبادت سے بھی انسان کو باطنی طہارت حاصل ہوتی ہے اور عبادت کرنے سے پہلے ظاہری طہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر نماز بھی ادا نہیں ہوسکتی۔ اور نماز کے ذریعے انسان اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ گذشتہ درس میں طہارت صغریٰ یعنی وضو کا مسئلہ بیان ہوچکا ہے۔ اب آج کے درس میں طہارت کبریٰ کا بیان ہے یعنی جنابت کی حالت طاری ہوجائے توکسطرح طہارت حاصل کرنی چاہیئے۔

حدث اکبر

بے وضو ہونا حدث اصغر ہے جب کہ جنابت کی حالت میں ہونا حدث اکبر ہے۔ جنابت کا معنیٰ بُعد یا دوری ہوتا ہے۔ جب یہ حالت طاری ہوتی ہے تو انسان ملائکہ سے دُور ہوجاتا ہے اور جب مکمل طہارت کرلیتا ہے تو اُسے پھر ملائکہ سے مشابہت پیدا ہوجاتی ہے۔ جنابت کا مذکورہ معنیٰ زمانہ جاہلیت کے عربی شاعر کے شعر سے بھی واضح ہوتا ہے۔

فَلَا تَحْرِمَنِّی نَائِلًا عَنْ جَنَابَةٍ
فَاِنِّی امْرَءٌ وَسْطَ الْقِبَابِ غَرِیْبٌ

شاعر کہتا ہے مجھے میرے غریب الوطن یعنی گھر سے دُور ہونے کی وجہ سے محروم نہ کرنا کیونکہ اِن تمام خیموں میں ایک میں ہی غریب الوطن ہوں۔ مقصد یہ کہ جنابت کا لفظی معنیٰ دوری ہے کیونکہ جنابت کی حالت میں انسان پاکیزگی اور فرشتوں سے دُور ہوجاتا ہے۔

جنابت اس حالت کو کہتے ہیں جب انسانی جسم سے مادۂ تولید شہوت کے ساتھ خارج ہو۔ اخراج مادہ منویہ خواہ مباشرت کی وجہ سے ہو یا احتلام کی بنا پر، آدمی ہر صورت میں جنبی ہوجاتا ہے۔ طہارت کا ایک عام قاعدہ

یہ ہے کہ انسانی جسم کے جو اعضا منکشف یعنی کھلے ہوتے ہیں۔ انہیں دھونے
کا حکم ہے، جیسے منہ، ہاتھ اور پاؤں۔ اور سر چونکہ اکثر پگڑی، ٹوپی یا رومال سے
ڈھکا رہتا ہے۔ اس کے لیے صرف مسح کافی ہے۔ برخلاف اس کے جنابت
سے چونکہ سارا جسم اور اعصاب متاثر ہوتے ہیں۔ لہذا سارے جسم کے لیے نجاست
حکمی لاحق ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے پورے جسم کو پاک کرنا ضروری ہو جاتا ہے
اس کی دوسری مثال حیض و نفاس ہے۔ اِن دو حالتوں میں بھی عورت مکمل
طور پر ناپاک ہو جاتی ہے، لہذا اس کے لیے بھی مکمل طہارت لازم ہے۔
حیض کی حالت میں حکم ہے کہ عورتوں کے قریب نہ جاؤ حَتّٰی یَطْهُرْنَ
یہاں تک کہ وہ خوب اچھی طرح پاک صاف ہو جائیں۔ یہاں جنابت کی
صورت کے متعلق بھی فرمایا، کہ جب جنبی ہو جاؤ "فَاطَّهَّرُوْا" تو مکمل طہارت
حاصل کرو۔ غرضیکہ جنابت سے پاکیزگی کے لیے مکمل غسل فرض ہو جاتا ہے۔
جس طرح وضو کے بعض فرائض ہیں، اسی طرح غسل کے بھی فرائض
ہیں جن کی ادائیگی کے بغیر نہ غسل مکمل ہوتا ہے اور نہ انسان پاک ہوتا ہے۔
وضو کے دوران کلی کرنا سنت ہے جب کہ غسلِ جنابت میں فرض کا درجہ
رکھتا ہے اسی طرح ناک میں پانی ڈالنا وضو میں سنت ہے جب کہ غسلِ جنابت
میں ضروری ہے۔ اس کے بغیر غسل مکمل نہیں ہوتا۔ پھر اس کے بعد پورے
جسم پر پانی بہانا بھی فرض ہے حتیٰ کہ کوئی جگہ خشک نہ رہ جائے کیونکہ تَحْتَ
كُلِّ شَعْرَةٍ جَنَابَةٌ ہر بال کے نیچے جنابت ہوتی ہے۔ اسی لیے
فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ اگر پورے جسم میں ایک بال کے برابر بھی جگہ خشک
رہ گئی تو غسل مکمل نہ ہوگا۔ اس خطرے کے پیش نظر حضرت علیؓ کا مقولہ
ہے فَمِنْ ثَمَّ عَادَيْتُ رَاْسِيْ اسی لیے میں نے اپنے سر
کے ساتھ دشمنی کی ہے یعنی پورا سر منڈوا دیا ہے تاکہ غسلِ جنابت میں بال برابر
جگہ بھی خشک نہ رہ جائے، چنانچہ حکم ہے کہ جنابت سے طہارت کے

لیے خوب اچھی طرح مل مل کر غسل کرو۔

پانی مطہر ہے

پوری متمدن دنیا میں پانی آلہ طہارت تسلیم کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُوْرًا (الفرقان) ہم نے آسمان سے پاکیزہ پانی نازل فرمایا ہے۔ طہور مبالغے کا صیغہ ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ پانی خود پاک ہے اور دوسری چیزوں کو پاک کرتا ہے۔ گویا پانی اولین آلہ طہارت ہے۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ خوشبو بھی آلات طہارت میں داخل ہے مگر یہ دوسرے درجے پر ہے۔ بہرحال اس آیت کریمہ میں ارشاد ہے۔ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا اگر تم جنابت کی حالت میں ہو تو اچھی طرح طہارت کر لو۔ طہارت کا طریقہ میں نے عرض کر دیا ہے۔

پانی کی عدم موجودگی

یہ تو واضح ہو گیا کہ طہارت کے بغیر نہ تو قرآن پاک کو ہاتھ لگایا جا سکتا ہے اور نہ نماز یا کوئی دیگر عبادت کی جا سکتی ہے۔ اب اگر انسان بے وضو ہو جائے یا حالتِ جنابت طاری ہو جائے اور آلہ طہارت یعنی پانی بھی میسر نہ ہو، تو طہارت کیسے حاصل کی جائے؟ اور عبادت کیسے ادا کی جائے؟ ایسی ہی صورت حال کے متعلق فرمایا وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اگر تم بیمار ہو جاؤ اور بیماری کی نوعیت ایسی ہو کہ پانی کے استعمال سے بیماری کے بڑھ جانے کا خطرہ ہو اور ڈاکٹر نے پانی استعمال کرنے سے منع کر دیا ہو اَوْ عَلٰى سَفَرٍ یا تم سفر پر ہو اور دورانِ سفر پانی میسر نہ ہو۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ اگر پانی مسافر کے عارضی قیام سے کم از کم ایک میل کے فاصلے پر ہو، تو اُس کے لیے تیمم مباح ہو جاتا ہے۔ تاہم حالتِ سفر ہو اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ یا تم میں سے کوئی جائے ضرورت سے آیا ہو۔ غائط دراصل پست جگہ کو کہتے ہیں۔ رفع حاجت کے لیے عموماً لوگ پست اور نچلی جگہ کو تلاش کرتے ہیں تاکہ کسی کی نظر نہ پڑے۔ اس

لیے اصطلاحاً غائط بول و براز کرنے کو کہتے ہیں۔ فرمایا اگر تم رفع حاجت کے
بعد آئے ہو۔ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ یا تم عورتوں کے پاس گئے ہو۔
لمس کے دو معانی وارد ہوئے ہیں۔ امام شافعیؒ لمس سے مراد صرف ہاتھ
لگانا لیتے ہیں، گویا عورت کو ہاتھ لگنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ تاہم
امام ابوحنیفہؒ اور دیگر ائمہ کرام لمس سے مراد مباشرت لیتے ہیں۔ لٰمَسْتُمْ
باب مفاعلہ کا صیغہ ہے۔ اور اس باب کا تقاضا یہ ہے کہ فعل جانبین کی
طرف سے ہو، لہٰذا لمس کا معنی عورت سے قربت یا مباشرت ہی ہے
حضرات عبداللہ بن عباسؓ، حضرت علیؓ اور دوسرے صحابہؓ نے یہی معنی لیا ہے
کہ جب تم عورتوں سے مقاربت کرو۔ غرضیکہ اللہ تعالیٰ نے چار علل بیان
فرمائے کہ اگر تم مریض ہو، یا سفر پر ہو، یا جائے ضرورت سے آئے ہو، یا
تم نے عورتوں سے مقاربت کی ہے۔ ان میں سے کوئی صورت حال
پیدا ہو جائے، فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً پھر تم پانی نہ پاؤ۔ مذکورہ حالات
میں وضو کی ضرورت ہے یا غسل کی اور پانی موجود نہیں۔ یا تمہیں پانی پر قدرت
نہیں یا پانی کے استعمال سے بیماری کے مہلک ہونے کا خطرہ ہے۔ تو
پھر کیا کرو؟ فرمایا فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا قصد کرو پاک
مٹی کا، یعنی پاک مٹی سے تیمم کر لو۔ یہ تمہارے لیے وضو اور غسل کے قائم مقام ہوگا۔

تیمم کا طریقہ

تیمم کا لفظی معنی قصد کرنا ہے۔ فقہائے کرام تیمم کا معنی قصد الصعید
للتطہیر کرتے ہیں یعنی طہارت کے لیے پاک مٹی کا ارادہ کرنا۔ فرمایا
جب پانی میسر نہ ہو تو تیمم کر لو، مگر کیسے؟ فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ
وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ یعنی اس مٹی کو اپنے مونہوں اور ہاتھوں پر مل لو۔
اس کی تشریح نبی علیہ السلام نے خود اپنے ارشاد مبارک سے فرمائی۔ فرمایا
دونوں ہاتھوں سے ایک ضرب مٹی پر لگاؤ۔ اگر مٹی زیادہ لگ جائے تو
ہاتھوں کو جھاڑ دو۔ تاکہ گرد و غبار قدرے کم ہو جائے پھر دونوں ہاتھ اپنے

منہ پر مل لو۔ پھر دوسری ضرب مٹی پر لگاؤ اور دونوں ہاتھ دونوں ہاتھوں پر کہنیوں سمیت مل لو، تمہارا تیمم مکمل ہوگیا ضربات کی تعداد میں فقہائے کرام کا اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک ایک ہی ضرب لگا کر منہ اور ہاتھوں پر پھیر لینا کافی ہے مگر جمہور فقہائے کرام دو ضربات کے قائل ہیں۔ ایک دفعہ مٹی پر ہاتھ مار کر منہ پر مل لو اور دوسری دفعہ ہاتھ مار کر ہاتھوں پر پھیر لو۔ صحیح حدیث میں دو ضربوں کا ثبوت موجود ہے امام ابوحنیفہؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔ ہاتھوں کی تعریف میں بھی کئی قول ہیں۔ امام زہری کے نزدیک ہاتھوں کی حد بغلوں تک ہے۔ بعض کے نزدیک ہاتھ کلائی تک ہیں اور بعض کے نزدیک نصف ہاتھ تک۔ مگر امام ابوحنیفہؒ کہنیاں بھی ہاتھوں میں داخل کرتے ہیں۔ تیمم وضو کا نائب ہوتا ہے۔ اور وضو میں ہاتھ کہنیوں تک دھوئے جاتے ہیں لہٰذا تیمم میں بھی مٹی پر ہاتھ مار کر کہنیوں تک مل لینا چاہیئے۔ وضو میں ہاتھ گیلے کر کے سر پر مسح کیا جاتا ہے اور اس کے بعد پاؤں دھونا فرض ہے مگر تیمم میں دو فرائض پورے کیے جائیں گے اور دو ترک کر دیے جائیں گے۔ یعنی منہ اور ہاتھوں پر مسح ہوگا۔ اور سر اور پاؤں کو چھوڑ دیا جائے گا۔

پاک مٹی

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے صَعِيدًا طَيِّبًا فرمایا ہے۔ یعنی جس مٹی کے ساتھ تیمم کیا جائے وہ پاک ہونی چاہیئے ناپاک جگہ پر ہاتھ مار کر تیمم کرنے سے تیمم درست نہیں ہوگا۔ بعض مقامات پر لوگ گندگی پھینکتے ہیں اگرچہ خشک ہونے پر ایسی جگہ پر نماز پڑھی جاسکتی ہے مگر اس جگہ پر ہاتھ مار کر تیمم نہیں کیا جاسکتا۔ تیمم کے لیے مٹی بالکل پاک صاف ہونی چاہیئے۔

مٹی کے علاوہ جنسِ زمین سے کوئی بھی چیز ہو اس کے ساتھ تیمم کیا جاسکتا ہے، جیسے گرد و غبار، پتھر، سیمنٹ، چونا، ہڑتال، اینٹ روڑا وغیرہ ان اشیاء پر ضرب لگا کر تیمم کیا جاسکتا ہے، البتہ لکڑی کی راکھ درست نہیں کیونکہ یہ جنسِ ارض سے تعلق نہیں رکھتی۔ پہاڑی نمک کے ساتھ تیمم کیا جا

سکتا ہے۔ بشرطیکہ ان میں نمی نہ ہو۔ دریائی نمک میں چونکہ نمی ہوتی ہے، اس لیے اُس سے تیمم جائز نہیں۔ پتھر چونکہ جنسِ زمین سے ہے اس لیے اُس پر تیمم جائز ہے اگرچہ اس پر گرد و غبار نہ ہو۔ دھات مثلاً لوہا، تانبا، سونا، چاندی وغیرہ پر تیمم روا نہیں ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے اَلتُّرَابُ طَهُوْرُ الْمُسْلِمِ مسلمان کے لیے مٹی باعث طہارت ہے خواہ دس سال تک پانی میسر نہ ہو۔ اس دوران کوئی شخص تیمم کر کے مسجد میں داخل ہو سکتا ہے، قرآن پاک پکڑ سکتا ہے، نماز ادا کر سکتا ہے، غرضیکہ وہ تمام امور انجام دے سکتا ہے جو وضو کرنے سے ادا ہوتے ہیں۔ بہرحال یہاں پر وضو، غسل اور تیمم تینوں مسائل بیان کر دیے گئے ہیں۔

احسانات الہٰی

یہ تینوں مسائل بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ اللہ تعالیٰ تم پر کوئی تنگی نہیں ڈالنا چاہتا۔ اللہ نے تمہارے لیے بڑی آسانیاں پیدا کی ہیں وَلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ بلکہ وہ تو تمہیں پاک کرنا چاہتا ہے، کیونکہ اس کا اپنا فرمان ہے "وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ" (بقرہ) کہ وہ پاکیزہ لوگوں کو پسند کرتا ہے۔ اسی لیے اُس نے طہارت کے تمام طریقے تمہیں بتلا دیے ہیں۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ یہ بھی چاہتا ہے وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ تاکہ تم پر اپنی نعمت پوری کر دے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے احسانات اور اس کی مہربانیاں ہیں کہ اُس نے تمہارے لیے حلت و حرمت کے احکام بیان فرما دیے ہیں۔ وضو، غسل اور تیمم کا طریقہ تبلایا ہے، تمہارے لیے پاکیزہ چیزوں کو حلال اور جو چیزیں تمہارے جسم کی ساخت کے منافی اور روح کی طہارت کے خلاف ہیں انہیں حرام قرار دیا ہے اور خاص شروط کے تحت نکاح کی اجازت دی ہے، اس سے پہلے اللہ تعالیٰ اپنے احسانات میں سے اسلام کی دولت کا ذکر بھی کر چکے ہیں کہ اس کی طرف تمہاری راہنمائی فرمائی

اور پھر تم پر اپنا دین مکمل کیا، تمہیں خلافتِ ارضی، غلبہ اور عزت عطا فرمائی، قرآن جیسی عظیم کتاب کے علم سے تمہارے دلوں کو منور کیا اور نبی آخر الزماں کی سنت سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائی۔ فرمایا یہ تمام احسانات اس لیے کیے لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ تاکہ تم میرے شکر گزار بندے بن جاؤ۔ نعمت کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے، ورنہ یہی نعمت تمہارے لیے وبالِ جان بھی بن سکتی ہے۔ سورۃ سبا میں ارشاد ہے اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ۭ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ "اے آلِ داؤد! میرا شکر ادا کرو، اور میرے شکر گزار بندے بہت تھوڑے ہیں۔ اکثر لوگوں کو بے شمار نعمتیں حاصل ہیں مگر وہ شکر نہیں کرتے۔ اسی لیے فرمایا وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ان نعمتوں کو یاد کرو جو اللہ نے تمہیں عطا کی ہیں۔ اور اس کا شکریہ ادا کرتے رہو۔

عہدِ خداوندی

فرمایا اس کے علاوہ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اس عہد کو بھی یاد کرو جو اس نے تم سے پختہ طریقے پر ٹھہرایا ہے اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا جب تم نے کہا تھا کہ ہم نے سن لیا اور اطاعت کی اسی قسم کا ذکر اس امت کے بارہ میں سورۃ بقرہ کے آخری رکوع میں بھی موجود ہے" وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ"۔ ایمان والوں نے یہی کہا کہ ہم نے تیرے احکام سن لیے اور ان کی اطاعت کا عہد کرتے ہیں، اے مولا کریم! ہمارے گناہ معاف فرما کہ ہمیں تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ سابقہ سورۃ میں گزر چکا ہے۔ کہ آخری امت سے پہلے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے بھی عہد لیے۔ مگر انہوں نے توڑ دیے۔ سورۃ نساء میں "فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ" کے الفاظ موجود ہیں۔ کہ ان کے عہد توڑنے کی وجہ سے وہ لعنت کے ٹھہرے۔ اس سورۃ کی ابتدا بھی ایفائے عہد کے موضوع سے ہی

ہوئی ہے۔ "یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ" اے ایمان والو! اپنے عہدوں کو پورا کرو۔ عہد کا ایفا کرنا بہت بڑی ذمہ داری کی بات ہے جو شخص کلمہ توحید پڑھتا ہے۔ اللہ کے احکام کی اطاعت کا عہد کرتا ہے۔ تو اُسے چاہیئے کہ اپنے عہد کو پورا کرے۔ اسی لیے بیان فرمایا کہ اپنے اس عہد کو یاد کرو

عام طور پر اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ ہے کہ وہ قوانین یا احکام بیان کرنے کے بعد یا تو علم کا حوالہ دیتا ہے یا تقویٰ اختیار کرنے کا۔ چنانچہ بیان تیمم کے احکام بیان کرنے اور اپنے احسانات کے ذکر کے بعد فرمایا وَاتَّقُوا اللّٰهَ اللہ تعالیٰ سے ڈر جاؤ۔ کہیں اس کے عہد کی خلاف ورزی نہ کر بیٹھنا۔ یہ نہ سمجھنا کہ تم اپنے ہم جنسوں کی طرح اللہ تعالیٰ کو دھوکا دے سکو گے، بلکہ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ وہ تمہارے نیت اور ارادے سے واقف ہے۔ لہذا عہد شکنی کر کے تم اس کی سزا سے بچ نہیں سکتے۔

درس نمبر ۱۰ — آیت ۸ تا ۱۱

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ ۖ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿٨﴾ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ۙ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿٩﴾ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ﴿١٠﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ هَمَّ قَوْمٌ أَن يَبْسُطُوا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنكُمْ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿١١﴾ ع

ترجمہ :- اے ایمان والو ! ہو جاؤ قائم رہنے والے اللہ تعالیٰ کے لیے اس حال میں کہ تم گواہی دینے والے ہو انصاف کے ساتھ اور نہ آمادہ کرے تم کو کسی قوم کی دشمنی کہ تم انصاف کرنا چھوڑ دو ، انصاف کرو کہ یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو ، بیشک اللہ تعالیٰ خوب خبر رکھتا ہے اُن باتوں کی جو تم کرتے ہو ﴿٨﴾ اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے اُن لوگوں سے جو ایمان لاتے ہیں اور اچھے اعمال کیے ہیں کہ ان کے لیے بخشش

ہے اور بڑا اجر ہے ⑨ اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار
کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا یہ لوگ ہیں دوزخ والے ⑩ اے
ایمان والو ! یاد کرو اللہ کی نعمت کو تم پر۔ جب قصد کیا ایک
قوم نے کہ وہ بڑھائیں تمہاری طرف اپنے ہاتھوں کو پس روک دیا اللہ
نے اُن کے ہاتھوں کو تم سے اور ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور اللہ کی
ذات پر ہی چاہیئے کہ ایمان والے بھروسہ رکھیں ⑪

ربطِ آیات

پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے ایفائے عہد کا حکم دیا۔ انسانی سوسائٹی میں عہد و پیمان کو پورا کرنا بڑی قدر و قیمت رکھتا ہے۔ عہد و پیمان مخلوق کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی۔ اللہ کے عہد میں اس کی وحدانیت کو ماننا، جزائے عمل پر یقین رکھنا، تمام احکام کی تعمیل کرنا اور حلت و حرمت کے اُن قوانین پر عمل کرنا جو اس سورۃ میں تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں محرماتِ نکاح اور محرمات اکل و شرب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اللہ نے شعائر اللہ کی تعظیم کا حکم بھی دیا ہے۔ طہارت کے اصول بیان فرمائے ہیں ان میں ظاہری اور باطنی ہر دو قسم کی طہارت شامل ہے۔ نماز کے لیے طہارت کو شرط قرار دیا اور پھر اس ضمن میں وضو کے فرائض بیان فرمائے۔ طہارت کبریٰ یعنی غسلِ جنابت کا مسئلہ بیان فرمایا اور پھر پانی کی عدم دستیابی یا عدم قدرت کی بنا پر تیمم کے ذریعے طہارت حاصل کرنے کا طریقہ بتلایا۔ اس کے ساتھ پھر عہد و پیمان کو پورا کرنے کا حکم دیا اور تقوے کی ضرورت پر زور دیا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں وَاتَّقُوا اللّٰہَ کا لفظ بار بار آیا ہے جیسے وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ، نیز وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ ○ وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ

عدل کی اہمیت

تقوے کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے عدل کا حکم بھی دیا کیونکہ تقوے کا تقاضا یہ ہے کہ انسان ظلم سے بچ جائے اور عدل کو اختیار کرے۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ بنیادی اصول یا اخلاق چار ہیں جن کی پابندی از بس ضروری ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے

تو تمام قوانین اور شرائع انہی اصولوں کی تشریح معلوم ہوتے ہیں۔ ان اصولوں میں پہلا نمبر طہارت کا ہے، دوسرے نمبر پر اخبات یعنی خدا تعالیٰ کے سامنے عاجزی کا اظہار ہے تیسرے نمبر پر سماحت ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ کہ انسان رذیل چیزوں سے بچ جائے اور چوتھی چیز عدالت ہے جس پر اجتماعی نظام قائم ہے جس طرح طہارت سے انسان کی مشابہت ملائکہ سے ہوتی ہے، اسی طرح عدل و انصاف اختیار کرنے سے انسان کی مشابہت ملاء اعلیٰ سے ہوتی ہے۔ لہٰذا جو لوگ عدل کے ذریعے اجتماعی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں ملاء اعلیٰ کے فرشتے اُن کے حق میں بخشش کی دُعائیں کرتے ہیں کہ یہ اُن کے فرائض میں شامل ہے۔ اسی طرح جو لوگ اجتماعی حالت کو بگاڑنے کی کوشش کرتے ہیں ان پر ملاء اعلیٰ کی لعنت پڑتی ہے۔

سچی گواہی

عہد و پیمان کی پابندی ہی کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ اے ایمان والو! تم اللہ کے لیے قائم ہونے والے بن جاؤ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ جب کہ تم انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے ہو۔ قوّامین کا معنیٰ قائم رہنے والے ہو مگر کس کے لیے صرف اللہ کی خوشنودی اور رضا کے لیے، اس کے علاوہ کوئی دیگر غرض پیش نظر نہ ہو، صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں انصاف کے ساتھ سچی گواہی دو اس گواہی میں صرف مقدمات سے متعلقہ گواہی ہی شامل نہیں، بلکہ اس میں وہ تمام امور آ جاتے ہیں جن کا تعلق شہادت سے ہو۔ ایسے ہر معاملہ میں طرفداری اقربا پروری یا خود غرضی وغیرہ مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ شہادت کے متعلق صاف حکم موجود ہے "أَقِیْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ" یعنی شہادت محض اللہ کی رضا کی خاطر قائم کرو۔ اگر سچی گواہی کو چھپاؤ گے تو گنہگار رہو گے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس بات کا فیصلہ فرما دیا ہے وَمَنْ یَّکْتُمْهَا فَإِنَّهٗ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ" یعنی جو کوئی شہادت کو چھپائے گا اس کا دل گنہگار۔

ہوگا۔ اور جھوٹی شہادت کے متعلق حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد مبارک ہے
عُدِلَتْ شَهَادَةُ الزُّوْرِ بِالْاِشْرَاكِ بِاللّٰهِ یعنی جھوٹی گواہی کا جرم اللہ تعالےٰ
کے ساتھ شرک کرنے کے برابر ہے اسی لیے شہادتِ زور کو اکبر الکبائر میں
شمار کیا گیا ہے۔

شہادت کی وسعت

اس آیت کریمہ میں جس شہادت کا ذکر ہے۔ اُس کے متعلق حضرت
مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ اپنی تفسیر معارف القرآن میں بیان کرتے ہیں کہ اس
میں ہر قسم کی وہ شہادتیں داخل ہیں جن سے ہمیں روزمرہ واسطہ رہتا ہے اور
جن میں اکثر لوگ غلطیاں کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر کسی بیمار کے حق میں ڈاکٹری
سرٹیفکیٹ کو شہادت کی حیثیت حاصل ہے مگر عموماً ایسا سرٹیفکیٹ جھوٹا ہوتا
ہے۔ کوئی ملازم اپنی ڈیوٹی ادا کرنے کے اہل ہے یا نہیں، اس کی تصدیق ڈاکٹر
ہی کر سکتا ہے، اگر وہ پیسے لے کر غلط سرٹیفکیٹ جاری کرتا ہے، تو یہ چیز
تقویٰ اور عدل کے منافی ہے۔ اسی طرح طلبا کی سند کامیابی کو بھی گواہی کی
حیثیت حاصل ہے۔ ممتحن ادارہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ فلاں طالبعلم
فلاں ڈگری کا اہل ہے اور اگر کسی حیلے بہانے سے غلط ڈگری جاری ہوتی
ہے تو یہ متعلقہ ادارے کی طرف سے شہادتِ زور ہی تصور ہوگی۔ اگر نااہل
آدمی کو رشوت یا سفارش کی بنا پر بغیر اہلیت کے ڈپلوما، سرٹیفکیٹ یا ڈگری
جاری ہوتی ہے، تو اس کا نتیجہ کبھی اچھا نہیں نکلے گا۔ جھوٹی ڈگری حاصل کرنے
والا آدمی دنیا میں گمراہی کے سوا کیا پھیلائے گا۔

اسلامی نظام حکومت

جمہوری نظامِ حکومت میں ووٹ بھی ایک امانت ہوتی ہے جو کسی اہل
کے سپرد ہونی چاہیئے مگر غلط آدمی کے حق میں ووٹ دینا اُس کے حق میں جھوٹی
گواہی کے مترادف ہے۔ اُمیدوار مقامی کونسل کا ہو، صوبائی اسمبلی کا یا قومی اسمبلی
کا شہادت کا تقاضا یہ ہے کہ ووٹ اہل آدمی کو دیا جائے۔ مگر آج اہلیت
کو کون جانتا ہے؟ اب تو الیکشن پارٹی کی بنیاد پر یا برادری کی وجہ سے یا

رشوت کے زور سے بھیجے جاتے ہیں۔ حالانکہ نا اہل آدمی کو ووٹ دینا صریح خیانت ہے۔ ہماری نامرادی کی بنیادی وجہ یہی ہے۔ کہ نہ ہمارا ووٹ صحیح آدمی کو جاتا ہے اور نہ کوئی امید کی کرن نظر آتی ہے ظاہر ہے کہ جو آدمی لاکھوں روپے خرچ کر کے ممبر بنا ہے، وہ ممبر بن کر کئی گنا زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس طریقے سے ملک و قوم کی بہتری کی کیسے توقع کی جا سکتی ہے؟ جب اسمبلیوں میں فاسق فاجر لوگ جائیں گے تو وہ اسلام کے نظام کو کیسے قائم کریں گے، سرمایہ دارانہ یا ملحدانہ نظریات رکھنے والے لوگ اسلامی حکومت کبھی قائم نہیں کریں گے۔ بعض حلقوں میں برادری اور پارٹی بازی کی بنیاد پر بالکل جاہل آدمی ممبر بن جاتے ہیں۔ ایسے لوگ قوم و ملت کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟ بہر حال ہمارے ملک میں اسلامی نظام نہ آنے کی بنیادی وجہ یہی ہے۔ کہ ہم ووٹ دیتے وقت سچی گواہی نہیں دیتے۔ اگر ہماری رائے ایماندار اور صائب الرائے لوگوں کے حق میں جائے تو کتاب و سنت کا اسلامی نظام جس پر خلفائے راشدین نے عمل کیا آج بھی جاری ہو سکتا ہے۔

ہر حالت میں عدل

عدل و انصاف کی اہمیت کے پیش نظر فرمایا وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا کسی قوم کی دشمنی تمہیں ناانصافی پر آمادہ نہ کرنے پائے بلکہ اِعْدِلُوْا ہمیشہ انصاف کا دامن پکڑے رکھو۔ عدل بڑی ضروری صفت ہے، اجتماعی نظام کی کامیابی عدل پر موقوف ہے۔ عدل کرنے والوں کو ملا اعلیٰ سے بشارت ہوتی ہے۔ عدل کے بغیر کوئی نظام درست نہیں ہو سکتا۔ حضور علیہ السلام کا فرمان مبارک ہے، کوئی اپنا ہو یا بیگانہ، قریبی ہو یا اجنبی، رشتہ دار ہو یا پڑوسی ہر ایک کے ساتھ یکساں سلوک کرو، کسی کے ساتھ رو رعایت نہ کرو کہ یہ عدل کے خلاف ہے۔ فرمایا برخلاف اس کے عدل کرو هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى عدل ہی تقوے کے قریب تر ہے۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو کیونکہ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا

تَعْمَلُوْنَ اللہ تعالیٰ تمہارے ہر عمل سے باخبر ہے۔

پہلے حلت و حرمت کے انفرادی احکام بیان ہوئے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کا ذکر ہوا اور تلقین کی گئی ہے کہ دونوں حقوق احسن طریقے سے ادا کرو۔ اب اجتماعی احکام بیان ہو رہے ہیں اور اس ضمن میں شہادت اور عدل و انصاف کا تذکرہ ہوا ہے۔

اہل ایمان سے وعدہ

آگے فرمایا تعمیل حکم کرنے والے اور نافرمانی کرنے والے اپنا اپنا انجام بھی سن لیں فرمایا وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے وعدہ کیا ہے جو ایمان لائے ہیں وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اور انہوں نے اعمال صالحہ انجام دیے ہیں کامیابی کی بنیاد تو یہی دو چیزیں ہیں یعنی ایمان اور عمل صالح۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، اس کی کتابوں، رسولوں اور یوم آخرت پر ایمان لانا اور پھر نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد جیسے نیک اعمال اختیار کرنا۔ ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ یقیناً انہیں بخشش حاصل ہوگی۔ اللہ تعالیٰ چھوٹی موٹی کوتاہیاں معاف فرمائے گا کچھ ایمان کی بدولت اور کچھ اعمال صالحہ کی وجہ سے۔ بہرحال ایسے لوگوں کے لیے بخشش کے علاوہ وَاَجْرٌ عَظِيْمٌ کی بشارت بھی ہے اللہ تعالیٰ انہیں بہت بڑا اجر عطا فرمائیں گے۔

کفار کا انجام

برخلاف اس کے وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا جن لوگوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا۔ توحید کی بجائے شرک کو اختیار کیا، اخلاص کی بجائے نفاق میں آلودہ ہو گئے اور اعمال میں خلوص کی بجائے ریاکاری کا عنصر غالب آگیا۔ اس کے علاوہ وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا۔ یا تو قول سے تکذیب کی یا پھر مانتے ہوئے بھی عمل نہ کر کے عمل سے تکذیب کی اور اس طرح منافقین کا شیوہ اختیار کیا، فرمایا اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ یہی جہنم والے لوگ ہیں۔ دنیا میں یہ کتنی بھی عیش و عشرت کر لیں۔

ہر طرح کی آرام و راحت حاصل کر لیں مگر آخر میں، یہ جہنم کے کندۂ ناتراش ہیں۔ اِن کا حشر ویسا ہی ہوگا جیسے گذشتہ سورۃ میں آچکا ہے "نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۖ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا" جو کوئی اغیار کا طریق اختیار کریگا، ہم اُس کا رُخ اُدھر ہی پھیر دیں گے جدھر وہ جانا چاہتا ہے۔ اور بالآخر وہ جہنم میں پہنچ جائے گا جو بہت بُرا ٹھکانا ہے۔

انعام کا شکریہ

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان سے خطاب کر کے اپنی عطا کردہ نعمتوں کا شکریہ ادا کرنے کا حکم دیا۔ ان نعمتوں میں حلت و حرمت کی تعلیم، ایمان کی دولت، اعمال صالحہ کی توفیق، صفتِ عدل کا حصول وغیرہ ہیں۔ کوئی چھوٹا انعام ہے کوئی بڑا انعام ہے۔ ان سب پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرو جو اس نے تم پر کیں۔ یہاں پر ایک خاص واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ کہ دیکھو! اللہ نے تم پر احسان کیا اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ جب ایک قوم نے تمہاری طرف ہاتھ بڑھانے کا ارادہ کیا۔ لڑائی کا میدان تھا حضور علیہ السلام اور صحابہ کرامؓ میدان جنگ میں موجود تھے۔ اہل اسلام نے ظہر کی نماز میدان جنگ میں ہی ادا کی۔ بعد میں کفار کو بڑا افسوس ہوا کہ اُن سے غلطی ہوگئی، جب مسلمان نماز میں مصروف تھے تو اُن پر یکبارگی حملہ کر دینا چاہیئے تھا۔ پھر سوچا، کوئی بات نہیں۔ ابھی عصر کی نماز آنے والی ہے، اور یہ نماز مسلمان کو اپنی اولاد سے بھی زیادہ عزیز ہے لہٰذا وہ ضرور ادا کریں گے اور ہم اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اُن پر حالتِ نماز میں ہی لوٹ پڑیں گے۔ اُدھر اللہ تعالیٰ نے خاص احسان فرما کر وحی کے ذریعے صلوٰۃِ خوف پڑھنے کی اجازت دے دی جس کی وجہ سے مسلمانوں نے نماز بھی ادا کر لی اور دشمن کا دفاع بھی کرتے رہے۔

چنانچہ صلوٰۃ خوف کے طریقہ کے مطابق مجاہدین دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔
ایک گروہ نے حضور علیہ السلام کی قیادت و امامت میں نصف نماز ادا کی
اور اس دوران دوسرا گروہ محاذ پہ کھڑا رہا۔ پھر پہلا گروہ محاذ پر چلا گیا اور
دوسرے گروہ نے نصف نماز حضور علیہ السلام کے ساتھ ادا کی۔ اس طرح
ہر دو گروہوں نے آدھی آدھی نماز جماعت کے ساتھ اور باقی آدھی آدھی
انفرادی طور پہ ادا کی۔ اس طرح نماز بھی ادا ہو گئی اور دشمن کو حملہ کرنیکا موقع
بھی نہ ملا۔ اللہ نے اس واقعہ کی طرف اشارہ کر کے احسان جتلایا ہے۔
کہ میری اس نعمت کو یاد کرو۔ کہ جب ایک قوم نے تمہیں نیست و نابود
کرنے کا ارادہ کیا فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ پس ہم نے اُن کے
ہاتھ تمہاری طرف بڑھنے سے روک دیے۔

اللہ پہ بھروسہ

فرمایا وَاتَّقُوا اللّٰهَ اللہ سے ڈر جاؤ۔ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ
الْمُؤْمِنُوْنَ اور مومنوں کو چاہیئے کہ وہ خدا تعالیٰ کی ذات پر ہی بھروسہ
رکھیں۔ بیشک ہتھیار اور دیگر ذرائع استعمال کرو۔ مگر نتائج کے لیے
بھروسہ ہمیشہ اللہ پہ ہی رکھو، کیونکہ کسی چیز میں اثر پیدا کرنا اُسی کے قبضے میں
ہے۔ وہ جب چاہے گا تمہارے لیے اچھے نتائج پیدا فرمائے گا۔ اگر وہ
نہیں چاہے گا، تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ لہذا تمام وسائل بروئے کار لانے کے
بعد نتائج کے لیے بھروسہ اللہ پہ ہی ہونا چاہیئے۔ ہر چیز کا تصرف اُسی
کے پاس ہے، وہ جس ذریعہ سے کام لینا چاہے گا از خود لے لے گا۔
تم پورے خلوص کے ساتھ بقدر ہمت اپنا فرض ادا کرو اور اس کے بعد
اسے اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دو کہ اہل ایمان کی یہی شان ہے۔

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاۗءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۲﴾

ترجمہ :- البتہ تحقیق اللہ نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا، اور بھیجے ہم نے اُن میں سے بارہ سردار، اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نماز قائم کرتے رہے اور زکوٰۃ ادا کرتے رہے اور تم میرے رسولوں پر ایمان لائے اور اُن کی تائید کرتے رہے اور قرض دیا تم نے اللہ تعالیٰ کو اچھا قرض تو میں ضرور معاف کردوں گا تم سے تمہارے گناہ، اور میں ضرور داخل کروں گا تم کو جنتوں میں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ اور جس نے کفر کیا اس کے بعد تم میں سے، پس بیشک وہ گمراہ ہوگیا سیدھے راستے سے ﴿۱۲﴾

ایفائے عہد

سورۃ کی پہلی آیت میں ہی ایفائے عہد کی تلقین کی گئی تھی "یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ" یعنی اے ایمان والو! اپنے عہد و پیمان کو پورا کرو۔

اس کے بعد دیگر آیات میں بھی اللہ تعالیٰ نے پابندیٔ عہد کا حکم دیا ہے اور پھر اہل اسلام کو فرمایا کہ یہ ایفائے عہد کا قانون صرف تمہارے لیے ہی نہیں ہے بلکہ یہ قانون بنی اسرائیل پر بھی نافذ تھا اور ان کو بھی عہد و پیمان کا پابند کیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا" عہد کو پورا کرو کیونکہ اس کے متعلق باز پُرس ہوگی۔ ایفائے عہد انسانی سوسائٹی کی ترقی کے لیے ضروری ہے۔ عہد و پیمان اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ہو یعنی حقوق اللہ ہوں یا انسانوں کے حقوق العباد ان سب کی وفا بہر طور ضروری ہے۔

ہر مومن جو ایمان قبول کرتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ سے اپنے مومن ہونے اور اس کے احکام کی تعمیل کا وعدہ کرتا ہے۔ میاں بیوی میں نکاح کی صورت میں بعض شرائط پر عہد و پیمان کرتے ہیں اور دونوں اپنے اپنے حقوق و فرائض کی ادائیگی کا ذمہ لیتے ہیں دو افراد میں کسی معاملہ میں شراکت کا معاہدہ ہو تو اسے بھی پورا کرنا لازم ہے۔ اسی طرح دو ملکوں کے درمیان کوئی معاہدہ ہو جائے تو دونوں کا فرض ہے کہ اس کی پابندی کریں۔ کیونکہ عہد شکنی منافق کی نشانی ہے اِذَا عَاهَدَ غَدَرَ جب وہ کسی سے عہد کرتا ہے تو غداری کرتا ہے مگر مومن کی صفت یہ ہے کہ جب عہد کرے تو اسے پورا کرے

بنی اسرائیل سے عہد

گذشتہ آیات میں اہل اسلام کو ایفائے عہد کی تلقین ہوتی رہی ہے اب فرمایا، دیکھو! وَلَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ بیشک ہم نے بنی اسرائیل سے بھی عہد و پیمان لیا اور ان عہدوں کی نوعیت مختلف تھی۔ سورۃ بقرہ میں گزر چکا ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل سے اس بات کا عہد لیا لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کروگے۔ اور والدین، اقربا، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ احسان کروگے اور نماز قائم کروگے، اور زکوٰۃ ادا کروگے، پھر یہ بھی ان سے عہد لیا

لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَاءَكُمْ کہ تم آپس میں خونریزی نہیں کروگے اور ایک دوسرے کو بے وطن نہیں کروگے۔ سورۃ بقرہ میں طور پہاڑ ان کے سروں پر معلق کرکے اللہ کی کتاب پر عمل کرنے کے عہد کا ذکر آتا ہے پھر سورۃ آل عمران میں اللہ کی کتاب تورات کے متعلق عہد کا تذکرہ ہے۔ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ کہ تم اس کے احکام کو لوگوں کے سامنے بیان کروگے اور انہیں چھپاؤگے نہیں۔

بہرحال یہاں پر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے عہود کی مثال بیان کرکے اہل ایمان کو یاد دلایا ہے کہ جس طرح ان کے لیے عہد و پیمان کا ایفا ضروری تھا، اسی طرح تمہارے لیے بھی ضروری ہے اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوق سے کیے گئے عہد و پیمان کو پورا کرو۔

بارہ نقیب

ارشاد ہوتا ہے وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا اور ہم نے ان میں سے بارہ نقیب مقرر کیے۔ چونکہ بنی اسرائیل بارہ خاندانوں پر مشتمل تھے، لہٰذا ہر خاندان کے لیے ایک نقیب مقرر کیا گیا۔ نقب سوراخ کو کہتے ہیں اور تنقیب کا معنی کریدنا، دیکھ بھال کرنا، حفاظت اور نگرانی کرنا ہوتا ہے۔ اسی لیے نقیب سردار یا سرکردہ آدمی کے لیے بولا جاتا ہے، کیونکہ وہ اپنے خاندان، قبیلے یا گروہ کا سربراہ محافظ یا نگران ہوتا ہے۔ طلبا کے مانیٹر کے لیے بھی نقیب کا لفظ بولا جاتا ہے، کہ وہ جماعت کی دیکھ بھال یا نگرانی کرتا ہے۔ یہاں جس عہد کا ذکر کیا جا رہا ہے، یہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وساطت سے لیا تھا اور اس کا خلاصہ آگے آرہا ہے۔

جس طرح موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے بارہ نقیب مقرر کیے تھے اسی طرح حضور نبی کریم علیہ السلام نے بھی انصار مدینہ کے بارہ نقیب

مقرر کیے گئے تھے۔ ہجرتِ مدینہ سے پہلے مدینہ کے دو عظیم خاندانوں اوس اور خزرج نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ جب وہ لوگ اسلام قبول کرنے کے لیے مکہ مکرمہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں آئے تو آپ نے اُن کے معاملات کی دیکھ بھال اور مکہ سے رابطہ قائم رکھنے کے لیے بارہ نقیب مقرر کیے تھے۔ خزرج بہت بڑا خاندان تھا لہٰذا اس میں سے نو نقیب مقرر کیے تھے اور قبیلہ اوس سے تین۔ یہ لوگ مدینہ میں اسلام کی تبلیغ کرتے تھے اور مسلمانوں کی طرف سے تعمیل احکام کی نگرانی کرتے تھے۔ جب کسی معاملہ میں ہدایات کی ضرورت محسوس کرتے تو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے حاصل کرتے۔

معیتِ خدا

بہرحال اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور بارہ نقیب مقرر فرمائے وَقَالَ اللّٰهُ إِنِّي مَعَكُمْ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں یعنی اگر تم نے عہد کی پابندی اختیار کی تو میری شفقت اور مہربانی تمہارے شاملِ حال ہوگی۔ تمہیں بلند درجات نصیب ہوں گے اور تم فلاح پا جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان إِنِّي مَعَكُمْ بہت بڑی قدر و قیمت رکھتا ہے یہاں کوئی معمولی تھانیدار کسی کو کہہ دے کہ فکر نہ کرنا میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تو اس کی بھی بڑی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ کسی کی پشت پر گورنر ہو یا صدرِ مملکت کسی کو امداد کی تسلی دے دے تو یہ متعلقہ شخص کے لیے بہت بڑی بات ہوتی ہے مگر یہی بات شہنشاہِ مطلق اور مالک الملک فرمائے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تو پھر کس چیز کی کمی رہ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے اپنی معیت کا وعدہ کیا مگر یہ قوم اپنے عہد و پیمان پہ قائم نہ رہ سکی، جس کی وجہ سے اللہ کے ہاں مغضوب علیہ ٹھہری۔

اس قسم کی معیت کی کئی ایک مثالیں قرآن پاک میں ملتی ہیں۔ جب موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر نکل کھڑے ہوئے تو آگے سمندر آ گیا اور

پیچھے فرعون کی فوج آ رہی تھی۔ قوم سخت پریشان ہوگئی تو اس وقت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا گھبراؤ نہیں اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ بیشک میرا رب میرے ساتھ ہے۔
ہجرت کی ابتدا میں جب حضور علیہ السلام اور صدیق اکبرؓ غار ثور میں چلے گئے تو کفار بھی آپ کے تعاقب میں پہنچ گئے۔ اس موقع پر صدیق اکبرؓ پر گھبراہٹ کی کیفیت طاری ہوئی تو حضور علیہ السلام نے یہی فرمایا تھا لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا یعنی گھبراؤ نہیں بیشک اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔ ہم اسی کے حکم سے نکلے ہیں اور اس کی تائید و نصرت ہمارے شامل حال ہے وہ خود ہماری حفاظت فرمائیگا۔ حضور علیہ السلام کے صحابہ کرامؓ جیسے باعمل لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَاللّٰہُ مَعَ الْمُؤْمِنِیْنَ اللہ تعالیٰ مومنوں کے ساتھ ہے۔
اللہ تعالیٰ کی طرف سے معیت کا وعدہ اس وقت تھا جب لوگ اس پر خلوص دل سے ایمان رکھتے تھے اور خلوص نیت سے اس کے احکام پر عمل کرتے تھے، مگر آج وہ چیز کہاں ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی نصرت شامل حال ہوتی ہے۔ جب مخلوق اپنے عہد پر قائم نہیں رہی تو اللہ کی تائید و حمایت کیسے حاصل ہوگی۔ وہ ہمارے تمام امور کو جانتا ہے ہمارے اعمال کو دیکھ رہا ہے اور ہماری نیت اور ارادے تک سے واقف ہے لہذا اس کی معیت اسی وقت حاصل ہوگی جب ہم خلوص نیت کے ساتھ اس کے احکام کی تعمیل پر کمربستہ ہو جائیں گے۔

نماز اور زکوٰۃ

آگے اللہ تعالیٰ وہ شرائط بیان فرماتے ہیں جن کو پورا کرنے سے اللہ تعالیٰ کی معیت نصیب ہو سکتی ہے ارشاد ہے۔ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوۃَ اگر تم نے نماز کو قائم کیا وَاٰتَیْتُمُ الزَّکٰوۃَ اور زکوٰۃ دیتے رہے ایمان کے بعد نماز اور زکوٰۃ اہم ترین ارکان اسلام ہیں۔ قرآن پاک میں ان دو چیزوں پر مداومت کی بار بار تاکید کی گئی ہے مسلمانوں کے گروہ میں شامل ہونے کی یہ دو ظاہری علامات ہیں۔ نماز بدنی عبادت ہے اور اس کا تعلق حقوق اللہ سے

ہے۔ زکوٰۃ مالی عبادت ہے اور اس کا تعلق حقوق العباد سے ہے۔ نماز میں طہارت اور اخبات کی صفات پائی جاتی ہیں کیونکہ طہارت کے بغیر نماز ادا نہیں ہو سکتی اور اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کے اظہار کا یہ بہترین ذریعہ ہے۔ زکوٰۃ کے عمل میں سماحت کی صفت پائی جاتی ہے۔ زکوٰۃ دینے والا شخص فیاض، غریب پروری اور بنی نوع انسان سے ہمدردی کی صفات سے متصف ہوتا ہے۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ کے ذریعے انسان میں دو اعلیٰ اخلاق پیدا ہوتے ہیں، ایک بنی نوع انسان سے ہمدردی اور دوسرا اپنی ذات سے بخل کی بیخ کنی۔ مال خرچ کرنے والا شخص بخیل نہیں ہوگا۔ بخل بہت بڑی بیماری ہے جس کے متعلق حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد مبارک[1] ہے اَیُّ دَاءٍ اَدْوَءُ مِنَ الْبُخْلِ یعنی کنجوسی سے زیادہ بڑی بیماری کون سی ہو سکتی ہے۔

ایمان بالرسل

فرمایا اگر تم نماز ادا کرتے رہے اور زکوٰۃ دیتے رہے وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ اور میرے رسولوں پر ایمان لائے۔ اس آیت کریمہ میں نماز اور زکوٰۃ کو پہلے بیان کیا ہے اور ایمان کا تذکرہ بعد میں، حالانکہ ایمان ہی ہر عمل کی بنیاد ہے اور اس کا تذکرہ پہلے ہونا چاہیے تھا۔ مگر یہاں پر بات یہ سمجھائی جا رہی ہے کہ نماز اور زکوٰۃ کا اُس وقت تک کچھ فائدہ نہیں جب تک ایمان درست نہیں ہے یہ بھی ایک طرز بیان ہے۔ کہ ایمان میں زور پیدا کرنے کے لیے اس کو بعد میں ذکر کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ نیکی کی قدر و قیمت ایمان کے ساتھ ہے۔ جو شخص صحیح ایمان سے محروم ہے اُس کی لمبی لمبی نمازیں، صدقہ و خیرات اور نیکی کے دیگر امور عبث محض ہیں۔ ایمان کے بغیر فلاح حاصل نہیں ہو سکتی۔

فرمایا میرے رسولوں پر صرف زبانی ایمان لانا کافی نہیں۔ بلکہ ایمان کے ساتھ ساتھ اگر وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ تم اُن کی تائید کرو گے۔ رسولوں

[1] مسند احمد ج۳ ص۳۰۸ و کنز العمال ج۴ ص۲۵۲ (فیاض)

کی لائی ہوئی شریعت کی تقویت کا باعث بنو گے۔ تعزیہ کا لفظ بھی اس سے ہے۔ مجرموں پر جو تعزیہ لگائی جاتی ہے اُس کا معنیٰ بھی یہی ہے کہ اس کے ذریعے جرائم کی روک تھام کرنے والے ادارہ میں قوت پیدا ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے جرائم کے سدِّباب میں مدد ملتی ہے۔ تو فرمایا اگر تم دین کے احکام پر عمل پیرا رہے اور تمام امورِ نبی کے احکام کے مطابق انجام دیئے تو پھر اس کا صلہ آگے بیان ہو رہا ہے۔

قرضِ حسن

فرمایا وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا اور اگر تم اللہ کو قرضِ حسن دو گے۔ اللہ کو قرض دینے کا مطلب یہ ہے کہ اُس کی خوشنودی کے لیے غرباء و مساکین پر خرچ کیا جائے اُن کو صدقہ و خیرات دی جائے زکوٰۃ کا حکم چونکہ پہلے بیان ہو چکا ہے لہٰذا اس قرضِ حسن سے مراد نفلی صدقہ خیرات ہو گا جو خدا تعالیٰ کی رضا کی خاطر مستحقین میں تقسیم کیا جائے۔ قرضِ حسن وہ ہے جو خالص نیک نیتی کے ساتھ دیا جائے اور اس میں نہ کوئی ریاکاری ہو اور نہ اس سے کوئی دوسرا مفاد حاصل کرنا مقصود ہو جو شخص اللہ کے حکم کے مطابق قرضِ حسن دیتا ہے اُسے یقین ہوتا ہے کہ اُس کا مال محفوظ ہے اور اسے اللہ تعالیٰ آخرت میں ضرور لوٹا دیں گے، لہٰذا اسے قرضِ حسن کہا گیا ہے

قرضِ حسن اُسے بھی کہتے ہیں جو کوئی شخص کسی حاجت مند کو مقررہ مدت کے لیے کوئی رقم ادھار پر دے دے اور اس کے ساتھ کوئی سود یا دیگر مفاد حاصل نہ کرے، اس قرض کے لیے بھی طرفین کی طرف سے خلوصِ نیت کی ضرورت ہے۔ قرض دینے والا محض اللہ کی رضا کی خاطر اپنے بھائی کی مدد کرے تاکہ ضرورت پوری کرنے کے بعد وہ رقم واپس کر دے۔ اگر قرض خواہ کی نیت میں ذرہ بھی فتور ہو گا اور وہ قرض دے کر احسان جتلائیگا یا کوئی چھوٹا موٹا مفاد حاصل کرنے کی کوشش کریگا تو وہ قرضِ حسن نہیں ہو گا اسی طرح مقروض کے لیے بھی لازم ہے کہ وہ قرض لیتے وقت خلوصِ نیت

سے مقررہ مدت میں قرضہ کی واپسی کا ارادہ کرے اور پھر واپسی میں کسی قسم کا پس و پیش نہ کرے۔ اگر مقروض واقعی مجبور ہے اور وقت مقررہ پر قرض واپس کرنے پر قادر نہیں تو قرض خواہ کو چاہیئے کہ "فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ" کے مصداق اُسے مزید مہلت دے اور اگر مقروض زیادہ ہی نادار ہے تو قرض کا کچھ حصہ یا سارے کا سارا بھی معاف کر دے تو اللہ تعالیٰ سے اجرِ عظیم کا مستحق قرار پائیگا۔

زمانہ حال میں تو قرضِ حسن کا تصور ہی ختم ہو چکا ہے۔ مادہ پرستی کے اس دور میں ہر شخص اپنے مفاد کو دیکھتا ہے اور ہر وقت دولت جمع کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔ جو شخص بنک میں رقم جمع کرا کے مقررہ سود حاصل کرنے کی فکر میں رہتا ہے وہ کسی کو قرضِ حسن کیسے ادا کرے گا۔ اسی طرح جو شخص قرض تو حاصل کرتا ہے مگر اس کی نیت میں فتور ہے اور واپسی کا ارادہ نہیں رکھتا اور مقررہ وقت پر ٹال مٹول کرتا ہے تو یہ بہت بڑا ظلم ہے۔ اسی لیے کوئی آدمی قرضِ حسن دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ کیونکہ اُسے واپسی کا یقین نہیں ہوتا۔ غرضیکہ دونوں طرف کی مفاد پرستی کی وجہ سے قرضِ حسن کا نظام ہی ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اسے بہت بڑا عمل شمار کیا ہے۔ اور اسے نماز زکوٰۃ اور ایمان بالرسل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

بہتر صلہ

فرمایا اگر تم متذکرہ امور پر عمل پیرا ہو گے اُس کا صلہ یہ ہے لَاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ میں تمہارے گناہوں کو مٹا دوں گا، تمہاری خطاؤں سے درگزر کروں گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تمہیں جنتوں میں داخل کروں گا، ایسے باغات تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ تمہارا ٹھکانا ایسے اعلیٰ مقامات میں ہوگا مگر یہ بھی یاد رکھو فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ ان احکام پر عملدرآمد کرنے کے عہد کے بعد جس شخص نے انکار کیا۔ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ

وہ سیدھے راستے سے بہک گیا۔

اب انکار کی بھی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ اگر متذکرہ احکام پر ایمان ہی باقی نہیں رہا۔ تو ایسا شخص بلاشبہ کافر ہوگیا۔ اور زبان سے تعمیلِ احکام کا اقرار کرتا ہے مگر عملاً انکار کرتا ہے، تو پھر کفر کے درجے کو تو نہیں پہنچا مگر ناشکرگزاروں میں ضرور داخل ہوگیا۔ اسی لیے تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "فَاِنَّ الْاِنْسَانَ کَفُوْرٌ" یعنی انسان عام طور پر ناشکرگزار ہی ہوتے ہیں۔

بہرحال فرمایا کہ ایسا شخص سیدھے راستے سے بھٹک گیا، کیونکہ سیدھا راستہ تو ایمان اور نیکی کا راستہ ہے، صراطِ مستقیم اُس شخص کو حاصل ہے جو انبیاء علیہم السلام پر ایمان رکھتا ہے، اُن کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق عبادت کا التزام کرتا ہے۔ بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردانہ سلوک روا رکھتا ہے اور اپنے عہد کا پابند ہے۔ اسی کے متعلق فرمایا "اِنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا" میری رحمت کے مقام تک پہنچنے کا یہی صراطِ مستقیم ہے۔ جو اس راستے پر چلے گا، وہ کامیاب ہوگا جو اس راستے سے بھٹک گیا وہ جہنم میں پہنچے گا۔ اللہ تعالیٰ نے عہد و پیمان کی بات بنی اسرائیل سے شروع کر کے یہی بات آخری اُمت کے لوگوں کو بھی سمجھائی ہے کہ جس طرح عہد و پیمان کی پابندی بنی اسرائیل پر لازم تھی، اسی طرح تم بھی عہد و پیمان اور تمام احکام بجا لانے کے پابند ہو۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا
قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ
وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى
خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ
وَاصْفَحْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٣﴾ وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا
اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا
ذُكِّرُوْا بِهٖ ۠ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ اِلٰى
يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۭ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا
يَصْنَعُوْنَ ﴿١٤﴾

ترجمہ پس بوجہ ان کے توڑ دینے کے اپنا عہدوپیمان ہم
نے ان پر لعنت کی اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا وہ تبدیل
کرتے ہیں کلمہ کو اس کے ٹھکانوں سے اور وہ بھول گئے فائدہ
اٹھانا اس چیز سے جس کے ساتھ ان کو نصیحت کی گئی تھی اور آپ
ہمیشہ مطلع ہوتے رہیں گے ان کی کسی نہ کسی خیانت پر مگر بہت کم
لوگ ان میں سے۔ آپ معاف کر دیں اور درگزر کریں اللہ تعالیٰ پسند
کرتا ہے احسان کرنے والوں کو (١٣) اور ان لوگوں میں سے جنہوں نے
کہا ہم نصاریٰ ہیں۔ ہم نے لیا ان سے پختہ عہد۔ پس بھول گئے

وہ فائدہ اٹھانا اس چیز سے جس کے ساتھ اُن کو نصیحت کی گئی تھی ۔
پھر ڈال دی ہم نے اُن کے درمیان عداوت اور دشمنی قیامت تک
اور عنقریب اللہ تعالیٰ اُن کو بتلائے گا جو کچھ وہ کیا کرتے تھے (۱۴)

ربط آیات

ابتدائے سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو ایفائے عہد کی تلقین کی تھی اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ۔ اس ضمن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ عہد صرف تمہیں سے نہیں لیا گیا بلکہ تم سے پہلے بنی اسرائیل سے بھی عہد لیے گئے پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے توسط سے اُن میں سے بارہ نقیب مقرر کیے گئے بنی اسرائیل کے بارہ خاندانوں کے لیے ایک ایک نقیب تھا جو اپنے قبیلے کی نگرانی اور حفاظت کا ذمہ دار تھا ۔ اللہ نے اُن لوگوں سے فرمایا کہ میری مدد تمہارے ساتھ ہوگی اگر تم نماز قائم کرتے رہو گے ، زکوٰۃ ادا کرتے رہو گے رسولوں پر ایمان لاؤ گے اور اُن کی تائید کرتے رہو گے ، پھر اللہ کو قرض حسن دو گے یعنی محتاجوں پر خرچ کرتے رہو گے ، اگر ایسا کرتے رہو گے تو میں تمہاری خطائیں معاف کر دوں گا اور تمہیں باغات میں داخل کر دوں گا مگر جس نے کفر کا راستہ اختیار کیا تو یقین جانو کہ وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا ۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا تذکرہ کر کے اہل ایمان کو سمجھا دیا کہ عہد و پیمان کو پورا کرنا لازمی ہے ، ورنہ انسان گمراہ ہو جاتے ہیں ۔

نقض عہد پر لعنت

آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے اُس سزا کا ذکر کیا ہے جو بنی اسرائیل کو عہد توڑنے کی وجہ سے دی گئی ۔ اس جرم کی سزا نہ صرف دنیا میں دی گئی بلکہ انہیں آخرت میں بھی سزا ملیگی ۔ ارشاد ہوتا ہے فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ پس بوجہ اُن لوگوں کے توڑ دینے اپنے پختہ عہد کو ، یہاں مَا زائدہ ہے اور یہ تاکید کے لیے آتا ہے ، مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو سخت تاکید کی گئی تھی کہ وہ اپنے عہد کو پورا کریں مگر بوجہ اُن کے اُس عہد کو توڑ ڈالنے کے لَعَنّٰهُمْ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے اُن پر لعنت کی ۔ لعنت کا معنی دھتکار دینا یا دور کر دینا ہے ۔ اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اپنی رحمت و مہربانی سے دور کر دیا ۔ یہ وہی دوری یا لعنت ہے جو شیطان کے حق میں ہمیشہ کے

پیش آگئی ہے۔ اس نے اللہ تعالیٰ کے سامنے تکبر کا اظہار کیا تو اللہ نے اُسے دائمی ملعون قرار دیا، اسی طرح بنی اسرائیل نے عہدشکنی کی تو اللہ نے انہیں بھی مستحق لعنت ٹھرایا۔

سنگدلی

فرمایا لعنت کے علاوہ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً سزا کے طور پر ہم نے اُن کے دِل سخت کر دیے۔ سنگدلی میں خدا تعالیٰ کی طرف سے عذاب ہے۔ ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے۔

خدا تعالیٰ سے دور ہونے والی چیزوں میں سب سے زیادہ دور سخت دل لوگ ہیں تو فرمایا کہ بنی اسرائیل کو سنگدل بنا دیا گیا۔ جب دِل سخت ہو جائیں۔ تو فہم بھی معکوس ہو جاتے ہیں، ایسے لوگوں کی سمجھ اور فکر خراب ہو جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وہ اللہ کے کلام کو اپنے مقام سے پھیر دیتے ہیں۔ یعنی اصل احکام میں تحریف کر دیتے ہیں، رد و بدل کے مرتکب ہوتے ہیں۔ گویا عہدشکنی کی وجہ سے پہلے ان پر لعنت ہوئی، پھر اُن کے دل سخت ہوئے اور آخر میں انہوں نے اللہ کے کلام کو ہی بدل ڈالا یہ سب عہدشکنی کی سزا تھی۔

تحریف لفظی ومعنوی

یہود و نصاریٰ کی کارگزاری کا تذکرہ اگلی آیات میں آرہا ہے تاہم یہودیوں نے اللہ تعالیٰ کی کتاب میں بہت زیادہ تحریف کی۔ یہ اُن کی عادتِ قدیمہ ہے کہ وہ اللہ کی کتاب میں تبدیلیاں کر کے اُسے بگاڑتے رہتے ہیں۔ اور اب صورت حال یہ ہوگئی ہے کہ اصل کتابوں کا حصہ بہت کم رہ گیا ہے۔ اور بگاڑ والی خود ساختہ چیزیں ان میں داخل ہو چکی ہیں۔ ان کتابوں میں اب صریح کفر و شرک، اور بے حیائی اور بداخلاقی جیسی قبیح چیزیں موجود ہیں۔ انہوں نے انبیاء علیہم السلام سے متعلق نہایت ناروا باتیں درج کر دی ہیں حالانکہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ان انبیاء کی عصمت کا بار بار ذکر کیا ہے۔ ان بدبختوں نے تحریف کے ذریعے اللہ کے پاک نبیوں کے کردار کو بھی داغدار کرنے کی کوشش کی ہے۔

تحریف دو قسم کی ہوتی ہے یعنی لفظی اور معنوی۔ انجیل میں تحریف لفظی کی گئی

جن کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ سریانی انجیل میں فارقلیط کا لفظ موجود ہے اور اس کا معنی احمد ہے۔ یہ نبی آخر الزمان علیہ السلام کی آمد کی بشارت تھی مگر یہودیوں نے فارقلیط کی بجائے شفیع اور مددگار کے الفاظ داخل کر دیئے یہی لفظی تحریف ہے۔ جو لفظ اللہ نے نازل کیا تھا اُس کی جگہ دوسرا لفظ لگا دیا گیا۔

حضور علیہ السلام کی آمد کی پیشین گوئیاں تورات میں بھی موجود تھیں۔ اصل تورات میں یہ الفاظ تھے کہ وہ آخری نبیؐ فاران کی چوٹیوں سے جلوہ گر ہوگا۔ دس ہزار قدسیوں کی جماعت کے ساتھ آئیگا۔ اُس کے دائیں ہاتھ پر آتشیں شریعت ہوگی، وہ دنیا کی قوموں سے محبت کرنے والا ہوگا اور قومیں اُس کے قدموں میں جمع کی جائیں گی، یہ تمام نشانیاں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر صادق آتی ہیں۔ فتح مکہ کے موقع پر آپ کے ہمراہ دس ہزار صحابہؓ موجود تھے۔ مگر یہودیوں نے تورات میں دس ہزار کی بجائے لاکھوں لکھ دیا تاکہ یہ پیش گوئی نبی آخر الزمان علیہ السلام پر ثابت نہ ہو سکے۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنی کتاب فوز الکبیر میں لکھتے ہیں۔ کہ اہل کتاب نے لفظی تحریف سے زیادہ معنوی تحریف کی ہے۔ انہوں نے کلام الٰہی کے مطالب و معانی کو غلط رنگ میں پیش کیا اور اس طرح وہ ہدایت الٰہی سے مستقل طور پر محروم ہو گئے۔ انہیں تورات، انجیل کے ذریعے نصیحت کی گئی تھی تاکہ ان کے احوال درست ہو جائیں مگر وَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ اور اُس نصیحت سے مستفید ہونا بھلا بیٹھے اور اللہ کے کلام سے کچھ فائدہ حاصل کیا۔

اسکے بعد اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ انکی سابقہ تحریف کے متعلق آپکو بہت کچھ بتایا جا چکا ہے اب انکی آئندہ تحریف کے متعلق فرمایا وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلَىٰ خَائِنَةٍ مِّنْهُمْ آپ اُن کی آئندہ خیانت یعنی تحریف سے بھی مطلع ہوتے رہیں گے۔ یہ لوگ جب بھی اللہ کے کلام میں تبدیلی کے مرتکب ہوں گے، آپ وقتاً فوقتاً اس پر مطلع ہوتے رہیں گے۔ فرمایا سارے

اہل کتاب ایک جیسے نہیں ہیں - اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ اُن کی ایک قلیل تعداد اللہ کی کتابوں میں تحریف کی مرتکب نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم علیہ السلام کو فرمایا کہ اہل کتاب کی اِن تمام تر خباثتوں کے باوجود فَاعْفُ عَنْهُمْ آپ اُن کو معاف کر دیں وَاصْفَحْ اور درگزر فرمائیں نیکی پر قائم رہیں کیونکہ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ بیشک اللہ تعالیٰ نیکی کرنیوالوں کو پسند فرماتا ہے۔

میثاقِ نصاریٰ

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے نصاریٰ کے متعلق خصوصی طور پر فرمایا وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اپنے آپ کو نصاریٰ کہلانے والے لوگوں سے۔ نصاریٰ یا نصرانی انصار کے مادہ سے ہے جس کا معنیٰ مددگار ہے سورۃ صف میں موجود ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں سے کہا مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ اللہ کے دین کی خاطر میری کون مدد کرے گا قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ تو حواریوں نے کہا کہ ہم مطلوبہ مدد پر تیار ہیں اس وجہ سے انہیں نصرانی کہا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ نصاریٰ کی نسبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے گاؤں ناصرہ کی طرف ہے۔ بہرحال جو لوگ اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے ہیں۔ وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹے ہیں وہ عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہیں رکھتے۔ نہ انجیل پر اُن کا صحیح ایمان ہے۔ بہرحال فرمایا کہ جن لوگوں نے نصاریٰ ہونے کا دعویٰ کیا اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ ہم نے اُن سے پختہ عہد لیا۔ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ مگر وہ اس چیز سے فائدہ اٹھانا بھول گئے جس کی انہیں نصیحت کی گئی تھی۔ فرمایا اس کے نتیجہ میں فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ ہم نے اُن کے درمیان عداوت اور دشمنی اور کینہ ڈال دیا یہ دُنیا میں ہی اُن کو سزا دے دی گئی کہ وہ ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ یہ سب کچھ عہد شکنی کا نتیجہ تھا کہ اُن پر لعنت کی گئی اور اُن کے دلوں کو سخت بنا دیا گیا۔ پھر انہوں نے

اللہ کی کتاب میں تحریف کی اور اصل کتاب کے احکام کو بھول گئے نصاری
کے متعلق خاص طور پر فرمایا کہ انہیں آپس کی دشمنی اور عداوت کی سزا دی گئی
إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ جو ہمیشہ انہیں ملتی رہیگی۔ یہاں پر قیامت کے دن
سے مراد یوم آخرت نہیں بلکہ اس سے لمبا عرصہ مراد ہے۔ ان معانی کی مثال
زمانۂ جاہلیت کے شاعر عبید ابن ابرص کے کلام سے ملتی ہے۔ یہ شخص
اپنے زمانے کا عظیم شاعر تھا مگر حضور علیہ السلام کی ولادت سے اکیس[۲] سال پہلے
مر گیا تھا۔ عرب کے کسی علاقے کا بادشاہ قبیلہ بنی اسد پر ناراض ہو گیا اور اس نے
قتل عام کا حکم دے دیا۔ شاعر نے کھڑے ہو کر بادشاہ کے سامنے قصیدہ پڑھا
اور معافی کی درخواست ان الفاظ میں کی

أَنتَ الْمَلِيكُ عَلَيْهِمْ وَهُمُ الْعَبِيدُ إِلَى الْقِيَامَةِ

تم بادشاہ ہو خدا کے لیے ان پر رحم کرو۔ یہ قیامت تک تمہارے غلام رہیں گے مطلب
یہ کہ لوگ لمبے عرصے تک تمہارے مطیع و فرمانبردار رہیں گے۔ غرضیکہ اللہ تعالیٰ نے نصاری
کے متعلق فرمایا کہ ان میں غیر محدود عرصہ کے لیے عداوت ڈال دی گئی۔

اہل کتاب مسلمان

جن خرابیوں کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے متعلق کیا ہے۔ آج
ہم دیکھتے ہیں کہ سب خرابیاں خود اہل ایمان میں بھی پیدا ہو چکی ہیں۔ حضور نبی کریم
صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے متعلق فرمایا[۱] لَتَتَّبِعُنَّ سَنَنَ مَنْ
قَبْلَكُمْ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ تم بھی پہلے لوگوں کے نقش قدم
پر ہی چلو گے۔ جس طرح جوتا جوتے کے ساتھ برابر ہوتا ہے۔ اسی طرح
تم میں اور سابقہ امتوں میں کوئی فرق نہیں ہو گا۔ چنانچہ جو جو خرابیاں اللہ نے
اہل کتاب کی گنوائی ہیں وہی خرابیاں اس امت میں بھی موجود ہیں۔ نقض عہد
مسلمان قوم کا شیوہ بن چکا ہے۔ عہد انفرادی ہو یا اجتماعی۔ ملکی سطح کا ہو یا
بین الاقوامی اس کی خلاف ورزی کی مثالیں زبان زد عام ہیں اسی طرح
تمام مسلم اقوام میں سنگدلی کی بیماری بھی پیدا ہو چکی ہے، کوئی کسی کے ساتھ

[۱] بخاری ص۴۹۱ ج۱، ص۱۰۸۹ ج۲، مسلم ص۳۳۹ ج۲ و مستدرک ص۱۲۹ ج۱، و ترمذی ص۳۰ (زیابی)

احسان و مروت کا سلوک کرنے کے لیے تیار نہیں۔ آج محسن لوگ مفقود ہیں جو قرآن پاک کے اس حکم کی تعمیل پر کمربستہ ہوں اِنَّ اللہَ یَاْمُرُ ـــــ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ۔ اس کے بجائے خود مسلمانوں میں سنگدلی پیدا ہو چکی ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ اب مسلمانوں سے طہارت، سماحت، اخبات اور عدل جیسے اصول منہ موڑ چکے ہیں۔

جہاں تک تحریف کا تعلق ہے مسلمان لفظی تحریف پر تو قادر نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کی حفاظت کا ذمہ خود لے رکھا ہے۔ تاہم مسلمانوں کے ہر فرقے میں کسی نہ کسی حد تک معنوی تحریف ضرور پائی جاتی ہے۔ اپنے ذاتی مفاد یا اپنے فرقہ کو تقویت پہنچانے کے لیے قرآن پاک کے مطالب و معانی کو غلط رنگ میں پیش کرنا۔ اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی غلط تاویلات کرنا تحریف معنوی ہی تو ہے۔

فرقہ پرستی

سید جمال الدین افغانی عالمِ اسلام کے بہت بڑے راہنما ہوئے ہیں۔ وہ مسلمانوں کی فرقہ پرستی سے سخت بیزار تھے۔ کہا کرتے تھے کہ اگر میرا بس چلے تو دس بارہ سال کے بچوں کو چھوڑ کر باقی سب آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دوں۔ اُن کا تجربہ یہ تھا کہ موجودہ نسل فرقہ پرستی میں اس حد تک آگے نکل چکی ہے کہ اب اِن کا واپس آنا ناممکن ہے۔ اہل اسلام کو راہِ راست پر لانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ان سب کو یکدم نیست و نابود کر کے نئی نسل کو بات سمجھانے کی کوشش کی جائے تو شاید وہ سمجھ جائیں۔ کیونکہ موجودہ نسل اپنی ڈگر سے ہٹنے کے لیے ہرگز تیار نہیں۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ اپنے دو سو سالہ دورِ حکومت میں انگریز نے تمہیں اس طرح پیس کر رکھ دیا ہے جس طرح کوئی چیز کھرل میں پیسی جاتی ہے۔ انہوں نے اہلِ اسلام کی اجتماعیت اور خلافت کو ختم کر کے اس کی جگہ فرقہ بندی کی بیماری پیدا کر دی ہے۔ اب مناسب اندرونی خلفشار کی وجہ سے دنیا میں تمہاری کوئی حیثیت

نہیں رہی۔ انگریز کا واحد مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کا اپنے دین کے ساتھ تعلق قائم نہ رہے۔ بلکہ ان کا تعلق اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے ساتھ بھی منقطع کر دیا جائے۔ فرماتے تھے کہ دنیا میں ہر جگہ مسلمان ان خرابیوں میں مبتلا ہیں۔ اللہ تعالیٰ کسی نئی قوم کو اٹھائے جو ان سب کی سرکوبی کرے اور قرآن پاک کے پروگرام پر عمل پیرا ہو تو شاید حالات درست ہو جائیں۔ ورنہ اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ فرماتے تھے عربوں اور ترکوں کے تعلقات کا جائزہ لیں اُن کی دشمنی ختم ہونے میں نہیں آتی۔ اسی طرح مذہبی فرقہ واری ہے۔ ہر فرقہ دوسرے کے خون کا پیاسا ہے۔ یہ وہی خرابی ہے جو اہل کتاب میں نقض عہد کی وجہ سے پیدا ہوئی اور آج مسلمانوں میں بھی موجود ہے۔ ان میں سنگدلی پیدا ہو چکی ہے، احسان ختم ہو گیا ہے، اخبات، سماحت اور عدل کہیں نظر نہیں آتے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ تحریف کی لعنت ہے۔

مولانا عبید اللہ سندھی بھی عظیم مسلمان اور درد دل رکھنے والے انسان تھے۔ انگریزوں کے دور میں آپ پچیس (۲۵) سال تک برصغیر سے جلاوطن رہے۔ آپ نے ایک سال روس میں، سات سال افغانستان میں، چار سال ترکی میں اور بارہ سال سے زیادہ عرصہ مکہ مکرمہ اور دوسری جگہ بسر کیا۔ آپ بھی انگریز کے سخت مخالف تھے۔ آخر میں جب واپس ہندوستان آئے تو فرمایا کہ میری خواہش تو یہ تھی کہ عمر کے آخری لمحات حرم شریف میں گذارتا مگر میں آپ لوگوں کو یہ بتانے کے لیے واپس آیا ہوں کہ بڑے طوفان برپا ہیں۔ انگریز تمہارے مذہب کی جڑ اکھاڑ رہے ہیں مگر تم سمجھ رہے ہو کہ ہم ترقی کر رہے ہیں لہٰذا اپنے دین کو بچانے کے لیے قائم ہو جاؤ۔ اپنے اندرونی اختلافات کو ختم کر کے دین حق کے مددگار بن جاؤ، ورنہ پوری دنیا میں تمہاری ہوا اکھڑ جائیگی اور تم اغیار کے دست نگر بن کر رہ جاؤ گے۔

عیسائی فرقے

الغرض! فرمایا کہ ہم نے نصاریٰ کے درمیان عداوت اور دشمنی

ڈال دی اور وہ گروہوں میں تقسیم ہو کر رہ گئے۔ ہر فرقہ دوسرے کا دشمن بن گیا۔ آج بھی دیکھ لیں رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ آپس میں کس طرح دست و گریباں ہیں، برطانیہ اور سکاٹ لینڈ والوں کے تنازعہ کی بنیاد کیا ہے۔ مختلف اعتقاد رکھنے والے لوگ کبھی اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا ماننے والے یا تیسرا خدا تسلیم کرنے والے یا بالکل بعینہٖ خدا ماننے والے ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا ہیں۔ یہی عداوت اور اختلاف مختلف سلطنتوں کے درمیان دشمنی کی بنیاد بن چکے ہیں اللہ نے فرمایا کہ یہ سب کچھ ان کے لیے سزا کے طور پہ ہے۔

یہ تو دنیا میں سزا مل رہی ہے۔ جب قیامت کا دن آئیگا اور حساب کتاب کی منزل آئے گی تو ان کا کیا دھرا ان کے سامنے کر دیا جائے گا۔ اس دن ان بدبختوں کو بتایا جائے گا کہ تم اپنی بدکرداری کی وجہ سے سزا کے مستحق ٹھہرے ہو۔ فرمایا وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ اور عنقریب اللہ تعالیٰ انہیں بتائے گا کہ جو کچھ وہ دنیا میں کرتے تھے۔ بہرحال اہل کتاب کی خرابیاں بیان فرما کر مسلمانوں کو خبردار کر دیا گیا ہے کہ تم بھی ان کے نقش قدم پہ نہ چل نکلنا۔

يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ قَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلُنَا يُبَيِّنُ لَـكُمۡ كَثِيۡرًا مِّمَّا كُنۡتُمۡ تُخۡفُوۡنَ مِنَ الۡكِتٰبِ وَيَعۡفُوۡا عَنۡ كَثِيۡرٍ ؕ قَدۡ جَآءَكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ نُوۡرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيۡنٌ ۙ ﴿۱۵﴾ يَّهۡدِىۡ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضۡوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخۡرِجُهُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ بِاِذۡنِهٖ وَيَهۡدِيۡهِمۡ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴿۱۶﴾

ترجمہ :- اے اہل کتاب ! تحقیق آگیا ہے تمہارے پاس ہمارا رسول جو ظاہر کرتا ہے تمہارے لیے بہت سی وہ چیزیں جن کو تم چھپاتے کتاب میں سے اور درگذر کرتا ہے بہت سی چیزوں سے ، تحقیق آگیا ہے تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور اور کھول کر بیان کرنے والی کتاب ﴿۱۵﴾ اللہ اس کے ذریعے ہدایت دیتا ہے اُس کو جو پیروی کرتا ہے اُس کی خوشنودی کی سلامتی کے راستہ کی ، اور نکالتا ہے اُن کو اندھیروں سے روشنی کی طرف اپنے حکم سے اور چلاتا ہے اُن کو صراطِ مستقیم پر ﴿۱۶﴾

ربط آیات

گذشتہ دروس میں اہل کتاب کے دونوں فرقوں کی نقضِ عہد کی خرابی بیان ہو چکی ہے۔ یہودیوں کے متعلق خصوصی طور پر بیان ہو چکا ہے کہ یہ لوگ عہد توڑنے کی وجہ سے ملعون ٹھہرے اور اُن کے دل سخت کر دیے گئے۔ پھر اس کے نتیجہ میں انہوں نے کتاب اللہ میں تحریف کی اور دین میں بگاڑ پیدا کیا اور جو نصیحت اُن کو

کی گئی تھی، اس کو فراموش کر بیٹھے پھر نصاریٰ کے متعلق فرمایا کہ انہوں نے بھی عہد کا پاس نہ کیا اور جو نصیحت کی گئی تھی اُس کو بھول گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس دنیا میں ان کے درمیان عداوت اور بغض ڈال دیا گیا، وہ فرقوں میں بٹ کر ایک دوسرے کے دشمن بن گئے اور ان کے درمیان انفرادی عداوت بھی پیدا ہو گئی۔ بہرحال فرمایا کہ یہ تو دنیا کی سزا تھی، اب آخرت میں ان کا سارا کیا دھرا اُن کے سامنے رکھ دیا جائے گا اور پھر وہ دائمی سزا کے مستحق ہوں گے۔ ایک ایسا دور بھی آنے والا ہے۔

تبیینِ احکام

اب یہاں پر اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کو نصیحت فرمائی ہے کہ اگر تم نقضِ عہد کی لعنت اور سزا سے بچنا چاہتے ہو تو اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ نبی آخرالزمان پر ایمان لے آؤ۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے یَاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا اے اہل کتاب! تمہارے پاس ہمارا رسول آگیا ہے یعنی اللہ کے آخری نبی حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہو چکے ہیں۔ اگر دنیا کی ذلت اور آخرت کی رسوائی سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہو تو اُن کے دامن سے وابستہ ہو جاؤ۔ اس رسول اعظم کی ایک خاص نشانی یہ ہے يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وہ تمہارے سامنے بہت سی چیزیں ظاہر کرتا ہے جسے تم کتاب میں سے چھپاتے تھے۔

یہودیوں کی طرف سے کتمانِ حق کے سلسلے میں اسی سورۃ میں آگے آئے گا کہ وہ رجم کے حکم کو چھپاتے تھے۔ خود یہودیوں کے درمیان زنا کا ایک واقعہ پیش آگیا۔ وہ لوگ مسئلہ دریافت کرنے کے لیے حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے مگر آپ نے انہی کے علماء سے دریافت کیا کہ تمہاری کتاب کے مطابق زانی کی سزا کیا ہے۔ انہوں نے تورات کے حکم کو چھپانے کی کوشش کی مگر اللہ تعالیٰ نے حضرت عبداللہ بن سلامؓ کے

ذریعے اُسے ظاہر فرما دیا۔ کہ زنا کی سزا رجم ہے۔ آج بھی بائبل کے ترجمے میں یہ آیت موجود ہے کہ جو کوئی پڑوسی کی بیوی سے زنا کریگا، وہ جان سے مارا جائے گا، گویا تورات میں بھی زانی سزائے موت کا مستحق ہے۔

اسی طرح عیسائیوں نے حضور علیہ السلام کے اسم مبارک اور آپ کی نشانیوں کو چھپانے کی کوشش کی۔ جیسا کہ کل عرض کیا تھا۔ انہوں نے اپنی کتاب سے فارقلیط کا لفظ ہی نکال دیا جس کا معنیٰ احمد ہوتا ہے۔ آپ کی نشانیوں میں سے دس ہزار قدسیوں کے الفاظ میں بھی تحریف کر دی۔ آپ کی آمد کے متعلق پیش گوئیوں کو حذف کر دیا۔ بلکہ اگر کوئی شخص ان سے پوچھتا کہ نبی آخر الزمان کی بعض نشانیوں کو ظاہر کرو تو یہ بدبخت ایسی نشانیاں تبلاتے جو حضور علیہ السلام کے خلاف پڑتیں۔ گزشتہ سورۃ کی تفسیر میں یہ بات عیاں ہو چکی ہے۔ کہ جب مشرکین مکہ ان یہودیوں سے پوچھتے کہ بتاؤ ہمارا دین سچا ہے یا مسلمانوں کا، تو یہ کہتے کہ تمہارا دین زیادہ بہتر ہے۔ حالانکہ اللہ نے فرمایا کہ یہ لوگ کتابوں سے واقف ہیں، انبیاء کو جانتے ہیں۔ مگر کس قدر خائن، متعصب اور بددیانت ہیں کہ محض اسلام دشمنی کی وجہ سے مشرکین کے مذہب کو اچھا تبلاتے ہیں۔

تورات میں یہ آیت موجود تھی۔ کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو چھ دن میں پیدا فرمایا۔ مگر انہوں نے اُس کے آگے از خود یہ بڑھا دیا کہ پھر ساتویں دن آرام کیا۔ حالانکہ یہ کفر کا کلمہ ہے۔ آرام کی ضرورت تو اُسے ہوتی ہے جو تھک جائے مگر اللہ تعالیٰ ان چیزوں سے پاک ہے انہوں نے اللہ تعالیٰ پر افترا باندھا۔ اس کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں سورۃ قٓ میں فرمائی وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ۖ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ۔ ہم نے آسمان و زمین اور اُن کے درمیان تمام چیزوں کو چھ دن میں پیدا کیا اور ہمیں کوئی تھکاوٹ

لاحق نہیں ہوئی۔ بہرحال یہ بھی اُن کی طرف سے تحریف فی الکتاب کی ایک مثال ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہمارا نبی بہت سی ایسی چیزوں کو بیان کر دیتا ہے جن کو تم چھپاتے تھے۔

وَيَعْفُوا عَنْ كَثِيرٍ اور کئی چیزوں سے درگزر کرتا ہے۔ بعض ضروری چیزوں کو ظاہر کر دیتا ہے مگر بعض غیر اہم چیزوں سے تعرض ہی نہیں کرتا کہ ان کو ظاہر کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، البتہ جنہیں مخفی رکھنے میں کوئی قباحت پائی جاتی ہے۔ اور جس سے مزید الجھنیں پیدا ہو سکتی ہیں انہیں ظاہر فرما دیتا ہے۔ اور یہ سب کچھ وحی کے ذریعے ہوتا ہے جیسا کہ گذشتہ درس میں بھی آ چکا ہے۔ کہ یہ لوگ جس قدر خیانتیں کرتے ہیں آپ ان پر وقتاً فوقتاً مطلع ہوتے رہیں گے۔

نور اور کتاب

فرمایا دوسری بات یہ ہے قَدْ جَاءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُورٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِينٌ تحقیق آئی ہے تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک روشنی اور کھلی کتاب۔ یہاں پر الفاظ نور اور کتاب مبین خاص طور پر توجہ طلب ہیں۔ عام مفسرین کے نزدیک دونوں الفاظ کے درمیان "و" عطفِ تفسیری ہے اور ان دونوں الفاظ سے ایک ہی چیز مراد ہے یعنی قرآن کریم۔ نور بھی وہی ہے اور کتاب مبین بھی اُسی کو کہا گیا ہے۔ گذشتہ سورۃ نسا کے آخر میں بھی نور کا لفظ انہی معانی میں استعمال ہوا ہے۔ "يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا" اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے دلیل آ چکی ہے اور ہم نے تمہاری طرف نورِ مبین بھی نازل فرمایا ہے۔ گویا نورِ مبین سے مراد قرآن کریم ہی ہے۔ سورۃ اعراف میں بھی نور کا لفظ قرآن پاک کے لیے آیا ہے۔ "وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ" اور انہوں نے اُس نور کی پیروی کی جو اُس کے ساتھ اتارا گیا اور یہی لوگ کامیابی حاصل کرنے

والے ہیں مطلب یہ کہ نور اور کتاب سے مراد ایک ہی چیز ہے اور وہ ہے، قرآن پاک۔ اور یہ اس لحاظ سے مبین ہے کہ ہر چیز کو کھول کھول کر یعنی واضح طور پر بیان کرتا ہے

ان معانی پر یہ قرینہ بھی موجود ہے کہ رسول کا ذکر تو آیت کے پہلے حصے میں آچکا ہے "قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا" تحقیق تمہارے پاس ہمارا رسول آچکا ہے۔ لہذا اس دوسرے حصہ آیت میں نور سے مراد رسول نہیں بلکہ کتاب یعنی قرآن مجید ہے انہی معانی پر قرینہ اگلی آیت کے ابتدائی حصہ میں بھی پایا جاتا ہے وہاں ہے "يَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ" اللہ اس کے ذریعے ہدایت دیتا ہے۔ بِهٖ کی ضمیر صیغہ واحد ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی ایک ہدایت دہندہ چیز کا ذکر ہو رہا ہے اور وہ ہے قرآن کریم جو نور بھی ہے اور واضح کتاب بھی۔ اگر یہ دو مختلف چیزیں ہوتیں تو ضمیر واحد کی بجائے تثنیہ استعمال ہوتی یعنی يَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ کی بجائے يَهْدِيْ بِهِمَا اللّٰهُ کے الفاظ آتے اور معنیٰ یہ ہوتا کہ اللہ تعالیٰ ان دونوں چیزوں کے ذریعے ہدایت عطا کرتا ہے۔ درواقع میں بھی یہی ہے۔ کہ اللہ کا نبی اور قرآن پاک دونوں ہی ذرائع ہدایت ہیں مگر یہاں پر مستعملہ ضمیر واحد سے عیاں ہے۔ کہ نورؔ اور کتاب ایک ہی چیز ہے۔

تاہم بعض مفسرین عظام مثلاً امام بیضاوی اور امام ابن جریر طبری نے ان دو الفاظ کو دو مختلف معانی پر محمول کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ نور سے مُراد حضور علیہ السلام کی ذاتِ مقدسہ ہے اور کتاب مبین سے مراد قرآن حکیم ہے مگر راجح تفسیر پہلے بیان کردہ ہی ہے۔ اور اگر ان حضرات کے مطابق نور سے حضور علیہ السلام کی ذات بھی لی جائے تو اس کا معنیٰ نور ہدایت ہوگا یعنی آپ کے پاس نور ہدایت اور واضح کتاب آچکی ہے قرآن میں نور کے مختلف معنیٰ بیان ہوئے ہیں۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا ہے۔ خود قرآن کو بھی نور

کہا گیا ہے۔ اسلام بھی نور ہے جیسے فرمایا "اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ" (زمر) جس کا سینہ اللہ تعالے نے اسلام کے لیے کھول دیا، وہ اپنے رب کی طرف سے عطا کردہ نور پر ہے۔ ایمان کے متعلق سورۃ شوریٰ میں موجود ہے۔ "وَمَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا" آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب اور ایمان کیا چیز ہے مگر ہم نے اُسے نور بنایا جس کے ذریعے ہم اپنے بندوں میں جسے چاہیں ہدایت دیتے ہیں۔

عربوں میں نور محاورہ کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور اس سے مراد فرد یا جماعت ہوتی ہے۔ اس ضمن میں شبیب بن برصاد کا یہ شعر حماسہ میں موجود ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّا نُوْرُ قَوْمٍ وَّاِنَّمَا یُبَیِّنُ فِی الظَّلْمَآءِ لِلنَّاسِ نُوْرُهَا

اے مخاطب کیا تم دیکھتے نہیں کہ ہم قوم کا نور ہیں۔ ہماری قوم کا نور لوگوں کے سامنے اندھیروں میں واضح ہوتا ہے۔ مقصد یہ کہ ہم اس لحاظ سے نور ہیں کہ لوگ ہماری رائے کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ لفظ ہادی اور راہنما کے لیے بھی استعمال ہوتا۔ اس لحاظ سے اگر نور کا لفظ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات سے وابستہ کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ نورِ ہدایت ہادی اور راہنما ہیں۔

ویسے نور کا اطلاق خود اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھی کیا گیا ہے سورۃ نور میں موجود ہے "اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" یعنی اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ نور اللہ تعالیٰ کی صفتِ قدیمہ بھی ہے اور اس سے مراد ایسا نور ہے جو خود ظاہر ہے اور دوسری چیزوں کو ظاہر کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس صفت میں بھی کوئی اُس کا شریک نہیں ہے۔

بہر حال حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس لحاظ سے نور ہیں کہ آپ کے ذریعے سے ہدایت، روشنی، ایمان، تقویٰ اور طاعت حاصل ہوتی ہے۔ اس مفہوم سے کسی کو مجالِ انکار نہیں۔ اللہ کے سارے نبی نورِ ہدایت ہیں، نبی کا اتباع باعث نجات، ورنہ توہین باعثِ کفر ہوتا ہے۔

نور اور بشر

البتہ اہلِ بدعت نے نور کے لفظ سے غلط مفہوم اخذ کیا ہے۔ اور انہوں نے نور سے مراد حضور علیہ السلام کی ذاتِ مبارک لیا۔ اور پھر اس کا تقابل بشر کے ساتھ کر کے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بشریت کا انکار کر دیا حالانکہ قرآن پاک میں بیسیوں جگہ حضور علیہ السلام اور دوسرے انبیاء کی بشریت کا اعلان کیا گیا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے بشر (انسان) اور نبی حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق فرمایا اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ "یعنی میں مٹی سے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں۔ سورۃ بنی اسرائیل میں موجود ہے۔ کہ جب کفار نے نبی علیہ السلام سے کئی قسم کے معجزات طلب کیے تو اللہ نے فرمایا آپ کہہ دیجئے هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا میں تو بشر رسول ہوں سورۃ کہف میں بھی آپ کی زبان سے کہلوایا "قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ" یعنی میں بھی تمہاری طرح انسان ہی ہوں۔ سورۃ ابراہیم میں اللہ تعالیٰ نے رسولوں کی زبان سے کہلوایا" قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ" ان کے رسولوں نے کہا کہ ہم کچھ نہیں ہیں مگر تمہارے جیسے بشر مگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے۔ نوازتا ہے مقصد یہ کہ انبیاء کی بشریت کا انکار نص قطعی کا انکار ہے۔ مگر اہلِ بدعت ایک قدم اور آگے چلے اور نُوْرٌ مِّنْ نُّوْرِ اللّٰهِ کا عقیدہ وضع کیا۔ گویا حضور علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نور میں سے ایک ٹکڑا ہیں جو علیحدہ ہو گیا ہے (العیاذ باللہ) یہ تو وہی عیسائیوں کا تین خداؤں والا عقیدہ ہے جسے سورۃ زخرف

میں یوں بیان کیا گیا ہے "وَجَعَلُوا لَهُ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا"
یعنی مشرکوں نے اللہ کے بندوں میں سے اُس کا جزو بنا لیا۔ یہ تو انکارِ بشریت
ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ انبیاء میں صاف فرمایا ہے "وَمَآ اَرْسَلْنَا
قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ" یعنی اے نبی علیہ السلام آپ سے
پہلے بھی ہم نے انسانوں ہی کو نبی بنا کر بھیجا جن کی طرف ہم نے وحی کی
گویا تمام سابقہ انبیاء مرد اور انسان تھے۔ اللہ کے وہ برگزیدہ بندے حضرت
آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے، وہ کھاتے پیتے تھے اور تمام امورِ طبعیہ
انجام دیتے تھے۔ وہ بیویاں اور اولاد رکھتے تھے اور زندگی کے تمام تقاضے
پورے کرتے تھے ان پر موت وحیات طاری ہوتی۔ اس کے ساتھ ساتھ
وہ وحی الٰہی کے مورد تھے اور جس ہستی پر وحی نازل ہوتی ہے اُس سے عالی
مرتبت کوئی دوسرا انسان نہیں ہوتا۔

اس مقام پر بعض لوگوں کو مزید غلط فہمی ہوئی ہے وہ سمجھتے ہیں کہ
حضور علیہ السلام کو انسان تسلیم کرنے سے العیاذ باللہ آپ کی توہین ہو جائیگی
اُن کے مطابق حضور علیہ السلام کو انسان ماننا اپنے ہم مرتبہ خیال کرنا ہے۔ ایسا ہرگز
نہیں۔ مرتبے کے لحاظ سے کوئی شخص حتیٰ کہ کوئی نبی بھی آپکے برابر نہیں ہو
سکتا۔ کوئی ذی شعور آدمی تو اپنے اساتذہ کو بھی اپنے سے اعلیٰ وارفع سمجھتا ہے
چہ جائیکہ وہ نبی کی ذات مقدسہ کو اپنے برابر قرار دے۔ نبی علیہ السلام کو اپنے
بھائی یا باپ کے ہم مرتبت سمجھنا تو کلمہ کفر ہے۔ نبی معصوم ہوتے ہیں۔
جب کہ عام انسان خطا کار ہیں۔ لہذا یہ محض پراپیگنڈہ ہے کہ فلاں شخص
پیغمبر اسلام کو بڑے بھائی کے برابر سمجھتا ہے۔ اس کے باوجود انبیاء علیہم السلام
کی انسانیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ وہ سب آدم علیہ السلام کی اولاد
اور اپنے اپنے خاندان اور نسب میں سے ہیں۔ اُن کی بشریت کا انکار سراسر
گمراہی ہے۔

فرمایا تمہارے پاس اللہ کی جانب سے نور اور کتاب مبین آچکی ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ یَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ ہر اُس شخص کو سلامتی کے راستے کی ہدایت دیتا ہے جو اُس کی خوشنودی کی پیروی کرتا ہے۔ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ، اور اپنے حکم سے انہیں کفر، شرک، بدعات اور معاصی کے اندھیروں سے اسلام، ایمان، نیکی، تقویٰ کی روشنی کی طرف نکالتا ہے۔ انسان کے دل میں روشنی، بصیرت اور یقین کامل پیدا ہوتا ہے۔ دوسرے مقام پر اللہ نے ایمان اور اسلام کو روشنی اور کفر کو اندھیرے سے تشبیہ دی ہے سورۃ انعام میں ارشاد ہوتا ہے۔" اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا" بھلا وہ شخص جو پہلے (کفر کی وجہ سے) مردہ تھا، ہم نے اُس کو (اسلام کی وجہ سے) زندہ کیا اور اس کے لیے (ایمان کی) روشنی کر دی جس کے ذریعے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے۔ کیا وہ اُس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو (کفر کے) اندھیروں میں پڑا ہوا ہو، اور اُس سے نکل ہی نہ سکے۔

بہر حال فرمایا کہ اللہ تعالیٰ خوشنودی کے متبع کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالتا ہے وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ اور انہیں سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ چنانچہ اللہ کے نیک بندے اسی راستے پر چل کر جنت جیسے اعلیٰ مقام میں پہنچ جاتے ہیں برخلاف اس کے کفر کا راستہ اختیار کرنے والوں کے متعلق پہلے بیان ہو چکا ہے" فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ" اس کے بعد جس نے کفر کا راستہ

اختیار کیا تو وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔ اس نے جس پگڈنڈی پر
سفر کا آغاز کیا ہے، وہ بالآخر اُسے جہنم میں لے جائیگی۔ صراطِ مستقیم
سے بھٹکنے والوں کا یہی انجام ہوگا۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ؕ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۷﴾

ترجمہ :- البتہ تحقیق کافر ہوئے وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ بیشک اللہ تعالیٰ بعینہٖ مسیح ابن مریم ہے ۔ اے پیغمبر ! آپ کہہ دیجئے پس کون مالک ہے اللہ کے سامنے کسی چیز کا اگر وہ ارادہ کرے کہ ہلاک کر دے مسیح ابن مریم اور اُن کی والدہ کو اور جو زمین میں ہیں سب کے سب اور اللہ ہی کے لیے ہے سلطنت آسمانوں کی اور زمین کی ، اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے ، وہ پیدا کرتا ہے جو چاہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ﴿۱۷﴾

ربطِ آیات پہلے اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب کے نقضِ عہد کا ذکر کیا اور دونوں گروہوں کو دنیا میں دی گئی سزا سے آگاہ کیا یہودیوں کے متعلق فرمایا کہ وہ نقضِ عہد کے نتیجے میں ملعون ٹھہرے ، سنگدل بنے ۔ انہوں نے کتابِ الٰہی میں تحریف کی اور جو نصیحت انہیں کی گئی اُس کو فراموش کر دیا ۔ اسی طرح نصاریٰ کے متعلق فرمایا کہ وہ بھی نصیحت کو بھول گئے جس کے نتیجے میں اُن کے درمیان عداوت دشمنی اور کینہ ڈال دیا گیا ۔ پھر اُن کو اشارتاً یہ جتلا دیا کہ ایک دن آنے والا ہے ۔

جس دن اس دنیا میں کی گئی کارگزاری کی سزا انہیں بھگتنا ہو گی۔ پھر فرمایا اگر دنیا
کی لعنت اور آخرت کے عذاب سے بچنا چاہتے ہو تو اس کے لیے صرف
ایک ہی راستہ ہے کہ اللہ کے آخری نبی اور اس پہ نازل کی گئی کتاب پر ایمان
لے آؤ۔ یہ ایسی روشنی ہے جو ہر چیز کو کھول کر بیان کرنے والی ہے۔
عذاب الٰہی سے بچنے کی یہی ایک صورت ہے۔

عیسائیوں کی فرقہ بندی

اب اللہ تعالیٰ نے عیسائیوں کے متعلق فرمایا ہے۔ کہ ان میں بھی
بہت سی خرابیاں پائی جاتی ہیں۔ اب ان کا اعتقاد کفر و شرک میں ملوث ہو
کر بالکل فاسد ہو چکا ہے۔ اللہ نے ان کے مختلف فرقوں کا بھی رد فرمایا
ہے۔ نصاریٰ کا ایک فرقہ ایسا ہے۔ جو مسیح علیہ السلام کو ابن اللہ کہتا ہے
ہے۔ یعنی آپ اللہ کے بیٹے ہیں۔ یہ عقیدۂ ابنیت ہے اور اس کے
ماننے والوں کا نسطوری فرقہ مشہور ہو گیا۔ نصاریٰ کا ایک اور فرقہ
ایسا ہے جو مسیح علیہ السلام کو تین خداؤں میں سے ایک کہتے ہیں۔ عقیدہ
تثلیث کو ماننے والا ملکانی فرقہ کہلاتا ہے۔ یہ لوگ باپ، بیٹا اور روح القدس
تین خدا مانتے ہیں، گویا خدا تین بھی ہیں اور جب یہ مل جاتے ہیں، تو ایک
خدا بن جاتا ہے۔ ایک فرقہ یعقوبیہ کے نام سے مشہور ہے۔ ان کا
عقیدہ یہ ہے کہ مسیح علیہ السلام بعینہٖ خدا ہیں۔ کیونکہ خدا نے مسیح کے اندر
حلول کیا ہے۔ یہ دیگر مشرکین والا حلولی عقیدہ ہے۔ اللہ نے ان تینوں
فرقوں کے متعلق صاف فرمایا ہے کہ یہ کافر ہیں

عقیدہ عینیت

عقیدہ تثلیث کا ذکر تو آگے آئیگا، تاہم یہاں پر عینیت کا عقیدہ رکھنے
والوں کا رد کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ
اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ وہ لوگ کافر ہوئے جنہوں نے یوں
کہا کہ تحقیق اللہ تعالیٰ بعینہٖ مسیح ابن مریم ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے مسیح علیہ السلام
میں حلول کیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ حلولی یا اتحادی فرقہ بھی کہلاتا ہے۔ یہ

عقیدہ بالکل ہندوؤں جیسا عقیدہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا کسی بھی شکل پر متشکل ہو سکتا ہے۔ اور کسی شے میں حلول کر سکتا ہے اور اس کے ساتھ اتحاد کر سکتا ہے۔ اسی عقیدے کے مطابق خدا نے مسیح علیہ السلام میں حلول کیا اور پھر وہ دونوں متحد ہو گئے۔ ان کو اللہ نے کافر فرمایا ہے۔

اصل بات یہ ہے۔ کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں پر مہربانی فرماتا ہے اور ان پر اپنی تجلیات نازل فرماتا ہے تو انہیں خدا تعالیٰ کا قرب حاصل ہو جاتا ہے۔ انہیں عروج نصیب ہوتا ہے اور وہ انسانیت کے بلند ترین مقام پر پہنچ جاتے ہیں۔ مگر جو لوگ یہ تصور قائم کرتے ہیں کہ وہ خدا کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ اور پھر بعینہ خدا بن جاتے ہیں۔ وہ کفر میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اللہ کے برگزیدہ بندے انسانیت میں کمال حاصل کرتے ہیں مگر ان کے پیرکار ان سے صادر ہونے والے کمالات کو ان کے ذاتی کمالات سمجھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ ان سے جو خارق عادت چیزیں ظاہر ہوتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور قدرت سے ہوتی ہیں۔ اسی اشتباہ میں مبتلا ہو کر ایسے لوگ کافر بن جاتے ہیں۔ نبی کا معجزہ یا ولی کی کرامت اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت ہوتی ہے، اللہ کا اپنا فعل ہوتا ہے۔ مالک الملک جس کے ہاتھ پر اُسے ظاہر کرتا ہے، اُسے عزت عطا کرتا ہے مگر یہ لوگ اُن کا ذاتی فعل سمجھ کر اُنہیں الوہیت کے منصب تک پہنچا دیتے ہیں۔ یہی کفر ہے۔

مسیح علیہ السلام کی پیدائش حیرت انگیز طریقے سے عمل میں آئی۔ آپ اور ان کی والدہ اللہ کے مقربین میں سے ہیں اللہ نے دونوں کو عزت بخشی۔ ایک نبی ہے اور ایک صدیقہ ہے۔ لیکن نصاریٰ نے اُن کے متعلق بالکل باطل عقیدہ وضع کر لیا ہے اُن کو مسیح علیہ السلام کی غیر معمولی پیدائش کی وجہ سے غلطی لاحق ہوئی ہے۔ چونکہ مسیح علیہ السلام کا باپ کوئی نہ تھا۔ اس لیے انہوں نے آپ کی نسبت خدا تعالیٰ کی طرف کر دی۔ اور جو معجزات آپ کے ہاتھ سے صادر ہوئے، اُن کی ـــــ وجہ سے انہوں نے آپ کو

الوہیت کے درجے تک پہنچا دیا اور اس طرح یہ لوگ شدید گمراہی میں مبتلا ہو گئے۔ چنانچہ انہوں نے کہہ دیا کہ مسیح ابن مریم بعینہٖ خدا ہے۔ وحدت الوجود والوں میں سے ہے جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا مخلوق کے روپ میں ظاہر ہوا ہے اور بعینہٖ مخلوق کے ساتھ متحد ہو گیا ہے۔ وہ بھی کفریہ عقیدہ رکھتے ہیں سید علی ہجویریؒ نے کشف المحجوب[1] میں صوفیاء کے بارہ فرقوں کا ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں، ان میں سے دس گروہ حق پر ہیں اور دو گمراہ ہیں جو حلولی عقیدہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ حلاج حلولی عقیدے کا قائل نہیں تھا۔ وہ وحدت الوجود کے مسئلہ کا قائل تھا مگر حلول کا نہیں۔ فرماتے ہیں جو دو فرقے حلول کے قائل ہیں، وہ کافر اور زندیق ہیں لہٰذا وحدت الوجود کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ خدا بعینہٖ مخلوق کے ساتھ متحد ہو جاتا ہے۔ یہ تو حلول اور اوتار والا عقیدہ ہے جو کفر پر منتج ہوتا ہے۔

اللہ کی قدرت تامہ

آگے اللہ تعالیٰ نے عقیدۂ عینیت کی تردید کے ضمن میں حضور علیہ السلام کو فرمایا قُلْ آپ کہہ دیجئے اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا اگر اللہ تعالیٰ ارادہ کرے کہ مسیح علیہ السلام، اُن کی والدہ اور تمام اہل زمین کو ہلاک کر دے، تو خدا تعالیٰ کے سامنے کون دم مار سکتا ہے اور اس کے ارادے کو کون بدل سکتا ہے وہ قادر مطلق ہے۔ اگر وہ ہلاک کرنا چاہے فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا تو خدا کے سامنے کون کسی چیز کا مالک ہے جو اللہ کی مشیت کو رکوا سکے۔ مقصد یہ کہ نصاریٰ کا یہ عقیدہ بالکل باطل ہے۔ کہ مسیح علیہ السلام بعینہٖ خدا ہے۔ فرمایا آپ کی حیثیت تو اتنی ہے کہ اگر مالک الملک اُن کو، اُن کی والدہ اور روئے زمین پر بسنے والی تمام مخلوق کو ہلاک کرنا چاہے تو اس کے ہاتھ کو کون پکڑ سکتا ہے۔ ازل سے لے کر ابد تک کے تمام انسانوں کی اجتماعی قوت بھی اللہ تعالیٰ کے ارادے کو کم از کم وقت کے لیے بھی

[1] کشف المحجوب فارسی ص۱۸۳ (فیاض)

ملتوی نہیں کرسکتی۔ جب وہ اتنی قدرت کا مالک ہے تو اُس کے ساتھ مسیح علیہ السلام کو کیسے شریک کرتے ہو۔ خدا تعالیٰ کی قدرت ذاتی اور لامحدود ہے جب کہ مخلوق کی قدرت عطائی اور محدود ہے۔ اللہ تعالےٰ اپنی مخلوق کو اتنی ہی طاقت اور قدرت عطا کرتا ہے، جتنی وہ اپنی مصلحت کے مطابق مناسب سمجھتا ہے۔ اُس کے مقابلے میں اُس کے تمام بندے عاجز محض ہیں جس کا اعتراف یہ لوگ ہر وقت کرتے رہتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ توانائی کا سرچشمہ واحد ذاتِ خداوندی ہے، وہی قدرت اور طاقت کا مالک ہے۔

خود مسیح علیہ السلام جنہیں خدائی کا درجہ دیا جا رہا ہے وہ بھی خدا کے سامنے اپنی عاجزی ہی کا اظہار کرتے ہیں۔ چنانچہ انجیل مرقس میں یہ آیت موجود ہے کہ "اے باپ! ہر چیز تیری قدرت کے تحت ہے، تو مجھ سے موت کا پیالہ ٹال دے۔ اس طرح نہیں جو میں چاہتا ہوں، بلکہ اس طرح جیسا تیرا ارادہ ہے۔ سارا اختیار تیرے قبضہ میں ہے، تو اگر چاہے تو مجھ سے موت کا پیالہ ٹال سکتا ہے، جس طرح تو چاہے" غرضیکہ مسیح علیہ السلام کا عقیدہ تو یہ ہے کہ اختیار و ارادہ صرف خدا تعالیٰ کا ہے۔ لہٰذا تم انہیں یا اُن کی والدہ کو خدائی کے منصب پر کیسے بٹھاتے ہو۔ یہ تو نہایت گستاخی اور بے ادبی کی بات ہے کہ اُن کے حق میں خدائی کا دعویٰ کیا جائے۔ وہ نہ تو خود خدا ہیں اور نہ اُن میں الوہیت کی کوئی صفت آگئی ہے۔ بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کے عاجز بندے ہیں۔

جس وقت یہ آیت نازل ہوئی اس وقت حضرت مریم تو فوت ہو چکی تھیں البتہ حضرت مسیح علیہ السلام اب بھی زندہ ہیں تو درحقیقت انہی کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے کہ اگر وہ آپ کو اور تمام اہل ارض کو آنِ واحد میں ہلاک کرنا چاہے تو اُسے کوئی روک نہیں سکتا۔ ہلاکت کا معنی فوت ہونا ہوتا

ہے جیسے فرمایا "كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ" اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا ہر چیز ہلاک ہونے والی یعنی فانی ہے۔ نیست و نابود ہونے والی ہے بہر حال اُس کے ارادے میں کوئی بھی مخل نہیں ہو سکتا۔ شیخ عطارؒ نے بھی فرمایا ہے

؎ اُوست سلطان ہر چہ خواہد آں کند
عالمے را در دمے ویران کند

بادشاہ اور سلطان تو وہ ہے جو چاہے کرے اور سب جہان کو آن واحد میں فنا کر دے۔

شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بعض اوقات انبیاء کے متعلق ایسی بات اس لیے کرتے ہیں تاکہ اُن کی اُمت انہیں بندگی کی حد سے آگے نہ بڑھا دے۔ ورنہ انبیا تو اللہ کے مقرب بندے ہوتے ہیں "وَإِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْأَخْيَارِ" وہ تو بڑے برگزیدہ اور اللہ کے منتخب بندے ہوتے ہیں وہ عالی مرتبت ہونے کی بنا، پر اس قسم کے خطاب کے لائق نہیں ہوتے مگر امت کو سمجھانے کے لیے با اوقات ایسا خطاب کیا جاتا ہے کہ اگر پیغمبر کو الوہیت کے درجے تک پہنچاؤ گے تو گمراہ ہو کر جہنم رسید ہو گے۔

اللہ کی قدرتِ تخلیق

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا باپ کوئی نہیں تو ان کی تخلیق کیسے ہوئی۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا مالک خدائے وحدہٗ لاشریک ہی ہے وہ بااختیار ہے يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وہ جو چاہے پیدا کرے، اُسے نہ تو اسباب کی ضرورت ہے اور نہ وہ کسی چیز کا محتاج ہے۔ اُس نے آدم علیہ السلام کو ماں اور باپ دونوں کے بغیر پیدا فرمایا اور مسیح علیہ السلام کی پیدائش میں حضرت آدم کی مثال پیش کی "إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِنْدَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ"

عیسیٰ علیہ السلام کی مثال آدم علیہ السلام کی سی سمجھو ”خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ“
جسے مٹی سے پیدا کیا گیا۔ اُن کا ماں باپ کون تھا۔ کوئی نہیں۔ اسی طرح مگر
وہ چاہے تو بغیر ماں کے پیدا کرے۔ چنانچہ اماں حوّا کے متعلق یہی مشہور ہے
کہ اُسے حضرت آدم علیہ السلام کے جسم سے پیدا کیا گیا حضرت مسیح علیہ السلام
کو بغیر باپ کے پیدا کیا، اُن کی ماں موجود ہے۔ اور عام نوعِ انسانی کے
متعلق فرمایا ”فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنْثٰى“ نسل
انسانی میں سے مرد و زن کے جوڑے بنائے۔ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے
وہ ان چاروں صورتوں میں سے جس صورت میں چاہے کسی کو پیدا کرے
لہٰذا اس کے لیے مسیح علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا کرنا کون سا مشکل کام
ہے۔ وہ خَلَّاقُ الْعَلِيْمُ ہے۔ جو کوئی اس کی صفتِ خاصہ میں
اُس کا شریک بنائے گا، وہ کافر ہو جائے گا۔ یہی بات اللہ تعالیٰ نے
یہاں سمجھائی ہے۔

شاہ اسماعیل شہید

یہی مسئلہ شاہ اسماعیل شہیدؒ نے اپنی کتاب تقویۃ الایمان میں بھی بیان
فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں اگر خدا چاہے تو جبرائیل جیسے فرشتے اور محمد صلی اللہ
علیہ وسلم جیسے ہزاروں پیغمبر پیدا کر دے۔ یہی بات اللہ نے یہاں بیان فرمائی
ہے يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وہ خالق جو چیز چاہے پیدا کرے۔ مگر اہلِ بدعت
نے شاہ صاحب کی اس بات کو بہت اچھالا ہے۔ اُسے غلط معانی پر
محمول کیا کہ حضور علیہ السلام کی تو نظیر ہی ممکن نہیں مگر انہوں نے کہہ دیا کہ اللہ
ہزاروں پیدا کر سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس آیت اور شاہ صاحب
کے قول سے قادرِ مطلق کی عظمت کا بیان مقصود ہے کہ وہ ایسا کرنے پر
قادر ہے اگرچہ وہ حضور نبی کریم علیہ السلام جیسا کوئی دوسرا پیدا نہیں فرمائے گا
کیونکہ یہ خاص خصوصیت بھی اللہ ہی نے آپ کو عطا کی ہے۔ مگر وہ اس
پر قادر تو ہے، اُس کی قدرت کا انکار تو کفر کے مترادف ہے۔ اسی طرح

وہ ہزاروں لاکھوں جبرائیل پیدا کرنے پر بھی قادر ہے اگرچہ جبرائیل ایک ہی ہے
اُس کی مشیت اور ارادے میں کون دخل اندازی کر سکتا ہے۔ مگر یار لوگوں
نے شاہ اسماعیل شہیدؒ کی تحریکِ جہاد کی مخالفت میں اُن پر کفر کا فتویٰ بھی لگا
دیا کہ یہ بے ادب اور گستاخ ہیں۔ اُن کا اصل مقصد اِن چیزوں میں اُلجھا
کر لوگوں کے جذبہ جہاد کو کمزور کرنا تھا۔ باطل پرست طاقتیں ہمیشہ ایسے ہی
ہتھکنڈے استعمال کرتی ہیں تاکہ مسلمان آگے بڑھ کر اپنا اصل مقام نہ حاصل
کر سکیں۔ بہر حال مسئلہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ تخلیق کا تھا یَخۡلُقُ مَا یَشَآءُ
وہ جو چاہے پیدا کرے مگر اہلِ بدعت نے اُسے غلط معانی پہنا دیے۔

اس کے بعد فرمایا وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ اللہ تعالیٰ
ہر چیز پر قادر ہے۔ یہ بھی پہلی بات کا تتمہ ہی ہے۔ جب وہ ہر چیز پر
قادر ہے تو جو چاہے پیدا بھی کر سکتا ہے۔ اس میں کون سی اچنبھے کی
بات ہے۔ چنانچہ اللہ نے عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا فرمایا۔ اللہ
نے عیسائیوں کے عقیدہ حلول کی تردید فرمائی ہے کہ بغیر باپ کے پیدا ہونے کی
وجہ سے عیسیٰ علیہ السلام خود خدا نہیں بن گئے بلکہ وہ اللہ کے عاجز بندے
اور مخلوق ہیں۔ انہیں الٰہ بنانے کا عقیدہ کفریہ ہے، اِسی لیے اللہ نے
صاف فرما دیا لَقَدۡ کَفَرَ الَّذِیۡنَ.... الآیۃ اُن لوگوں نے صریحاً کفر
کیا جنہوں نے کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام بعینہٖ خدا ہیں۔ اب اگلی آیات میں دیگر
عقائدِ باطلہ کا ذکر بھی آئے گا۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۫ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۸﴾ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ ۫ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۹﴾ ع

ترجمہ: اور کہا یہودیوں نے اور نصرانیوں نے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں (اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے، پس وہ تمہیں کیوں سزا دیتا ہے تمہارے گناہوں پر۔ (ایسا نہیں ہے) بلکہ تم انسان ہو اُن میں سے جن کو اللہ نے پیدا کیا، وہ بخشتا ہے جس کو چاہے اور سزا دیتا ہے جس کو چاہے اور اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے، اور اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے ﴿۱۸﴾ اے اہل کتاب! تحقیق تمہارے پاس آیا ہے ہمارا رسول جو کھول کر بیان کرتا ہے تمہارے لیے رسولوں کے منقطع ہونے پر۔ تاکہ تم یہ نہ کہو کہ ہمارے پاس کوئی نہیں آیا خوشخبری

سنانے والا اور نہ کوئی ڈرانے والا۔ بیشک آیا ہے تمہارے پاس خوشخبری
سنانے والا اور ڈرانے والا اور اللہ تعالیٰ ہر ایک چیز پہ قدرت رکھنے
والا ہے (۱۹)

ہدایت

گذشتہ آیت میں اللہ نے عیسائیوں کے عقیدہ عینیت کا رد فرمایا تھا نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بعینہٖ خدا سمجھ کر حلولی اور اتحادی عقیدہ کے قائل ہیں مگر ذاتِ خداوندی اس چیز سے پاک ہے کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام یا کسی دیگر شخصیت میں حلول کرے، وہ کسی روپ میں ظاہر نہیں ہوتا، لہٰذا عقیدہ عینیت سخت کافرانہ عقیدہ ہے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے وہ چاہے تو عیسیٰ علیہ السلام، اُن کی والدہ اور روئے زمین پہ بسنے والی ساری مخلوق کو یکدم ہلاک کر دے، اس کو کون روک سکتا ہے بہر حال اللہ نے یہود و نصاریٰ دونوں گروہوں کی تردید فرمائی کہ دونوں گمراہی اور شرک میں مبتلا ہیں۔

اس سے پہلے یہودیوں کے متعلق بیان ہو چکا ہے کہ انہوں نے عہد کو توڑا جس کی پاداش میں وہ ملعون ٹھہرے، سنگدل بن گئے اور پھر انہوں نے کتابِ الٰہی میں تحریف کی جس میں انہوں نے لوگوں کے لیے گمراہی کا سامان پیدا کر دیا۔ نصاریٰ کا حال بھی یہودیوں سے مختلف نہیں ہے، وہ بھی نصیحت کو فراموش کر کے سزا کے مستحق ہوئے نصاریٰ کو اس دُنیا میں یہ سزا دی گئی کہ اُن کے اپنے درمیان عداوت اور دشمنی پیدا کر دی گئی۔ پوری عیسائیت کی تاریخ میں ان کے فرقے، پارٹیاں اور حکومتیں ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رہی ہیں۔ اور آج بھی ان کا یہی حال ہے۔ یہ نہ اعتقادی لحاظ سے آپس میں متفق ہیں اور نہ سیاسی طور پر۔ ایک دوسرے کے خلاف ریشہ دوانیاں کرتے رہتے ہیں، تاہم اہلِ اسلام کو نقصان پہنچانے کے لیے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ برطانیہ اور امریکہ آج بھی ایک دوسرے سے متنفر ہیں۔ ہم عقیدہ ہونے کے باوجود برطانیہ کا زارِ روس کے ساتھ بڑے عرصے تک اختلاف رہا۔ اٹلی، فرانس اور جرمنی سے بھی جنگیں ہوتی رہیں۔ یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کے ارشاد "فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ" کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ یہ تو اس دُنیا کی سزا ہے

اس کے بعد آخرت کا عذاب تو اپنے وقت پر آنے والا ہے۔

محبوبانِ خدا ہونے کا دعوے

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی روایت میں آتا ہے۔ کہ کسی موقع پر کچھ یہودی عالم حضور علیہ السلام کے پاس آئے۔ آپ نے اُن کو اسلام کی دعوت دی اور کہا کہ اللہ سے ڈرو اور گمراہی کا راستہ چھوڑ دو، اس کے بجائے ایمان کا صراطِ مستقیم اختیار کرو۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صحابہؓ نے بھی یہودیوں سے کہا کہ تم جانتے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، آپ کا تذکرہ، آپ کی صفات و علامات تمہاری کتابوں میں موجود ہیں مگر تم آپ پر ایمان کیوں نہیں لاتے۔ یہودی کہنے لگے آپ ہمیں اپنے دین سے بدظن کرتے ہیں اور کسی ممکنہ عذاب سے ڈراتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے جواب کو اس آیت میں دہرایا ہے وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصٰرٰى یہودیوں اور نصرانیوں نے کہا نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ہم تو اللہ کے بیٹے اور اُس کے محبوب ہیں۔ اُن کا مقصد یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ ہمارا حقیقی باپ تو نہیں ہے مگر وہ ہم پر باپ کی طرح شفیق ہے، لہٰذا تم ہمیں کس چیز سے ڈراتے ہو ہم محبوبانِ خدا ہیں، وہ ہمیں کوئی سزا نہیں دے گا۔ یہودیوں کے اس باطل عقیدہ کا تذکرہ سورۃ بقرہ میں بھی ہو چکا ہے۔ وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً کہنے لگے ہم انبیاء کی اولاد میں سے ہیں۔ ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف نسبت رکھتے ہیں، وہ ہمیں دوزخ میں نہیں جانے دیں گے اور اگر بالفرض سزا ملی بھی تو معدودے چند دن کے لیے جتنے دنوں اُن کے آباؤ اجداد نے بچھڑے کی پوجا کی تھی۔ اور وہ صرف چالیس دن تھے۔ وگرنہ ہم تو محبوبانِ خدا ہیں، وہ ہمارے ساتھ بیٹوں جیسا مہربان ہے، وہ ہمیں دوزخ میں کیسے داخل کرے گا۔ اُن کی کتابوں میں یہ بھی موجود ہے۔ کہ قیامت کے دن حضرت ابراہیم علیہ السلام دوزخ کے دروازے پر موجود ہوں گے اور کسی ختنہ شدہ اسرائیلی کو اس

میں نہیں جانے دیں گے۔

عیسائی بھی اس معاملہ میں پیچھے نہیں ہیں۔ سورۃ بقرہ میں موجود ہے کہ انہوں نے بھی ایسا ہی دعویٰ کیا وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى "یعنی جنت کے ٹھیکیدار ہم ہیں۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے علاوہ کوئی شخص جنت میں نہیں جا سکتا۔ جنت میں وہی جائیگا جو ہمارے اعتقاد پر ہوگا۔ بہرحال — جب مسلمانوں نے اہل کتاب کو آخرت کے عذاب سے ڈرانا چاہا تو کہنے لگے ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں، ہمیں کسی دوزخ کا خوف نہیں ہے۔ ہماری نجات قطعی ہے۔ ہمیں کوئی عمل کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ کفارے کا عقیدہ رکھنے والوں نے تو صاف کر دیا کہ مسیح علیہ السلام سولی پر چڑھ کر ہمارا کفارہ بن چکے ہیں، لہٰذا ہمیں اب کسی نیک عمل کی ضرورت نہیں۔ ہم ہر صورت میں نجات یافتہ ہیں۔

محبوبیت کی بنیاد

حقیقت یہ ہے کہ انبیاء کے شرائع میں یہ بات موجود ہے کہ انسان کو اللہ کی محبوبیت صحیح اعتقاد اور اچھے اعمال کی بنیاد پر حاصل ہوتی ہے۔ يُحِبُّوْنَهٗ وَيُحِبُّهُمْ "اللہ کے بندے اللہ سے محبت کرتے ہیں اور اللہ ان سے محبت کرتا ہے۔ اللہ ایمان والوں کو محبوب رکھتا ہے جو نیک اعمال انجام دیتے ہیں، باطل اعتقاد، صرف صاحبزادگی یا محض کسی بزرگ کے ساتھ نسبت کچھ مفید نہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کے صلبی بیٹے کے متعلق اللہ نے فیصلہ دے دیا تھا اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ یہ تیرا بیٹا نہیں ہے۔ اللہ نے حقیقی بیٹے کی نفی کر دی کیونکہ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ "اس کا عمل اچھا نہیں ہے۔ غرضیکہ محبوبیت کا مدار ایمان، تقوے اور اعمال صالحہ پر ہے مگر اہل کتاب کہتے ہیں کہ ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ سورۃ بقرہ میں بھی اللہ تعالیٰ کا ارشاد موجود ہے کہ جو نیک

کریگا۔ تقویٰ اختیار کریگا۔ اور اعمال صالحہ انجام دے گا، وہ بہشت میں جائیگا
اور جو اعتقادی یا عملی برائی کا ارتکاب کریگا، وہ یقیناً جہنمی ہوگا، وہ خدا کا پیارا
کیسے ہوسکتا ہے۔

شرک کی ابتداد

دنیا میں جس قدر شرک پایا جاتا ہے وہ کسی قوم میں یکدم وارد نہیں ہوا۔
بلکہ بتدریج آیا ہے۔ انجیل میں لفظ باپ کا اطلاق خدا تعالیٰ کے لیے کیا گیا ہے
چنانچہ مسیح علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ "میں تمہارے اور اپنے باپ (خدا) کے
پاس جاتا ہوں، وہ تمہارے پاس ایک اور مددگار کو بھیجے گا جو تمہارے
ساتھ رہے گا، میں جاؤں گا تو وہ آئیگا"، امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ
فرماتے ہیں کہ ابتدا میں باپ سے یہی مراد لیا جاتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں
پر شفقت کے اعتبار سے اُن کے بمنزلہ باپ کے ہے۔ مگر بعد میں
اہل کتاب نے اُسے حقیقی باپ اور بیٹے پر محمول کر لیا۔ مشرکین میں بھی
شرک آہستہ آہستہ آیا۔ ابتدا میں اُن کا اعتقاد یہ تھا کہ بُت اللہ کے ہاں اُن
کے سفارشی ہیں اور اللہ تعالیٰ اُن کی بات رد نہیں کرتا، مگر بعد میں آنے
والی نسلوں میں یہ اعتقاد جڑ پکڑ گیا کہ یہ بُت خود خدا ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے
دونوں اعتقادات کا رد فرمایا۔ کہیں فرمایا کہ دیکھو! انہوں نے خود اپنے
ہاتھ سے مورتیاں بنائیں اور انہیں خدا کا درجہ دیا اور پھر خود ہی اُن کی پوجا
شروع کر دی۔ سفارشی عقیدے کے متعلق فرمایا کہ جن کو تم خدا کے ساتھ
شریک کرتے ہو یا جبری سفارشی بناتے ہو اُن کو کوئی اختیار حاصل نہیں۔ اور
نہ کوئی ایسی سفارش کر سکتا ہے۔ "مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ"
کون ہے جو اللہ کی اجازت کے بغیر اُس کے سامنے سفارش پیش کرے
سفارش تو ساری اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ انہوں نے کیسا عقیدہ بنا لیا کہ یہ معبود
اللہ کے ہاں اُن کی لازماً سفارش کر کے چھڑا لیں گے۔ بہر حال ابتدا میں عیسائیوں
کے عقیدہ ابنیت کا مطلب یہ تھا کہ وہ خدا کے محبوب ہیں مگر بعد میں اُسے

حقیقی بیٹے پر محمول کرنے لگے۔ چونکہ مسیح علیہ السلام کا باپ کوئی نہیں لہذا خدا ہی اس کا باپ ہے (العیاذ باللہ) اور اس طرح انہوں نے یہ باطل عقیدہ وضع کیا۔

اہل کتاب کی تعذیب

اہل کتاب کے دعویٰ محبوبیت کے خلاف اللہ تعالیٰ نے ایک دلیل پیش کی ہے۔ ارشاد ہے قُلْ اے پیغمبر! آپ ان سے کہہ دیں کہ اگر تم واقعی اللہ کے پیارے ہو فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوبِكُمْ تو اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارے گناہوں کی سزا کیوں دیتا ہے۔ ان کی پوری تاریخ ان پر نازل ہونے والی آفات سے بھری پڑی ہے۔ کبھی ان پر بخت نصر کو مسلط کیا، کبھی غلام بنایا گیا۔ اور کبھی صحراؤں میں دوڑایا گیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا خدا اپنے پیاروں کو ایسی ہی سزائیں دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا دعویٰ ہی باطل ہے۔ یہ جھوٹے ہیں، ان میں کوئی خصوصیت نہیں اللہ نے فرمایا بَلْ أَنْتُمْ بَشَرٌ مِمَّنْ خَلَقَ بلکہ تم اس کی مخلوق میں سے ایک بشر ہو، انسان ہو۔ بشرہ کھال کو کہتے ہیں۔ انسان کی کھال دوسرے جانداروں کی نسبت واضح ہوتی ہے۔ جب کہ دیگر چرند، پرند وغیرہ کے جسموں پر بال یا پر ہوتے ہیں اور ان کی کھال نظر نہیں آتی۔ نوع انسانی کی اسی خصوصیت کی وجہ سے اسے بشر کہا جاتا ہے۔ بہرحال فرمایا کہ اللہ کے نزدیک تمہیں دیگر انسانوں کی نسبت کوئی خصوصیت حاصل نہیں اور اس کا قانون یہ ہے کہ يَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ جسے چاہے معاف کر دے۔ دنیا میں یہ معافی رعایتاً بھی ہو سکتی ہے کہ اللہ مہلت دے دے، مگر حقیقی معافی اسی کے لیے ہے جو ایمان لائے اور نیک اعمال انجام دے۔ برخلاف اس کے وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ وہ جس کو چاہتا ہے، سزا بھی دیتا ہے۔ اس کے راستے میں کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی اور اس کی سزا کا قانون یہ ہے کہ وہ کسی گستاخی، بے ادبی، بدعقیدگی یا

بداعمالی کی وجہ سے آیا کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر اُس شخص کو سزا میں مبتلا کرے گا جو ظالم، مشرک، منافق یا فاسد ہوگا۔ جو کوئی انبیا اور اُن کی شرائع کا انکار کریگا۔ وہ اللہ کے عذاب سے بچ نہیں سکے گا۔

فرمایا یاد رکھو! وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا آسمان و زمین اور اُن کے درمیان ہر چیز پہ اختیار و قدرت اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے۔ وہ کمال حکمت کا مالک ہے۔ جس کو چاہے معاف کر دے یا عدل و انصاف کے ساتھ سزا دیدے، اُسکی مشیت اور ارادے میں کوئی مزاحم نہیں ہو سکتا اور جب وہ گرفت کرے تو پھر چھڑا بھی کوئی نہیں سکتا۔ "وَهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ" وہ دوسروں کو پناہ دیتا ہے مگر اس کے مقابلے میں کوئی دوسری ہستی پناہ نہیں دے سکتی، ارض و سما کی ساری بادشاہی اُسی کے پاس ہے وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ اور ہر ایک آدمی کو اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ دوسری زندگی بھی اُسی کے قبضۂ قدرت میں ہے وَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰى اگر پہلی زندگی کا مالک وہ ہے تو دوسری زندگی بھی اسی کی ملکیت ہے۔ لہذا محبت کے جھوٹے دعویدار اور باپ بیٹے کا رشتہ جتلانے والوں کو اگر اس دنیا میں تھوڑی مہلت بھی مل گئی تو آخرت میں ضرور پکڑے جائیں گے۔

رسولوں کے درمیان وقفہ

آخری نبی اور رسول کی آمد کا تذکرہ گذشتہ آیات میں بھی ہو چکا ہے، اب پھر بطور نصیحت فرمایا يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ اے اہل کتاب! قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا تحقیق آگیا ہے تمہارے پاس ہمارا رسول اور وہ کرتا کیا ہے۔ يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ جو کھول کر بیان کرتا ہے تمہارے لیے رسولوں کے وقفے پر۔ یعنی یہ رسول آخرالزمان ایسے وقت میں آیا ہے کہ اس سے پہلے عرصے تک کوئی رسول مبعوث نہیں ہوا۔ حضرت سلمان فارسیؓ کی روایت میں آتا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا اَنَا اَوْلٰی بِعِیْسَیٰ ابْنِ مَرْیَمَ میں عیسٰی علیہ السلام کے ساتھ زیادہ
اولیٰ یعنی قریب ہوں لَیْسَ بَیْنِیْ وَبَیْنَہٗ نَبِیٌّ اُن کے اور میرے
درمیان کوئی نبی نہیں آیا۔ گویا بنی اسرائیل کے آخری نبی حضرت عیسٰی علیہ السلام ہی تھے
حضور علیہ السلام کی ولادت باسعادت ۵۷۰ء میں ہوئی اور آپ کو نبوت
۶۱۰ء میں عطا کی گئی۔ اس طرح آپ کے اور عیسٰی علیہ السلام کے درمیان
پورے چھ سو سال کا وقفہ ہے۔ البتہ عربوں میں رسول کی بعثت کو ہزار سال
سے بھی زیادہ عرصہ گزر چکا تھا کیونکہ اس سرزمین کے گذشتہ نبی حضرت
اسماعیل علیہ السلام ہی تھے۔ اس دوران دوسری اقوام میں تو انبیاء مبعوث
ہوتے رہے مگر عرب ایک طویل عرصہ تک محروم رہے لہٰذا اتنی لمبی مدت
یہ رسول کے چرچے سے ناواقف رہے۔ اسی لیے عربوں میں لقب اُمّی مشہور
ہو گیا۔ فترۃ الرسل کا تذکرہ حضرت حسان بن ثابتؓ کے شعر سے بھی ملتا ہے

نبیٌ جاءنا من بعد فترۃ   وفی الارض اوثان تعبد

عرب میں شرک کی ابتداء

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد پندرہ یا سولہ سو سال تک عرب لوگ
آپ ہی کے دین پر رہے۔ حضور علیہ السلام کی بعثت سے تقریباً چار سو سال
قبل اس خطے میں شرک کی ابتداء ہوئی۔ ایک شخص عمرو ابن قنیتہ یا عمرو ابن لحیّ
عرب سے باہر کسی دوسرے علاقہ میں گیا اور وہاں سے کچھ مورتیاں لے آیا
پھر اُس نے یہاں بھی مورتیاں بنانی شروع کیں اور اس طرح عرب میں شرک
کا آغاز ہوا۔ قصی ابن کلاب کے زمانے تک لوگ بالکل دینِ اسماعیلی پر تھے
اس کے بعد شرک کی لعنت پیدا ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضور علیہ السلام
کی بعثت تک عرب بھی دوسرے علاقوں کی طرح شرک میں ڈوب چکا تھا
اُس زمانے تک ہزاروں میں کوئی ایک آدھ آدمی توحید کا تصور رکھتا تھا۔
ورنہ غالب اکثریت شرک میں ملوث ہو چکی تھی۔ اہل کتاب میں سے بھی اکے
دکے لوگ توحید پہ قائم تھے تاہم مجموعی طور پہ پوری دنیا شرک کی اتھاہ گہرائیوں

میں غرق ہو چکی تھی۔

مسیح علیہ السلام کے فرائض

قرآن حکیم کے مطابق اللہ تعالیٰ نے مسیح علیہ السلام کو دو فرائض سونپے
تھے۔ پہلی ڈیوٹی یہ تھی کہ آپ بنی اسرائیل کو صراطِ مستقیم کی تبلیغ کریں کیونکہ آپ
کو مبعوث ہی اس قوم کی طرف کیا گیا تھا جیسے فرمایا وَرَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ
(آل عمران) آپ کا حلقہ تبلیغ صرف بنی اسرائیل تھے نہ کہ پوری دنیا۔ آپ کا
دوسرا فرضِ منصبی یہ تھا وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْ بَعْدِی اسْمُهٗۤ
اَحْمَدُ (صف) یعنی آپ اس بات ____ کی خوشخبری سنا دیں۔ کہ
میرے بعد ایک عظیم الشان رسول آنے والا ہے جس کا نام احمد ہوگا۔ اس
کو سریانی زبان میں فارقلیط کہتے ہیں جس کا معنی ستودہ جہان ہے۔ تاہم جیسا
کہ گذشتہ دروس میں بیان ہو چکا ہے۔ عیسائیوں نے اس لفظ کو انجیل سے
حذف کر دیا کیونکہ یہ حضور علیہ السلام پر صادق آتا تھا۔ گذشتہ ڈیڑھ صدی تک
یہ لفظ انجیل میں موجود تھا مگر موجودہ انجیلوں سے حذف کیا جا چکا ہے۔ انجیل
میں تحریف کے متعلق خود ان کے بڑے بڑے پادریوں نے تسلیم کیا ہے۔
کہ موجودہ اناجیل میں تین ہزار سے زیادہ اغلاط موجود ہیں۔ اب اصل انجیل
کو تلاش کرنا ممکن نہیں رہا، جملہ اناجیل کی ایک سو بیس تک کی تعداد کا پتہ
چلتا ہے مگر اس وقت چار انجیلیں، متی، لوقا، یوحنا اور مرقس تو بائبل کے
ساتھ ملی ہوئی ہیں اور پانچویں انجیل برناباس بھی موجود ہے۔

اتمام حجت

بہر حال فرمایا کہ رسولوں کے اس طویل عرصہ کے بعد تمہارے پاس ہمارا
رسول آگیا ہے، جو تمہیں تمام احکام کھول کھول کر بیان کرتا ہے۔ پہلے بھی
گزر چکا ہے کہ مصلحت کے مطابق بعض احکام کو تفصیل کے ساتھ بیان
کر دیتا ہے اور جسے بنی اسرائیل چھپاتے تھے انہیں ظاہر کرتا ہے اور
بعض کم اہمیت کے معاملات سے درگزر کرتا ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ
کا مقصود یہ ہے کہ وہ تم پر اپنی حجت پوری کر دے اَنْ تَقُوْلُوْا مَاجَآءَنَا

مِنْ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ تاکہ تم کل کو یہ نہ کہہ سکو کہ ہمارے پاس کوئی خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا۔ فرمایا فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّ نَذِيْرٌ پس تمہارے پاس آگیا ہے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا۔ اللہ کا یہ آخری رسول خدا کی رحمت کی خوشخبری سناتا ہے اور تمہیں تمہارے بُرے انجام سے ڈراتا ہے۔ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ (النساء) تاکہ لوگوں کے لیے اللہ پر کوئی حجت باقی نہ رہے۔ اور وہ قیامت کو کوئی عذر پیش نہ کرسکیں

امام بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے تمام سامان مہیا کر دیے ہیں۔ اُس نے انسانوں کو حواس خمسہ عطا کیے عقل و شعور دیا تاکہ دیکھ کر سمجھ کر اچھے بُرے میں تمیز کرسکیں۔ پھر اُس نے رسول مبعوث کیے ان کے نائب آتے رہے اپنی کتابیں بھیجیں، قدرت کی تمام نشانیاں پھیلا دیں، غرضیکہ ظاہری اور باطنی ہدایت کے تمام سامان مہیا کر دیے تاکہ کسی کو کلام کی گنجائش نہ رہے اس کے باوجود اگر کوئی ہدایت کا راستہ اختیار نہیں کرتا، تو پھر وہ گمراہی کا خود ذمہ دار ہے۔ جب سورج طلوع ہو کر اپنی روشنی چار دانگ عالم میں پھیلا چکا ہو، اور اس کے بعد اگر کوئی شخص آنکھیں بند کر کے کہے کہ مجھے کچھ نظر نہیں آتا، تو اس کا کوئی علاج نہیں اس کا واحد انجام جہنم رسیدگی ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے کوئی عذر باقی نہیں رہنے دیا۔ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ وہ ہر چیز پر قادر ہے اس اتمام حجت کے بعد جب چاہے گا مجرموں کو پکڑ لے گا اور پھر اُن کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔

وَاِذۡ قَالَ مُوۡسٰی لِقَوۡمِهٖ يٰقَوۡمِ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ اِذۡ جَعَلَ فِيۡكُمۡ اَنۡۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمۡ مُّلُوۡكًا ‌ۖ وَّاٰتٰٮكُمۡ مَّا لَمۡ يُؤۡتِ اَحَدًا مِّنَ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۲۰﴾ يٰقَوۡمِ ادۡخُلُوا الۡاَرۡضَ الۡمُقَدَّسَةَ الَّتِىۡ كَتَبَ اللّٰهُ لَـكُمۡ وَلَا تَرۡتَدُّوۡا عَلٰۤى اَدۡبَارِكُمۡ فَتَـنۡقَلِبُوۡا خٰسِرِيۡنَ ﴿۲۱﴾ قَالُوۡا يٰمُوۡسٰٓى اِنَّ فِيۡهَا قَوۡمًا جَبَّارِيۡنَ ‌ۖ وَاِنَّا لَنۡ نَّدۡخُلَهَا حَتّٰى يَخۡرُجُوۡا مِنۡهَا‌ ۚ فَاِنۡ يَّخۡرُجُوۡا مِنۡهَا فَاِنَّا دٰخِلُوۡنَ ﴿۲۲﴾ قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيۡنَ يَخَافُوۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمَا ادۡخُلُوۡا عَلَيۡهِمُ الۡبَابَ‌ ۚ فَاِذَا دَخَلۡتُمُوۡهُ فَاِنَّكُمۡ غٰلِبُوۡنَ ‌ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوۡۤا اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۲۳﴾

ترجمہ : (اور وہ واقعہ قابلِ ذکر ہے) جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا ، اے میری قوم ! یاد کرو اللہ کے احسان کو جو اُس نے تم پر کیا ہے جب کہ اُس نے تمہارے اندر نبی بنائے اور تم کو بادشاہ بنایا اور تم کو وہ چیز دی جو اُس نے نہیں دی کسی کو جہان والوں میں سے (۲۰) اے میری قوم کے لوگو ! داخل ہو جاؤ پاک سرزمین میں جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے ، اور نہ لوٹو اپنی پشتوں پر پس ہو جاؤ گے تم نقصان اٹھانے والے (۲۱) اُن لوگوں نے کہا اے موسیٰ !

بیشک اس سرزمین میں ایک جبار اور زبردست قوم ہے اور بیشک ہم
ہرگز داخل نہیں ہوں گے اُس میں جب تک کہ وہ وہاں سے نکل
نہ جائیں، پس اگر وہ وہاں سے نکل جائیں گے تو ہم داخل ہونگے ﴿۲۲﴾
کہا دو شخصوں نے اُن لوگوں میں سے جو خوف کھاتے
تھے اللہ نے ان پر انعام فرمایا تھا داخل ہو جاؤ اُن پر دروازے سے۔ پس
جب تم داخل ہو گے، تو بیشک تم غالب آنے والے ہو گے اور چاہیے
کہ تم اللہ پر بھروسہ کرو۔ اگر تم ایمان والے ہو ﴿۲۳﴾

ربط آیات

پہلے اہلِ کتاب کے دونوں گروہوں یہود و نصاریٰ کا رد فرمایا اور نصیحت کے طور پر یہ بات کہ دی کہ تمہارے پاس اللہ کا رسول اور اُس کی کتاب آگئی ہے، اگر تم خرابی سے نکلنا چاہتے ہو تو اس کا اتباع کرو۔ اس سے پہلے یہ بھی واضح فرمایا تھا کہ اُن کی عہد شکنی کی وجہ سے ہم نے اُن پر لعنت بھیجی اور اُن کے دل سخت ہو گئے پھر انہوں نے اللہ کی کتاب میں تحریف کا ارتکاب کیا۔ نصاریٰ کے متعلق فرمایا کہ اُن کی طرف سے ترکِ نصیحت کے جرم میں ہم نے اُن کے درمیان عداوت اور دشمنی کا بیج بو دیا اور وہ آپس میں دست و گریباں ہے۔ اہلِ کتاب کی انہی خصلتوں کے پیشِ نظر اس سورۃ کی ابتداء میں اہلِ ایمان سے خطاب کر کے فرمایا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ یعنی عہد و پیمان کی پابندی کرو۔ اہلِ کتاب کی طرح عہد شکنی نہ کرنا۔ اللہ تعالیٰ یا اس کی مخلوق کے ساتھ جو بھی عہد کرو اُس کو پورا کرو اس کے علاوہ شعائر کی تعظیم اور اللہ کے قانونِ حلت و حرمت کی پابندی کا حکم دیا۔

اس کے بعد اہلِ ایمان کو سچی گواہی کی تلقین فرمائی کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ بلا رو رعایت انصاف کی گواہی دینے کے لیے کمربستہ ہو جاؤ اور کسی قوم کی دوستی یا دشمنی تمہیں حق کے راستے سے گمراہ نہ کرے۔ فرمایا تقوے کا تقاضا یہی ہے۔ پھر اللہ نے اپنے احسانات کا تذکرہ فرمایا کہ دیکھو ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا اور اُن کی نگرانی کے لیے اُن کے بارہ قبائل میں بارہ سردار مقرر کر دیئے اور اللہ نے اُن سے وعدہ فرمایا تھا

کہ اگر تم اپنے عہد پر قائم رہے تو میری مدد تمہارے شاملِ حال رہی جس کے نتیجے میں تم جنت کے حقدار بن جاؤ گے۔ مگر بنی اسرائیل نقضِ عہد کے مرتکب ہوئے جس کے نتیجے میں ملعون ٹھہرے۔ پھر اللہ نے اہلِ کتاب کے باطل عقائد کا تذکرہ بھی کیا کہ یہود نقضِ عہد کی وجہ سے مغضوب علیہ ٹھہرے اور عیسائی تثلیث اور ابنیت کے عقیدے میں ملوث ہو کر راہِ راست سے بھٹک گئے۔

اب آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو وہ واقعہ یاد دلایا ہے جب اس نے ان پر مہربانی فرما کر انہیں غلامی سے آزادی دلائی اور ان سے ارضِ مقدس میں آبادکاری کا وعدہ فرمایا۔ اس ضمن میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے غلط کردار اور ان کی ناکامی کا تذکرہ فرمایا ہے۔ اشارتاً اہلِ ایمان کو بھی خبردار کر دیا گیا ہے کہ اگر تم بھی یہودیوں جیسا کردار ادا کرو گے تو تم بھی ان کی طرح ناکامی کا منہ دیکھو گے۔

ارضِ مقدس کا وعدہ

ان آیات میں مذکور وعدہ کی ابتدا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوتی ہے اللہ نے ان سے وعدہ فرمایا تھا کہ شام و فلسطین کی سرزمین تیری اولاد کو دی جائیگی۔ آپ کا وطنِ مولود دی تو بابل تھا جو بغداد سے ستر یا اسی میل دور آباد تھا۔ اُس زمانے میں یہ وسیع آبادی کا متمدن شہر تھا، وہاں پر عظیم حکومت قائم تھی۔ جب ابراہیم علیہ السلام نے وہاں سے ہجرت کی تو عرصہ دراز تک ان کے ہاں اولاد نہ ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بشارت دے رکھی تھی کہ تیری اولاد کو بہت پھیلاؤں گا، بلکہ تورات کی روایت کے مطابق جب ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھینکا گیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی دی کہ اے ابراہیم! یہ لوگ تجھے نیست و نابود کرنے پر تلے بیٹھے ہیں میری مشیت یہ ہے کہ تیری اولاد کو ریت کے ذروں کی طرح پھیلا دوں گا۔

شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ تاریخ کا طویل عرصہ گزر گیا

حتیٰ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ آگیا۔ اُس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدے کی تکمیل یوں کی کہ بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے آزادی حاصل ہوئی دشمن ہلاک ہوا، اور بنی اسرائیل بحر قلزم کو عبور کرکے صحرائے سینا میں پہنچ گئے۔ اس وقت پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم آیا کہ اے بنی اسرائیل! تم قابض قوم سے جہاد کرو تاکہ شام و فلسطین کی وہ سرزمین تمہارے قبضہ میں دے دی جائے، جو تمہارے حصے میں لکھی جاچکی ہے۔

ارضِ مقدس کی واگذاری

گذشتہ دروس میں یہ تذکرہ آچکا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے بارہ قبائل میں بارہ نقیب مقرر فرمائے تاکہ وہ اپنے اپنے قبیلے کی نگرانی کر سکیں۔ جب انہیں جہاد کا حکم ہوا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں بارہ نقیبوں کو مقبوضہ مقدس سرزمین کے حالات معلوم کرنے پر مامور کیا تاکہ وہاں کے حالات اور قابض قوم عمالقہ کی قوت کے مطابق جہاد کی تیاری کی جاسکے۔ آپ نے انہیں یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ تم اُس قوم کی ظاہری طاقت اور شان و شوکت کو بنی اسرائیل کے سامنے ظاہر نہ کرنا ورنہ وہ بددل ہوکر جہاد سے گریز کریں گے، حالانکہ اللہ نے اُس زمین کی واگذاری کا وعدہ فرمایا ہے اور وہ ضرور ہمیں فتح نصیب کریگا۔ جب یہ لوگ وہاں پہنچے تو قوم عمالقہ کی وجاہت دیکھ کر سخت مرعوب ہوئے۔ اُن میں سے دس آدمیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نصیحت پر عمل نہ کیا اور واپس آکر اپنی قوم کو اُس قوم کی قوت کے ایسے افسانے سنائے کہ بنی اسرائیل ہمت ہار بیٹھے اور انہوں نے جہاد سے انکار کر دیا۔ اگرچہ باقی دو نقیبوں کالب اور یوشع علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہدایت کے مطابق ارضِ پاک کی خوبیاں بیان کر کے قوم کو جہاد پر آمادہ کرنا چاہا، مگر قوم سخت بددل ہوچکی تھی۔ لہٰذا موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو اس واقعہ سے سخت کوفت ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے بطور سزا بنی اسرائیل کو فرمادیا کہ اس حکم عدولی کی وجہ سے تم

چالیس سال تک صحراؤں میں سرگرداں پھرتے رہو گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔
پھر خروجِ مصر سے ستر اسی سال بعد جب نئی نسل تیار ہوئی تو انہوں نے دشمن
کا مقابلہ کر کے شام و فلسطین کا علاقہ فتح کیا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کا وعدہ
پورا ہو گیا۔ اگر یہ لوگ ابتدا ہی میں جہاد کے لیے تیار ہو جاتے تو اللہ تعالیٰ
ان کی مدد فرماتا اور وہ اُسی وقت مقدس سرزمین پر قابض ہو جاتے مگر
اپنی بزدلی کی وجہ سے انہیں چالیس سال تک صحرا نوردی اختیار کرنا پڑی۔

بنی اسرائیل پر احسانات

ارشاد ہوتا ہے وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ اس واقعہ کو یاد کرو جب
موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا یٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ
اے میری قوم! اللہ کے ان احسانات کو یاد کرو، جو اس نے تم پر کیے۔
مؤرخین فرماتے ہیں کہ اس آیت میں جن احسانات کی طرف اشارہ ہے
وہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے ۱۴۴
سال قبل کیے تھے۔ پھر جب مسیح علیہ السلام کا زمانہ آیا تو انہوں نے اپنی قوم
کو اللہ کے وہ احسانات یاد دلائے۔ پھر مسیح علیہ السلام کے بعد چھ سو سال
کا مزید عرصہ گزر گیا۔ جب کہ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی
اور اللہ تعالیٰ نے ان آیات کے ذریعے گذشتہ واقعات کا تذکرہ فرمایا۔
مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل پر سب سے بڑا احسان یہ
تھا کہ اللہ نے انہیں توحید پرست بنایا۔ بحیثیت قوم بنی اسرائیل خدا کی وحدانیت
کا تصور رکھتے تھے۔ البتہ باقی احسانات کا تذکرہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ
نے یوں بیان فرمایا ہے اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ تمہاری قوم
میں اللہ تعالیٰ نے بکثرت نبی پیدا فرمائے تفسیری روایتوں میں آتا ہے کہ
مجموعی طور پر بنی اسرائیل میں چار ہزار نبی مبعوث ہوئے۔ جو کہ اللہ کا بہت
بڑا احسان ہے۔ نبی کی بعثت بڑی فخر کی بات ہے کہ اُسی کے ذریعے
انسان کا ایمان، عقیدہ اور عمل درست ہوتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی

وحدانیت سے روشناس ہوتا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ پہلا احسان تم پر یہ فرمایا کہ تم میں ہزاروں نبی مبعوث فرمائے۔

پھر فرمایا وَجَعَلَكُمْ مُّلُوكًا اور تم کو بادشاہ بنایا۔ بڑی بڑی سلطنتیں عطا فرمائیں۔ چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی عظیم سلطنتیں تاریخ کا اہم حصہ ہیں۔ حضرت طالوتؒ کی بادشاہت کا تذکرہ بھی سورۃ بقرہ میں آچکا ہے۔ اس کے علاوہ بھی بے شمار جلیل القدر بادشاہ پیدا کیے۔ یہ خدا کی مہربانی اور اس کا احسان تھا۔ عام طور پر بادشاہ تخت و تاج کے مالک کو کہا جاتا ہے، مگر حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں۔ کہ بنی اسرائیل ہر خوشحال اور آسودہ حال آدمی کو بادشاہ کہتے تھے۔ صحیح مسلم شریف میں بھی آتا ہے کہ کچھ لوگ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کے پاس گئے اور کہنے لگے اَلَسْنَا فُقَرَاءَ الْمُهَاجِرِيْنَ کیا ہم محتاج اور مہاجر نہیں ہیں۔ آپ نے فرمایا، کیا تمہاری بیوی موجود ہے؟ عرض کیا موجود ہے آپ نے پوچھا تمہارے پاس مکان بھی ہے، کہا مکان بھی ہے، آپ نے فرمایا پھر تم محتاج کیسے ہو اَنْتَ مِنَ الْاَغْنِيَاءِ تم تو غنی ہو۔ اُس شخص نے پھر عرض کیا حضرت میرے پاس تو خادم بھی ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا اَنْتَ مِنَ الْمُلُوْكِ پھر تو ملوک میں سے ہے یعنی خوشحال آدمی ہے کیونکہ تیرے پاس بیوی ہے، رہنے کے لیے مکان ہے اور خدمت کے لیے خادم بھی موجود ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو یاد دلایا کہ تم میں انبیاء پیدا کیے، تمہیں خوشحال بنایا تم میں عظیم سلطنتوں والے بادشاہ بنائے۔ ان میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی بادشاہی جن، انس اور طیور پر بھی تھی۔ آپ کو ہوا پر بھی تسلط حاصل تھا۔ آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ (ص) اے اللہ مجھے معاف کر دے اور

ایسی سلطنت عطا کر جو میرے بعد کسی کو حاصل نہ ہو، چنانچہ اس دعا کے نتیجے میں اللہ نے آپ کو بے مثال حکومت عطا فرمائی۔ اس کے علاوہ بنی اسرائیل میں بڑے بڑے فوجی جرنیل، حکیم، فلاسفر، دانش ور اور صاحب علم لوگ پیدا ہوئے۔ یہ سب بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کے احسانات تھے۔

آگے فرمایا وَاٰتٰىكُمْ مَّالَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ اور تمہیں وہ چیز عطا کی جو جہاں بھر میں کسی کو نہ دی گئی۔ یہ عظمت و تفوق بنی اسرائیل کو اپنے دور میں بحیثیت قوم حاصل ہوئی۔ اللہ نے ایسا اعزاز اور شرف عطا کیا کہ کوئی دوسری قوم بنی اسرائیل کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ پھر یہی عظمت اللہ تعالیٰ نے آل ابراہیمؑ میں سے قریش اور حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کی، اس کا ذکر احادیث اور قرآن میں بکثرت موجود ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا امت محمدیہ کو یہ برتری عرصہ دراز تک دنیا میں حاصل رہی۔ اللہ تعالیٰ نے تمام قوموں اور ملتوں میں اس امت کو سرفراز فرمایا مگر بالآخر ان میں بھی وہی قباحتیں پیدا ہو گئیں جو بنی اسرائیل میں پائی جاتی تھیں اور حضور علیہ السلام کی حذو النعل بالنعل والی پیشین گوئی پوری ہو گئی۔ آخری امت بھی بنی اسرائیل کے نقش قدم پر ہی چل پڑی۔ آج بنی اسرائیل والی تمام بری خصلتیں اور ذلتیں مسلمانوں میں موجود ہیں حتیٰ کہ مشرک اور دہریے بھی ان کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اس کے برخلاف دنیا کی ذلیل ترین یہودی قوم مادی لحاظ سے آج مسلمانوں سے کہیں آگے ہے۔

ارض مقدسہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کے احسانات یاد دلانے کے بعد فرمایا يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِىْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ اے میری قوم! تم ارض مقدسہ میں داخل ہو جاؤ جو

اللہ نے تمہارے لیے لکھدی ہے۔ سرزمین شام و فلسطین کو مقدس اس اعتبار سے کہا گیا ہے کہ یہ ایک نہایت ہی زرخیز خطہ ہے۔ جسے اللہ نے تمام ظاہری اور باطنی خوبیوں سے نوازا ہے بعض مفسرین اس خطہ میں اردن کو بھی شامل کرتے ہیں۔ اس کے بابرکت ہونے کی انبیا نے دعائیں کیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس سرزمین میں ہزاروں انبیاء مبعوث فرمائے یہ علاقہ حضرت ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کا وطن ہونے کے علاوہ سینکڑوں اور ہزاروں دیگر انبیاء کا مولد و مسکن رہا ہے۔ ظاہری طور پر بھی بڑا زرخیز خطہ ہے۔ پانی کے چشمے، باغات، سبزہ زار اور معتدل موسم ہے۔ اس سرزمین کو قبلہ اوّل ہونے کا بھی شرف حاصل ہے مگر یہی مقام اب ناپاک ہاتھوں میں چلا گیا ہے۔ دراصل مسلمان ہی اس سرزمین کے امین، اس کی حفاظت اور تقدس کے ذمہ دار تھے، مگر عربوں کی بداعمالیوں کی وجہ سے اب مسلمان ذلت کا شکار ہیں۔

مصر کے عظیم شاعر شوقی نے بھی اس سرزمین کی شان و شوکت کا تذکرہ اپنے کلام میں کیا ہے۔ ہمارے ہاں علامہ اقبال کی طرح یہ بھی عربوں کا قومی شاعر تھا۔ عربی ادب سے واقف لوگ کہتے ہیں کہ گذشتہ ایک ہزار سال میں اتنا عظیم شاعر پیدا نہیں ہوا۔ اس نے ۱۹۲۱ء میں وفات پائی، وہ دمشق کے متعلق کہتا ہے ؎

آمَنْتُ بِاللّٰهِ وَاسْتَثْنَیْتُ جَنَّتَهٗ
دِمَشْقُ رَوْحٌ وَّجَنَّاتٌ وَّرَیْحَانٌ

میں اللہ پر ایمان لایا ہوں مگر میں نے جنت کو مستثنیٰ کر دیا ہے مجھے جنت پر ایمان لانے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس سرزمین پر دمشق جنت کے نمونے کے طور پر موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں جنت کی تمام خوبیاں۔ پھل، پھول، پانی کے چشمے، باغات، نہریں وغیرہ پیدا کی ہیں

س شعر میں اگرچہ شاعرانہ مبالغہ ضرور ہے مگر اس سرزمین کی خوبیاں ایسی ہی

داخلے کا حکم

بہرحال حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے کہا کہ اس خطہ ارضی میں داخل ہو جاؤ، اسے اللہ نے تمہارے مقدر میں کر رکھا ہے۔ اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بھی وعدہ کیا تھا کہ اس سرزمین کو تیری اولاد کا مرکز بناؤں گا۔ لہٰذا تم اس میں داخلے کے لیے جہاد کا آغاز کرو وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ اور اپنی پشتوں پر نہ پھرنا یعنی بزدل ہو کر واپس نہ آجانا بلکہ آگے کی طرف بڑھنا۔ اور اگر تم پیچھے کی طرف مڑے فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ تم نقصان اٹھانے والوں میں ہو جاؤ گے۔ اللہ کے حکم کی تعمیل میں اقدام کرو تو ملک فتح ہو جائے گا۔ مگر بنی اسرائیل کہنے لگے قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ وہاں تو بڑی زبردست قوم عمالقہ رہتی ہے وہ بڑے قدآور اور طاقتور لوگ ہیں۔ ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ لہٰذا وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ہم ان کے علاقے میں ہرگز داخل نہیں ہوں گے جب تک وہ وہاں سے نکل نہ جائیں۔ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ جب وہ لوگ اس سرزمین سے نکل جائیں گے۔ تو پھر ہم داخل ہو جائیں گے۔ ہم ان کی موجودگی میں نہیں جا سکتے۔ کیونکہ وہ بڑے زبردست لوگ ہیں۔

فرمایا قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ ان میں سے دو آدمیوں نے کہا جو اللہ کا خوف رکھتے ہیں۔ یہ وہی حضرات کالب اور یوشع ہیں جنہیں موسیٰ علیہ السلام نے دیگر نقیبوں کے ہمراہ ارض مقدسہ کے حالات معلوم کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ باقی دس آدمی تو قوم عمالقہ سے خوف زدہ ہو گئے مگر ان دو حضرات نے موسیٰ علیہ السلام کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے انہیں جہاد کی ترغیب دی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد یہی حضرات آپ کے جانشین ہوئے، حضرت یوشع علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ

نے نبوت سے بھی سرفراز فرمایا۔ تو ان آدمیوں کے متعلق فرمایا کہ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْہِمَا اللہ تعالیٰ نے ان پر انعام فرمایا تھا۔ ایمان کا حصول اور نبی کا اتباع بہت بڑا انعام اور اللہ کا احسان ہے جو ان کو حاصل ہوا۔ تو ان دو حضرات نے قوم سے کہا اُدْخُلُوْا عَلَیْہِمُ الْبَابَ تم ایک مرتبہ قوم عمالقہ کے دروازے میں داخل ہو جاؤ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْہُ فَاِنَّکُمْ غٰلِبُوْنَ جب تم داخل ہو جاؤ گے تو تمہیں غلبہ بھی حاصل ہو جائے گا۔

توکل علی اللہ

ان آدمیوں کی ایمان پر پختگی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم کا نتیجہ تھی۔ جب اللہ کا نبی فرما رہا ہے۔ کہ یہ اللہ کی طرف سے حکم ہے کہ اس زمین میں داخل ہو جاؤ۔ یہ تمہیں دے دی گئی ہے تو اب اس کی طرف بڑھنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہیئے۔ جب اللہ نے فتح کا وعدہ کر لیا ہے تو ممکن ہے کہ بغیر جنگ کے ہی فتح حاصل ہو جائے تاہم ایسے عظیم کام کے لیے پوری تیاری کے ساتھ نکلنا بھی ضروری ہے انہوں نے یہ بھی کہا وَعَلَی اللّٰہِ فَتَوَکَّلُوْا تم اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھو، اپنی ظاہری کمزوری کو خاطر میں نہ لاؤ، اسلحہ کے فقدان سے مت گھبراؤ بلکہ اللہ کے حکم کی تعمیل میں حملہ آور ہو جاؤ، تمہیں اللہ کی تائید حاصل ہے لہذا فتح تمہاری ہوگی

گذشتہ رکوع میں بھی گذر چکا ہے۔ کہ اللہ نے بنی اسرائیل سے فرمایا تھا کہ اگر تم نماز قائم کرو گے، زکوٰۃ ادا کرو گے، میرے رسولوں پر ایمان لاؤ گے، ان کی تائید کرو گے تو "اِنِّیْ مَعَکُمْ" میں تمہارے ساتھ ہوں۔ یہاں بھی فرمایا کہ تم اللہ پر بھروسہ رکھو اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ اگر تم ایمان رکھتے ہو اور ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی ذات پر مکمل اعتماد کرتے ہوئے اس کے حکم کی تعمیل کر گزرو۔ وہ مسبب الاسباب ہے، تمہارے قلیل ساز و سامان میں بھی اثر پیدا کر دے گا، تاہم تمہاری طرف سے تعمیل حکم کا مظاہرہ تو ہونا چاہیے۔ بہرحال ان دو حضرات نے بنی اسرائیل کو سمجھانے کی کوشش کی مگر جیسا کہ اگلی

آیات میں آرہا ہے۔ قوم نے حکم کی تعمیل سے صاف انکار کر دیا جس کے نتیجے میں وہ عرصہ دراز تک وطن سے محروم رہے پھر کچھ زمانہ گزرنے کے بعد نئی نسل آئی۔ نیا خون پیدا ہوا، اچھے شعور کے لوگ آگے آئے اور انہوں نے جہاد کیا تو اللہ تعالیٰ نے ارض مقدسہ بنی اسرائیل کو عطا فرما دی۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿۲۴﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّىْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِىْ وَاَخِىْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۵﴾ قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِى الْاَرْضِ ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾

ع ۴

ترجمہ :- اُن لوگوں نے کہا ، اے موسیٰ ! بیشک ہم ہرگز داخل نہیں ہوں گے اس ملک میں کبھی بھی جب تک کہ وہ جبار لوگ اس میں ہوں گے ۔ پس جا تو اور تیرا پروردگار دونوں جاکر لڑو ۔ بیشک ہم تو یہاں بیٹھنے والے ہیں ﴿۲۴﴾ موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا ، اے میرے پروردگار ! میں نہیں اختیار رکھتا مگر اپنے نفس پر اور اپنے بھائی پر پس فیصلہ کر دے ہمارے درمیان اور فاسق قوم کے درمیان ﴿۲۵﴾ فرمایا اللہ تعالیٰ نے پس بیشک وہ سرزمین حرام قرار دی گئی ان پر چالیس برس تک ۔ یہ سرگرداں ہوں گے زمین میں پس نہ افسوس کر تو نافرمانی کرنیوالی قوم پر ﴿۲۶﴾

ربطِ آیات

گذشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے ۔ کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کے انعامات یاد دلائے کہ اس نے تمہارے اندر انبیاء مبعوث فرمائے عظیم سلطنت بادشاہ مقرر فرمائے اور تمہیں دنیا بھر میں فضیلت عطا کی ۔ اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام

نے قوم کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے وعدہ کر رکھا ہے کہ ارضِ مقدس میں تیری اولاد کو آباد کروں گا لہٰذا اس پر قبضہ کرنے کے لیے جہاد کرو مگر قوم نے کہا کہ وہاں بڑے جبار لوگ رہتے ہیں۔ جب تک وہ وہاں سے چلے نہ جائیں، ہم وہاں داخل نہیں ہوں گے۔ البتہ ان میں سے دو آدمی ایسے تھے جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان راسخ کیا تھا۔ اور اُن میں انبیاء کی اطاعت و فرمانبرداری کا جذبہ موجود تھا۔ انہوں نے بھی قوم سے کہا کہ تم اس ملک کے دروازے میں داخل ہو جاؤ۔ اللہ تعالیٰ تمہیں فتح عطا کریں گے اور اس طرح اللہ کا وعدہ پورا ہو جائیگا۔ یہ دو حضرات کالب اور یوشع تھے۔ مؤخر الذکر کو اللہ تعالیٰ نے بعد میں نبوت بھی عطا فرمائی۔

قوم کا انکار

موسیٰ علیہ السلام نے بارہ آدمیوں کو دشمن کے حالات معلوم کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ جن میں سے دو نے تو اللہ پر بھروسہ رکھتے ہوئے بنی اسرائیل کو جہاد کی ترغیب دی، البتہ باقی دس آدمیوں نے قوم عمالقہ کی شہ زوری کے قصے سنائے جس کی وجہ سے بنی اسرائیل میں بزدلی پیدا ہوئی اور انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا قَالُوا يٰمُوسٰىٓ اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا اے موسیٰ علیہ السلام! ہم اس سرزمین میں اس وقت تک داخل نہیں ہوں گے جب تک یہ جبار قوم وہاں موجود ہے۔ تورات کے باب گنتی میں اس طرح آتا ہے۔ کہ جب دو ایمان والوں نے قوم کو جہاد کی ترغیب دی اور کہا کہ خدا تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہوئے اُس سرزمین میں داخل ہو جاؤ تو وہ لوگ سخت غصے میں آ گئے اور رونا چلانا شروع کر دیا انہوں نے حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام سے سخت ناراضگی کا اظہار کیا اور کہنے لگے کہ اس سے تو بہتر تھا کہ ہم مصر میں ہی مر جاتے یا صحرا نوردی کے دوران ہی ہلاک ہو جاتے تاکہ اس وقت تلوار کی زد میں تو نہ آتے۔ انہوں نے کہا، کہ اگر ہم قوم عمالقہ کے مقابلے میں گئے تو مارے جائیں گے۔ ہماری عورتیں

بیوہ اور بچے یتیم ہوکر دشمن کے قبضے میں چلے جائیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے دو نصیحت کنندگان پر سنگ باری کرنے کی بھی کوشش کی کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہی لوگ انہیں ہلاکت میں ڈالنا چاہتے ہیں۔

مذکورہ دو آدمیوں کے علاوہ پوری قوم نے جہاد کرنے سے انکار کر دیا جس کی وجہ سے اللہ کے انبیاء حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو سخت کوفت ہوئی۔ وہ لوگ اپنے رسولوں کے ساتھ نہایت گستاخی سے پیش آنے اور کہنے لگے فَاذْهَبْ أَنتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اے موسیٰ علیہ السلام! تم اور تمہارا خدا جاکر لڑو۔ إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ ہم تو یہیں بیٹھیں گے۔ ہم تمہارے ساتھ لڑائی میں شریک نہیں ہو سکتے۔

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے اس جواب کو مجازی اور حقیقی دونوں معنوں پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ اگر اس جملے کو مجازی معنوں میں لیا جائے تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ اے موسیٰ علیہ السلام ہم میں تو لڑائی کرنے کی ہمت نہیں ہے، لہٰذا آپ جائیں۔ خدا تعالیٰ آپ کا مددگار ہوگا۔ فرماتے ہیں کہ یہ معانی تو کسی حد تک قابلِ برداشت ہیں۔ اس سے کفر لازم نہیں آتا۔ اور اگر ان الفاظ کو حقیقی معنوں پر محمول کیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ اے موسیٰ علیہ السلام! تم خود جہاد پر نکلو اور اپنے رب کو بھی ساتھ لے لو جس طرح دوسرے لوگوں کو امداد کے لیے شریک کیا جاتا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہ نہایت بے ادبی، گستاخی اور کفر کا کلمہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو انسانی سطح پر لے آنا کفر کے مترادف ہے۔ بنی اسرائیل کی ایسی ہی گستاخی کا ذکر سورۃ البقرہ میں بھی ہو چکا ہے جب انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے صاف کہہ دیا تھا لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَى اللَّهَ جَهْرَةً ہم تیری بات کو ہرگز نہیں مانیں گے جب تک اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔ اس بے ادبی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک بجلی آئی اور سب کو جلا کر خاکستر

کر دیا۔ یہاں پر بھی بنی اسرائیل نے اسی قسم کی گستاخی کی، خدا کی نعمتوں کی ناقدری کی اور اللہ کے عظیم المرتبت رسولوں کا کچھ لحاظ نہ رکھا اور اُن کے حکم کا صاف انکار کر دیا۔

صحابہ کرامؓ کی جاں نثاری

برخلاف اس کے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرامؓ کی جاں نثاری کے واقعات زبان زدِ عام ہیں۔ منجملہ اُن کے جنگ بدر کی تیاری کا واقعہ ہے۔ جب قریش مکہ کی طرف سے جنگی تیاری کی خبر پہنچی تو حضور علیہ السلام نے صحابہ کرامؓ کو جمع فرمایا اور جنگ کی تیاری کے لیے اُن کی رائے طلب کی چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کھڑے ہوئے اور انہوں نے دشمن سے ٹکرا جانے کا مشورہ دیا، اس پر آپ خاموش رہے۔ پھر حضرت عمرؓ نے کھڑے ہو کر اپنی جاں نثاری کا یقین دلایا مگر آپ پھر بھی خاموش رہے۔ حضرت عمرؓ سمجھ گئے کہ آپ انصار مدینہ کی طرف سے یقین دہانی چاہتے ہیں چنانچہ آپ نے انصار کی طرف اشارہ کیا کہ اب تمہارے بولنے کا وقت ہے۔ چنانچہ انصار میں سے حضرت سعد بن معاذؓ نے عرض کیا کہ حضور اگر آپ کا روئے سخن ہماری طرف ہے تو ہم آپ کو قسم اٹھا کر یقین دلاتے ہیں۔ کہ اگر آپ حکم دیں گے تو اپنے گھوڑوں کو برک الغماد تک لے جائیں گے اور انہیں سمندر میں دوڑانے سے بھی دریغ نہیں کریں گے ہم آپ کے اشارے پر ہر طرح کی قربانی دینے پر تیار ہیں۔ عرض کیا، حضور! آپ ہمیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی مانند نہیں پائیں گے جنہوں نے اپنے نبی سے یوں کہا تھا کہ فَاذْهَبْ أَنتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اس کے بعد مہاجرین میں سے حضرت مقداد بن اسودؓ کھڑے ہوئے اور عرض کیا، حضور! آپ یقین جانیں کہ ہم آپ کے دائیں، بائیں، آگے اور پیچھے غرضیکہ ہر طرف سے دشمن کا مقابلہ کریں گے ہم جان کی بازی لگا دیں گے، آپ ہمیں موسیٰ علیہ السلام کی قوم جیسا نہیں پائیں گے۔ انصار و مہاجرین کے اس جوش و جذبہ سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام

بہت خوش ہوئے آپ کا چہرہ مبارک چمکنے لگا اور آپ نے اللہ کا نام
لے کر کوچ کا حکم دے دیا۔ بہر حال حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضور خاتم النبیین
کی اقوام کے نظریات کا یہ ایک تقابلی جائزہ ہے۔

دعائے افتراق

الغرض! جب قوم موسیٰ نے جہاد سے صاف انکار کر دیا تو اللہ
کے نبیوں کے دل پریشان ہو گئے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے
نہایت عاجزی کے ساتھ بارگاہِ رب العزت میں دعا کی قَالَ رَبِّ اِنِّیْ لَآ
اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَاَخِیْ اے پروردگار! میں کچھ اختیار نہیں رکھتا سوائے
اپنی اور اپنے بھائی کی جان کے یعنی میں تو ہر حالت میں تیرا فرمانبردار ہوں اور
میرا بھائی بھی میری بات مانتا ہے۔ مگر اس قوم پر میرا کچھ بس نہیں چلتا یہ میری
بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اب ان کے ساتھ میرا نباہ نہیں
ہو سکتا۔ لہٰذا فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ؎
ہمارے اور فاسق قوم کے درمیان تفریق ڈال دے۔ اے مولا کریم! اس قوم
نے تیرے حکم کو ٹھکرا دیا ہے، یہ فسق و معصیت میں مبتلا ہیں، تیرے انعام
کو قبول کرنے کی بجائے بزدلی کا مظاہرہ کر رہے ہیں، اس لیے تو ہمارے
درمیان اب اپنا فیصلہ ہی صادر فرما دے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ان کو دنیاوی سزا
بھی ملی کہ فی الوقت ایک نعمت سے محروم ہو گئے۔ اس واقعہ کے تین سال
بعد حضرت ہارون علیہ السلام اللہ کو پیارے ہو گئے اور پھر مزید ایک سال بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی ان
سے جا ملے اور اس طرح اللہ کے نبیوں اور قوم کے درمیان جدائی پیدا ہو گئی جدائی کا یہ مطلب نہیں
کہ دونوں انبیاء قوم کو چھوڑ کر کسی دوسرے علاقے میں چلے جاتے یہ بات ان کے شایانِ شان
نہ تھی اور وہ اپنی قوم کے ساتھ رہنا بھی پسند نہ کرتے تھے، لہٰذا اللہ تعالیٰ
نے ان کی دعا قبول کی اور دونوں انبیاء کی فوتیدگی سے مطلوبہ افتراق
عمل میں آ گیا۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا اور اپنے

بھائی کا ذکر تو کیا ہے مگر اُن دو کامل الایمان لوگوں حضرت کالب اور یوشع کا ذکر اپنے ساتھ کیوں نہیں کیا۔ مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ قوم سے افتراق میں ان دو حضرات کو اپنے ساتھ شامل نہ کرنے کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے یہ دعا نہایت اضطراب اور تنگدلی کی حالت میں کی تھی۔ اور ایسی حالت میں بعض اوقات آدمی کلام کو مختصر کرنے کے لیے کسی چیز کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس کی دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہارون علیہ السلام تو آپ کے بھائی اور نبی تھے۔ اُن کے متعلق آپ کو یقین تھا کہ یہ میرے ساتھ ہے لہٰذا اُن کا نام اپنے ساتھ شامل کر دیا مگر باقی دو حضرات کے متعلق انہیں مکمل یقین نہیں تھا۔ آپ کا خیال تھا کہ ہو سکتا ہے آزمائش آنے پر وہ بھی ثابت قدم نہ رہ سکیں گے، لہٰذا آپ نے قوم سے افتراق میں اُن کو اپنے ساتھ شامل نہ کیا۔ یاد رہے کہ حضرت یوشع علیہ السلام کو اُس وقت نبوت نہیں ملی تھی جس کی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام ان سے پوری طرح مطمئن نہیں تھے۔ اُن کو نبوت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد عطا ہوئی۔

مفسرِ قرآن مولانا شاہ اشرف علی تھانوی اسی آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ جس طرح موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو پورے وثوق کے ساتھ اپنے ساتھ شریک کر لیا۔ اسی طرح شیخ یا بزرگ کو اپنے مرید یا شاگرد پر تصرف حاصل ہوتا ہے اور وہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ میرا فلاں شاگرد یا مرید فلاں کام میں میرے ساتھ شریک ہو گا۔ گویا شیخ کو اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنے مرید کو اپنے ساتھ شامل کر سکے۔

چالیس سالہ ذلت

بنی اسرائیل کی بے ادبی، گستاخی اور حکم عدولی کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً
[illegible]

دے دی گئی۔ اگر وہ لوگ جہاد پر آمادہ ہو جاتے تو اللہ تعالیٰ اسی وقت انہیں
وہ نعمت عطا کر دیتا مگر ان کی بزدلی کی وجہ سے انہیں یہ سزا ملی کہ وہ ارض
مقدس سے چالیس سال تک کے لیے محروم ہو گئے۔ حدیث شریف
میں آتا ہے ان العبد لیحرم من الرزق بالذنب یعنی بندہ اپنی
معصیت کی وجہ سے رزق سے محروم ہو جاتا ہے۔ یعنی جب کوئی گناہ
کرتا ہے تو اسے ملنے والی نعمت بھی روک لی جاتی ہے۔ چنانچہ اللہ نے
حکم دے دیا کہ اب یہ قوم چالیس سال تک ارضِ مقدس میں داخل نہیں ہو سکتی۔

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ اس چالیس سالہ دور میں تمام بوڑھے
بنی اسرائیلی ختم ہو گئے اور ان میں سے کوئی بھی سرزمین مقدس میں نہ پہنچ
سکا۔ اس دوران نئی نسل پیدا ہوئی۔ انہوں نے اپنے اندر تنظیم پیدا کی۔
پھر حضرت یوشع علیہ السلام کی قیادت میں انہوں نے جہاد کیا تو وہ ارض مقدس
کو فتح کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ورنہ چالیس سال تک ان کی
حالت یہ رہی یَتِیْهُوْنَ فِی الْاَرْضِ وہ سزا کے طور پر اسی صحرائے
سینا (میدان تیہ) میں دیوانوں کی طرح سرگرداں پھرتے رہے۔ سورۃ بقرہ
میں گزر چکا ہے کہ وہ اس میدان میں مارے مارے پھرتے رہے۔ ان کی
سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں مگر اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے
ان پر بھی مہربانی جاری رکھی۔ جب ان کے خیمے پھٹ گئے تو فرمایا
وَظَلَّلْنَا عَلَیْكُمُ الْغَمَامَ ہم نے تم پر بادلوں کے سایے
کر دیے اور جب بھوکوں مرنے لگے تو وَاَنْزَلْنَا عَلَیْكُمُ الْمَنَّ
وَالسَّلْوٰی تو من و سلویٰ جیسی لذیذ اور شیریں خوراک بہم پہنچائی۔

غلامی بہت بری چیز ہے۔ اس کی وجہ سے لوگوں میں قبیح صفات
پیدا ہوتی ہیں۔ کمینگی اور بخل جیسی بری خصلتیں جنم لیتی ہیں۔ ان سے ذہنی
اور غیروں سے وفاداری کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ جن [illegible] بھی بجے

عرصہ تک غلامی میں رہنے کی وجہ سے اچھی خصلتوں سے محروم ہو چکے تھے
لہذا انہوں نے اللہ کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ پھر جب نئی نسل آئی
غلامی کے اثرات ختم ہوئے تو ان میں ملی جوش و جذبہ عود کر آیا۔ پھر
انہوں نے جہاد کر کے اپنا وطن حاصل کر لیا۔

موسیٰ علیہ السلام کو تسلی

چونکہ موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سے سخت مایوس ہو چکے تھے۔ اُن
کی مسلسل نافرمانی اور معصیت کی وجہ سے آپ کو امید کی کوئی کرن نظر نہیں
آرہی تھی، اِن حالات میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو تسلی دی فَلَا
تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ آپ اس فاسق قوم پر افسوس کا اظہار
نہ کریں۔ یہ نعمتِ خداوندی سے محروم ہو چکے ہیں اب ارضِ مقدس کی
نعمت اِن کی آئندہ نسل کو ملے گی۔ اس قسم کی تشفی کی مثالیں دیگر انبیاء کے
متعلق بھی ملتی ہیں۔ چنانچہ شعیب علیہ السلام کی قوم نے جب آپ کے
پیغام اور نصیحت کو قبول نہ کیا تو فرمایا "فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ"
اس کافر قوم پر کس طرح اظہار افسوس کیا جائے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی
قوم کو کافر کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے مگر یہاں پر بنی اسرائیل کے متعلق
ایسا نہیں کہا گیا کیونکہ وہ لوگ نافرمان اور گنہگار تھے مگر نبی کی ملت میں ہی
تھے۔ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو اللہ کے نبی تسلیم کرتے تھے
مگر اپنی گستاخی، بے ادبی اور بداعمالیوں کی وجہ سے سزا بھی پاتے تھے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ؕ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ؕ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿٢٧﴾ لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّيْۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٨﴾ اِنِّيْۤ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ ﴿٢٩﴾

ترجمہ: (اے پیغمبر) آپ ان کو پڑھ کر سنائیں حال آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا حق کے ساتھ جب کہ ان دونوں نے قربانی پیش کی پس ان میں سے ایک سے قبول کی گئی اور دوسرے سے قبول نہ کی گئی دوسرے نے کہا کہ میں تمہیں قتل کر ڈالوں گا۔ اُس نے کہا بیشک اللہ تعالیٰ قبول کرتا ہے متقیوں سے ﴿٢٧﴾ اگر تو بڑھائے گا میری طرف اپنا ہاتھ مجھے قتل کرنے کے لیے تو میں نہیں بڑھانے والا اپنا ہاتھ تیری طرف تجھے قتل کرنے کے لیے۔ بیشک میں خوف کرتا ہوں اللہ تعالیٰ سے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے ﴿٢٨﴾ میں چاہتا ہوں کہ لوٹے تو میرا گناہ لے کر اور اپنا گناہ۔ پس ہو جائے گا تو دوزخ والوں سے اور یہی سزا ہے ان لوگوں کی جو ظلم کرنے والے ہوتے ہیں ﴿٢٩﴾

ربط آیات: پچھلے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی بزدلی کا حال ذکر کیا تھا۔

کہ وہ دشمن سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے جس کی پاداش میں چالیس سال تک سرزمینِ مقدس سے محروم رہے۔ جس طرح دشمن کے مقابلے میں بزدلی دکھانا بہت بُری بات ہے اسی طرح قتل ناحق پر دلیر ہونا بھی قبیح خصلت ہے۔ اسی مناسبت سے اللہ تعالیٰ نے آج کے درس کی آیات میں آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا حال ذکر کیا ہے۔

اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے دونوں فرقوں کے نقضِ عہد کا تذکرہ فرمایا تھا۔ یہودی عہد شکنی کی وجہ سے ملعون ٹھہرے، پھر سنگدل ہوئے اور اللہ کی کتاب میں تحریف کے مرتکب ہوئے۔ اسی عہد شکنی کی وجہ سے گروہِ نصاریٰ باہمی جنگ و جدل میں مبتلا ہوئے۔ چنانچہ ابتدائے سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو بھی ایفائے عہد کی تلقین کی یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ یعنی اے اہل ایمان! اپنے عہد و پیمان کو پورا کرو۔

آدم علیہ السلام کے دو بیٹے

آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا تذکرہ فرمایا ہے جن میں سے ایک نے دوسرے کو قتل کر دیا تھا۔ یہ بھی قاتل کی طرف سے عہد شکنی کی وجہ سے ہی ہوا تھا۔ ارشاد ہوتا ہے وَاتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ ابْنَیْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ اے پیغمبر! اصلی اللہ علیہ وسلم آپ ان کو آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا حال پڑھ کر سنا دیں حق کے ساتھ نبا کا معنی خبر، حال یا واقعہ ہوتا ہے۔ اور ابنِ آدم سے عام طور پر انسان مراد لیا جاتا ہے کیونکہ ہر انسان آدم علیہ السلام کا ہی بیٹا ہے۔ تاہم حضرت عبد اللہ بن عباس، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ، مجاہدؒ، قتادہؒ وغیرہم فرماتے ہیں کہ اس آیت کریمہ میں مذکور دو بیٹوں سے حضرت آدم علیہ السلام کے حقیقی بیٹے مراد ہیں۔ ان دو بیٹوں یعنی ہابیل اور قابیل کا تذکرہ تورات میں بھی موجود ہے تاہم دونوں کے نام قرآن میں کہیں نہیں آئے ہیں۔

دو بیٹوں کا واقعہ حضور علیہ السلام کی بعثت سے ہزاروں سال پہلے پیش آیا اور اس کا ٹھیک ٹھیک طور پر علم بغیر وحی الٰہی کے نہیں ہو سکتا تھا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے وحی ہی کے ذریعے اپنے پیغمبر کو فرمایا کہ آپ بنی اسرائیل اور دوسرے لوگوں کو اس واقعہ کی ٹھیک ٹھیک تفصیلات سنا دیں تاکہ ان کو علم ہو سکے کہ عہد شکنی کے کس قدر قبیح نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

پیدائش اور نکاح

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ سب کے جد امجد حضرت آدم علیہ السلام کے ہاں ہر حمل سے دو جڑواں بچے پیدا ہوتے تھے جن میں ایک لڑکا ہوتا اور دوسری لڑکی۔ چنانچہ جب آدم علیہ السلام اپنی زندگی کے ایک ہزار برس مکمل کر کے اس دنیا سے رخصت ہوئے تو آپ ایک ہزار سے زیادہ اولاد یعنی لڑکے لڑکیاں پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ کو ایسا ہی منظور تھا۔ نسل انسانی کی ابتدا انہی سے ہوئی اور اسے پوری دنیا میں پھیلانا مقصود تھا۔ لہٰذا حضرت آدم علیہ السلام کے ہاں کثرت سے بچے پیدا ہوتے۔ جب بچے جوان ہوتے اور ان کے نکاح کا مسئلہ پیدا ہوتا تو آپ کی شریعت کے مطابق ایک حمل کے لڑکے اور دوسرے حمل کی لڑکی کا آپس میں نکاح کر دیا جاتا اور اس طرح نسل انسانی بڑھنے اور پھیلنے لگی۔

وجہ تنازعہ اور قربانی

آدم علیہ السلام کے دو بیٹے ہابیل اور قابیل دو مختلف جنوں (حملوں) سے تھے مگر اتفاق کی بات کہ ہابیل کے ساتھ پیدا ہونے والی لڑکی اچھی شکل و صورت کی نہ تھی جب کہ قابیل کی جڑواں بہن خوبصورت تھی اب اس وقت کی شریعت کے مطابق قابیل کا نکاح ہابیل کے ساتھ پیدا ہونے والی لڑکی کے ساتھ ہونا چاہیے تھا مگر وہ اسے پسند نہیں کرتا تھا اور اس کی بجائے اپنے ساتھ جنم لینے والی خوبرو لڑکی سے نکاح کا خواہشمند تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے انہیں سمجھایا کہ ایسا کرنا درست نہیں ہے کیونکہ یہ حکم خداوندی کی طرف سے نازل ہوئی مگر قابیل اپنی ضد پر مصر رہا۔ ادھر ہابیل

بھی اُسی لڑکی کے ساتھ نکاح کرنا چاہتا تھا کیونکہ شریعت کے مطابق اُس کے نکاح میں وہی آنی چاہیئے تھی۔ آخر کار آدم علیہ السلام نے یہ تدبیر پیش کی کہ دونوں بھائی اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے نیاز یا قربانی پیش کریں اور جس بھائی کی قربانی قبول ہو جائے گی۔ اُس کا موقف درست تسلیم کیا جائے گا۔ چنانچہ دونوں بھائی اس تجویز پر رضامند ہو گئے۔

ہابیل کا پیشہ گلہ بانی تھا، اُس نے ریوڑ پال رکھے تھے اور قابیل کاشتکاری کرتا تھا۔ چنانچہ ہابیل نے اپنے جانوروں میں سے ایک اچھا اور عمدہ جانور منتخب کیا اور اُسے اللہ کی راہ میں ذبح کر دیا۔ دوسرے بھائی قابیل نے اپنے غلے کی پیداوار میں سے ردی مال قربانی کے لیے پیش کیا۔ جیسا کہ سورۃ آل عمران میں بیان ہو چکا ہے، قربانی کی قبولیت کی نشانی یہ تھی کہ متعلقہ چیز کو ایک خاص مقام پر رکھ دیا جاتا تھا، آسمان سے آگ نازل ہوتی تھی اور قبولیت کی صورت میں قربانی کی چیز کو جلا کر راکھ کر دیتی تھی اسی طریقے کے مطابق دونوں بھائیوں نے اپنی اپنی قربانی اللہ کی بارگاہ میں پیش کی اس آیت کریمہ میں اسی چیز کو یہاں بیان کیا گیا ہے۔ إِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا جب دونوں نے قربانی پیش کی فَتُقُبِّلَ مِنْ أَحَدِهِمَا تو ان میں سے ایک یعنی ہابیل کی قربانی قبول کر لی گئی۔ وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْآخَرِ اور دوسرے یعنی قابیل کی قربانی قبول نہ کی گئی۔

قابیل کا ارادہ قتل

اس پر قابیل حسد کی آگ میں جل گیا اور اُس نے غصے میں آکر دوسرے بھائی ہابیل سے کہا قَالَ لَأَقْتُلَنَّكَ میں تجھے مار ڈالوں گا کیونکہ تو میری خواہش کے راستے میں حائل ہے۔ تیرا کام تمام کر کے ہی میں اپنے لیے راستہ صاف کر سکتا ہوں اس کے جواب میں ہابیل نے کہا کہ بھائی طیش میں نہ آؤ۔ قربانی کی قبولیت یا عدم قبولیت تو اُس مالک الملک کے ہاتھ میں ہے جس کے حضور قربانی پیش کی جاتی ہے۔ اور اُس کا قانون یہ ہے

قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ کہ خدا تعالیٰ متقیوں کی قربانی قبول فرماتا ہے۔ اگر تیری قربانی قبول نہیں ہوئی تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے تقویٰ کی صفت سے متصف کیا ہے اور میری قربانی قبول فرمائی ہے۔ اگر تجھ میں بھی یہ صفت پائی جاتی تو اللہ تعالیٰ تمہاری قربانی بھی قبول کر لیتا۔ حضرت ابودرداءؓ بڑے اونچے درجے کے صحابی رسول ہیں۔ آپ حکیم الامت کہلاتے تھے۔ اُن کا قول ہے کہ بخدا اگر مجھے یقین ہو کہ میری یہ دو رکعت نماز قبول ہو گئی ہے تو یہ میرے لیے دنیا و ما فیہا سے زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ اس آیت کریمہ کی رُو سے کہ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ میں سمجھوں گا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے متقین کی صف میں شامل کر لیا ہے۔

ہابیل کی فراخدلی

بہرحال ہابیل نے قابیل کی قتل کی دھمکی کے جواب میں ایک تو اُسے سمجھانے کی کوشش کی کہ اُس کی قربانی کی عدم قبولیت میں میرا کوئی قصور نہیں کیونکہ اللہ متقیوں کی قربانی قبول فرماتا ہے۔ اور دوسری بات یہ کی کہ اے بھائی! لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَیَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِیْ اگر دھمکی کے مطابق تو مجھے قتل کرنے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھائے گا تو اس کے جواب میں مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِیَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ میں تمہاری طرف ارادہ قتل سے اپنا ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا۔ کیونکہ اِنِّیْۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ میں اللہ رب العلمین سے ڈرتا ہوں کہ کہیں اُس کی گرفت میں نہ آ جاؤں، لہٰذا میں تیرے ساتھ کوئی زیادتی کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔

ہابیل کی طرف سے بھائی کے خلاف ہاتھ نہ اٹھانے کا عزم اس وجہ سے تھا کہ اگر اپنے دفاع کے لیے بھی ہاتھ اٹھایا تو مجھے جارحیت کا ہاتھ نہ سمجھا جائے۔ اور جب دو اشخاص ایک دوسرے پر حملہ آور ہوں تو دونوں مجرم ہوتے ہیں خواہ ابتدا کسی طرف سے ہو۔ اسی لیے حضور علیہ السلام

فرمایا ہے اَلْقَاتِلُ وَالْمَقْتُوْلُ كِلَاهُمَا فِي النَّارِ قاتل اور مقتول دونوں دوزخی ہیں۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا حضور! قاتل تو جہنمی ٹھہرا کہ وہ قتل ناحق کا مرتکب ہوا مگر مقتول کو کیسی سزا؟ فرمایا اِنَّهٗ كَانَ حَرِيْصًا عَلٰى قَتْلِ صَاحِبِهٖ وہ بھی اپنے ساتھی کو قتل کرنے پر حریص تھا یعنی ارادہ تو دونوں کا یہی تھا کہ ایک دوسرے کو قتل کر دیں مگر ایک قاتل ہو اور دوسرا مقتول۔ تاہم اپنے ارادہ کے اعتبار سے دونوں جہنمی ہیں۔

اس تمام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان احکام کی روشنی میں کیا کسی مظلوم کو اپنے دفاع کا حق بھی حاصل نہیں؟ تو بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ مظلوم کے لیے اپنا دفاع نہ کرنا صرف حضرت آدم علیہ السلام کی شریعت میں جائز تھا۔ ہماری شریعت میں ایسا حکم نہیں ہے۔ بلکہ یہاں تو حکم یہ ہے فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ (البقرہ) جو کوئی تم پر زیادتی کرے تم بھی اسی طرح جواب دو۔ ہماری شریعت میں مظلوم کو بدلہ لینے کی اجازت ہے اور اگر صبر کیا جائے اور شہادت حاصل ہو جائے تو یہ مقام عزیمت ہے۔ حضرت عثمانؓ نے اپنے آخری دور میں نہ خود مخالفین پر ہاتھ اٹھایا اور نہ اپنی فوج کو ان کا مقابلہ کرنے کی اجازت دی۔ یہ بہت اونچا درجہ ہے جسے حاصل ہو جائے۔ تاہم انتقام لینے کی رخصت ہے

گناہوں کا بار

بہرحال ہابیل نے عزیمت کا راستہ اختیار کیا اور کہا کہ اے میرے بھائی میں تیرے خلاف ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ اِنِّيْٓ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓءَ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ میں چاہتا ہوں کہ تو میرا گناہ اور اپنا گناہ بھی لے کر لوٹے۔ یہاں اشکال پیدا ہوتا ہے کہ قاتل اپنے گناہ تو سمیٹے گا مگر مقتول کے گناہوں کا بوجھ کیسے اٹھائے گا جب کہ قرآن پاک کا عام ضابطہ یہ ہے۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ یہ اصول ہے کہ ہر کسی پر

سکے گناہ کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھاتا۔ تو مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہاں بِاِثْمِیْ کا مطلب ہابیل کے سارے گناہ نہیں بلکہ صرف اُس کے قتل کا گناہ مراد ہے جسے قابیل اٹھا کر لے جائیگا۔ حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ ان الفاظ سے ایک لطیف مطلب بھی اخذ کیا جاسکتا ہے حضور علیہ السلام کا فرمان مبارک ہے السیف محاء الذنوب یعنی تلوار گناہوں کو مٹا دیتی ہے۔ اسی لیے شہید کے تمام گناہ معاف ہوجاتے ہیں اِلَّا الدَّیْن سوائے قرض کے کہ وہ معاف نہیں ہوتا جب تک کہ قرض خواہ خود معاف نہ کرے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ہابیل کے کلام کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے۔ کہ مجھے قتل کر کے میرے گناہوں کے مٹانے کا بھی تو ہی سبب بنے گا۔ گویا میرے گناہ بھی لے جائیگا اور تیرے اپنے گناہ تو تیرے ساتھ ہی ہوں گے۔ فرماتے ہیں اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مقتول کے تمام گناہ قاتل کے سر پر ڈال دیئے جائیں گے۔

قاتل کا انجام

فرمایا جب تو ایک قتل ناحق کا ارتکاب کر ہی بیٹھے گا فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ پس تو جہنمیوں میں سے ہو جائے گا۔ یعنی تیرے لیے دوزخ واجب کر دی جائیگی۔ قتل چند اکبر الکبائر یعنی بڑے گناہوں میں سے ایک ہے۔ دوسرے مقام پر فرمایا وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا (النساء) جو کسی مومن کو عمداً قتل کریگا۔ تو اس کی سزا دائمی جہنم ہے۔ اگر قتل کو حلال سمجھ کر کیا ہے۔ تو قاتل کافر اور مرتد سمجھا جائے گا اور ہمیشہ دوزخ میں جلتا رہے گا۔ اور اگر حلال نہیں سمجھتا مگر قتل کا مرتکب ہوا ہے تو لمبے عرصہ تک سزا پانے کے بعد ایمان کی بدولت رہائی حاصل کرے گا۔ فرمایا وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ ظلم کرنے والوں کی یہی جزا ہوا کرتی ہے۔ کہ وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔

بہرحال جب قابیل نے ہابیل کو قتل کرنے کا ارادہ کیا، تو ہابیل نے
نے اسے ہرچند سمجھانے کی کوشش کی کہ ایسا کرنے سے تو قانون خداوندی
کو توڑے گا جسکی بدولت تو خدا تعالیٰ کی ابدی گرفت میں مبتلا ہوگا۔

فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۳۰﴾ فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ قَالَ يٰوَيْلَتٰۤى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ﴿۳۱﴾

ترجمہ: پس آمادہ کیا اُس کو اُس کے نفس نے اپنے بھائی کے قتل پر، پھر اُس نے اُس کو قتل کر ڈالا، پس ہو گیا وہ نقصان اٹھانے والوں میں ﴿۳۰﴾ پھر بھیجا اللہ نے کوّے کو، وہ زمین کو کریدتا تھا تاکہ دکھائے اُس کو کہ کس طرح چھپائے وہ اپنے بھائی کی لاش کو۔ وہ کہنے لگا۔ ہائے افسوس! کیا میں عاجز ہو گیا ہوں اس بات سے کہ میں ہو جاؤں اس کوّے جیسا کہ میں اپنے بھائی کی لاش کو چھپا لوں۔ پھر ہو گیا وہ پچھتانے والوں میں ﴿۳۱﴾

ربط آیات

آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کے درمیان تنازعہ کا ابتدائی حصہ گذشتہ درس میں بیان ہو چکا تھا۔ دونوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی اپنی قربانی پیش کی۔ ہابیل کی قربانی قبول ہو گئی جب کہ قابیل کی نہ ہوئی۔ اُس نے غصے میں آ کر اپنے بھائی کو قتل کی دھمکی دی مگر ہابیل نے کہا کہ اس میں میرا کیا قصور ہے۔ اللہ کے ہاں قربانی کی قبولیت کا معیار یہ ہے کہ وہ متقیوں سے قبول کرتا ہے۔ اگر تم بھی تقوے کی صفت سے متصف ہوتے تو اللہ تعالیٰ تمہاری قربانی بھی قبول فرما لیتا۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ اگر تو مجھے قتل کرنے کیلئے

اپنا ہاتھ میری طرف بڑھائیگا۔ تو میں تیرے قتل کے لیے اپنا ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا، کیونکہ میں اُس اللہ سے ڈرتا ہوں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ اور اگر تم نے مجھے قتل کر ہی دیا۔ تو پھر تمہیں میرے قتل کا گناہ اور خود اپنے گناہ بھی اٹھانا ہوں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم جہنمی بن جاؤ گے۔

بھائی کا قتل

باوجود اس کے کہ ہابیل نے بڑی مؤثر بات کی مگر قابیل اپنے ارادے سے باز نہ آیا۔ اللہ جل شانہٗ نے اِس کیفیت کو یوں بیان فرمایا ہے فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ اُس کے نفس نے اُسے بھائی کے قتل پر آمادہ کر دیا۔ طوعت کے کئی ایک معنی آتے ہیں جیسے آمادہ کر دینا، آسان کر دینا، مزین کر دینا، ہموار کر دینا وغیرہ۔ بہر حال قابیل کے نفس نے اُسے اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ ہابیل کو اپنے راستے سے ہٹا دے، فَقَتَلَهٗ پھر اُس نے اُس کو قتل کر دیا۔

نفس کی آمادگی کے متعلق خود قرآن میں موجود ہے۔ "اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ" نفس کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ انسان کو برائی پر آمادہ کرتا ہے۔ کوئی بھی گناہ کرتے وقت ابتداء میں جھجک محسوس ہوتی ہے پھر آہستہ آہستہ انسان کا نفس اور شیطان اس کو برائی پر آمادہ کر لیتا ہے پھر جب وہ ایک دفعہ گناہ میں ملوث ہو جاتا ہے۔ تو اُس کے لیے راہ ہموار ہو جاتی ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے۔ واعظ اللّٰہ فی قلب کل مؤمن ہر مومن کے دل میں خدا کی جانب سے ایک واعظ ہوتا ہے۔ اور اس سے مراد انسان کا ضمیر ہے جو بیدار ہوتا ہے اور ہر برائی پر اُسے خبردار کرتا ہے۔ انسان جب اس نصیحت کو نظر انداز کر کے پہلی مرتبہ گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔ تو اس کے دل پر سیاہ داغ لگ جاتا ہے۔ پھر بھی اُس کے لیے موقع ہوتا ہے کہ توبہ کر لے اور آئندہ اُس سے باز آجائے۔ اگر ایسا کر لے تو سیاہ دھبہ صاف ہو جاتا ہے اور

اگر گناہ پر اصرار کرتا ہے تو دل کی سیاہی بڑھتی جاتی ہے حتیٰ کہ سارا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ" لوگو! سن لو، ان لوگوں کی برائیوں کی وجہ سے ان کے دلوں پر زنگ چڑھ گیا ہے اور ان کے دل سیاہ ہو چکے ہیں۔ بہرحال فرمایا کہ قابیل کے نفس نے اُسے اپنے بھائی کے قتل پر آمادہ کر لیا اور اس نے اُسے قتل کر دیا۔

دوہرا نقصان

طریقۂ قتل کے متعلق تفسیری روایات میں آتا ہے کہ ہابیل کہیں سو رہا تھا۔ قابیل کو موقع مل گیا اور اُس نے اُوپر سے پتھر مار کر بھائی کا سر کچل دیا۔ قتل کی جو بھی صورت ہو، اللہ نے فرمایا کہ اس فعل کے ارتکاب کے بعد فَأَصْبَحَ مِنَ الْخَاسِرِينَ وہ نقصان اٹھانے والوں میں ہو گیا قاتل کو ظاہری نقصان تو یہ ہوا کہ اُس کے ماں باپ سخت ناراض ہو گئے۔ گویا بھائی سے محرومی اور والدین کی ناراضگی بذاتِ خود بہت بڑا نقصان ہے۔ عرب لوگ کہا کرتے ہیں "المرء كثير باخيه" بھائیوں کی وجہ سے آدمیوں کی اکثریت ہوتی ہے۔ فارسی کا مقولہ بھی ہے "ہر کہ برادر ندارد قوتِ بازو ندارد" جس کا بھائی نہیں ہے، اُس کے پاس قوتِ بازو نہیں ہے۔ بھائیوں کی تائید انسان کی طاقت کا ذریعہ ہوتا ہے مصیبت کے وقت بھائیوں کے تعاون کی ضرورت پڑتی ہے۔ تو بھائی کو قتل کر کے دوسرا بھائی قوتِ بازو سے محروم ہو گیا۔ یہ بہت بڑا نقصان ہے فارسی والے کہتے ہیں "ہر کہ مادر ندارد شفقت ندارد" جس کی ماں نہیں ہے وہ شفقت سے محروم ہے۔ اور "ہر کہ زن ندارد آسائشِ تن ندارد" جس کی بیوی نہیں ہے اُسے جسم کا آرام میسر نہیں ہے۔ اللہ نے بھی فرمایا کہ تمہارے لیے بیویاں پیدا کی ہیں لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا تاکہ تمہیں راحت نصیب ہو۔ اسی طرح ایک بھائی کے لیے دوسرا بھائی بھی بہت بڑی نعمت ہے

خاص طور پر نیک اور متقی بھائی سے محرومی نقصانِ عظیم ہے۔

اس دنیوی اور فوری نقصان کے علاوہ آخرت کا شدید ترین اور دائمی نقصان بھی پیش آنے والا ہے۔ بھائی کا قتل انتہائی ظلم اور قطع رحمی کی بدترین مثال ہے۔ دنیا میں خونریزی کی ابتدا اسی قتل سے ہوئی اس سے پہلے کوئی خون نہیں بہا تھا۔ اس اولین قتل کا اثر نہ صرف والدین اور بھائی پر ہوا بلکہ پورے ماحول پر ہوا۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ قاتل کا بدن سیاہ ہوگیا، نباتی دنیا میں پھل کڑوے ہوگئے، درختوں کے ساتھ کانٹے لگ گئے اور اسی طرح کئی دیگر ناگوار تغیرات پیش آئے۔ یہ سب تفسیری روایات میں آتا ہے۔

اخروی نقصانات میں سے ایک عظیم ترین نقصان یہ ہے کہ اس قتل ناحق کا وبال قابیل کے ہمیشہ کے لیے قائم ہوگیا۔ اب قیامت تک جتنے بھی قتل ناحق ہوتے رہیں گے اُن کا گناہ متعلقہ قاتل کے علاوہ اولین قاتل قابیل کے نامہ اعمال میں بھی درج ہوتا رہے گا کیونکہ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے لانہ اول من سن القتل اس لیے کہ قابیل نے دنیا پہ پہلا قتل کر کے اس جرم کو رائج کیا۔ اب ہر ایسے فعل کی برائی اسکو بھی ملتی رہے گی۔ اسی طرح جو شخص کسی نیکی کا دستور قائم کرے گا، اس پر عمل کرنے والے ہر شخص کے علاوہ اس کا ثواب اُس کے اولین جاری کنندہ کو بھی پہنچتا رہے گا۔ غرضیکہ اس لحاظ سے بھی قابیل کے لیے یہ بہت بڑا نقصان ہے کہ دنیا کے ہر قتل میں سے اُس کو حصہ ملتا رہے گا۔

تدفینِ میت

چونکہ اس سے پہلے کسی انسان کی موت واقع نہیں ہوئی تھی، اس لیے قابیل کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ بھائی کی بے جان لاش کو کیسے ٹھکانے لگائے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ وہ لاش کو کندھے پر اٹھائے پھرتا رہا اور جب وہ گلنے سڑنے لگی تو دماغ چکرانا شروع ہوگیا، اس

سے اُسے مزید پریشانی لاحق ہوگئی۔ اس موقع پہ اللہ تعالیٰ نے اُس کی راہنمائی فرمائی فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا اللہ نے کوے کو بھیجا یَبْحَثُ فِی الْاَرْضِ جو زمین میں کریدتا تھا۔ اس کا ذکر بائبل میں بھی موجود ہے مگر وہاں کوے کی بجائے جنگلی فاختہ کے الفاظ ہیں۔ بائبل تو تحریف سے پاک نہیں رہی اور یہاں اللہ تعالیٰ نے صراحتاً کوے کا ذکر فرمایا ہے۔ لہٰذا یہی بات درست ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کام کوے سے لیا۔

کوے کے ذریعے راہنمائی کے متعلق مفسرین نے کئی واقعات لکھے ہیں مثلاً یہ کہ دو کوے آپس میں لڑ پڑے، پھر ایک نے دوسرے کے پَر وغیرہ نوچ ڈالے حتیٰ کہ اُسے مار ڈالا۔ اس کے بعد زمین کو کرید کر گڑھا بنایا اور مردہ کوے کو اس میں دفن کر دیا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں۔ کہ کسی مردہ جانور کے دفن کرنے کا واقعہ پیش نہیں آیا تھا بلکہ کوئی بھی ایسی چیز جسے فوری استعمال کرنا مطلوب نہ ہو اسے آئندہ استعمال کے لیے زمین میں دبا دیا جاتا ہے تو ایسا ہی کوئی واقعہ قابیل کے سامنے پیش آیا تھا۔

اس سلسلہ میں اللہ کی طرف سے کوے کا انتخاب بڑا معنی خیز ہے کہ کوے کی فطرت میں یہ چیز پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے ہم جنس کی لاش پر بڑا شور مچاتے ہیں اور سب کوے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ پھر جب تک وہ لاش کسی ٹھکانے نہ لگ جائے کوؤں کی بے چینی اور شور و غل جاری رہتا ہے۔ چنانچہ ہابیل کی لاش کی تدفین کے لیے بھی اللہ نے کوے سے کام لیا اس نے اپنی چونچ اور پنجوں سے زمین کو کریدا اور مردہ کوے یا کسی دوسری چیز کو اس گڑھے میں دفن کیا۔ مقصد یہ تھا لِیُرِیَهٗ كَیْفَ یُوَارِیْ سَوْءَةَ اَخِیْهِ کہ قابیل کو دکھا دیا جائے کہ وہ اپنے بھائی کی لاش کو کیسے چھپائے۔ سَوْءَة لاش پہ بھی بولا جاتا ہے اور اعضائے مستورہ پہ بھی، اور اس کا اطلاق مطلق جسم پہ بھی ہوتا ہے۔ بہر حال اس پہلی میت کے تدفین کا طریقہ اللہ نے

ایک کوسے کے ذریعے سمجھا دیا۔
میت کی تدفین ایک فطری عمل ہے، اس سے جسمِ انسانی کی حفاظت بھی ہو جاتی ہے اور اس کی توہین و تذلیل بھی نہیں ہوتی، اس کے علاوہ میت کو ٹھکانے لگانے کے سارے طریقے غیر فطری ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کا یہ بھی ایک خاصہ بیان فرمایا ہے "اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا اَحْيَاءً وَّاَمْوَاتًا" (مرسلات) یہ زمین زندوں کو بھی اپنے اوپر تھامتی ہے اور مُردوں کو بھی سمیٹ لیتی ہے۔ سورۃ عبس میں فرمایا کہ ہم نے انسان کو نطفہ سے پیدا کیا۔ پھر اس نے زندگی کی تمام منازل طے کیں "ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ" پھر ہم نے اُسے موت دی اور اُسے قبر کے سپرد کر دیا۔ گویا مُردے کو قبر میں دفن کرنا ایک فطری عمل ہے۔ ہندو اپنے مردوں کو جلا ڈالتے ہیں۔ جو کہ اشرف المخلوقات کی سخت توہین ہے مجوسی لاش کو اونچی جگہ پر کھلے عام رکھ دیتے ہیں۔ چیلیں آکر اُس کا گوشت نوچ لیتی ہیں۔ اُس کی ہڈیاں نیچے گر پڑتی ہیں جنہیں بعد میں ٹھکانے لگا دیا جاتا ہے۔ یہ سب غیر فطری طریقے ہیں۔ انسان کی عزت و احترام کا تقاضا یہی ہے کہ اُس کے مردہ کو ادب و احترام کے ساتھ زمین میں دفن کر دیا جائے۔

اظہارِ تاسف

بہر حال جب قابیل نے ایک کوے کو دیکھا کہ اُس نے زمین کرید کر مردہ کوے کو دفن کیا ہے تو اپنے آپ پر افسوس کرنے لگا قَالَ يٰوَيْلَتٰٓى اَعَجَزْتُ ہائے افسوس کیا میں اتنا عاجز آگیا ہوں اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ کہ میں اِس کوے جیسا بن جاؤں۔ مطلب یہ تھا کہ افسوس میں ایک کوے جتنی عقل بھی نہیں رکھتا۔ ایک پرندے نے تو لاش کو دفن کر دیا مگر مجھ سے اتنا بھی نہ ہو سکا۔ یہ قابیل کی طرف سے اظہارِ تاسف کے الفاظ تھے۔ اپنی کم عقلی اور کمزوری کو ظاہر کرنے کے بعد اُس نے

کوے سے سبق سیکھا فَاُوَارِیَ سَوْءَةَ اَخِیْ مجھ سے تو اتنا بھی نہ ہو کہ میں اپنے بھائی کی میت کو چھپا دیتا یعنی زمین میں دفن کر دیتا۔

قانون ایفائے عہد

اس سورۃ مبارکہ کی ابتدا میں اہل ایمان کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے۔ "اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ" یعنی اپنے عہد و پیمان کو پورا کرو اور نقض عہد کا ارتکاب مت کرو۔ اگر عہد کو پورا کرو گے تو تمہیں ترقی نصیب ہوگی اور عہد شکنی کے مرتکب ہوگے تو بُرے نتائج سامنے آئیں گے۔ یہودی عہد شکنی کی وجہ سے ہی سنگدل اور ملعون ٹھہرے اور نصاریٰ باہمی جنگ و جدل میں مبتلا ہوئے اہل ایمان کو سمجھایا گیا ہے۔ کہ اگر تم بھی اہل کتاب کی روش پر چلو گے تو یہ بیماریاں تمہارے اندر بھی پیدا ہو جائیں گی، انسان قانون کا مکلف ہے اور اس کی پابندی میں ہی اس کا عروج ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں ملکیت اور بہیمیت کی باہمی کشمکش رکھ دی ہے۔ اب یہ اس کی فطرت کا تقاضا ہے۔ وہ صفتِ ملکیت کو غالب لا کر قانونِ خداوندی کی پابندی کرے۔ اگر اس کی خلاف ورزی کرے گا تو انسانیت کے دائرہ سے نکل کر بہیمیت والوں کے گروہ میں شامل ہو جائے گا، بلکہ اُن سے بھی کمتر درجے میں چلا جائیگا۔ اللہ نے فرمایا ہے۔ "ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ" جب وہ قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے تو درندوں، پرندوں اور کیڑے مکوڑوں سے بھی ذلیل تر ہو جاتا ہے۔ اور قابیل کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ اُس نے قانونِ خداوندی کے خلاف کیا تو اللہ نے اُسے دکھا دیا کہ وہ کوے جیسے جانور سے بھی ذلیل ہو گیا ہے۔

احساسِ ندامت

بہر حال قابیل نے اللہ تعالیٰ کے قانون کو توڑا، بھائی کو قتل کیا، پھر لاش کو ٹھکانے لگانے سے بھی عاجز رہا، ان سب باتوں کا نتیجہ یہ نکلا فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ وہ ندامت اٹھانے والوں یعنی پچھتانے والوں میں ہو گیا۔ اُسے اپنی عاجزی اور بے عقلی پر افسوس ہوا جس کی وجہ

سے اُسے احساسِ ندامت ہوا۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے التوبۃ الندم یعنی توبہ ندامت ہی کا نام ہے۔ جب کوئی شخص غلط کام کر بیٹھتا ہے پھر اُسے ندامت ہوتی ہے اور وہ اس کام سے باز آجاتا ہے۔ وہ آئندہ کے لیے بھی عزم کرتا ہے کہ ایسے کام کا اعادہ نہیں کریگا۔ تو یہی توبہ ہے۔ مگر قابیل کا معاملہ مختلف ہے۔ وہ اپنی بے عقلی پہ اظہار ندامت کر رہا تھا کہ اُسے ایک کوے جیسی عقل بھی حاصل نہیں، مگر وہ اپنے فعلِ قتل پر نادم نہیں ہوا اور نہ اس نے توبہ کی، لہٰذا وقتی طور پر تو اُسکی پریشانی دور ہو گئی مگر جرم قتل عمد میں ہمیشہ کے لیے عذاب کا مستحق بن گیا۔

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ وَمَنْ اَحْیَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَیِّنٰتِ ؗ ثُمَّ اِنَّ كَثِیْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِی الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ﴿۳۲﴾

ترجمہ:۔ اس وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر لکھ دیا کہ بیشک شان یہ ہے کہ جس نے قتل کیا کسی نفس کو بغیر کسی جان کے بدلے کے یا بغیر زمین میں فساد کرنے کے تو گویا اس نے سب لوگوں کو قتل کر دیا۔ اور جس نے زندہ رکھا اس ایک جان کو، پس گویا کہ اس نے زندہ رکھا سب لوگوں کو۔ اور البتہ تحقیق آئے ہیں ان لوگوں کے پاس ہمارے رسول واضح باتیں لے کر، پھر بہت سے ان میں سے اس کے بعد زمین میں البتہ اسراف کرنے والے ہیں ﴿۳۲﴾

ربط آیات

گذشتہ درس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا تذکرہ فرمایا تھا۔ اُن میں سے ایک نے دوسرے کو تعدی اور ظلم کے ساتھ قتل کر دیا چونکہ اس سے پہلے روئے زمین پر کوئی موت واقع نہیں ہوئی تھی، اس لیے قاتل اپنے بھائی کی لاش کو ٹھکانے لگانے سے متعلق پریشان

ہوگیا۔ اس عظیم گناہ کی وجہ سے اُس کی عقل اس حد تک جواب دے چکی تھی کہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس لاش کو کیا کرے۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے ایک کوے کو بھیج کر مردہ کو دفن کرنے کی تدبیر بتلائی۔ قاتل بھائی اس فعل پر نادم نہ ہوا مگر یہ ندامت توبہ کی ندامت نہ تھی بلکہ یہ اُس کی کمزوری اور کم عقلی کی بنا پر تھی کہ وہ ایک پرندے جتنا شعور بھی نہ رکھتا تھا۔ کوے نے تو مردہ کوے کو زمین میں دفن کر دیا مگر وہ اتنا بھی نہ کر سکا۔

اب آج کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسانی جان کے احترام کا ذکر فرمایا ہے اور اس ضمن میں روئے سخن بنی اسرائیل کی طرف ہی ہے کیونکہ پہلے سے انہی کا ذکر آ رہا ہے۔ بنی اسرائیل جہاد کے معاملے میں نہایت بزدل واقع ہوئے تھے، گذشتہ رکوع میں بیان ہو چکا ہے۔ کہ موسیٰ علیہ السلام کی انتہائی تلقین و ترغیب کے باوجود یہ قوم جہاد کے لیے آمادہ نہ ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چالیس سال تک ارض مقدس سے محروم رہے۔ پھر نئی نسل نے قربانی پیش کی، دشمن قوم سے جہاد کیا تو اللہ نے انہیں وہ نعمت عطا کر دی۔ بنی اسرائیل ایک طرف تو جنگ کے معاملہ میں اس قدر بزدل تھے، مگر دوسری طرف قتل ناحق میں بڑے تیز تھے۔ انہوں نے بہت سے بے گناہ لوگوں کو قتل کیا، جیسا کہ گذشتہ سورتوں میں گزر چکا ہے اللہ کے نیک بندے بھی ان کے ظلم سے محفوظ نہ رہ سکے۔ سورۃ بقرہ شاہد ہے "وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ" وہ اللہ کے نبیوں کو ناحق قتل کر دیتے تھے چونکہ ان کا یہ فعل آدم علیہ السلام کے بیٹے کے فعلِ قتل کے مشابہ تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے قتل ناحق کی قباحت کے متعلق انہی کو بات سمجھائی ہے

انسدادِ قتلِ ناحق

ارشاد ہوتا ہے مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ اسی وجہ سے۔ دراصل اجل کا معنیٰ ہوتا ہے شر کو کھینچ کر لانا۔ اِس کو مطلق علت کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ چونکہ آدم علیہ السلام کے بیٹے نے ناحق قتل کرنے

ظلم و تعدی کا ثبوت دیا۔ اِس علت کی بنا پر یعنی اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انسدادِ قتل کے لیے بنی اسرائیل پر یہ قانون نازل کیا ہے۔ جیسا کہ گذشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے قتل ناحق بہت قبیح حرکت ہے۔ یہ انسان کے لیے تباہ کن ہے اسی کی پاداش میں "فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ" انسان جہنمی بنتا ہے۔ قتل ناحق کے وبال کے متعلق گذشتہ سورۃ میں بھی گذر چکا ہے۔ "وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ" جو کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کرے گا اس کے لیے جہنم واجب ہو گی۔ اس کے علاوہ "وَلَعَنَهٗ" کے الفاظ بھی آئے ہیں کہ ایسے شخص پر اللہ کا غضب اور ناراضگی نازل ہوتی ہے۔ غرضیکہ قاتل کی دنیا اور عاقبت دونوں خراب ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس قبیح جرم کے انسداد کے لیے یہاں یہ قانون بیان فرمایا ہے۔

قصاص کی برکات

سورۃ البقرہ میں قصاص کا قانون بیان ہو چکا ہے "وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ" اے عقلمندو! تمہارے لیے قصاص کے قانون میں زندگی ہے۔ اگر اس قانون کو ٹھیک طور پر جاری کرو گے تو تمہاری زندگیاں محفوظ ہو جائیں گی اور قتل کی وارداتیں رُک جائیں گی، بصورتِ دیگر قتل ہوتے رہیں گے اور تمہاری جانیں ہمیشہ غیر محفوظ رہیں گی۔ ہمارے اپنے ملک میں ابھی تک انگریز کا تعزیراتی قانون نافذ ہے جس کے نتیجے میں دن رات دھڑا دھڑ قتل ہو رہے ہیں اگر اسلام کا قانونِ قصاص نافذ ہوتا تو قتل کی وارداتیں رُک جاتیں۔ اِس کے برخلاف سعودی عرب میں اسلامی تعزیرات نافذ ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ پوری دنیا کے مقابلے میں اس خطۂ ارضی پر قتل کے کیس نہ ہونے کے برابر ہیں۔ قتل کی واردات شاذ و نادر ہی ہوتی ہے اور وہ بھی ایسے لوگوں سے جو غیر ممالک سے آ کر سعودیہ میں ملازمت کرتے ہیں۔ عربوں میں تو قتل بہت شاذ ہوتا ہے۔ کیونکہ وہاں قصاص

کا اسلامی قانون نافذ ہے۔ وہاں پر جرمِ قتل کا فیصلہ چند دن میں ہو جاتا ہے اور مجرم کی گردن تن سے جدا کر دی جاتی ہے۔

قتلِ ناحق

قتل جیسے گھناؤنے جرم کے متعلق اللہ نے فرمایا کَتَبْنَا عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ہم نے بنی اسرائیل پر لکھ دیا۔ اَنَّہٗ بیشک شان یہ ہے۔ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَیْرِ نَفْسٍ جس کسی نے کسی جان کو قتل کیا بغیر جان کے عوض کے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی کو جان کے بدلے میں قصاص کے طور پر قتل نہیں کیا۔ بلکہ جس نے کسی کو ناحق قتل کر دیا اُس قاتل کو مقتول کے بدلے میں قتل کرنا بالکل جائز ہے۔ کیونکہ قانونِ خداوندی یہ ہے۔ "اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ" جان کے بدلے میں جان ماری جائیگی۔ ہر عضو کے بدلے میں قصاص ہے یعنی آنکھ کے بدلے آنکھ، کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت حتیٰ کہ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ "زخموں کا بھی قصاص ہے" مقصد یہ ہے کہ اسلام نے مظلوم کی ہر لحاظ سے مدد کی ہے جس طرح کا اسے نقصان پہنچے اسی قسم کا بدلہ لینے کی اجازت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قانونِ قصاص قتل کے واقعات کی روک تھام کے لیے ایک مؤثر قانون ہے۔

فساد فی الارض

فرمایا۔ ہم نے بنی اسرائیل پر لکھ دیا تھا کہ جو کسی شخص کو ناحق قتل کریگا اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ یا کسی ایسے شخص کو قتل کریگا۔ جو زمین میں فساد کا مرتکب نہیں ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص فساد برپا کرے تو اس کو مار ڈالنا تو روا ہے مثلاً کفار کے ساتھ جہاد کرنا جائز ہے کیونکہ وہ اہلِ حق کو حق کے رستے سے روکتے ہیں۔ سورۃ بقرہ کی ابتدا میں منافقوں کے متعلق آتا ہے "وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ" جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد برپا نہ کرو یعنی اسلام کے راستے میں رکاوٹ نہ بنو تو وہ کہتے ہیں کہ ہم مفسد نہیں "اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ" بلکہ ہم تو مصلح ہیں۔ فساد کیا ہے اخلال بالشرائع

یعنی قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کرنا۔ اُن میں بگاڑ پیدا کرنا۔ چنانچہ ایسے لوگ واجب القتل ہوتے ہیں کیونکہ یہ لوگ اللہ کے دین میں فساد پیدا کرتے ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف شرارتیں کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ چوری کرنا، ڈاکہ ڈالنا، لوگوں کو تنگ کرنا سب فساد ہی کی مختلف صورتیں ہیں۔ اللہ کے راستے سے روکنا جیسے فرمایا وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ان سب لوگوں کے خلاف جہاد کرنا اور ان کو مارنا بالکل درست ہے۔

قتلِ عام

بہرحال فرمایا کہ جس نے کسی شخص کو نہ تو جان کے بدلے میں قتل کیا اور زمین میں فساد برپا کرنے کی وجہ سے، بلکہ بلاوجہ کسی کی جان لینے کا مرتکب ہوا فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا تو اُس نے ایک شخص کو قتل نہیں کیا بلکہ یوں سمجھو کہ اُس نے تمام لوگوں کو قتل کر ڈالا۔ ایک جان کا اتلاف پوری نسل انسانی کے اتلاف کے برابر ہے۔ یہ بات حضور علیہ السلام نے یوں سمجھائی کہ دنیا میں جب بھی کوئی قتل ناحق ہوتا ہے الا كان كفل على ابن ادم تو ایک حصہ گناہ آدم علیہ السلام کے اُس بیٹے پر بھی ڈالا جاتا ہے جس نے دنیا میں انسانی قتل کی ابتداء کی تھی لانه اول من سن القتل کیونکہ جرم قتل کا وہی موجد ہے۔ کسی کام کی ابتدا کرنے والا اُس کے پیچھے آنے والوں کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ کام اچھا ہو یا بُرا، موجد کو اس کا حصہ ملتا رہتا ہے۔ اگر کسی نے اچھا طریقہ جاری کیا ہے، اپنے نبی کی سنت کا اجرا کیا ہے تو اس کا عمل کرنے والوں کے ساتھ ساتھ ایسے کام کی ابتدا کرنے والے کو بھی برابر اجر ملتا رہیگا۔ اسی طرح اگر کسی نے بُرے کام کی بنیاد رکھی ہے، کسی بدعت کا اجرا کیا ہے تو اس بُرے کام کے ہر عامل کے گناہ کے ساتھ ایک ایک گناہ اُس کے جاری کنندہ پر بھی ڈالا جاتا رہے گا۔ الغرض! یہاں یہ فرمایا کہ جس نے ایک آدمی کو قتل کیا، اُس نے سب لوگوں کو قتل کیا، کیونکہ ہر قتل کا گناہ اس کے موجد کے نامہ اعمال میں بھی درج ہوتا رہے گا۔

حفاظتِ جان

جس طرح ایک آدمی کا قتل سب آدمیوں کا قتل ہے اسی طرح فرمایا۔ وَمَنْ اَحْیَاھَا جس نے ایک آدمی کو زندہ رکھا فَکَاَنَّمَا اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا اُس نے گویا سب آدمیوں کو زندہ رکھا۔ مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے شرو فساد کے خلاف کسی ایک انسانی جان کی حفاظت کی، اُس نے گویا تمام نسلِ انسانی کی حفاظت کا فریضہ انجام دیا۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں انسانی جان کی قدر و قیمت بہت زیادہ ہے اور اس نے ایک جان کی حفاظت کو پوری نوعِ انسانی کی حفاظت کے برابر قرار دیا ہے۔
ابن ماجہ شریف میں سندِ حسن کے ساتھ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے لزوال الدنیا اھون علی اللہ من قتل رجل مؤمن اللہ تعالیٰ کے نزدیک کسی ایک مومن آدمی کا قتل پوری دنیا کی تباہی سے بھی بڑا ہے۔ بیہقی شریف کی روایت میں یہ بھی آتا ہے وَلَوْ اَنَّ اَھْلَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِشْتَرَکُوْا فِیْ قَتْلِ رَجُلٍ لَاَدْخَلَھُمُ اللہُ النَّارَ اگر زمین و آسمان کی ساری مخلوق مشترکہ طور پر کسی قتل میں شریک ہو تو اللہ تعالیٰ سب کو جہنم میں ڈال دے گا۔ ایک انسانی جان کا اتنا بڑا احترام اور اتنی قدر و قیمت ہے۔
حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاصؓ کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے بیت اللہ شریف کو خطاب کر کے فرمایا مَا اَعْظَمَکَ وَاَعْظَمَ حُرْمَتَکَ وَاَطْیَبَکَ یعنی اے اللہ کے گھر! تو کتنا پاک ہے اور تیری حرمت کتنی عظیم ہے مگر میں کہتا ہوں کہ اللہ کے ہاں ایک مومن کی جان کی حرمت تجھ سے بھی زیادہ ہے۔ بہر حال احترام اور حفاظتِ جان کا یہ قانون بنی اسرائیل کو خطاب کر کے سمجھایا کیونکہ اس معاملہ میں وہ حد سے تجاوز کر چکے تھے۔

قتل کی فراوانی

حضور علیہ السلام نے اہلِ ایمان کو بھی فرمایا تھا کہ ایک وقت ایسا آنے گا جب تم بھی یہود و نصاریٰ کے نقشِ قدم پر چل نکلو گے، جو جو قباحتیں ان میں پائی جاتی تھیں وہ تم میں بھی عود کر آئیں گی۔ اگر وہ قتلِ ناحق کے عادی بن

چکے تھے تو تم بھی ان سے پیچھے نہیں رہو گے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اہل ایمان میں سب سے پہلا قتل ناحق حضرت عثمانؓ کا ہوا مسلمانوں کے درمیان تلوار چلنے کی ابتداء ہوئی جو اب تک جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گی۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا کہ ہمارے ملک میں انگریزی تعزیراتی قانون کی بدولت قتلوں کی بھرمار ہے۔ ایک اخباری رپورٹ کے مطابق پاکستان کے ایک ضلع میں ایک سال کے اندر ایک ہزار قتل ہوئے۔ صدر ایوب کے زمانہ میں متعلقہ سیکرٹری نے اسمبلی میں یہ رپورٹ پیش کی تھی کہ غالباً تین سال کے عرصہ میں اس ملک عزیز میں سولہ ہزار قتل ہوئے۔ قتل کی فراوانی کا اندازہ یہ ہے کہ میں نے خود اخبار میں پڑھا کہ ایک سگریٹ کے تنازعہ میں ایک آدمی نے دوسرے کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ معمولی معمولی باتوں پہ قتل ناحق کی یہ واردتیں انسانی خون کی ارزانی پہ گواہ ہیں حالانکہ اسی چیز کو روکنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسداد قتل کا قانون بنی اسرائیل کو سمجھایا ہے۔

مسرفین کی کثرت

فرمایا وَلَقَدْ جَاءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ہمارے رسول بنی اسرائیل کے پاس واضح باتیں لے کر آتے رہے۔ بینات سے مراد محض معجزات نہیں بلکہ احکام اور دلائل بھی مراد ہیں اگرچہ ہمارے رسول واضح تعلیم اور اصول لے کر آتے رہے۔ انہوں نے اللہ کے عاید کردہ حدود و قیود ان پہ واضح کر دیے اس کے باوجود ثُمَّ إِنَّ كَثِيرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْأَرْضِ لَمُسْرِفُونَ پھر اس کے بعد ان میں اکثر لوگ زمین میں اسراف کرنے والے ہیں سابقہ انبیاء نے بھی بالوضاحت حلت و حرمت اور جائز و ناجائز کے قوانین بیان فرمائے اور پھر سب سے آخر میں آنے والے ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی واضح کر دیا کہ مَا مِنْ شَيْءٍ يُقَرِّبُكُمْ إِلَى الْجَنَّةِ وَيُبَاعِدُكُمْ مِنَ النَّارِ یعنی جنت کے قریب اور دوزخ سے بعید کرنیوالی تمام چیزیں تمہیں بتادی

گئی ہیں تاکہ کل کو کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہمیں علم نہیں ہوا۔ اب ان کے پاس کوئی حجت باقی نہیں رہی۔ یہ لوگ اپنی غفلت، جہالت، اور نادانی پر پچھتائے جائیں گے۔ قتل ناحق اور دیگر عیوب سے بچنے کی تدابیر بتلا دی ہیں، گناہ اور ان کے مدرجات واضح کر دیئے ہیں۔ گناہوں سے بچنے کی تدابیر واضح کر دی ہیں، سوسائٹی میں امن وامان کے قیام کے اصول سمجھا دیئے ہیں اور معاشرے کے افراد کی عزت و احترام کا طریقہ بتا دیا ہے لہٰذا اب یہ ان کا کام ہے کہ پوری دنیا سے فتنہ و فساد کا قلع قمع کر کے معاشرے کو امن کا گہوارہ بنا دیں۔

اسراف کا لفظی معنیٰ حد اعتدال سے آگے بڑھنا ہے معاملہ کھانے پینے کا ہو یا لباس کا، مسئلہ سیاسی ہو یا معاشی کسی بھی موقع پر حد سے آگے نہیں بڑھنا چاہیئے۔ اگر ایک روپے کا کھانا کفایت کر سکتا ہے تو دس روپے خرچ کرنا ضرور اسراف ہوگا۔ حدودِ شریعت کو توڑ کر حرام چیزوں کی طرف رغبت کرنا اسراف ہی تو ہے۔ اللہ نے فرمایا "كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا" مگر حدِ اعتدال سے آگے نہ بڑھو۔ بے جا خرچ نہ کرو۔ یہاں پر یہی بات سمجھائی گئی ہے۔ کہ ہمارے رسول واضح احکام اور دلائل لے کر آئے ہیں مگر اس کے باوجود لوگوں کی اکثریت اسراف و تبذیر کا شکار ہے انہیں حد اعتدال سے آگے نہیں بڑھنا چاہیئے۔ اسی سلسلہ میں اب اگلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے چوری اور ڈاکے کا قانون بتایا ہے اور مرتکبین کی سزا کا ذکر کیا ہے۔

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْىٌ فِى الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۳۳﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۴﴾ ع ۵

ترجمہ: بیشک جزا اُن لوگوں کی جو لڑتے ہیں اللہ اور اُس کے رسول سے، اور کوشش کرتے ہیں زمین میں فساد کی یہ ہے کہ اُن کو قتل کیا جائے یا انہیں سولی پر لٹکایا جائے یا کاٹے جائیں اُن کے ہاتھ اور پاؤں اُلٹے سیدھے، یا اُن کو دُور کر دیا جائے زمین سے۔ یہ اُن کے لیے رسوائی ہے دُنیا میں اور اُن کے لیے آخرت میں عذابِ عظیم ہے ﴿۳۳﴾ مگر وہ لوگ جنہوں نے توبہ کرلی پیشتر اس کے کہ تم اُن پر قابو پالو، تو جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ بخشش کرنے والا اور مہربان ہے ﴿۳۴﴾

ربطِ آیات

گذشتہ آیات میں اللہ نے آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا ذکر کیا تھا جن میں سے ایک نے ظلم و تعدی کے ساتھ دوسرے کو قتل کر دیا اور اس ضمن میں اللہ تعالیٰ نے قتل ناحق کی مذمت بیان فرمائی۔ چونکہ بنی اسرائیل میں یہ بیماری بکثرت موجود تھی اس لیے اللہ نے فرمایا کہ ہم نے بنی اسرائیل کی تعلیم کے لیے یہ بات

لکھدی کہ جو کوئی کسی شخص کو بغیر قتل نفس اور بغیر فساد فی الارض کے قتل کرتا ہے وہ گویا تمام انسانوں کا قاتل ہے کیونکہ دنیا میں جس قدر قتل ناحق ہوتے ہیں ان سب کا ایک ایک وبال سب سے پہلے قاتل پر بھی پڑتا ہے۔ ایک شخص کا قاتل پوری دنیا کے انسانوں کے قتل کی راہ ہموار کرتا ہے۔ اس کے برخلاف فرمایا کہ جو شخص کسی ایک انسانی جان کی حفاظت کرتا ہے وہ گویا تمام نسلِ انسانی کی حفاظت میں شریک ہوتا ہے۔

اب آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے فساد کی ایک اور قسم کا ذکر کر کے مفسد کو دی جانے والی سزا کو بیان فرمایا ہے۔ لفظ فساد اپنے اندر بہت وسیع معانی رکھتا ہے۔ ویسے تو کفر، شرک اور قتل ناحق فساد ہی کی اقسام ہیں۔ کسی کے مال و جان کو نقصان پہنچانا، کسی کی عزت و آبرو سے کھیلنا فساد ہی کے حصے ہیں مگر اس آیت کریمہ میں فساد کی ایک قسم حرابہ یا ڈکیتی کا ذکر کر کے اُس کی سزا کو بیان فرمایا ہے۔ اس سے اگلی آیات میں جہاد فی سبیل اللہ اور تقویٰ کا بیان ہے اور اس کے بعد پھر فساد ہی کی ایک قسم چوری اور اس کی سزا کا ذکر ہے۔

ڈاکہ کی تعریف

چوری اور ڈاکہ میں فرق ہے۔ چوری کی صورت میں تو خفیہ طریقے سے کسی کا مال حاصل کیا جاتا ہے۔ مگر ڈاکے میں علی الاعلان بزورِ قوت مال حاصل کیا جاتا ہے اور اگر ضرورت پڑے تو جان کو مارنے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا۔ ڈاکو جب ڈاکہ کے ارادہ سے نکلتے ہیں تو وہ مطلوبہ کام کے لیے افرادی قوت جمع کرتے ہیں اسلحہ مہیا کرتے ہیں، اپنی جان کی حفاظت کا بندوبست کرتے ہیں اور پھر اس ظلم و تعدی کا آغاز کرتے ہیں۔ چونکہ ڈاکو پوری تیاری کے ساتھ اپنے کام کا آغاز کرتے ہیں اس لیے وہ حملہ آور ہو کر مال و اسباب چھین لیتے ہیں اور بعض اوقات عورتوں کو بھی اغواء کر لیتے ہیں۔ چونکہ مخالف فریق اس ناگہانی آفت کے لیے پہلے سے تیار نہیں ہوتا

اس لیے بسا اوقات ڈاکوؤں سے تعرض کرتا ہے تو وہ اس کی جان تلف
کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ لہٰذا عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ اس قسم کے
حالات میں لوگ خود ہی سب کچھ ڈاکوؤں کو پیش کر دیتے ہیں اور اگر کوئی
حیل و حجت کرتا ہے تو اُسے مال کے ساتھ جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔

ڈاکے کی بیماری قدیم زمانے سے چلی آرہی ہے اور ساری دنیا اس میں
مبتلا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ متمدن اور ترقی یافتہ کہلانے والے
ممالک میں ڈاکے کی شرح ترقی پذیر ممالک کی نسبت بہت زیادہ ہے
مشرقی ممالک میں تو یہ وبا موجود ہے مگر امریکہ اور برطانیہ جیسے صفِ اول کے
ملک بھی اس سے محفوظ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو صاف فرما دیا ہے۔ "وَاللّٰہُ
لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ" کہ وہ فتنہ و فساد کو بالکل پسند نہیں کرتا۔ مگر دنیا کا
شاید ہی کوئی خطہ ڈاکے جیسے قبیح جرم سے مامون ہو۔

اسلامی تعزیرات

قرآن پاک میں حدود کا ذکر بہت مختصر ہے البتہ تعزیرات کا وسیع بیان
موجود ہے۔ حدود میں چوری، شراب نوشی، قذف، زنا، ارتداد، بغاوت
اور ڈاکہ شامل ہیں۔ جرائم کی نوعیت کے اعتبار سے اسلام نے تین قسم کی
سزائیں مقرر کی ہیں۔ حدود مقررہ تعزیرات ہیں اور ان میں کمی بیشی نہیں کی جا
سکتی۔ دوسری قسم قصاص ہے۔ یہ سزا قتل ناحق کے جرم میں دی جاتی ہے
سزاؤں کی تیسری قسم تعزیرات ہیں جن کا باب بہت وسیع ہے۔ اسلامی
نظام میں تعزیرات کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ البتہ مختلف جرائم کی
سزا تجویز کرنا مسلمان حاکم کی صوابدید پر ہے۔ وہ جرم کی نوعیت کے اعتبار
سے جو سزا مناسب سمجھے، عائد کر دے۔ تاہم اصولی بات یہ ہے کہ ظلم
کسی صورت میں بھی قابلِ برداشت نہیں ہے

اللہ اور رسول سے جنگ

ارشاد باری تعالیٰ ہے اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ
وَرَسُوْلَہٗ بیشک سزا اُن لوگوں کی جو اللہ اور اُس کے رسول کے ساتھ جنگ کرتے

ہیں وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں
اللہ تعالیٰ نے یہاں پہ دو جرائم کا تذکرہ کر کے پھر اُن کی سزا بیان فرمائی
ہے یعنی اللہ اور اُس کے رسُول کے ساتھ جنگ اور فساد فی الارض
امام ابوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت کریمہ میں اللہ اور اس کے
رسول کے ساتھ لڑائی کو حقیقی معنوں پہ محمول نہیں کیا جا سکتا۔ رسول کے
ساتھ لڑائی تو پھر بھی کسی حد تک قابلِ فہم ہے مگر اللہ تعالیٰ کی ذات
کے ساتھ جنگ کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ وہ تو قادرِ مطلق ہے جب
چاہے کسی کو فی الفور فنا کر دے، اُس کے ساتھ مقابلہ کی کون جرأت کر
سکتا ہے۔ اسی لیے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہاں پہ اللہ کے ساتھ لڑائی
کو حقیقی معنی کی بجائے مجازی معنوں پہ محمول کیا جاتا ہے اور اس کا مطلب
یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک مامون لوگوں کے ساتھ لڑائی کرنا خود اللہ تعالیٰ
کے ساتھ جنگ کرنے کے مترادف ہے۔ مسلمان کی جان و مال محفوظ ہے۔
اسی طرح مسلمان ملک میں خدا کے قانون کی بالادستی کو تسلیم کرنے والے غیر مسلم
ذمی بھی مامون ہیں۔ اُن کے مال، جان، عزت، آبرو کی حفاظت اسلامی
حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ اگر کوئی فرد یا گروہ مامون لوگوں کے ساتھ
تعرض کرتا ہے، اُن کے مال چھینتا ہے، جان کے ساتھ کھیلتا ہے یا اُن
کی عزت و آبرو کے درپے ہوتا ہے، تو وہ گویا اللہ کے قائم کردہ امن
کو تباہ کرتا ہے اور اس طرح خود اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں جنگ کے لیے
آ کھڑا ہوتا ہے۔ اللہ سے جنگ کی مثال دوسرے مقام پر بھی ملتی ہے
فرمایا اگر سود خوری سے باز نہیں آتے "فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَ
رَسُولِهِ" تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔
یہاں پر بھی اللہ اور رسول کے ساتھ جنگ کو انہی معانی میں لیا گیا ہے۔
امام ابوبکر جصاصؒ نے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام

نے حضرت معاذؓ سے فرمایا، اے معاذؓ! تھوڑی سی ریاکاری بھی شرک میں داخل ہے۔ ریاکاری عملی شرک ہے اور اس سے بچنا چاہیئے۔ دوسری بات یہ فرمائی مَنْ اٰذٰی وَلِیًّا فَقَدْ بَارَزَنِیْ بِالْحَرْبِ یعنی اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے کہ جس نے میرے ولی کو ایذا پہنچائی اس نے مجھے جنگ کا چیلنج دیا۔ یہاں بھی مجازی معنیٰ مراد ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ آمنے سامنے جنگ تو نہیں کرتا۔ مقصد یہی ہے کہ قانون کی خلاف ورزی کرنا، امن وامان کو تباہ کرنا گویا خدا تعالیٰ سے لڑائی کرنا ہے۔ کسی ہستی کے نافذ کردہ قانون کی خلاف ورزی خود اُس ہستی کے ساتھ دشمنی کے برابر ہے۔ اللہ اور اُس کے رسول نے تو امن قائم کرنے کا حکم دیا ہے۔ اب جو ان کے اس قانون کو توڑتا ہے گویا خدا کے ساتھ جنگ کرتا ہے۔ بہر حال یہاں پر حقیقی جنگ مراد نہیں ہے بلکہ اللہ نے یہ لفظ مبالغہ کے طور پر فرمایا ہے۔

بعض فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ جنگ کرنے سے مراد اُس کے بندوں سے جنگ کرنا ہے۔ "یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ" کی یہی توجیہہ کی جاتی ہے کہ منافقین اللہ تعالیٰ کو دھوکہ تو نہیں دے سکتے، یہ لفظ مجازاً اس کے بندوں کے لیے استعمال کیا گیا کہ وہ مومنوں کو دھوکا دیتے ہیں اسی طرح "یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ" سے مراد اللہ سے جنگ نہیں بلکہ اُس کے بندوں کے ساتھ جنگ مراد ہے۔ اس طرح یہ مجاز مرسل ہو جائیگا جس میں اولیاء کو مضاف محذوف ماننا پڑے گا اور مطلب یہ ہوگا یُحَارِبُوْنَ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ یعنی جو اللہ اور رسول کے دوستوں سے لڑتے ہیں اُن کی سزا یہ ہے جہاں تک اس آیت میں بیان کردہ دوسرے جرم فساد فی الارض کا تعلق ہے تو کفر اور شرک سے بڑھ کر اور کیا فساد ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قانون کی خلاف ورزی اور گناہ کا ارتکاب زمین میں فساد ہی تو ہے۔ جو شخص دوسرے شخص پر ظلم و تعدی کرتا ہے، وہ فساد فی الارض کا مرتکب ہوتا ہے اور

سے ایسے ہی لوگوں کے متعلق اس آیت میں سزا کا ذکر کیا گیا ہے ۔

امن وامان کی ذمہ داری

ملک میں امن و امان قائم کرنے کی ذمہ داری اسلامی حکومت اور جماعت المسلمین پر عائد ہوتی ہے ، ظاہر ہے کہ حکومت جماعت ہی کی فرع ہے ۔ لہذا یہ جماعت اور حکومت دونوں کا فرض ہے ۔ کہ وہ خود قانون کی پابندی کرے اور امن وامان کے مسئلہ سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ایسی انتظامیہ وجود میں لائے جو عوام الناس کو اسلامی قانون پر عملدرآمد پر مجبور کر سکے ، اللہ نے فرمایا ہے کہ جہاد کی ضرورت اس وقت تک ہے جب تک فتنہ مکمل طور پر ختم ہو کر "وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ" دین خالصتاً اللہ کا قائم نہ ہو جائے ، لوگ خدا کے قانون کی پابندی کرنے لگیں ، معاشرے کے ہر فرد کو امن وامان اور اس کا جائز حق حاصل ہو اور ہر شخص ظلم و زیادتی سے محفوظ ہو ۔

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اپنی معرکتہ الآرا کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں کہ بعثت انبیاء کے مقاصد میں ایک یہ مقصد بھی شامل ہے رفع التظالم من بين الناس لوگوں کے درمیان ظلم کو رفع کرنا ۔ انبیائے کرام کی بعثت کا اولین مقصد تو اصلاحِ عقیدہ ہوتا ہے تاکہ انسان کی فکر کو درست کیا جائے تاہم ایک درجے پر ظلم کا قلع قمع بھی انبیاء کے مشن میں داخل ہے ۔ چنانچہ تمام انبیاء اس فرض کو انجام دیتے آئے ہیں اور ظلم کے خلاف آواز اٹھاتے رہے ہیں ۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا اس ملک میں ابھی تک انگریزی قانون رائج ہے جو بلاشبہ امن وامان کے قیام میں ناکام ہو چکا ہے ۔ بلکہ ہماری انتظامیہ کی حالت یہ ہے کہ یہ خود بڑے بڑے جرائم میں ملوث ہوتی ہے اور مجرموں کو ان کی پشت پناہی حاصل ہوتی ہے ۔ جن لوگوں کے فرائض میں امن وامان کی نگرانی ہو اور وہ اس کام کے لیے باقاعدہ تنخواہ وصول کرتے ہوں ، اگر وہی لوگ مجرموں

لہ حجۃ اللہ البالغہ صہ ۲۳۷ (فہاس)

کی حوصلہ افزائی کرنے لگیں تو امن کیسے قائم ہو سکتا ہے۔ ہماری پولیس سے کون واقف نہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ شاید ہی ڈکیتی کی کوئی واردات ایسی ہو جس میں خود پولیس کو دخل حاصل نہ ہو۔ نظام سرمایہ دارانہ ہو یا اشتراکی، ملوکیت ہو یا جمہوریت، جب تک قانون نافذ کرنے والے ادارے اپنے فرض کو کما حقہٗ ادا نہیں کریں گے۔ لوگ ظلم و جور کی چکی میں پستے رہیں گے۔

جرم اور سزا

الغرض اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں جرم ڈاکہ کی مختلف نوعیتوں اور اُن کی سزا کا ذکر کیا ہے۔ اس جرم میں واردات کی نوعیت چار اقسام سے ہو سکتی ہے۔ پہلی صورت یہ ہے۔ کہ ڈاکہ کا ارتکاب ہوا ہے مگر مجرمین مال حاصل نہیں کر سکے بلکہ صرف قتل ناحق کے مرتکب ہوئے ہیں۔ تو فرمایا ایسے مجرمین کی سزا یہ ہے اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا کہ ان کو بھی سزا کے طور پر قتل کیا جائے اور دوسری صورت یہ ہے کہ ڈاکو مال بھی لے گئے ہیں اور کسی جان کو بھی تلف کیا ہے۔ ایسے مجرمین کے متعلق فرمایا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا یا اُن کو سولی پر لٹکا دیا جائے۔ چونکہ اس واردات میں دو جرائم کا ارتکاب ہوا ہے۔ لہٰذا اس کے لیے سزائیں بھی دو تجویز کی گئی ہیں۔ پہلے مجرم کو زندہ سولی پر لٹکایا جائے گا پھر نیزے مار مار کر اُس کو ہلاک کر دیا جائیگا۔ یہ حاکم کی صوابدید پر منحصر ہے۔ کہ مجرم کو کھلے عام سولی پر لٹکائے اور پھر عبرت کے لیے دو یا تین دن جس قدر مناسب سمجھے لٹکتا رہنے دے۔

ڈاکہ کی واردات کی تیسری قسم یہ ہو سکتی ہے۔ کہ ڈاکو مال حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں، البتہ کسی جان کا ضیاع نہیں ہوا۔ ایسی صورت میں فرمایا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ ڈاکو کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کاٹ دیا جائے۔ مِنْ خِلَافٍ کا مطلب یہ ہے۔ کہ اگر ہاتھ دایاں کاٹا ہے تو پاؤں بایاں کٹے گا اور اگر ہاتھ بایاں ہے تو پاؤں دایاں ہوگا۔ اب چوتھی صورت یہ رہ گئی ہے کہ

ڈاکہ تو ڈالا گیا ہے مگر ڈاکو اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ نہ تو کوئی مال و متاع حاصل کر سکے ہیں اور نہ کسی جان کو نقصان پہنچا ہے۔ مثال کے طور پر فریق ثانی کو بر وقت اطلاع مل گئی ہے اور وہ چوکس ہو گئے ہیں۔ یا آگے سے مقابلہ ہو گیا ہے اور ڈاکو ناکام واپس لوٹ گئے ہیں۔ تو ایسی صورت میں مجرمین کی تعزیر کے متعلق فرمایا اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ یعنی جرم کے مرتکبین کو زمین سے ہٹا دیا جائے۔

امام شافعیؒ کے نزدیک زمین سے ہٹا دینے کا مطلب یہ ہے کہ مجرم کو ملک بدر کر دیا جائے۔ یہ بھی اچھی خاصی سزا ہے کہ کسی کو گھر بار اور وطن سے دُور کر دیا جائے۔ مگر امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں۔ کہ اگر ایسے شخص کو ملک بدر کیا گیا تو جہاں جائیگا، ہو سکتا ہے وہاں اس جرم کا پھر ارتکاب کرے۔ لہٰذا آپ کی رائے میں۔ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ کا مطلب یہ ہے کہ اُسے قید میں ڈال دیا جائے۔

ڈاکہ کے مقام کے ضمن میں بھی فقہائے کرام کے درمیان قدرے اختلاف پایا جاتا ہے امام ابُوحنیفہؒ کے نزدیک شہری آبادی میں ڈاکہ ڈالنے کی نوبت نہیں آتی کیونکہ وہاں پر پولیس اور دیگر حفاظتی انتظام ہوتے ہیں لہٰذا ڈاکہ کا اطلاق کسی شہر میں کی گئی واردات پر نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف امام شافعیؒ اور امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ ڈاکے کی واردات خواہ کسی بھی مقام پر ہو، وہ ڈاکہ ہی کہلائے گی اور جرم کی نوعیت کے مطابق سزا دی جائیگی ڈاکہ ڈالنے کے لیے جن لوازمات کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً افرادی قوت، اسلحہ، سواری (گھوڑا، موٹر سائیکل، کار) وغیرہ کے ساتھ اگر ڈاکہ ڈالا گیا ہے تو ایسی واردات خواہ شہر، دیہات یا قصبہ میں ہو بہرحال ڈاکہ تصور ہوگی اور مجرموں کو مناسب سزا دی جائیگی۔

دنیا اور آخرت کی رسوائی

اِن چاروں اقسام کی سزا کے متعلق فرمایا ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ

فِی الدُّنْیَا یہ ان کے لیے دنیا کی رسوائی ہے۔ جب سولی پر لٹکائے جائیں، ہاتھ پاؤں کٹیں گے یا قید و بند کی سزا ہوگی تو دنیا میں بدنامی کا باعث ہوگی۔ وَلَھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ایسے لوگوں کو آخرت میں بھی بہت بڑا عذاب ہوگا۔ گویا دنیا اور آخرت ہر دو مقامات پر مجرمین کے لیے ذلت و رسوائی کا سامان ہوگا۔

اس آیت سے امام ابوحنیفہؒ استدلال کرتے ہیں کہ کسی جرم میں حد کا قیام اُس جرم کا کفارہ نہیں بن جاتا بلکہ یہ تو زجر یعنی تنبیہ ہوتی ہے البتہ بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے۔ کہ جب کسی شخص پر حد جاری ہوگئی تو وہ اس کے لیے کفارہ بن گئی۔ امام صاحب فرماتے ہیں۔ کہ یہ سزا آخرت کے لیے کفارہ بن جاتی تو پھر اس آیت کریمہ میں دنیا کی رسوائی اور آخرت کے عذاب کا علیحدہ علیحدہ ذکر نہ کیا جاتا۔ — معلوم ہوا ہے کہ حد یا تعزیر دنیا کے نظام کو درست رکھنے کے لیے ضروری ہے اور توبہ آخرت کے عذاب سے بچنے کے لیے ہے۔ عام طور پر جب کوئی مسلمان کسی جرم میں سزا پاتا ہے تو وہ توبہ کر لیتا ہے اور وہ آخرت کے عذاب عظیم سے بچ جاتا ہے۔ البتہ اگر کوئی آدمی جرم کو جائز سمجھتا ہے تو ایسے شخص کے لیے حد یا تعزیر دنیا کی رسوائی ہے اور آخرت میں بہت بڑا عذاب بھی ہے۔

توبہ قبل از گرفتاری

فرمایا اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَیْھِمْ ہاں جس شخص نے اُس پر قابو پائے جانے سے قبل توبہ کر لی، وہ اپنے جرم پر نادم ہوگیا، تو پھر اُس پر حد جاری نہیں ہوگی، اُسے صرف حق تلفی کا ازالہ کرنا ہوگا۔ اگر کوئی حق تلفی ہوئی ہے۔ کسی سے کوئی چیز چھینی ہے تو واپس کرے اُس پر حد جاری نہیں ہوگی۔ فَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ اللہ تعالیٰ غفور اور رحیم ہے۔ اگر اس نے سچے دل سے توبہ کر لی ہے تو وہ معافی کا مستحق ہے۔ یاد رہے کہ معافی کا قانون صرف چوری

کے جرم میں ہے۔ باقی قابلِ حد جرائم زنا، قذف، شراب نوشی، ارتداد، وغیرہ میں جرم ثابت ہونے پر حد لازماً جاری ہوگی۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَٱبْتَغُوٓا۟ إِلَيْهِ ٱلْوَسِيلَةَ وَجَٰهِدُوا۟ فِى سَبِيلِهِۦ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۳۵﴾ إِنَّ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ لَوْ أَنَّ لَهُم مَّا فِى ٱلْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُۥ مَعَهُۥ لِيَفْتَدُوا۟ بِهِۦ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ ٱلْقِيَٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۳۶﴾ يُرِيدُونَ أَن يَخْرُجُوا۟ مِنَ ٱلنَّارِ وَمَا هُم بِخَٰرِجِينَ مِنْهَا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيمٌ ﴿۳۷﴾

ترجمہ :- اے ایمان والو ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور تلاش کرو اس کی طرف وسیلہ اور جہاد کرو اُس کے راستے میں تاکہ تم فلاح پا جاؤ ﴿۳۵﴾ بیشک جن لوگوں نے کفر کیا، اگر اُن کے لیے ہو جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب اور اُس جیسا اور بھی ہو اُس کے ساتھ تاکہ وہ فدیہ دیں اس کو قیامت کے دن عذاب سے تو نہیں قبول کیا جائے گا اُن سے اور اُن کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿۳۶﴾ وہ چاہیں گے کہ نکل جائیں دوزخ کی آگ سے اور نہیں ہوں گے وہ نکلنے والے اُس سے اور اُن کے لیے عذاب ہو گا دائمی ﴿۳۷﴾

ربط آیات

بنی اسرائیل کے نقضِ عہد کا تذکرہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام

کے دو بیٹوں کا ذکر کیا۔ ایک بیٹے نے ظلم و تعدی کی اور دوسرے کو ناحق قتل کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو حفاظتِ جان کی تعلیم دی اور فرمایا کہ ایک انسانی جان کا قتل پوری نسل انسانی کے قتل کے برابر ہے اور ایک جان کی حفاظت تمام انسانی سوسائٹی کی حفاظت کے مترادف ہے۔ پھر اللہ نے فساد فی الارض کی مذمت بیان فرمائی اور اس کی ایک قسم ڈکیتی کی سزا کا ذکر کیا۔ اس درس کے بعد فساد فی الارض کی دوسری قسم سرقہ کا بیان ہوگا تاہم درمیان میں اہل ایمان سے خطاب کر کے بعض چیزوں کا مطالبہ کیا گیا ہے کیونکہ بنی اسرائیل میں پائی جانے والی خرابیوں سے بچنے کے لیے مطلوبہ چیزوں کی پابندی ضروری ہے۔

بنی اسرائیل چونکہ جہاد سے گریز کرتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو جہاد کا حکم دیا ہے۔ وہ قوم فسق و فجور میں مبتلا تھی، اہل ایمان کو اس سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔ بنی اسرائیل ظلم و زیادتی کے مرتکب ہوتے تھے۔ قتل ناحق اور ڈکیتی جیسی قبیح حرکات کرتے تھے، اللہ نے اہل ایمان کو تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ آج کے درس میں کفار کے بُرے انجام سے بھی خبردار کیا گیا ہے۔ پھر اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ قیامت کے دن کفار کی طرف سے زمین بھر مال و دولت بھی فدیہ میں قبول نہیں کیا جائے گا، بلکہ وہ سخت عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ آخرت میں کام آنے والی چیزیں تقویٰ، اطاعت عدل و انصاف اور جہاد فی سبیل اللہ وغیرہ ہیں۔

خوفِ خدا

ارشاد ہوتا ہے۔ یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ یعنی اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو۔ تقویٰ یا خوفِ خدا کی اولین علامت یہ ہے کہ انسان بدعقیدگی سے بچ جائے، شرک اور کفر کو قریب نہ آنے دے۔ اس کے بعد دوسرے نمبر پر معاصی ہیں، انہیں ترک کرنا ہوگا، کافر،

مشرک اور منافق متقی نہیں ہو سکتا۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں۔ کہ تقویٰ کا مفہوم ہے محافظت بر حدود شرعیہ یعنی شریعت کی قائم کردہ حدود کی حفاظت کرنا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول ہے۔ کہ متقی وہ لوگ ہیں جو کفر، شرک، نفاق اور معاصی سے بچتے ہیں اور نیکی پر عمل کرتے ہیں۔ عدل و انصاف اُن کا خاصہ اور لازمہ ہوتا ہے۔

خوفِ خدا سے مراد ایسا ڈر نہیں جیسا کہ سانپ یا بچھو سے آتا ہے۔ بلکہ اس خوف سے مراد یہ ہے کہ انسان کہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی خوشنودی سے دور نہ جا پڑے۔ انسان کے دل میں یہ خوف ہمیشہ موجود رہنا چاہیئے کہ کوئی کام اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف نہ ہو جائے۔

وسیلہ کی تلاش

فرمایا اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ اور اللہ کی طرف وسیلہ تلاش کرو۔ لفظ وسیلہ متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ وسیلہ کا معنی قرب ہوتا ہے۔ اس کا دوسرا معنی مرتبہ اور پھر حاجت پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ تاہم مفسر قرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حسن بصریؒ اور دیگر مفسرین فرماتے ہیں کہ یہاں پر وسیلہ تلاش کرنے کا مطلب ہے تَقَرَّبُوْٓا اِلَيْهِ بِطَاعَتِهٖ وَالْعَمَلِ بِمَا يُرْضِيْهِ یعنی اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرو۔ اس کی اطاعت کے ساتھ اور اس چیز کے ساتھ جو اللہ کو راضی کرتی ہے۔

لفظ وسیلہ س اور ص دونوں کے ساتھ آتا ہے اور اس کا معنی قرب اور اتصال ہے۔ عربی شاعر کہتا ہے ؎

اِذا غفل الواشون عدنا لوصلنا
وَ عادت التصافی بیننا والوسائل

جب چغل خور غافل ہوتے ہیں تو ہم اپنے قرب کی طرف لوٹ آتے ہیں اور ہماری محبت اور قرب کے تمام وسائل پلٹ آتے ہیں۔ مطلب یہ کہ

عربی زبان میں وسیلہ قرب کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

وسیلہ جنت میں ایک اعلیٰ مقام کا نام بھی ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان مبارک ہے کہ وسیلہ ایک بلند ترین مقام ہے اور وہ اللہ کی مخلوق میں سے صرف ایک شخص کو ملیگا۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ وہ میں ہی ہوں گا، لہٰذا اذان کے بعد مجھ پہ درود پڑھا کرو اور میرے لیے وسیلے کی دُعا کیا کرو۔ اَللّٰھُمَّ رَبَّ ھٰذِہِ الدَّعْوَۃِ التَّآمَّۃِ وَالصَّلٰوۃِ الْقَآئِمَۃِ اٰتِ مُحَمَّدَنِ الْوَسِیْلَۃَ..... الخ اس دُعا سے امت کے حق میں بھی بہتری ہوگی۔ گویا اُس منزلت کا نام وسیلہ ہے جسے ہم اذان کے بعد دعا میں طلب کرتے ہیں حضرت مولانا شیخ الاسلامؒ فرماتے ہیں کہ وسیلہ حق تعالیٰ کے مقاماتِ قرب میں سے بلند تر مقام ہے۔

عربی میں وسیلہ کا معنیٰ حاجت بھی آتا ہے۔ زمانۂ جاہلیت کا شاعر کہتا ہے ؎

ان الرجال لھم الیك وسیلۃ

ان یاخذوكِ تکحّلی وتخضبی

عورت کو مخاطب کرکے کہتا ہے۔ کہ مردوں کو تیری ضرورت یعنی حاجت ہے، لہٰذا تم آنکھوں پر سرمہ لگالو۔ اور ہاتھوں کو مہندی سے رنگ لو۔

بہرحال اللہ کی طرف وسیلہ تلاش کرنے کا مطلب یہ بھی ہے کہ اس کی طرف توجہ ہو اپنی حاجتیں اُسی سے طلب کرو۔ حاصل کلام یہ کہ تقرب الی اللہ کے جتنے بھی ذرائع ہیں وہ سب وسیلہ کہلا سکتے ہیں۔ تو فرمایا اللہ تعالیٰ کی ناخوشی، بُعد اور ہجر سے ڈر کر اس کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ اور یہ جبھی ہو سکتا ہے جب درمیان کے تمام راستے طے ہو جائیں جن پر چل کر اُس تک پہنچ سکتے ہیں۔

لہ بخاری ص ۹۶ ج ۱ (فیاض)

توسل بالذات

جیسا کہ عرض کیا وسیلہ کا معنیٰ اگرچہ تقرب، اطاعت، حاجت یا منزلہ و مرتبہ ہے مگر تقرب الی اللہ کے ذرائع میں ہر ایسی چیز داخل ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی خوشنودی مدِنظر ہو۔ چنانچہ تقرب الی اللہ کے ذرائع میں انبیاء اولیاء اللہ اور صالحین کی محبت و رفاقت بھی شامل ہے۔ اسی لیے اگر دُعا میں کسی نیک آدمی کا توسل پیش کیا جائے تو یہ ضروری تو نہیں مگر مباح ہے اور اس کا معنیٰ یہ ہوگا کہ ہمیں جو محبت اور الفت اِس بزرگ کے ساتھ ہے اس کے وسیلے سے ہم خدا کی بارگاہ میں دُعا کرتے ہیں۔ کہ وہ ہمارے مقصد کو پورا فرمائے۔ کسی کی ذات کے توسل کا یہی مطلب ہے، نہ یہ کہ ہم اُس بزرگ کو حاضر و ناظر جانتے ہیں اور یہ کہ وہ ہماری ہر بات کو جانتا ہے اور خدا خواہ راضی ہو یا ناراض وہ ہر صورت میں ہمارا کام کروا دیگا۔ توسل کا یہ مطلب تو مشرکین کا عقیدہ ہے۔ یہ تو وہ جبری شفاعت والا مسئلہ آگیا۔ حالانکہ خداوند تعالیٰ کا فیصلہ یہ ہے" مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ" اور سورۃ بقرہ میں یہ بھی ہے" وَلَا تَنْفَعُھَا شَفَاعَۃٌ" یعنی نہ تو اللہ کی اجازت کے بغیر کسی کو شفاعت کی اجازت ہوگی اور نہ ایسی سفارش کوئی فائدہ دیگی۔ باطل پرست یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ہم جو چاہیں کرتے رہیں ہمارے بزرگ ہمیں چھڑا لیں گے، یہ بالکل مشرکانہ اور جبری شفاعت کا عقیدہ ہے۔

حضرت مجدّد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ ہم دُعا کرتے ہیں بِحُرْمَۃِ النَّبِیِّ وَاٰلِہٖ حضور نبی کریم اور آپ کی آل کے واسطہ کے ساتھ۔ یعنی اے اللہ اپنے نبی کی حرمت اور عزت کے ساتھ ہماری دُعا قبول فرما، حرمت، طفیل، وسیلہ اور حق کا یہی معنیٰ ہے ؎

خدایا بحق بنی فاطمہ   کہ بر قولِ ایماں کنی خاتمہ

اے خدایا! حضرتِ فاطمہ کی اولاد کے طفیل ہمارا خاتمہ بالایمان فرما۔

کہیں وجاہت کا ذکر ہے اور کہیں الفت اور محبت کا تذکرہ ہے اولیاء اللہ سے محبت رکھنا بھی نیک عمل ہے۔ ہر نیک آدمی سے اتصال اور الفت ایمان کی نشانی ہے۔ اس لیے ان کے توسل سے دعا کرنا نیک عمل ہی کا واسطہ ہے۔ اس صفت کے بغیر کسی کی ذات کا توسل مراد نہیں ہے۔ بزرگان دین انہی معنوں میں توسل کو جائز قرار دیتے ہیں۔ اس کے برخلاف مشرکین جبری شفاعت کے قائل ہیں کہ خدا راضی ہو یا نہ ہو۔ ہمارے بزرگ ہر حالت میں ہماری مراد پوری کرا دیں گے۔ وہ کہتے تھے "مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ" ہم ان کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کا قرب دلا دیں گے۔ ہم تو براہ راست خدا کی بارگاہ میں نہیں پہنچ سکتے لہذا یہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیتے ہیں۔ چونکہ یہ عقیدہ معبودانِ باطلہ کی عبادت کے مترادف ہے، اس لیے شرک ہے بہرحال حاجت ہر حالت میں اللہ تعالیٰ سے ہی طلب کی جاتی ہے اور نبی یا ولی کی حیثیت محض وسیلہ کی ہوتی ہے۔ کہ دعا مانگنے والا ان سے محبت رکھتا ہے۔

وظیفہ شیئاً للہ

اس لحاظ سے اللہ تعالیٰ سے یوں دعا مانگنا کہ اے اللہ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے وسیلے سے ہماری دعا قبول کر۔ درست ہے مگر لوگ اُلٹ وظیفہ پڑھتے ہیں یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ اس جملے میں شیخ عبدالقادر کو مقصود بنا کر اُن سے حاجت طلب کی جاتی ہے اور درمیان میں اللہ کو وسیلہ بنایا جاتا ہے۔ یعنی اے عبدالقادر! خدا کے وسیلے سے ہمیں کوئی چیز عطا کر دے۔ یہی تو شرک ہے۔ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اپنی کتاب تقویۃ الایمان میں شرک کی تردید میں لکھتے ہیں کہ اگر اس کا یوں الٹ کر دیا جائے۔ یا اللہ شیئاً للشیخ عبدالقادر جیلانی تو درست ہے، یعنی اے مولا کریم! شیخ عبدالقادرؒ کے وسیلہ سے میری حاجت پوری کر دے۔ اس میں مقصود اور حاجت روا خدا تعالیٰ کو تسلیم کیا جائے گا اور شیخ عبدالقادرؒ کی محبت

کا وسیلہ پیش ہو گا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وسیلہ، طفیل یا حرمت کہنا درست نہیں ہے، مگر جیسا کہ عرض کیا کہ یہ کوئی لازمی نہیں ہے بلکہ صرف مباح ہے اگر کوئی ایسا وسیلہ استعمال نہیں کرتا تو ظاہر ہے کہ دعا میں کوئی کمی واقع نہیں ہو گی اور اگر یہ چیز بزرگوں سے ثابت ہے، تو اسے مباح کی حیثیت حاصل ہے۔ بہرحال اس سے ایسا وسیلہ مراد نہیں جو مشرک سمجھتے ہیں۔

توسل بالاعمال

البتہ اعمال کا توسل سب کے نزدیک جائز ہے۔ امام ابن تیمیہؒ اور دیگر بزرگان دین اس پر متفق ہیں۔ بخاری شریف میں تین آدمیوں کا ذکر آتا ہے جو پہاڑ کی ایک غار میں پھنس گئے تھے۔ انہوں نے اپنے اپنے نیک اعمال کے توسل سے دعا مانگی تو اللہ نے ان کو مصیبت سے نجات دے دی تھی۔ لہذا سید علی ہجویریؒ کے توسل سے دعا کرنا۔ اُن کے نیک اعمال ہی کا توسل پکڑنا ہے نہ کہ محض اُن کی ذات کا۔ آپ ایک صالح آدمی تھے۔ آپ ہزاروں آدمیوں کی ہدایت کا ذریعہ بنے۔ لوگ کفر اور شرک سے نکل کر ایمان اور توحید کی روشنی میں آئے، ہم اُن کے پیروکار ہیں، ہمیں اُن سے محبت ہے اے اللہ! اُن کی برکت اور طفیل سے ہماری حاجت پوری کر دے اس طرح تو جائز ہے۔ اور اگر ان بزرگوں کو حاضر و ناظر اور عالم الغیب سمجھے گا اور جبری شفاعت کا عقیدہ رکھے گا کہ یہ ضرور ہی ہمیں چھڑا لیں گے۔ یا خود ہماری حاجت پوری کر دیں گے تو یہ سو فیصدی صریح اور جلی شرک ہے۔ جو کہ قطعی طور پر حرام ہے۔ بہرحال وسیلہ کے لفظ کی تشریح میں نے عرض کر دی۔

جہاد فی سبیل اللہ

فرمایا اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کی طرف وسیلہ تلاش کرو۔ تیسری چیز فرمایا وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ اور جہاد کرو اُس کے رستے میں تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔ جہاد میں ہر قسم کا جہاد یعنی مالی، جانی، قلمی اور زبانی شامل ہے جس طرح کفر کو مٹانے اور ظلم کی بیخ کنی کے لیے جانی اور مالی جہاد کیا جاتا ہے۔ اس طرح قلمی جہاد بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ جن لوگوں نے قرآن پاک کے تراجم

کیے ہیں، بڑی بڑی تفسیریں لکھی ہیں، حدیث کی کتابیں مرتب کی ہیں۔ انہوں نے اپنے قلم سے جہاد کیا ہے۔ قرآن پاک میں جگہ جگہ موجود ہے "جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ" یعنی مال اور جان کے ذریعے جہاد کرو۔ دین کی اقامت اور اسکی تقویت کے لیے جو شخص مال خرچ کرتا ہے بلاشبہ وہ جہاد میں حصہ لیتا ہے۔ نظامِ اسلام کی سربلندی کے لیے روپیہ خرچ کرنا جہاد ہے۔ اس کے برخلاف کھیل تماشے پر خرچ کرنا، فضول عمارت بنانا، عیاشی اور فحاشی پر خرچ کرنا شیطان کے راستے پر خرچ کرنا ہے اگر مسجد یا مدرسے کی تعمیر پر خرچ کیا جائے گا، کتاب کی اشاعت میں تعاون کیا جائیگا تو یہی مال توشہ آخرت بن جائے گا۔

ابوداؤد شریف کی حدیث میں موجود ہے جَاهِدُوا الْكُفَّارَ وَالْمُشْرِكِيْنَ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ وَاَلْسِنَتِكُمْ یعنی کفار و مشرکین کے ساتھ، مالوں، جانوں اور زبانوں کے ساتھ جہاد کرو کفر و شرک اور برائی کی تردید میں تبلیغ کرنا جہاد باللسان ہے۔ اسی طرح خدا اور رسول کا پیغام غیر مسلموں تک پہنچانا بھی زبان کے ذریعے سے جہاد ہے۔ مگر کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ دین کا پیغام غیر مسلم اقوام تک پہنچانے کی بجائے آجکل مسلمانوں کی زبانیں آپس کی طعن و تشنیع پر ہی لگی ہوئی ہیں ایک دوسرے فرقے کے خلاف زہر اگلا جا رہا ہے، مگر اصل کام کی طرف بہت کم توجہ دی جا رہی ہے۔ جہاد باللسان تو یہ ہے کہ جن لوگوں تک دین کی روشنی نہیں پہنچ پاتی انہیں اس سے روشناس کرو۔ زبان تقریر اور بیان سے دین کا پیغام گھر گھر پہنچاؤ۔ مگر آج کسے فرصت ہے کہ وہ غیر مسلموں تک اسلام کی روشنی پھیلانے، تبلیغی جماعت والے جو تھوڑی بہت کوشش کرتے ہیں اس کا دائرہ کار بھی زیادہ تر مسلمانوں تک ہی محدود ہے۔ غیر مسلموں کیطرف رُخ کرنے کی کسی کو ہمت ہی نہیں پڑتی، جب اُن سے اسلام

کی بات کی جاتی ہے تو وہ جواباً کہتے ہیں کہ دین کی خوبیاں گنوانے سے پہلے انہیں اپنے آپ پر نافذ کر کے تو دکھاؤ۔ پہلے اپنے آپ کو درست کرو پھر ہماری طرف رُخ کرنا۔

مسلمان کا کردار

ہمارے ایک دوست ٹریننگ کے لیے سویڈن گئے۔ واپسی پر میں نے پوچھا کہ وہاں کسی کو دین کی دعوت بھی دی ہے کہنے لگے ہاں، میں نے بعض لوگوں کو اسلام کی دعوت دی تھی مگر انہوں نے عجیب وغریب جواب دیا۔ کہنے لگے اسلام میں داخل کر کے کیا تم ہمیں بھی اپنی طرح چور اور غلام بنانا چاہتے ہو۔ انہوں نے اپنا تجربہ بیان کیا کہ وہ جس اسلامی ملک میں گئے ہیں وہاں کے لوگوں کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑا پایا ہے کوئی روس کا غلام ہے اور کوئی امریکہ کا۔ مسلمانوں کے ملکوں میں چوری عام ہے، دھوکہ اور فریب ہے کیا تم ہمیں بھی ویسا ہی بنانا چاہتے ہو۔ ہمارے دوست کہنے لگے کہ میں اُن کے اس جواب سے سخت شرمسار ہوا۔ حقیقت یہی ہے کہ مسلمانوں جیسے چوروں اور غلاموں کا دین کون اختیار کرے گا، دنیا بھر کے اغوا، ڈاکے زنا اور فتنہ وفساد مسلمانوں میں پائے جاتے ہیں۔ نقب زنی کی کوئی شکل وصورت شیطان نے ایجاد نہیں کی جو مسلمانوں میں پائی جاتی ہو۔ مسلمانوں کا کردار دیکھ کر اسلام کی طرف لوگ کیسے رغبت کریں گے۔

جاپان کے پروفیسر ہشام کا اسلام آباد میں انٹرویو لیا گیا تھا۔ اس سے پوچھا گیا کہ تم مسلمان کیسے ہوئے۔ کہنے لگا میں مسلمانوں کو دیکھ کر مسلمان نہیں ہوا، مگر خوش قسمتی سے قرآن پاک کا جاپانی زبان میں ترجمہ مجھے میسر آگیا۔ یہ کتاب پڑھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ یہ واقعی اللہ کی سچی کتاب ہے۔ لہٰذا میں نے اسلام قبول کر لیا۔ پہلے زمانے میں لوگ مسلمانوں کا کردار اور عمل دیکھ کر اسلام لاتے تھے مگر اب وہ عملی اور اخلاقی کشش مسلمانوں میں باقی نہیں رہی۔

جہاد کے لیے جماعت کی تنظیم ضروری ہے۔ اسلامی معاشرہ میں

صائب الرائے لوگوں کی ایسی جماعت ہونی چاہیئے جو داخلی اور خارجی معاملات کے لیے مناسب منصوبہ بندی کر سکے۔ اندرونِ ملک امن وامان کا قیام اور لوگوں کے مال وجان کی حفاظت داخلی مسئلہ ہے اور کفار کے ساتھ جہاد خارجی معاملہ ہے۔ ان دونوں امور کی انجام دہی کے لیے ایک اچھی سوسائٹی کی ضرورت ہے۔ جو اچھے افراد سے معرضِ وجود میں آسکتی ہے۔

کفر کا انجام

آگے اللہ تعالیٰ نے آخرت میں کفار کی بے بسی کا تذکرہ فرمایا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بیشک وہ لوگ جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا۔ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ جو کچھ زمین میں ہے اگر سب کا سب ان کا ہو جائے اور اُس جیسا مزید بھی۔ یعنی اگر پوری زمین سونے چاندی اور مال و دولت سے بھری اُن کی ملکیت ہو اور اس سے ڈبل کے مالک بھی وہ ہو جائیں اور پھر وہ اس پورے مال کو لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ قیامت کے دن کے عذاب کے بدلے میں فدیہ دینا چاہیں مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ تو ان سے یہ فدیہ قبول نہیں کیا جائیگا۔ اول تو قیامت کے دن اس بات کا امکان ہی نہیں کہ کوئی شخص زمین بھر مال و دولت کا مالک ہو۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ فرض کرو ایسا ہو جائے اور وہ شخص یہ سب کچھ بلکہ اس سے دُگنا بھی فدیہ ادا کر کے عذاب سے بچنا چاہے تو بچ نہیں سکے گا۔ ایسے لوگ اپنے انجام کو لازماً پہنچیں گے وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ اور انہیں دائمی عذاب کا مزہ چکھنا ہو گا۔ مطلب یہ ہے کہ آخرت کی فلاح اس مال و دولت پر نہیں بلکہ اس کا انحصار تقویٰ، جہاد، تقرب الی اللہ، ایفائے عہد، احترامِ شریعت جیسے اعمال صالحہ پر ہے۔

فرمایا کفار لوگ آگ کے عذاب میں مبتلا ہونے کے بعد يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ اُس دوزخ سے نکلنا چاہیں گے

وَمَا هُم بِخَارِجِينَ مِنْهَا مگر وہ اس سے نکل نہیں سکیں گے۔ جہنم کے شعلے اُن لوگوں کو جہنم کے کنارے تک لائیں گے اور وہ کوشش کریں گے کہ چھلانگ لگا کر باہر کود جائیں مگر انہیں دوبارہ جہنم کی گہرائیوں میں پھینک دیا جائیگا۔ سورۃ الم سجدہ میں بھی ایسے لوگوں کے متعلق آتا ہے كُلَّمَآ اَرَادُوٓا اَنْ يَّخْرُجُوا مِنْهَآ اُعِيْدُوْا فِيْهَا جب بھی وہ باہر نکلنے کی کوشش کریں گے انہیں دوبارہ اُس میں جھونک دیا جائے گا۔ جہنم سے آزادی کا واحد ذریعہ ایمان اور تقویٰ ہے۔ جو لوگ اِن اوصاف سے خالی ہوں گے اُن کے لیے وہاں سے نکلنے کی کوئی صورت نہ ہو گی اور وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيمٌ اور ان کے لیے عذاب ہوگا دائمی۔

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۳۸﴾ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوبُ عَلَيْهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۳۹﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۴۰﴾

ترجمہ:۔ اور چوری کرنے والا مرد اور چوری کرنے والی عورت ، پس کاٹ ڈالو ان کے ہاتھ یہ سزا ہے اس کی جو انہوں نے کمایا ۔ یہ عبرت ناک سزا ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے اور اللہ تعالیٰ غالب ہے اور حکمت والا ہے ﴿۳۸﴾ پھر جس شخص نے توبہ کرلی اپنے ظلم کرنے کے بعد اور اس نے اصلاح کرلی تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرتا ہے ۔ بیشک اللہ تعالیٰ بخشش کرنے والا مہربان ہے ﴿۳۹﴾ اے مخاطب ! کیا تم نہیں جانتے کہ بیشک اللہ ہی کے لیے ہے بادشاہی آسمانوں کی اور زمین کی ۔ سزا دیتا ہے جس کو چاہے اور بخشتا ہے جس کو چاہے اور اللہ تعالیٰ ہر ایک چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ﴿۴۰﴾

ربط آیات

گذشتہ سے پیوستہ درس میں اللہ تعالیٰ نے فساد فی الارض کی ایک اہم

شکل ڈکیتی کا ذکر کیا تھا کہ اس میں جان، مال، عزت اور آبرو کا ضیاع ہوتا ہے۔ پھر ڈکیتی کی چار اقسام اور ہر ایک قسم کے لیے مقررہ سزا کا بیان ہو چکا ہے۔ اس کے بعد گذشتہ درس میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو تقویٰ اور جہاد کی ترغیب دی۔ پھر اللہ نے کافروں کے بُرے انجام سے آگاہ فرمایا۔ اب آج کے درس میں فساد فی الارض کی ایک دوسری قسم سرقہ کا بیان ہے۔ ڈاکہ اور چوری ایک ہی قبیل سے ہیں۔ تاہم ڈاکے کی صورت میں بیگانے مال پر بزورِ قوت قبضہ کیا جاتا ہے اور بعض اوقات جان کا اتلاف بھی ہوتا ہے اسے سرقہ کبریٰ بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں چوری سرقہ صغریٰ ہے، اور اس میں محفوظ مقام سے خفیہ طور پر مال حاصل کیا جاتا ہے۔ چوری کبیرہ گناہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس پر حد مقرر کی ہے۔ کہ چور خواہ مرد ہو یا عورت اُس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے اس کے ساتھ ساتھ خیانت بھی کبیرہ گناہ تصور ہوتا ہے، مگر اس کے لیے اللہ نے حد مقرر نہیں کی۔

مرد وزن میں تقدم و تاخر

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس مقام پر اپنی تفسیر میں ایک نہایت لطیف نکتہ بیان کیا ہے۔ اور پھر اُس کا جواب بھی لکھا ہے فرماتے ہیں۔ کہ اس آیت کریمہ میں السارق (چوری کرنے والا مرد) کا ذکر پہلے کیا ہے اور السارقۃ (چوری کرنے والی عورت) کا ذکر بعد میں۔ اس کے برخلاف سورۃ نور میں جہاں جرم زنا کی سزا کا ذکر ہے۔ وہاں زانیہ عورت کا ذکر پہلے ہے اور زانی مرد کا بعد میں "اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي" فرماتے ہیں کہ اس تقدم و تاخر کی حکمت کے متعلق میں نے اپنے استاد محترم حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ سے استفسار کیا، آپ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے شاگردوں میں سے ہیں۔
آپ دارالعلوم دیوبند کے پہلے صدر مدرس تھے۔ مولانا تھانویؒ فرماتے

ہیں کہ استادِ محترم نے اِس کی تشریح اس طرح بیان فرمائی کہ چوری کے معاملے میں عورت کی نسبت مرد طاقتور اور باہمت ہوتا ہے، کام کاج اور محنت مشقت کرنے کے قابل ہوتا ہے لہذا اگر وہ چوری کا ارتکاب کرے تو عورت کی نسبت زیادہ ذمہ دار اور زیادہ گناہ گار ہوتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالےٰ نے چوری کے معاملہ میں اس کا پہلے ذکر کیا ہے اَلسَّارِقُ۔ اور عورت چونکہ مرد کے مقابلہ میں کمزور واقع ہوئی ہے۔ زیادہ محنت مشقت بھی نہیں کر سکتی، اس لیے اس میں سرقہ کا گناہ کم نوعیت کا ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر مرد کے ذکر کے بعد کیا ہے۔

جہاں تک فعل زنا کا تعلق ہے۔ اس میں عورت اس فعل شنیع کی زیادہ ذمہ دار ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں شرم وحیا کا زیادہ مادہ رکھا ہے اس لیے اگر عورت اس فعل کا ارتکاب کرتی ہے تو مرد کی نسبت زیادہ ذمہ دار اور زیادہ گنہگار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زنا کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے عورت کو مقدم رکھا ہے اور مرد کو مؤخر کیا ہے۔

سرقہ کا نصاب

ارشاد ہوتا ہے وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوٓا اَيْدِيَهُمَا چور مرد اور چور عورت کے ہاتھ کاٹ ڈالو۔ اس آیت کریمہ میں صرف قطع ید کا حکم ہے مگر اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی کہ چور کا ایک ہاتھ کاٹا جائیگا یا دونوں۔ تاہم تمام علماء اس بات پر متفق ہیں کہ چوری کا جرم ثابت ہونے پر صرف ایک ہاتھ کاٹا جائے گا، نہ کہ دونوں البتہ چوری کے نصاب کے متعلق فقہائے کرام میں اختلاف پایا جاتا ہے، حسن بصریؒ ، فرقہ خوارج کے لوگ اور بعض دیگر حضرات فرماتے ہیں کہ یہاں پر مطلق چوری کا ذکر ہے لہذا اس کا کوئی نصاب نہیں، کم سے کم مالیت کی چوری پر بھی ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ تاہم جمہور علماء و فقہاء، صحابہ کرامؓ، تابعین عظامؒ اور سلف صالحین سرقہ کے نصاب کے قائل ہیں۔ احادیث سے

بھی چوری کا نصاب ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ چوری کا نصاب ایک چوتھائی دینار یا تین درہم کی مالیت کے برابر ہے۔ اس سے کم مالیت کی چوری پر قطع ید کی سزا نہیں ہے۔ یاد رہے کہ دینار سونے کا سکہ ہوتا تھا اور اس کا وزن چار ماشے ہوتا تھا۔ درہم چاندی کا سکہ تھا اور اس کا وزن تقریباً سوا تین ماشے ہوتا تھا۔ امام شافعیؒ کے نزدیک بھی چوری کا نصاب تین درہم ہی ہے، بعض علما پانچ درہم کے بھی قائل ہیں۔ البتہ امام ابوحنیفہؒ اور اُن کے شاگردانِ رشید امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ اور امام سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ چوری کا نصاب دس درہم ہے اس سے کم مالیت کے سرقہ پر حد جاری نہیں ہوگی۔ دراصل روایات میں اختلاف پایا جاتا ہے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام کے زمانۂ مبارک میں ایک ڈھال کی چوری پر چور کا ہاتھ کاٹا گیا۔ اُس وقت تک ڈھال کی قیمت تین درہم یا پانچ درہم تھی۔ بعض روایات میں دس درہم کا ذکر بھی آتا ہے اس لیے مختلف فقہائے کرام کے نزدیک چوری کا نصاب تین پانچ یا دس درہم ہے۔ بہرحال دس درہم پر کسی کا اختلاف نہیں اور احتیاط بھی اسی میں ہے کہ دس درہم سے کم مالیت کی چوری پر ہاتھ نہ کاٹا جائے۔

قابلِ حد سرقہ

حدِ سرقہ جاری کرنے کے لیے بعض دیگر چیزوں کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ مثلاً یہ کہ چوری محفوظ جگہ سے کی گئی ہو۔ محفوظ جگہ سے مراد یہ ہے کہ جس مکان سے چوری کا ارتکاب ہوا اس میں قفل پڑا ہو یا جس صندوق سے چیز نکالی گئی ہے، اس میں تالا لگا ہوا ہو، یا مال کی حفاظت کے لیے پہریدار مقرر ہے مگر اس کے باوجود چوری کا ارتکاب ہو گیا تو ایسا سرقہ قابلِ حد ہوگا۔ اور اگر ایسا مال چوری کیا گیا ہے جس کی حفاظت کا کوئی

بندوبست نہیں کیا گیا تھا، تو اس پر حد جاری نہیں ہو گی۔

شراکت کے مال میں سے اگر حصے دار کوئی چوری کرے تو اس پر بھی حد نہیں لگے گی۔ اسی لیے صحابہ کرامؓ سے منقول ہے۔ کہ بیت المال کی چوری پر حد نہیں کیونکہ بیت المال میں ملکی باشندہ ہونے کی حیثیت سے چور کا بھی حق شامل ہے بعض معمولی چیزوں پر بھی حد جاری نہیں کی جاتی مثلاً جلد خراب ہو جانے والی اشیاء منجملہ سبزی، ترکاری، پکا ہوا گوشت، انڈے وغیرہ یا روٹی وغیرہ کا سرقہ حد سے مستثنیٰ ہے۔ ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ باغ سے پھل توڑنے یا کھجور کے درخت کے تنے سے گودا نکالنے پر بھی حد نہیں لگتی۔ اس کے علاوہ بعض رعایتیں بھی حاصل ہیں مثلاً قحط سالی کے زمانہ میں اگر کوئی شخص فاقہ کشی سے مجبور ہو کر چوری کرتا ہے تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ قطع ید چونکہ سخت سزا ہے۔ اس لیے شریعت نے اس معاملہ میں بعض رعایات بھی دی ہیں۔ ایک عام قانون یہ ہے کہ اِدْرَءُوا الْحُدُوْدَ بِالشُّبْهَاتِ یعنی اگر کسی معاملہ میں شک پڑ جائے تو بھی حد کو ساقط کر دو۔ حد جاری کرنے کے لیے قطعی ثبوت ہونا لازمی ہے[1]۔ اگر کسی پر حد سرقہ جاری ہو گئی تو مسروقہ مال اگر موجود ہے تو واپس کیا جائیگا اور اگر ضائع ہو گیا تو ملزم پر تاوان نہیں ڈالا جائے گا البتہ اگر حد جاری نہیں ہو سکی تو پھر مسروقہ مال یا اس کا بدل واپس کرنا لازمی ہو گا۔

کیفیت قطع ید

ہاتھ کی تعریف میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے کہ ثبوتِ جرم پر کتنا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ ایک شاذ قول یہ بھی ہے کہ کندھے تک ہاتھ تصور ہوتا ہے۔ لہٰذا کندھے تک کاٹا جائے گا مگر راجح قول یہ ہے۔ کہ ہاتھ کلائی سے قطع ہو گا پہلی دفعہ چوری ثابت ہونے پر دائیاں ہاتھ کاٹا جائیگا اور دوسری مرتبہ ارتکاب جرم پر بائیاں پاؤں ٹخنے سے نیچے کاٹ دیا جائیگا۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ تیسری دفعہ چوری ثابت ہونے پر ہاتھ یا پاؤں نہیں کاٹا جائیگا بلکہ ملزم کو قید میں

---

[1] البتہ اگر حاکم مناسب سمجھے تو اس پر تعزیر لگا سکتا ہے۔ سواتی

ڈال دیا جائیگا تاوقتیکہ یقین ہو جائے کہ وہ اس فعل شنیع سے تائب ہو چکا ہے البتہ یہ حاکم کی صوابدید پر ہے، اگر وہ مناسب سمجھے تو دوسرا ہاتھ یا پاؤں کاٹنے کا حکم بھی دے سکتا ہے۔ یہ تعزیرًا ہوگا اور تعزیر میں تو سزائے موت بھی دی جا سکتی ہے، یہ حالات کے مطابق فیصلہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ شرابی کے متعلق بھی آتا ہے۔ کہ تین دفعہ حد جاری کرنے کے باوجود اگر کوئی شخص شراب نوشی سے باز نہیں آتا تو حاکم وقت تعزیرًا اُس کے قتل کا حکم دے سکتا ہے امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اس قسم کے عادی مجرم کے متعلق فرماتے ہیں۔ اِعْدَامُهٗ اَوْفَقُ مِنْ وُجُوْدِهٖ یعنی اُس کے وجود سے اس کا معدوم کر دیا جانا بہتر ہے تاکہ سوسائٹی ایسے گندے شخص سے پاک ہو جائے۔ بہر حال ایسی سزا تعزیرًا ہوگی، یہ حد میں شامل نہیں ہے۔ بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ چوری وغیرہ کے معاملات آپس میں رفع دفع کر لیا کرو۔ حضور نے فرمایا جب معاملہ کسی عدالت کے روبرو پیش ہو جائے تو پھر معافی کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اس سے پہلے اگر فریقین از خود کسی نتیجہ پر پہنچ جائیں، تو اس کی اجازت ہے۔

قطع ید کا حکم دینے کے بعد فرمایا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا یہ جزا ہے۔ اُس چیز کی جو انہوں نے کمائی۔ انہوں (مرد یا عورت) نے سرقہ جیسے قبیح فعل کا ارتکاب کیا جو کہ کبیرہ گناہوں میں شمار ہوتا ہے لہٰذا اُن کے لیے ہاتھ کاٹنے کی سزا ہی مناسب ہے۔ اُن کے جرم کا تقاضا ہے کہ انہیں یہ سخت سزا دی جائے۔ فرمایا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عبرتناک سزا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے تنبیہ کی گئی ہے، کہ کوئی شخص سرقہ جیسے کبیرہ گناہ کا ارتکاب نہ کرے۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

بعض ملحد قسم کے لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ ایک انگلی کٹ جانے کی دیت پانچ اونٹ ہیں۔ اور یہ مجرم کو ادا کرنی پڑتی ہے اس کے برخلاف

صرف دس درہم کی چوری پر پورا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے، یہ شرعی احکام میں بہت بڑا تفاوت ہے۔ تفسیر روح المعانی والے، امام رازیؒ اور امام ابن کثیرؒ اور دوسرے مفسرین عظام فرماتے ہیں کہ اصل بات یہ ہے کہ انسانی ہاتھ لَمَّا كَانَتْ اَمِيْنَةً كَانَتْ ثَمِيْنَةً جب امانت دار تھا تو بڑا قیمتی تھا۔ جب کسی نے اُس کی ایک انگلی بھی کاٹ دی تو اُسے پانچ اونٹ بطور دیت دینے پڑے۔ مگر یہی ہاتھ فَلَمَّا خَانَتْ جب خائن ہو گیا۔ اُس نے چوری کا ارتکاب کر کے امانت میں خیانت کی فَهَانَتْ تو یہی ہاتھ ذلیل و خوار ہو گیا، اب اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہی، لہٰذا سرقہ کے جرم میں اس کا کٹ جانا ہی بہتر ہے۔

سفارش کی ممانعت

حدود کے نفاذ بلکہ ہر عدالتی کارروائی میں سفارش کی سخت ممانعت آئی ہے۔ قبیلہ بنی مخزوم کی ایک عورت فاطمہ کا چوری کا معاملہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں پیش ہوا۔ یہ اونچا خاندان تھا، انہوں نے سوچا اگر اس پر حد جاری ہو گئی تو سخت بے عزتی ہو گی، لہٰذا انہوں نے اُس عورت کی سفارش کے لیے حضرت اسامہ بن زیدؓ کو حضور کی خدمت میں بھیجا۔ حضرت اسامہؓ حضور کے متبنّٰی زیدؓ کے بیٹے تھے اور آپ کو دونوں سے بڑی محبت تھی۔ جب اسامہؓ نے سفارش پیش کی تو غصے سے آپ کا چہرہ سُرخ ہو گیا، آپ نے فرمایا اَتَشْفَعُ فِىْ حَدٍّ مِّنْ حُدُوْدِ اللّٰهِ کیا تم اللہ کی مقررہ حدود میں سفارش کرتے ہو۔ فرمایا اُس ذات پاک کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے لَوْ اَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقُطِعَتْ يَدُهَا اگر محمد کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کا ارتکاب کرتی تو اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیا جاتا۔ اسامہؓ وہ بڑے نادم ہوئے۔ حد جاری ہو گئی اس کے بعد فاطمہ نے حضور سے توبہ کی قبولیت کی درخواست کی آپ نے فرمایا تُبْ اِلَى اللّٰهِ یعنی اللہ کے سامنے توبہ کرو۔ اس نے پھر توبہ

کی تو فرمایا تمہاری توبہ قبول ہوگئی۔

ایک اور حدیث میں آتا ہے، جس کسی کو اس قسم کی سزا ملے اُس پر لعنت نہ کرو، اُسے بُرا بھلا مت کہو، بلکہ یوں کہو کہ اللہ تعالیٰ تمہاری توبہ قبول کرے۔
بنی اسرائیل کے قانون میں بھی اسلامی قانون کی طرح چوری اور زنا کے ارتکاب پر حد تھی اور قتل میں قصاص بھی تھا مگر انہوں نے کتاب اللہ میں تحریف کر کے احکام کو بگاڑ دیا تھا۔ اگر چور کوئی معمولی آدمی ہوتا تو اُس کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے اور اگر کوئی صاحب حیثیت ایسا کام کر گزرتا تو اُسے چھوڑ دیا جاتا۔ زیادہ سے زیادہ منہ کالا کر کے گدھے پر بٹھاتے اور اس طرح تذلیل و توہین ہی کو کافی سمجھتے، حالانکہ اللہ کے قانون میں بڑے چھوٹے کی کوئی تخصیص نہیں۔ مجرم کو اپنے جرم کی سزا لازماً بھگتنی ہوتی ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے لعن اللہ من اٰوی محدثاً جو گنہگار مجرم کو پناہ دیتا ہے اس پر خدا کی لعنت ہو۔ بہرحال مجرم کو بچانے کی کوشش کرنا بذات خود ایک قبیح فعل ہے۔ جب تک مجرم کو قرار واقعی سزا نہ دی جائے معاشرے میں امن وامان قائم نہیں ہو سکتا۔ لوگوں کے مال وجان اور عزت و آبرو کی حفاظت کے لیے گندے عنصر کا قلع قمع ضروری ہے۔

سخت سزا کی حکمت

فرمایا حد کا اجراء اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ ہے وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ اللہ تعالیٰ غالب اور صاحب حکمت ہے۔ اس کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں۔ اگرچہ اُس نے سزائیں سخت مقرر کی ہیں مگر انسانوں کی مصلحت اسی میں ہے اور امن وامان کا قیام اور انسانی جانوں کی حفاظت ایسے ہی قانون سے ممکن ہے۔

فرمایا فَمَنْ تَابَ بَعْدَ ظُلْمِہٖ جس نے ظلم یعنی چوری کرنے کے بعد توبہ کر لی وَاَصْلَحَ اور اپنے آپ کی اصلاح کر لی۔ یعنی خدا سے سابقہ گناہ کی معافی مانگی اور آئندہ اس سے باز آگیا تو فرمایا فَاِنَّ اللّٰہَ یَتُوْبُ عَلَیْہِ تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے کیونکہ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ اللہ تعالیٰ بخشش کرنے والا اور مہربان ہے۔ پھر فرمایا اے مخاطب اَلَمْ

تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کیا تو نہیں جانتا کہ آسمان اور زمین کی ساری بادشاہت اللہ تعالیٰ کی ہے وہ مالک الملک اور قادرِ مطلق ہے یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ وہ جسے چاہے سزا دے دے۔ وہاں چون وچرا کی کوئی گنجائش نہیں۔ وہ اپنی حکمت کے ساتھ احکام نازل کرتا ہے۔ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اُس کی طرف سے مقرر کردہ سخت سزاؤں پر اعتراض اٹھا سکے۔ اُس کے تمام قوانین مبنی بر حکمت ہیں وَیَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وہ جسے چاہے معاف کر دے وہ معاف کرنے پر بھی قادر ہے۔ کسی چھوٹے بڑے، انس، جن یا ملائکہ کو کائنات میں تصرف حاصل نہیں، ہر قسم کا تصرف قانون عاید کرنے والے کو ہی حاصل ہوتا ہے۔ وہ مالک ہے شہنشاہِ مطلق ہے، وہ جس طریقے سے چاہے تصرف کرے، بندوں کا کام صرف اطاعت کرنا ہے ان کی بہتری اسی میں ہے وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ اُسے معافی اور سزا کا کلی اختیار ہے۔ اُس کی مخلوق میں سے کسی کو اعتراض کا حق حاصل نہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ
مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ
وَمِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا ۛ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ
اٰخَرِيْنَ لَمْ يَاْتُوْكَ ۭ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ
يَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ
فَاحْذَرُوْا ۭ وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ
مِنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ
قُلُوْبَهُمْ ۭ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ښ وَّلَهُمْ فِي
الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۴۱ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ
اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ۭ فَاِنْ جَاۗءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ
اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ
يَّضُرُّوْكَ شَـيْـــًٔـا ۭ وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ
بِالْقِسْطِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝۴۲ وَكَيْفَ
يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ
ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۭ وَمَآ اُولٰۗىِٕكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ۝۴۳

ترجمہ :۔ اے رسول! نہ غم میں ڈالیں آپ کو وہ لوگ جو

دوڑتے ہیں کفر کی طرف ۔ اُن لوگوں میں سے جنوں نے کہا ہے کہ ہم ایمان لائے ہیں اپنے منہ سے صرف ، اور اُن کے دل ایمان نہیں لائے اور اُن لوگوں میں سے جو یہودی ہیں ۔ بہت سُننے ہیں وہ جھوٹ کو ۔ وہ سُننے ہیں دوسری قوم کے لیے جو آپ کے پاس نہیں آئے وہ تحریف کرتے ہیں کلام کو اس کی جگہ سے اور کہتے ہیں کہ اگر دیے جاؤ تم وہ بات جو تمہاری مرضی کے مطابق ہے پس لے لو اُس کو ۔ اور اگر تم کو نہ دی جائے وہ بات تو بچتے رہو ۔ اور جس شخص کے بارے میں اللہ چاہے فتنے میں ڈالنا پس ہرگز نہیں مالک ہوں گے آپ اُس کے لیے اللہ کے سامنے کسی چیز کے ۔ یہی لوگ ہیں کہ نہیں ارادہ کیا اللہ تعالیٰ نے کہ اُن کے دلوں کو پاک کرے ۔ اُن کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں عذاب عظیم (۴۱) یہ بہت سننے ہیں جھوٹ کو اور کھاتے ہیں حرام پس اگر یہ آئیں آپ کے پاس پس آپ فیصلہ کریں اُن کے درمیان یا اعراض کریں اُن سے ۔ اور اگر آپ اعراض کریں گے اُن سے تو آپ کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے ۔ اور اگر آپ فیصلہ کریں تو فیصلہ کریں اُن کے درمیان انصاف کے ساتھ ، بیشک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے انصاف کرنے والوں کے ساتھ (۴۲) اور یہ لوگ کس طرح آپ کو منصف بنائیں گے حالانکہ ان کے پاس تورات ہے جس میں اللہ کا حکم موجود ہے ۔ پھر یہ روگردانی کرتے ہیں اس کے بعد ۔ اور نہیں ہیں یہ لوگ ایمان والے (۴۳)

ربطِ آیات

گذشتہ رکوعات میں پہلے اہل کتاب کی طرف سے نقضِ عہد کا ذکر ہوا ۔ درمیان میں اللہ تعالیٰ نے فساد فی الارض کی قباحت بیان فرمائی

آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا تذکرہ ہوا، اُن میں سے ایک نے فساد فی الارض کا ارتکاب کرتے ہوئے دوسرے کو قتل کر دیا، پھر بھائی کی لاش کو ٹھکانے لگانے کے سلسلے میں قاتل بھائی کی بیوقوفی کا ذکر بھی ہوا اور پھر اُس کے آخرت کے انجام کی نشاندہی کی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو قتل نفس کی برائی سے آگاہ کیا اور تورات میں موجود انسانی جان کے تحفظ کا قانون ان کو یاد کرایا۔ پھر ڈاکے اور چوری کے جرائم کا تذکرہ ہوا اور اللہ تعالیٰ نے ان کی سزائیں بھی بیان فرمائیں۔ اہل کتاب میں سے خصوصاً یہود کی خباثتوں کا زیادہ ذکر ہے، اور اب کچھ ذکر منافقین کی قباحتوں کا بھی آ رہا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ پیغمبر اسلام کو تسلی بھی دی جا رہی ہے۔

منافقوں کی دو رخی

ارشاد ہوتا ہے۔ يَاأَيُّهَا الرَّسُولُ اے رسول مقبول! لَا يَحْزُنْكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ آپ کو وہ لوگ غم زدہ نہ کریں جو دوڑ دوڑ کر کفر میں جا رہے ہیں۔ مِنَ الَّذِينَ قَالُوا آمَنَّا بِأَفْوَاهِهِمْ اور وہ اُن لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے محض زبانی طور پر کہا کہ ہم ایمان لائے ہیں وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوبُهُمْ مگر اُن کے دل مومن نہیں ہوئے۔ یہ اُن منافقین کا ذکر ہے۔ جن کی اکثریت مدینے کے یہودیوں میں سے تھی۔ کفار کے ساتھ ان کا میل جول نبی علیہ السلام پر شاق گزرتا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی دی کہ منافقین کی مذموم حرکات سے آپ رنجیدہ نہ ہوں، بلکہ اہل حق کے مطابق اپنا فریضہ احسن طریقے سے انجام دیتے رہیں۔ اس کے باوجود اگر کوئی شخص برائی کی طرف رُخ کرتا ہے تو اس کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیں، وہ خود اُن سے نبٹ لے گا۔ بہرحال آیت کے اس حصہ میں اللہ جل شانہ نے ایک طرف یہود اور منافقین کی مذمت بیان فرمائی ہے تو دوسری طرف اپنے پیغمبر کی حوصلہ افزائی بھی کی ہے۔ دراصل منافقین نے دو رخی پالیسی اختیار کر رکھی تھی ذَا الْوَجْهَيْنِ الَّذِي يَأْتِي هَٰؤُلَاءِ بِوَجْهٍ

وَهُوْ لَاءِ يُوَجْهِهِ جب مسلمانوں کی مجالس میں آتے تو ان کی طرف داری کرتے اور جب یہود و کفار کے پاس جاتے تو اُن سے وفاداری اور مسلمانوں سے غداری کا اظہار کرتے ۔ اُن کے ذہنوں میں استقرار نہیں تھا مگر وہ کفار کے قریب تر تھے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت بیان فرمائی ہے

جاسوس یہودی

منافقوں کے تذکرے کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اُن یہودیوں کی نشاندہی بھی کی ہے جو اہلِ ایمان کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے ، اور اسلام کو زک پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے ۔فرمایا وَمِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا اور یہودیوں میں سے بھی کچھ لوگ ایسے ہیں سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ جو بہت زیادہ سُننے والے ہیں جھوٹ کو ۔ مطلب یہ کہ اسلام کے خلاف جھوٹی باتوں میں بہت دلچسپی لیتے ہیں ۔ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ دوسری قوم کے لیے بہت زیادہ سُننے والے ہیں ۔ سمّٰعون کا عام فہم معنی تو سننے والے ہی ہیں ۔ اللہ نے یہودیوں کی یہ خصلت بیان فرمائی ہے ۔ کہ جو کوئی اسلام کی مخالفت میں جھوٹی موٹی بات کرتا تھا اُسے بڑے غور سے سنتے تھے اور پھر اُن کے ساتھ اسلام دشمن پراپیگنڈے میں شریک ہو جاتے تھے ۔ سمّٰعون کا دوسرا معنی جاسوسی کرنا ہے ۔ یہ لوگ اغیار کے لیے اسلام کے خلاف جاسوسی کرتے تھے ۔ یہودیوں کا ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی مجالس میں حاضر ہو کر آپ کی باتیں بھی سنتا تھا ۔ اُن کا مقصد یہ ہوتا تھا ۔ کہ یہاں سے کوئی کمزور بات ہاتھ آئے تو اُس میں جھوٹ ملا کر اپنے بڑوں کے پاس جا کر کریں اور اس طرح اُن سے داد وصول کریں ۔ اس طریقے سے یہ لوگ اسلام کے خلاف پراپیگنڈا میں معاون بنتے تھے ۔ بہرحال فرمایا کہ ایسے یہودیوں کا مسلمانوں کی مجالس میں آنا دین میں رغبت کی وجہ سے نہیں ہوتا تھا بلکہ اس قوم کے لیے جاسوسی کرنا ہوتا تھا لَمْ يَاْتُوْكَ جو آپ کے

پاس نہیں آتے۔ یعنی آپ کے پاس آنے والے لوگ آپ کی باتیں اُن تک پہنچاتے ہیں۔ جو آپ کے پاس نہیں پہنچتے۔

تحریف فی الکتاب

فرمایا، یہ یہودی لوگ اسلام دشمنی میں تو پیش پیش ہیں مگر ان کی اخلاقی پستی کا یہ حال ہے کہ یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ کلام الٰہی کو اپنے موقع محل سے تبدیل کر دیتے ہیں۔ چنانچہ تورات میں مذکور جرائم کی سزاؤں میں از خود کمی بیشی کر لیتے تھے۔ اگر کوئی ذی اثر آدمی جرم کا ارتکاب کرتا، تو اُسے معمولی سزا دے کر چھوڑ دیتے اور اگر کوئی غریب آدمی کسی جرم میں ملوث ہو جاتا، تو اُسے پوری سزا دی جاتی۔ آہستہ آہستہ انہوں نے زنا کے جرم میں رجم کی سزا کو بالکل ختم کر دیا اور اس کی بجائے مرتکبین کی تذلیل و تحقیر کر کے معاملے کو ختم کر دیتے۔ اس سلسلے میں مفسرین کرام یہودیوں میں پیش آنے والے ایک زنا کے کیس کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ یہودیوں میں ایک شادی شدہ جوڑے نے زنا کا ارتکاب کیا۔ وہ خود تو رجم کی سزا کو ختم کر چکے تھے۔ لہذا انہوں نے منصوبہ یہ بنایا کہ اس معاملہ کو مسلمانوں کے پیغمبر کے پاس لے چلیں۔ اگر وہ ہماری مرضی کی سزا دیں تو اُسے قبول کر لیا جائے اور اگر وہ رجم کی سزا تجویز کریں تو پھر انکار کر دیا جائے۔ چنانچہ یہودی یہ مقدمہ لے کر حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ اس معاملہ میں فیصلہ فرما دیجئے، اُن میں ایک یہودی عالم ابن صوریا بھی تھا۔ نبی علیہ السلام نے اُس سے پوچھا کہ تورات میں زنا کی سزا کا کیا حکم ہے۔ آپ نے خاص طور پر دریافت کیا کہ کیا وہاں پر سنگساری کی سزا نہیں ہے۔ تو یہودی عالم نے انکار کر دیا۔ اس پر آپ نے تورات کا نسخہ منگوا کر یہودی کو پڑھنے کے لیے کہا۔ جب وہ رجم کی آیت پہ پہنچا تو اُسے چھپانا چاہا۔ اس آیت پہ انگلی رکھ کر اُس کا اگلا پچھلا حصہ پڑھ دیا۔ وہاں پہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ بھی موجود تھے۔ جو تورات کے بہت بڑے عالم تھے، انہیں اللہ نے ایمان کی دولت عطا کی تھی۔ انہوں نے

رجم والی آیت کی نشاندہی کر دی جس پر یہودی بہت نادم ہوئے اور اُن کی خیانت کا راز کھل گیا۔

اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہودی خود تو تحریف کے مرتکب ہوتے ہیں اور اگر کوئی معاملہ حضور ختم المرسلین کے پاس لے آتے ہیں تو ان کی سازش یہ ہوتی ہے یَقُولُونَ اِنْ اُوْتِیْتُمْ ھٰذَا فَخُذُوْہُ یعنی اگر تمہاری مرضی کا فیصلہ مل جائے تو اُسے قبول کر لو، وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْہُ فَاحْذَرُوْا اور اگر تمہیں مطلب کا فیصلہ نہ ملے تو اس سے بچ جاؤ یعنی قبول نہ کرو۔ اسی پالیسی کے تحت ابن صوریا نے بھی رجم کے حکم کا انکار کیا، مگر حضور علیہ السلام نے فرمایا میں تجھے اللہ وحدہٗ لاشریک کی قسم دیتا ہوں جس نے موسیٰ علیہ السلام کو نجات دی اور فرعون کو غرق کیا اور جس نے تورات کو نازل فرمایا، تم سچ سچ بتاؤ کیا تورات میں رجم کا حکم موجود نہیں ہے۔ بالآخر اُس یہودی عالم کو اس بات کا اقرار کرنا پڑا۔ اس پر دوسرے یہودی اُس کے خلاف ہو گئے اور اس سے الجھنے لگے۔ تاہم یہودیوں کی طرف سے تحریف فی الکتاب کا ثبوت مہیا ہو گیا

تورات میں تحریف کا ارتکاب یہودیوں کا پرانا مشغلہ ہے ہر نئے ایڈیشن میں کوئی نہ کوئی تبدیلی واقع ہو جاتی ہے، مگر خدا کی قدرت وہ آیت آج بھی تورات میں موجود ہے۔ تورات کے اُردو نسخوں میں یہ الفاظ موجود ہیں کہ جو شخص پڑوسی کی بیوی کے ساتھ زنا کرے وہ جان سے مارا جائے گا گویا شادی شدہ زانی کے لیے سزائے موت ہے اور یہ وہی سزا ہے جو دینِ محمدی میں بھی بدستور قائم ہے۔ یہود کی طرف سے بائیبل میں تحریف لفظی کی کئی ایک مثالیں بھی موجود ہیں۔ جیسا کہ کسی گذشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے۔ کہ بائیبل میں فارقلیط کا لفظ موجود تھا جس کے معنی احمد ہیں اور یہ لفظ حضور خاتم الانبیاء کی بعثت پر دلالت کرتا ہے، مگر انہوں نے فارقلیط کی

بجائے مددگار یا وکیل کا لفظ داخل کر دیا۔ بہر حال تحریف فی الکتاب کے مختلف
طریقے استعمال کرتے تھے، کبھی کسی حکم کو بالکل چھپا جاتے، کبھی الفاظ تبدیل کرتے
اور کبھی الفاظ کا مطلب غلط بیان کرتے، یہ سب تحریف ہی کی مختلف اقسام ہیں

حضور کو تسلی

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا، آپ ان کے بارے میں غم زدہ نہ ہوں، ان
کی ہدایت کے لیے زیادہ فکرمند نہ ہوں، کیونکہ وَمَنْ يُرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ
فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا ؕ جس کو اللہ فتنے میں ڈالنا
چاہے یعنی گمراہ کرنے کا ارادہ کرے، اُس کے لیے آپ کسی چیز کے مالک
نہیں ہیں۔ یعنی آپ اُن کو راہِ راست پر لانے پر قادر نہیں ہیں۔ فرمایا
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ
یہی لوگ ہیں کہ جن کے دلوں کو پاک کرنے کا اللہ تعالیٰ ارادہ نہیں رکھتا۔ یہ
لوگ کفر و نفاق میں اتنے آگے بڑھ چکے ہیں کہ ان کی واپسی کی کوئی اُمید باقی
نہیں رہی اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اُسی شخص کے دل کو پاک کرتا ہے جسے
خود طلب ہو۔ جو شخص اپنی غلطی کا احساس کر کے اپنی اصلاح کا خواہشمند
ہو، اللہ تعالیٰ اُس کی راہنمائی فرماتا ہے اور اُس کے دل کو کفر، شرک اور نفاق
سے پاک صاف کر دیتا ہے۔ برخلاف اس کے جو لوگ عنادی اور باطل پرست
ہوتے ہیں۔ ان کے متعلق اللہ نے فرمایا "خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ"
اُن کے دلوں پر مہریں لگ چکی ہیں "كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ
مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ" اپنی بدکرداری کی وجہ سے ان کے دل زنگ آلود
ہو چکے ہیں، لہٰذا اب وہ حق کی طرف نہیں آ سکتے۔ ہاں! اللہ تعالیٰ کا یہ
وعدہ اب بھی موجود ہے "وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ
سُبُلَنَا" جو ہماری طرف آنا چاہتے ہیں ہم ضرور ان کی سیدھے راستے
کی طرف راہنمائی کرتے ہیں۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف آ جاتے ہیں پھر
اللہ اُن کے دل پاک کر دیتا ہے

بہر حال فرمایا کہ اللہ تعالیٰ باطل پرست لوگوں کے دل پاک نہیں کرتا لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ اُن کے لیے دنیا میں رسوائی ہے وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ اور اُن کے لیے آخرت میں بھی عذاب عظیم تیار کیا گیا ہے۔ اگر بغیر توبہ کیے اُن کا خاتمہ یہودیت پر ہی ہو گیا تو بہت بڑی سزا کے مستحق ہوں گے۔

حرام خوری

فرمایا سَمّٰعُونَ لِلْكَذِبِ یہ لوگ جھوٹی باتیں سننے کے بڑے عادی ہیں یا یہ کہ جھوٹوں کے لیے جاسوسی کرتے ہیں تاکہ لوگ اسلام سے متنفر ہو جائیں۔ اس کے علاوہ یہ لوگ اَكّٰلُونَ لِلسُّحْتِ حرام خور بھی ہیں۔ اور وہ اس طرح کہ احکام میں غلط فتویٰ دیکر لوگوں کا مال کھاتے ہیں مقدمات میں غلط فیصلے کر کے رشوت لیتے ہیں۔ سود کے موجد یہی لوگ ہیں اور اس کے ذریعے بھی حرام خوری کے مرتکب ہوتے ہیں۔ سورۃ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ کہ یہودی عربوں کا مال ناجائز طریقے سے کھاتے تھے اور اُن کا فتویٰ تھا کہ اُمی لوگوں کا مال اُن کے لیے حلال ہے۔ یہ سب اُن کی حرام خوری کے ذرائع تھے۔ اِس کے علاوہ سحت غیر اللہ کی نذر و نیاز پر بھی صادق آتا ہے۔ قرآن پاک میں موجود ہے۔ "اِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ" یہودیوں کے اکثر علماء اور مشائخ لوگوں کا مال باطل طریقے سے کھاتے تھے غیر اللہ کی نذر و نیاز اسی قبیل سے ہے جو یہودی علماء بغیر ڈکار لیے کھا جاتے تھے۔ مگر حضور علیہ السلام کی پیشین گوئی کے مطابق یہ خصلت اب مسلمان مولویوں اور پیروں میں بھی پیدا ہو چکی ہیں۔ حلال و حرام کی تخصیص کیے بغیر اِن کو بھی کھانے سے غرض ہے۔ خواہ کسی راستے سے آئے۔ آج گنڈے تعویز کا سلسلہ بھی بڑی ترقی کر گیا ہے۔ جاہل عورتیں خود ساختہ پیروں کے دامِ فریب میں گرفتار ہیں۔ ہر جائز و ناجائز مقصد کے لیے

تعویذوں پر رقمیں خرچ کرتی ہیں اور کھانے والے یہ حرام کمائی کو کھاتے ہیں۔
یہ سب چیزیں سُحت کا حصہ ہیں۔

یہودیوں کے مقدمات

فرمایا یہ یہودی اپنے مقدمات کا فیصلہ آپ سے کرانا چاہتے ہیں فَإِنْ جَاءُوكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اگر وہ آپ کے پاس تنازعہ لے کر آجائیں تو آپ اُن کے درمیان فیصلہ کر دیں اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ یا اُن سے اعراض کریں یہ آپ کی صوابدید پر ہے فیصلہ کرنا پسند کریں تو کر دیں ورنہ جواب دے دیں۔ وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ اگر آپ اُن سے اعراض کا فیصلہ کریں یعنی ان کے مقدمات کی سماعت کو پسند نہ کریں تو پھر تشویش کی کوئی بات نہیں ہے فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْئًا یہ لوگ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ وَاِنْ حَكَمْتَ اور اگر اُن کے مقدمات نمٹانا چاہیں فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ تو آپ اُن کے درمیان حق و انصاف کی بنیاد پر فیصلہ کریں اپنے دین اور شریعت کے احکام کی روشنی میں اُن کی حق رسی کریں کیونکہ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ آپ مکمل انصاف کے مطابق فیصلہ کریں۔

آگے اللہ تعالیٰ نے خود ہی استفسارانہ لہجہ میں فرمایا وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ وہ لوگ آپ کو کیسے منصف بنائیں گے جبکہ اُن کے اپنے پاس تورات موجود ہے۔ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ جس میں اللہ تعالیٰ کے احکام موجود ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ اگر حق کا فیصلہ مطلوب ہو تو ان کے پاس تورات موجود ہے اس کے احکام کے مطابق فیصلہ خود کر سکتے ہیں مگر چونکہ یہ حیلے بہانے سے احکام الٰہی سے گریز کرتے ہیں لہٰذا آپ کے پاس آتے ہیں کہ شاید آپ اُن کی مرضی کے مطابق فیصلہ کر دیں مگر آپ کے لیے حکم یہی ہے کہ آپ حق و انصاف کے دامن کو مضبوطی

سے بچاتے رہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ وہی لوگ ہیں جو انصاف پر قائم رہتے ہیں۔

فرمایا تورات میں واضح احکام کی موجودگی کے باوجود ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ یہ لوگ اِن احکام کو ٹال جاتے ہیں، اُن سے روگردانی کرتے ہیں۔ تورات میں خود تحریف کی ہے، اور اب اپنی پسند کے فیصلے کے لیے دوسروں کا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔ چونکہ زنا کا کیس حضور علیہ السلام کی عدالت میں پیش ہو چکا تھا لہٰذا آپ نے تورات اور قرآن پاک کے حکم کے مطابق مرد و زن کے لیے سزائے موت کا حکم دیا صحیح احادیث میں موجود ہے کہ فیصلہ سُنانے کے بعد حضور علیہ السلام نے فرمایا الحمد للہ اللہ تعالیٰ نے میری وجہ سے اُس حکم کو زندہ کر دیا جسے یہودیوں نے چھپا رکھا تھا۔ فرمایا وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ان لوگوں میں ایمان کی کوئی رمق باقی نہیں۔ اگر ان میں کچھ بھی خوفِ خدا ہوتا تو خدا کی کتاب پر ایمان لاتے۔ اُس کے احکام کو دوبارہ زندگی بخشتے اور دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتے مگر یہ باطل پرست فرقہ کفر، شرک اور معاصی میں غرق ہو چکا ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۚ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾

ترجمہ: بیشک ہم نے اتاری ہے تورات جس میں ہدایت اور روشنی ہے فیصلہ کرتے تھے اس کے ساتھ اللہ کے نبی جو فرمانبردار تھے ، (وہ) اُن لوگوں کے لیے فیصلہ کرتے تھے جو یہودی ہوئے ۔ اور اسی کے مطابق فیصلہ کرتے تھے درویش لوگ اور علماء لوگ اس وجہ سے کہ اُن کو نگران بنایا گیا تھا اللہ کی کتاب پر اور وہ اس پر گواہ تھے ۔ پس نہ ڈرو تم لوگوں سے اور ڈرو مجھ سے اور نہ خریدو میری آیتوں کے بدلے قیمت تھوڑی ۔ اور جو فیصلہ نہ کرے اس کے مطابق جو اللہ نے نازل کیا ہے پس یہی لوگ ہیں کافر ﴿۴۴﴾

ربط آیات

گذشتہ درس میں اہل کتاب کی مذمت کے ضمن میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یہ لوگ آپ کے ساتھ کیسے متفق ہو سکتے ہیں حالانکہ ان کے پاس تورات ہے جس میں اللہ کا حکم موجود ہے اگر یہ تورات میں مذکور حکم الٰہی کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تو ظاہر ہے

کہ یہ بد دیانت ہیں۔ اور آپ کے پاس اپنا مقدمہ اس لیے لائے ہیں کہ یہ اپنا مفاد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ معاملہ زنا کا تھا جس کی سزا موت ہزاروں تغیرات کے بعد بھی تورات میں موجود ہے۔ اِن کا منصوبہ یہ تھا کہ اگر آپ کا فیصلہ ان کی مرضی کے مطابق ہوگا تو مان لیں گے، ورنہ نہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر یہ لوگ آپ کے پاس آئیں تو آپ ان کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دیں چنانچہ حضور علیہ السلام نے انہی کے علماء سے تورات میں مذکور سزائے موت کو ثابت کیا اور پھر اس حکم کے مطابق زانی مرد و زن کو سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ پھر حضور نے اللہ کا شکر ادا کیا اور فرمایا کہ اللہ نے میری وجہ سے تورات کے اس حکم کو زندہ کر دیا جسے یہودی لوگ چھپا رہے تھے۔ اب آج کی آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نازل کردہ کتاب تورات کی حیثیت کو واضح کیا ہے۔ اس کے مناقب بیان کیے ہیں اور لوگوں کو اس کے مطابق فیصلہ کرنے کی ہدایت فرمائی ہے اس کے بعد انجیل اور آخر میں قرآن پاک کے متعلق بیان آئیگا۔

نزول تورات

یہاں تورات کے متعلق ارشاد ہے۔ اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ ہم نے تورات کو نازل فرمایا۔ تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام پہ نازل کی گئی اور اس کا ذکر سورۃ اعراف میں یوں ہے۔ وَكَتَبْنَا لَهٗ فِى الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَىْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَىْءٍ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو تختیوں پر لکھی لکھائی کتاب عطا کی جس میں ہر قسم کی نصیحت اور قوانین موجود ہیں۔ اللہ کی نازل کردہ یہ کتاب زمانے کے دست برد سے محفوظ نہ رہ سکی اور نزولِ قرآن کے زمانہ تک اِس میں بہت سا تغیر و تبدل ہو چکا تھا، تاہم اس میں بعض اصل باتیں بھی موجود تھیں۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ موجودہ تورات کی مثال بعض کتب احادیث کی طرح ہے کہ جس میں صحیح روایات بھی ہیں اور غلط بھی۔ ہر دور میں تورات تحریف کا شکار ہوتی رہی ہے۔ گذشتہ درس میں گزر چکا ہے "يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ"

یہودی خود تورات کے احکام کو اپنے موقع محل سے بدل دیتے تھے۔ یہ بڑے بددیانت لوگ تھے تاہم فی الجملہ تورات میں آج بھی بعض صحیح باتیں موجود ہیں۔ جو انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کے مطابق ہیں۔ البتہ صحیح اور غلط کا امتیاز صاحب علم لوگ ہی کر سکتے ہیں، یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے چنانچہ شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ تورات کا مطالعہ ہمارے خاندان کے نصاب تعلیم کا حصہ ہے۔ چونکہ یہود و نصاریٰ سے اکثر واسطہ رہتا ہے لہٰذا ہم نے تورات کو بھی اپنی تعلیم کا حصہ بنا رکھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہمارے سلسلہ ولی اللّٰہی کے اکثر بزرگ تورات کا مطالعہ کرکے لوگوں کی ---- راہنمائی کرتے رہے ہیں۔ یہ صاحب علم ہی بتا سکتا ہے۔ کہ موجودہ تورات کی کون سی آیت قرآن و سنت کے مطابق ہے اور کون سی اس کے خلاف ہے۔ اس وقت تورات میں بعض ایسی فحش باتیں ہیں جو اللہ کے نبیوں سے منسوب کی گئی ہیں مگر اللہ کا کوئی نبی بھی ایسی بات نہیں کرسکتا، بلکہ ان کا دہرانا بھی سوءِ ادب ہے۔ ایسی چیزیں کتاب الٰہی کی تحریف کا زندہ ثبوت ہیں۔

مشرکین نے بھی یہودیوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ملتِ ابراہیمی میں بگاڑ پیدا کر دیا تھا۔ انہوں نے دین ابراہیمی کو ایسا خراب کیا کہ بیت اللہ شریف کا طواف بالکل برہنگی کی حالت میں ہونے لگا۔ مرد اور عورتیں سب ننگا طواف کرتے تھے اور پھر بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ اسے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے تھے، یا خدا کی طرف نسبت کرتے تھے کہ اللہ نے ایسا ہی حکم دیا ہے اللہ تعالیٰ نے اس کی تردید سورۃ اعراف میں فرمائی ہے۔" قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ " اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان سے کہہ دیں کہ بیشک اللہ تعالیٰ کبھی بے حیائی کی بات کا حکم نہیں دیتا۔ اس کے احکام تو صحیح اور حکیمانہ ہوتے ہیں۔ اللہ یا اس کا رسول ایسی بات نہیں کرسکتے۔

اللہ تعالیٰ نے تورات کو نازل فرمایا مگر بعد میں خود اس کے مترجم نقل تورات

ماننے والوں نے تبدیلیاں پیدا کر دیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل جب فرعون کی غلامی سے آزاد ہو گئے تو انہوں نے خود قانونِ الٰہی کا مطالبہ کیا کہنے لگے کہ ہم صدیوں سے فرعون کی غلامی میں جکڑے ہوئے تھے اور ہم اسکا قانون ماننے پر مجبور تھے۔ اب جبکہ ہم آزاد ہو چکے ہیں۔ ہمارا اپنا کوئی قانون ہونا چاہیئے جسکی روشنی میں ہم اپنی زندگی بسر کر سکیں، جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کی اس خواہش کا اظہار اللہ تعالیٰ سے کیا تو اللہ نے فرمایا کہ اے موسیٰ علیہ السلام! آپ کوہِ طور پہ ایک ماہ کا اعتکاف کریں جس کے بعد ہم آپ کو کتاب دیں گے، چنانچہ آپ کوہ طور پر تشریف لے گئے۔ اعتکاف کی مدت ایک ماہ سے بڑھ کر چالیس دن ہو گئی، تاہم اسکی تکمیل پر اللہ تعالیٰ نے تختیوں پہ لکھی لکھائی تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمائی، مگر جب قانون کی یہ کتاب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم پر پیش کی تو وہ ایچ پیچ کرنے لگے کہنے لگے اے موسیٰ علیہ السلام اس کتاب کے احکام بڑے سخت ہیں۔ لہذا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ہم نے احکام سن تو لیے مگر ان پر عمل کرنے سے قاصر ہیں لہذا ہم ان کا انکار کرتے ہیں۔ اللہ نے حکم دیا "خُذُوا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ" جو کچھ ہم نے دیا ہے۔ اس کو مضبوطی سے پکڑو "وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ" اور اس کو خوب یاد کرو اور اس پر عمل کرو، مگر اس قوم نے حیلے بہانوں سے تورات کے احکام ماننے سے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ اس میں طرح طرح کی تحریف کرنے لگے، جو آج تک جاری ہے۔ اور اس کتاب کا بیشتر حصہ تغیر و تبدل کا شکار ہو چکا ہے۔

آسمانی کتب کے لفظی معنی

تورات کا لفظی معنیٰ قانون (LAW) ہے۔ یہ عبرانی یا سریانی زبان کا لفظ ہے۔ اسی طرح انجیل کے معنی بشارت کے ہیں کیونکہ اس میں نبی آخر الزمان علیہ السلام کے متعلق بشارت دی گئی ہے۔ تیسری آسمانی کتاب زبور ہے جس کا معنیٰ صحیفہ ہے "وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا" اس کتاب میں اللہ کی حمد و ثنا اور اخلاقی باتیں زیادہ ہیں اور قوانین و احکام کم تعداد میں ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی چوتھی اور آخری کتاب قرآن پاک ہے۔ جس کا لفظی معنیٰ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ اصل میں قرأ کا معنیٰ جمع کرنا ہے۔ پڑھنے میں چونکہ حروف جمع کیے جاتے ہیں، اس لیے سے قرآن یعنی پڑھی جانے والی کتاب کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک کے متعلق انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا والے لکھتے ہیں

ENCYCLOPAEDIA OF BRITANNICA : IT IS THE MOST WIDELY READ BOOK IN THE WORLD.

یعنی قرآن پاک دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔

ہدایت اور نور

فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب تورات کو نازل کیا فِيهَا هُدًى وَنُورٌ اس میں ہدایت اور روشنی ہے۔ سورۃ نسآء میں موجود ہے "وَأَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا" ہم نے تمہاری طرف کھلا نور نازل فرمایا اس نور سے مراد چراغ یا بلب کی روشنی نہیں ہے بلکہ اس سے قلبی بصیرت مراد ہے۔ دوسرے مقام پر فرمایا "هَٰذَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ" قرآن پاک کی آیات لوگوں کے لیے بصیرت ہیں۔ جو کوئی ان کو پڑھے گا، ایمان لائے گا اس کا دل روشن ہو جائے گا اور وہ حق و باطل میں امتیاز کرنے کا اہل ہو سکے گا۔ اس روشنی کی وجہ سے وہ حلال و حرام اور جائز و ناجائز میں تمیز کر سکے گا۔ بہرحال نور سے مراد قلبی روشنی ہے اور ہدایت سے وہ قوانین اور ضابطے مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائے ہیں۔ اسی لیے فرمایا کہ ہم نے تمہاری طرف تورات نازل فرمائی جس میں ہدایت اور نور ہے۔

قرآن پاک میں بینات کا ذکر بھی آتا ہے "مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ" جو کچھ ہم نے بینات اور ہدایت میں سے اتارا ہے مفسر قرآن مولانا عبید اللہ سندھیؒ ہمارے زمانے میں قرآن پاک کا گہرا درک رکھنے والے بزرگ ہوئے ہیں۔ آپ بہت بڑے عالم اور تجربہ کار تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ بینات سے مراد وہ کھلی کھلی اور عام فہم باتیں ہیں جنہیں ہر شخص

آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ اس میں توحید، ذکر، شکر، صبر اور نماز وغیرہ آتے ہیں۔ اور ہدایت سے مراد وہ باریک باتیں ہیں جو استاد کی تعلیم و تشریح کے ساتھ ہی سمجھ میں آسکتی ہیں۔ الغرض فرمایا کہ تورات میں ہدایت اور روشنی ہے۔

تورات بطور حکم

یَحْکُمُ بِھَا النَّبِیُّوْنَ الَّذِیْنَ اَسْلَمُوْا اللہ کے نبی اس تورات کی روشنی میں فیصلے کرتے تھے اور وہ سارے انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے مطیع و فرمانبردار تھے۔ بنی اسرائیل میں اللہ نے ہزاروں انبیاء مبعوث فرمائے جن کو حکم دیا جاتا رہا کہ اس تورات کے احکام کی نشر و اشاعت کرو۔ اسلموا کے لفظ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ کے سارے نبی اسلام والے لوگ تھے نہ کہ یہودیت یا نصرانیت والے۔ تمام انبیا کا دین تو اصلاً ایک ہی رہا ہے اور وہ سارے اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری ہی کی دعوت دیتے رہے البتہ اُن میں زمان و مکان کی وجہ سے بعض فروعات میں اختلاف پایا جاتا تھا۔ مگر بنیادی طور پر دین ایک ہی تھا۔

تو فرمایا اللہ کے نبی اسی تورات کے مطابق فیصلے کرتے تھے لِلَّذِیْنَ ھَادُوْا اُن لوگوں کے لیے جو یہودی ہوئے۔ چونکہ تورات بنی اسرائیل کے لیے ہی نازل ہوئی تھی اس لیے اللہ کے نبی یہ قانون اُس قوم پہ نافذ کرتے رہے اور پھر یہ ہے کہ انبیاء کے علاوہ وَالرَّبّٰنِیُّوْنَ رب والے یعنی درویش لوگ بھی اسی تورات کے مطابق فیصلے کرتے رہے۔ ربانی کا تذکرہ پہلے بھی ہو چکا ہے۔ اللہ کی مخلوق میں ہزاروں لاکھوں درویش گزرے ہیں جو اسی کتاب کے مطابق فیصلے کرتے رہے۔ وَالْاَحْبَارُ اور عالم لوگ یعنی تورات کو جاننے اور سمجھنے والے لوگ بھی تورات کے احکام پر عمل کرتے اور کراتے رہے۔ احبار حبر یا حِبر کی جمع ہے اور اس سے وہ علماء مراد ہیں جو تورات کے حاملین تھے۔ وہ بھی لوگوں کے فیصلے تورات کے مطابق کرتے تھے بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ کِتٰبِ اللہِ وَکَانُوْا عَلَیْہِ شُھَدَآءَ اسلئے کہ ان لوگوں کو تورات کا

محافظ اور نگران بنایا گیا تھا۔ اور وہ اس پر گواہ تھے یہ انکی ذمہ داری تھی کہ لوگوں کو تورات کی طرف دعوت دیں اور اس کے احکام پر عمل کرائیں۔ قرآن پاک اور تاریخ سے یہ بات ثابت ہے۔ کہ اہل کتاب کے علماء و مشائخ میں یقیناً تورات کے عامل موجود تھے جنہوں نے تورات کو سینوں سے لگا رکھا تھا، مگر بعد میں ایسے لوگ پیدا ہو گئے جن کے متعلق قرآن پاک نے بتایا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ بہت سے عالم اور درویش ایسے ہیں جو لوگوں کا مال ناحق طریقے سے کھاتے ہیں اور دوسروں کو اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔ ان لوگوں نے تورات پر عمل کرنا چھوڑ دیا اور اس کی بجائے غیر اللہ کی نیازیں کھانا شروع کر دیں۔ اور تعویذ، گنڈوں اور جادو کے ذریعے لوگوں کا مال ہڑپ کرنا شروع کر دیا۔

اشاعت دین میں رکاوٹ

لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکنے کی مختلف صورتیں ہیں کبھی اصل احکام میں تحریف کر کے اور اُن کو غلط معانی پہنا کر صحیح بات پر عمل کرنے سے روک دیا جاتا ہے۔ اور کبھی احکام الٰہی کا صریحاً انکار کر کے اُس پر عملدرآمد کے راستے میں رکاوٹ ڈالی جاتی ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ احکام الٰہی کے مکلف لوگ اپنی بے عملی کی وجہ سے دوسرے لوگوں کو دین سے بدظن کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اللہ کی آخری کتاب قرآن اگرچہ تحریف سے پاک ہے اور دین اسلام محفوظ ہے۔ مگر مسلمان اپنی بے عملی کی وجہ سے دوسروں کے لیے کوئی اچھا نمونہ پیش نہیں کرتے جس کی وجہ سے غیر مسلم اسلام کے قریب آنے پر آمادہ نہیں ہوتے، دنیا کے پڑھے لکھے لوگ، ماہرین قانون، دانشور، انجنیئر، ڈاکٹر وغیرہ جب مسلمانوں کے عمل کی طرف دیکھتے ہیں تو اسلام سے بدظن ہو جاتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو اسلام کا عملی نمونہ دیکھنا چاہتے ہیں مگر جب انہیں اسلامی اصولوں کا عملی نمونہ میسر نہیں آتا تو وہ اسلام کی طرف راغب

نہیں ہوتے، اس طرح گویا ہم خود لوگوں کو اسلام سے دُور کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ اور یہی چیز دین کے راستے میں رکاوٹ ہے۔

یہاں ایک بات اور توجہ طلب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے علماء و مشائخ کو تورات کا محافظ اور نگران بنایا مگر وہ کتابِ الٰہی کی حفاظت کی ذمہ داری پوری نہ کر سکے جس کی وجہ سے تورات میں اس قدر تحریف ہو چکی ہے کہ ایک عمومی آدمی کے لیے اصل اور نقل میں امتیاز ممکن نہیں رہا۔ برخلاف اس کے قرآنِ پاک کی حفاظت کا ذمہ خود خدا تعالیٰ نے لیا۔ "إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ"۔ بیشک اس ذکر (قرآن پاک) کو ہم نے ہی نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔ چنانچہ گزشتہ چودہ صدیوں کی تاریخ شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس کلام میں سرمُو بھی تبدیلی نہیں آئی۔ البتہ مسلمانوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ یہ اس کتاب پر عمل پیرا نہیں رہ سکے بلکہ اس سے مسلسل اعراض برت رہے ہیں اہلِ اسلام کے پاس اللہ کا ایک قانون موجود ہے جو دنیا میں دیگر کسی قوم کے پاس نہیں۔ اس کے باوجود بے عملی کی وجہ سے یہ دنیا جہنم اور قید خانہ بنی ہوئی ہے جبر ظلم کی بھرمار ہے۔ کفر و شرک کی کوئی انتہا نہیں رہی اگر اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمان اس کتاب پر عمل کر کے دنیا کی کایا پلٹ سکتے ہیں، تو آج مسلمان اپنا کھویا ہوا وقار بحال کیوں نہیں کر سکتے۔

کتاب اللہ سے اعراض

آج مسلمان پوری دنیا میں سیاسی اقتدار سے محروم ہیں بعض اسلامی مملکتوں کے پاس سرمایہ کی کمی نہیں، تمام وسائل بھی موجود ہیں مگر وہ خدا کی کتاب پر عمل کرنے سے گریزاں ہیں کہیں شخصی حکومت ہو یا جمہوریت، سرمایہ دارانہ نظام ہو یا اشتراکی، سب نے قرآن پاک کی تعلیمات کو پس پشت ڈال رکھا ہے۔ اسلامی نظامِ حکومت اپنانے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں، یہودیوں کی بیماری مسلمانوں میں بھی پیدا ہو گئی ہے۔ یعنی جو حکم اپنی مرضی کے مطابق ہے

اُسے قبول کرلو اور جو اپنی خواہش کے خلاف ہے اُسے چھوڑ دو۔ آج مسلمانوں نے قرآن و سنت کو اپنی مرضی کے تابع کر لیا ہے، اِن حالات میں دنیا حقیقی ترقی کی منازل کیسے طے کر سکتی ہے، یہ اہل کتاب والا نفاق ہے جس میں مسلمان بھی مبتلا ہو چکے ہیں۔ جب تک اس خطہ ارضی پر انگریز حکومت کرتا رہا اُس وقت تک ایک بہانہ موجود تھا مگر اب قرآن و سنت کا نظام اپنانے میں کونسا امر مانع ہے۔ ابھی تک دو سو سال پرانا انگریز کا بنایا ہوا عدالتی نظام رائج ہے، ہم ابھی تک اسے نہیں بدل سکے۔ اصل بات یہ ہے کہ کتاب اللہ کی بالادستی کا جذبہ ہی ختم ہو کر رہ گیا ہے، ہم ابھی تک خود ساختہ قوانین کے غلام بنے بیٹھے ہیں۔ اس معاملہ میں نہ کوئی انفرادی کوشش ہو رہی ہے اور نہ اجتماعی، نہ کوئی حکومت اس طرف توجہ دیتی ہے نہ کوئی سیاسی پارٹی۔ ہر ایک کو اپنا ذاتی مفاد عزیز ہے، اعلائے کلمۃ الحق کا جذبہ مفقود ہو چکا ہے۔ یہ سب کچھ کتاب اللہ سے اعراض کا نتیجہ ہے۔

غیر اللہ خوف

فرمایا کتاب اللہ پر عمل کرنے کے خلاف کسی کو خاطر میں نہ لاؤ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ اس معاملے میں لوگوں سے مت ڈرو کہ اگر کتاب اللہ پر عمل شروع کر دیا تو وہ کیا کہیں گے۔ کسی فرد یا جماعت کی پروا نہ کرو، کسی بڑی سے بڑی حکومت کو خاطر میں نہ لاؤ کہ اسلامی نظام اپنانے سے وہ کیا کہیں گے۔ فرمایا باطل پرست لوگوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لو وَاخْشَوْنِ اور صرف مجھ ہی سے ڈرو۔ کہ کہیں میرے احکام کی خلاف ورزی نہ ہو جائے اگر تم دنیا کی سپر طاقتوں اور نام نہاد مہذب قوموں کی طرف دیکھتے رہے تو نہ تم اسلامی معاشرہ قائم کر سکو گے اور نہ دنیا کو امن چین نصیب ہو گا۔ ایسی صورت میں تم اغیار کے غلام بن کر رہ جاؤ گے۔ نہ تمہارا ذہن اپنا ہو گا اور نہ سیاست۔ حضور علیہ السلام کے صحابہ کرامؓ تو چھوٹی سے چھوٹی سنت پر عمل کرنے میں حجاب محسوس نہیں کرتے تھے مگر آج ہمارے اخلاق کا دیوالیہ

ہی نکل چکا ہے، ہم خدا تعالیٰ کی بجائے غیر اللہ سے خوفزدہ ہیں۔ حضرت حذیفہؓ کا واقعہ حدیث میں آتا ہے کہ کھانا کھاتے وقت ایک لقمہ ہاتھ سے گر پڑا۔ آپ نے اُسے فوراً اٹھایا اور صاف کر کے کھا لیا۔ کسی نے کہا کہ یہاں کے لوگ تو اسے معیوب سمجھتے ہیں، حضرت حذیفہؓ نے عجیب جواب دیا۔ کہنے لگے اَاَتْرُكُ سُنَّةَ حَبِيْبِيْ مُحَمَّدٍ لِقَوْلِ هٰٓؤُلَآءِ الْحَمْقٰى کیا میں اِن بیوقوفوں کے کہنے پر اپنے پیارے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو ترک کر دوں۔ آج یہ جذبہ ختم ہو چکا ہے، ہم نے ہر کام کے لیے اغیار کی طرف دیکھنا شروع کر دیا ہے جس کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔

کتاب اللہ پر عدم اعتقاد

فرمایا مجھ سے ڈرو وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اور نہ خریدو میری آیتوں کے بدلے دنیا کا حقیر سامان یعنی تھوڑی قیمت۔ مقدمات کے غلط فیصلے، رشوت لے کر غلط فتویٰ دینا، حکم کو تبدیل کر کے لوگوں کی مرضی کے مطابق ڈھالنا یہ سب کچھ چند ٹکوں کے لیے کیا جاتا ہے۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا۔ دنیا کے حقیر مال کے بدلے میری آیتوں کو نہ بیچ ڈالو، یہ بالآخر ختم ہونے والی ہے اور پھر تمہیں اپنے کیے پر سخت ندامت ہوگی۔ یاد رکھو اللہ کے احکام کی خلاف ورزی نہ کرو کیونکہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ جس نے اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ نہیں کیا فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ پس یہی لوگ کافر ہیں۔ امام محمدؒ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت نقل کرتے ہیں کہ جس نے خدا کے نازل کردہ احکام پر دل سے یقین نہ کیا تو وہ صریح کافر ہے۔ اور اعتقاد ہے مگر اُس پر عمل نہیں تو اُس کا حکم اگلی آیتوں میں آ رہا ہے۔ ایسے لوگوں کو ظالم اور فاسق کہا گیا ہے۔ یہود کا حال یہ تھا کہ کتاب اللہ پر اُن کا اعتقاد ہی اٹھ چکا تھا، وہ اللہ کے احکام کو اپنی خواہش کے مطابق چلانے لگے تھے۔ قرآن پاک کے بارے میں بھی یہی حکم ہے۔ جو

اللہ کی کتاب اور اس کے احکام پر مکمل اعتقاد نہ رکھے، انہیں غیر ضروری تصور کرے وہ قطعی کافر ہے۔ برطانیہ، فرانس، امریکہ اور روس کے نظام کو برتر سمجھنے والا صریح کافر ہے۔

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ أَنَّ ٱلنَّفْسَ بِٱلنَّفْسِ وَٱلْعَيْنَ بِٱلْعَيْنِ وَٱلْأَنفَ بِٱلْأَنفِ وَٱلْأُذُنَ بِٱلْأُذُنِ وَٱلسِّنَّ بِٱلسِّنِّ وَٱلْجُرُوحَ قِصَاصٌ ۚ فَمَن تَصَدَّقَ بِهِۦ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهُۥ ۚ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ فَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلظَّٰلِمُونَ ﴿٤٥﴾ وَقَفَّيْنَا عَلَىٰٓ ءَاثَٰرِهِم بِعِيسَى ٱبْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ ٱلتَّوْرَىٰةِ ۖ وَءَاتَيْنَٰهُ ٱلْإِنجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ ٱلتَّوْرَىٰةِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ﴿٤٦﴾ وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ ٱلْإِنجِيلِ بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ فِيهِ ۚ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ فَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْفَٰسِقُونَ ﴿٤٧﴾

ترجمہ: اور ہم نے لکھ دیا تھا ان (بنی اسرائیل) پر اس (تورات) میں کہ بیشک جان کے بدلے جان (کو قتل کیا جائے گا) اور آنکھ کے بدلے آنکھ، اور ناک کے بدلے ناک، اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت، اور زخموں کو قصاص ہے۔ پس جس شخص نے معاف کر دیا، پس وہ اس کے لیے کفارہ ہو گا اور جس نے حکم نہ

کیا اُس چیز کے ساتھ جس کو اللہ نے نازل کیا ہے۔ پس یہی لوگ ظالم
ہیں(۴۵) اور پہلے انبیاء کے پیچھے ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو بھیجا جو تصدیق
کرنے ہوئے تھے اُس چیز کی جو اُن سے پہلے تھی تورات اور
ہم نے اُن کو انجیل دی، اس میں ہدایت اور روشنی تھی اور وہ
تصدیق کرنے والی تھی اُس کی جو اس سے پہلے تھی تورات۔ اور
ہدیت اور نصیحت تھی متقیوں کے لیے(۴۶) اور چاہیئے کہ فیصلہ کریں
انجیل والے بھی اُس کے مطابق جو اللہ نے نازل فرمایا ہے اس میں
اور جو کوئی اللہ کی نازل کردہ چیز کے مطابق فیصلہ نہیں کریگا پس یہی لوگ ہیں نافرمان(۴۷)

ربط آیات

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ ہم نے تورات کو موسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمایا، اس میں ہدایت اور روشنی ہے اللہ کے نبی اس کے مطابق فیصلہ کرتے تھے مگر اس میں بنی اسرائیل نے گڑبڑ پیدا کر دی وہ تورات پر عمل نہیں کرتے تھے بلکہ اس میں انہوں نے لفظی اور معنوی دو طرح سے تحریف کر دی۔ الفاظ کو بھی تبدیل کر دیا اور معانی بھی اُلٹ پلٹ کر دیے مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو لوگ اللہ کی نازل کردہ تورات کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے، وہ کافر ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ احکام شریعت پر عدم اعتقاد اور اس کی تصدیق کفر کے مترادف ہے۔ اور اگر کوئی شخص کتاب اللہ کی تصدیق کرنے کے بعد اُس پر عمل نہیں کرتا، تو وہ کفران نعمت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی یہی خرابی بیان فرمائی۔ اِسی تسلسل میں اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ "اسی وجہ سے یعنی لوگوں کو ظلم سے بچانے اور قتل ناحق کو روکنے کے لیے اللہ نے بنی اسرائیل کو یہ تعلیم دی تھی کہ جو کوئی کسی کو ناحق قتل کرے گا یا کسی ایسے شخص کو قتل کرے گا جو زمین میں فساد کا مرتکب نہیں ہوا، تو ایسا کرنا پوری نسل انسانی کو قتل کرنے کے برابر ہے۔ اور جو کوئی کسی ایک جان کی حفاظت کرتا ہے، وہ گویا پوری نسل انسانی کی حفاظت کرتا ہے۔

اِس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی طرف سے نقضِ عہد کا ذکر کیا تھا یہود اور نصاریٰ دونوں گروہ اللہ کے ساتھ کیے گئے عہد و پیمان کو توڑنے کے مرتکب ہوئے تھے۔ اسی عہد شکنی کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا "وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلَىٰ خَائِنَةٍ مِّنْهُمْ" کہ آپ اُن کی خیانتوں پر برابر مطلع ہوتے رہیں گے۔ چنانچہ زنا کا جو واقعہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں پیش کیا گیا اُس میں تورات کے احکام کو چھپا کر یہودیوں نے مذہبی خیانت کا ارتکاب کیا۔ مگر اللہ نے اُس کو ظاہر کر دیا۔ دوسرا معاملہ یہودیوں کے دو قبیلوں بنو قریظہ اور بنو نضیر کے درمیان قصاص کا تھا۔ اِن میں سے بنو نضیر اپنے آپ کو بنو قریظہ پر فوقیت دیتے تھے اگر بنو قریظہ کا کوئی آدمی بنو نضیر کے کسی شخص سے قتل ہو جاتا تو اس کا قصاص نہیں دلاتے تھے کیونکہ وہ بنو قریظہ کو حقیر سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ ایک معمولی آدمی کے بدلے معزز شخص کی جان نہیں لی جا سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے تورات میں قانونِ قصاص سب کے لیے مساوی درجے کا نازل فرمایا تھا، اس میں چھوٹے بڑے، امیر غریب، اعلیٰ و ادنیٰ کی کوئی تفریق نہ تھی مگر انہوں نے مختلف خاندانوں کے درمیان تفریق پیدا کر کے اپنی خیانت کا ایک اور ثبوت فراہم کر دیا تھا۔

قانونِ قصاص

اللہ نے فرمایا کہ ہم نے تو قصاص کا واضح قانون دیا تھا "وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا" ہم نے اُن پر اس تورات میں لکھ دیا تھا "أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ" کہ بیشک جان کے بدلے جان ہے۔ اس میں کسی چھوٹے بڑے کا امتیاز نہیں۔ قاتل کو مقتول کے بدلے میں قتل کیا جائے گا۔ یہ قانون تو اللہ نے بنی اسرائیل کے لیے تورات میں بیان فرمایا، تاہم شریعت محمدیہ میں بھی یہی قانون نافذ ہے۔ کہ کسی مسلمان کے قتل عمد میں قاتل کو بھی قتل کیا جائے گا حضرت امام ابوحنیفہؒ کے فتوٰی کے مطابق ذمی آدمی کا مال و جان اور عزت و آبرو بھی

اُسی طرح محفوظ ہے جس طرح ایک مسلمان کا۔ ذمی کے بدلے میں مسلمان کو بھی قتل کیا جائیگا۔ بشرطیکہ ذمی کا قتل قتلِ عمد ہو۔ اگر قتل عمد نہیں بلکہ قتل خطاء ہے یا قتل شبہ عمد ہے تو اس صورت میں قصاص کی بجائے دیت ادا کرنا ہوگی۔ جیسا کہ گذشتہ سورۃ میں بیان ہو چکا ہے، قتلِ خطاء یہ ہے کہ ارادہ کسی جانور وغیرہ کو مارنے کا تھا مگر غلطی سے کوئی انسان زد میں آکر قتل ہوگیا۔ اور قتل شبہ عمد کی تعریف یہ ہے کہ موت کسی ایسے آلہ سے واقع ہوئی ہو جو عام طور پر قتل کے لیے استعمال نہیں ہوتا۔ غرضیکہ فقہ حنفی میں ذمی کا قتل بھی مسلمان کے قتل کے برابر ہے۔ تاہم بعض دیگر ائمہ کرام فرماتے ہیں کہ ذمی اگرچہ مسلمانوں کی رعایا ہے مگر وہ کافر تو بہرحال ہے اور اس کے متعلق حضور علیہ السلام کا فرمان ہے لَا يُقْتَلُ مُؤْمِنٌ بِكَافِرٍ یعنی کافر کے بدلے مومن کو قتل نہیں کیا جائیگا، لہذا ذمی کافر کے قصاص میں مومن کی جان نہیں لی جاسکتی ہے۔ مگر امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ یہ حکم ذمی کافر کے لیے نہیں بلکہ حربی کافر کے لیے ہے، پُرامن غیر مسلم شہری پر یہ حکم عاید نہیں ہوتا۔ امام صاحبؒ کا قول عقلی طور پر بھی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس سے انسانیت کا احترام ظاہر ہوتا ہے اور یہ ایک ایسا اصول ہے جو غیر مسلموں کو اسلام کے قریب آنے میں مدد دیتا ہے۔

اعضاء کا قصاص

جان کے بدلے جان کے بعد مختلف اعضاء تلفی کے متعلق فرمایا وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ آنکھ کے بدلے میں آنکھ ہے یعنی اگر کوئی شخص کسی دوسرے آدمی کی آنکھ پھوڑتا ہے تو قصاص میں اسکی آنکھ بھی پھوڑی جائیگی وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ اگر کسی کا ناک کاٹا ہے تو اس کے بدلے میں اس کی ناک کو کاٹا جائیگا۔ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ اگر کسی کا کان ضائع ہوا ہے۔ تو اسے بھی کان کاٹنے کی اجازت ہے۔ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ اور دانت کا قصاص دانت ہی ہے۔ اگر دانت ضائع ہوا ہے تو ضرب لگانے والے

کا دانت بھی اکھاڑا جائیگا۔ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ اور تمام زخموں میں قصاص ہے جس قسم کا زخم کسی کو لگایا گیا ہے، اُسی قسم کا زخم بدلے میں لگایا جائیگا۔ غرضیکہ قصاص کا قانون ایک ایسا قانون ہے جو فسادفی الارض کرنے والے کو مجبور کرتا کہ وہ کسی کو نقصان پہنچانے سے پہلے اس کے نتائج پر اچھی طرح غور کرے

یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ اعضا اور زخموں کا قصاص اُسی صورت میں جائز ہے۔ جب کہ وہ لگائے گئے زخم کے عین مطابق ہو اور اس میں کمی بیشی ممکن نہ ہو۔ مثال کے طور پر اگر ناک نچلے حصّے سے کٹی ہے جہاں پر ہڈی نہیں تو قصاص میں ناک کا اتنا حصہ کاٹ دینا تو ممکن ہے، لیکن اگر اُوپر والے حصے میں ناک کی ہڈی بھی توڑی گئی ہے تو قصاص میں اُسی جگہ بعینہٖ اتنی ہڈی توڑنا ممکن نہیں کیونکہ ایسا کرنے میں تھوڑی بہت کمی بیشی ضرور واقع ہو گی۔ اِسی طرح اگر کسی شخص کی ٹانگ کی یا بازو کی ہڈی توڑی گئی ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ بعینہٖ اسی جگہ سے اتنی ہی ہڈی قصاص میں توڑی جائے۔ تو ایسے حالات میں قصاص ممکن نہیں رہتا۔ لہٰذا ہر ایسے زخم کے بدلے میں قصاص کی بجائے دیت لازم آئیگی۔

فرمایا فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ جو کوئی لگائے گئے زخم کا صدقہ کرے یعنی جارح کو معاف کر دے تو اس کا یہ فعل اس کے گناہوں کا کفارہ بن جائے گا۔ معافی کی صورت یہ ہے کہ زخم خوردہ نہ تو قصاص میں زخم لگانے والے کو زخم لگائے اور نہ اس سے دیت وصول کرے۔ تو یہ بہت بڑا کام ہے۔ اللہ اس سے اُس شخص کے سابقہ گناہوں کا کفارہ بنا دے گا۔ اگر مضروب پوری دیت معاف کر دیتا ہے تو آخرت میں اُس کے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ اور نصف دیت معاف کرتا ہے تو نصف گناہوں کی معافی کا حقدار ہو جائیگا۔ بہر حال یہ متقیوں کا شیوہ ہے۔

زن
ائی

معافی کا قانون یہ ہے کہ قتل کی صورت میں مقتول کا ولی معاف کر سکتا ہے۔ اگر مقتول کے کئی وارث ہوں تو سب کی رائے لی جائیگی۔ البتہ اگر ان میں سے ایک وارث بھی قاتل کو معاف کرتا ہے تو اس سے قصاص ٹل جائے گا۔ البتہ دیت دینا پڑیگی۔ اور اگر مکمل معافی ہو جاتی ہے تو یہ مقتول کے گناہوں کا کفارہ بن جائیگا۔ زخم خوردگی کی صورت میں معافی کا اختیار خود مضروب کو حاصل ہوتا ہے۔ وہ چاہے تو قصاص یا دیت لے لے اور اگر وہ بالکل معاف ہی کر دیتا ہے تو یہ بہت بڑی بات ہے اور اس کے لیے آخرت میں ذریعہ نجات ہے۔

آگے فرمایا کہ قصاص کا قانون تو یہ ہے۔ البتہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ جو کوئی اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا، فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ تو یہی لوگ ظلم کرنے والے ہیں گذشتہ درس میں ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا تھا کہ وہ کافر ہیں کیونکہ انہوں نے اللہ کے احکام کی تصدیق ہی نہیں کی، اور جو شخص قانون الٰہی کو برحق تسلیم کرتے ہوئے اُس کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا ہے وہ ظالم ہے۔

عیسیٰ علیہ السلام بطور مصدق

فرمایا کہ عیسائیوں کا حال بھی یہودیوں سے ملتا جلتا ہے۔ ان میں تعصب عناد، ظلم و زیادتی اور سنگدلی اگرچہ یہودیوں سے قدرے کم ہے مگر خدا کی کتاب سے اعراض اور تاویل و تحریف کرنے میں عیسائی بھی یہودیوں سے کم نہیں۔ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو انبیاء کے نقش قدم پر بھیجا۔ آپ بنی اسرائیل کے سب سے آخری نبی ہیں۔ آپ کے بعد چھ سو سال تک دنیا میں کوئی نبی نہیں آیا اور سلسلہ نبوت کے آخری مرحلہ میں حضور خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت ہوئی۔ آپ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان کوئی نبی نہیں آیا۔ اسی لیے آپ کا ارشاد

ہے اَنَا اَوْلٰی بِعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ یعنی میں عیسیٰ علیہ السلام سے زیادہ قریب ہوں۔ آپ کی کتاب کا نام انجیل ہے، جس کا معنے بشارت ہے کیونکہ اس میں ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت دی گئی ہے۔ جیسا کہ سورۃ صف میں موجود ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے کہا کہ میں تمہاری طرف رسول بن کے آیا ہوں، میں تمہارے پاس موجود کتاب تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں" وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْ بَعْدِی اسْمُهٗ اَحْمَدُ" میں اپنے بعد آنے والے رسول کی بشارت دینے والا ہوں جس کا نام احمد ہوگا۔ چنانچہ گذشتہ صدی تک مختلف اناجیل میں فارقلیط کا لفظ موجود تھا جس کا عربی متبادل احمد ہے مگر یہ لفظ تحریف کی نذر ہو چکا ہے۔

انجیل بطور ہدایت اور روشنی

یہاں بھی فرمایا کہ ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو پیچھے لگایا مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ جو تصدیق کرنے والے تھے اس چیز کی جو ان کے پاس تھی یعنی تورات وَاٰتَیْنٰهُ الْاِنْجِیْلَ اور ہم نے ان کو انجیل عطا کی، تورات کی طرح انجیل بھی ایسی کتاب تھی فِیْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ جس میں ہدایت اور روشنی تھی اس میں ایسے اصول و ضوابط تھے جن پر عمل پیرا ہونے سے انسان .... کی اصلاح ہوتی ہے اور تورات کی طرح انجیل کی روشنی سے بھی شکوک و شبہات دور ہوتے تھے اور انسان کا ذہن بالکل صاف ہو جاتا تھا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کے متعلق بھی فرمایا" وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْكُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا" ہم نے تم پر واضح نور نازل فرمایا، جہاں کہیں شبہ پڑے، قرآن پاک کی طرف رجوع کرو یہ تمہارے تمام مسائل حل کر دے گا۔ البتہ" فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ" اگر تم خود مسائل نہ اخذ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے تو اہل علم لوگوں سے دریافت کر لو، وہ قرآن پاک سے استنباط

کرکے بتائیں گے۔ کہ فلاں فلاں مسئلہ فلاں فلاں آیت سے حل ہوتا ہے
اللہ تعالیٰ نے یہ عظیم کتاب اس لیے نازل فرمائی ہے "لِتُخْرِجَ النَّاسَ
مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ" تاکہ آپ لوگوں کو اندھیروں
سے نکال کر روشنی کی طرف لائیں، کفر، شرک، نفاق، بدعمی، فسق و فجور
یہ سب ظلمت ہے۔ آپ ان سے نکال کر اطاعت، اخلاص، توحید اور
نیکی کی روشنی کی طرف لائیں۔

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ روشنی سے یہ ظاہری روشنی مراد نہیں
ہے بلکہ اس سے دل کی بصیرت مراد ہے۔ قرآن پر ایمان لا کر اسے پڑھنے
سے دل کی تاریکی دور ہوتی ہے، انسان اچھے برے، توحید، شرک، حلال
حرام اور نیکی بدی میں امتیاز کرنے لگتا ہے، وحی الٰہی زندگی کے ہر موڑ پر انسان
کے لیے روشنی کا کام دیتی ہے۔ معاملہ انفرادی ہو یا اجتماعی، مسئلہ سیاسی
ہو یا معاشی، دین کا ہو یا دنیا کا، تنازعہ جنگ کا ہو یا صلح کا۔ تمام مواقع پر
کتاب الٰہی روشنی مہیا کرے گی۔ بشرطیکہ اس کو صدقِ دل سے تسلیم کر لیا
جائے، جو شخص اس کی حقیقت کو تسلیم ہی نہ کرے وہ اس سے راہنمائی کیسے
حاصل کر سکتا ہے۔ جو شخص دن میں آنکھیں بند کر کے بیٹھ جائے وہ روشنی
سے کیسے استفادہ کر سکیگا اور جو مکان کا دروازہ بند کرے اُسے سورج کی
روشنی اور گرمی کیسے حاصل ہو گی۔

بہرحال فرمایا کہ ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل عطا کی جو پہلی کتاب تورات
کی تصدیق کرنے والی تھی۔ جس طرح ہر آسمانی کتاب اپنے سے پہلے آنے
والی کتاب کی تصدیق کرتی رہی، اسی طرح ہر نبی اپنے سے پہلے انبیاء کی
تصدیق کرتا رہا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا "وَلِاُحِلَّ لَكُمْ
بَعْضَ الَّذِىْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ" میرے آنے کا ایک مقصد یہ بھی
ہے کہ بعض ایسی چیزوں کو حلال قرار دے دوں جو پہلے بنی اسرائیل پر

حرام تھیں۔ یہ حلت و حرمت بھی من جانب اللہ تھی۔ اس نے اپنی حکمت کے مطابق جب چاہا کسی چیز کو حرام کر دیا اور جب چاہا حلال قرار دے دیا۔

فرمایا انجیل کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ جس طرح عیسیٰ علیہ السلام تورات کی تصدیق کرنے والے تھے اسی طرح انجیل بھی تورات کی تصدیق کرنے والی تھی وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ یہ کتاب متقیوں کے لیے ہدایت اور نصیحت تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ ہدایت اور نصیحت اُسی کو مفید ہو سکتی ہے جو اس پر عمل پیرا ہو۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا جو شخص صراط مستقیم پر سفر کا آغاز کرتا ہے۔ اُس کو پہلے ہی دن غیب سے آواز آتی ہے کہ اللہ کے بندے! اس سیدھی سڑک پر چلتے جاؤ، اور دائیں بائیں نظر آنے والی پگڈنڈیوں اور دروازوں کی طرف متوجہ نہ ہونا۔ فرمایا یہ ندا کنندہ اللہ کا قرآن ہے۔ جب کوئی شخص مسلمان ہوتا ہے تو یہ قرآن پاک اس کو صراط مستقیم پر ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ اور غلط راستوں پر پڑ کر گمراہ ہونے سے خبردار کرتا ہے۔ سیدھا راستہ حظیرۃ القدس تک راہنمائی کرتا ہے جب کہ غلط راستہ جہنم تک لے جاتا ہے۔

عمل بالانجیل

فرمایا کہ بنی اسرائیل پر یہ فرض عاید ہوتا ہے وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ اور چاہیئے کہ فیصلہ کریں اہل انجیل اُس کے مطابق جو اللہ نے اُس میں نازل کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر عیسائی انجیل پر ٹھیک ٹھیک ایمان لے آئیں اور اس پر عمل کریں تو پھر انہیں قرآن پاک اور حضور خاتم النبیین علیہ السلام کی تصدیق بھی کرنا پڑیگی اور وہ اسلام میں داخل ہو جائیں گے۔ بگڑی ہوئی عیسائیت پر قائم رہنا محض جہالت ہے۔ یہ تعصب اور عناد کی وجہ سے اب تک ہو رہا ہے

فرمایا، یاد رکھو! وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ جو

کوئی اللہ کی نازل کردہ چیز کے مطابق فیصلہ نہیں کریگا فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ پس یہی لوگ نافرمان ہیں۔ اگر یہ لوگ کتاب اللہ کی دل سے تصدیق نہیں کرتے تو کامل درجے کے نافرمان اور دائرہ ملت سے خارج ہیں۔ اور اگر تصدیق کرنے کے باوجود عمل اس کے خلاف ہے تو پھر سخت مجرم، فاسق اور ظالم ہیں۔ یہ ملت حنیفیت کے پیروکار نہیں ہیں، بلکہ گمراہ ہیں۔ مسلمانوں کا حال بھی یہی ہے، قرآن وسنت پر ایمان لانے کے باوجود تمام فیصلے اس کے خلاف کرتے ہیں، ایسے لوگ فاسق اور ظالم ہیں۔ ممبران اسمبلی جج صاحبان اور قانون سے متعلقہ تمام لوگ اسکی زد میں ہیں۔ انہیں چاہیے کہ ایسے حالات پیدا کریں جن میں تمام فیصلے اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب کے مطابق طے پائیں۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ
مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ
بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا
جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً
وَّمِنْهَاجًا ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً
وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ
اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ
فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ
اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ
اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ۭ فَاِنْ
تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ
ذُنُوْبِهِمْ ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ﴿۴۹﴾
اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ۭ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ
اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع

ترجمہ: اور ہم نے آپ کی طرف کتاب اتاری حق کے
ساتھ جو تصدیق کرنے والی ہے اس کی جو اس سے پہلے ہیں

کتابوں سے اور یہ نگران ہے اُس پر پس فیصلہ کریں آپ اُن لوگوں کے درمیان اُس کے مطابق جو اللہ نے نازل فرمایا ہے، اور نہ پیروی کریں اُن کی خواہشات کی اُس چیز کو چھوڑ کر جو آچکی ہے آپ کے پاس حق سے۔ ہر ایک کے لیے ہم نے بنائی ہے تم میں سے ایک شریعت اور ایک راستہ۔ اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو بناتا تم کو ایک ہی امت، لیکن تاکہ آزمائے تم کو اُس چیز میں جو اللہ نے تم کو دی ہے۔ پس سبقت کرو نیکیوں کی طرف۔ اللہ ہی کی طرف سب کو لوٹ کر جانا ہے۔ پس وہ بتلائے گا تم کو وہ باتیں جن میں تم اختلاف کرتے تھے ﴿۴۸﴾ (اور یہ بھی اللہ کا فرمان ہے) کہ آپ اُن کے درمیان فیصلہ کریں اُس چیز کے مطابق جس کو اللہ نے نازل فرمایا ہے اور نہ پیروی کریں اُن کی خواہشات کی اور بچتے رہیں آپ اُن سے کہ کہیں وہ آپ کو فتنے میں نہ مبتلا کر دیں بعض ان چیزوں کے بارہ میں جن کو اللہ نے آپ کی طرف نازل کیا ہے۔ پس اگر یہ روگردانی کریں (اور نہ مانیں) تو آپ جان لیں کہ بیشک اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اُن کو سزا دے اُن کے بعض گناہوں کی وجہ سے اور بیشک بہت سے لوگ ایسے ہیں جو نافرمان ہیں کیا یہ لوگ جاہلیت کے زمانے کا فیصلہ تلاش کرتے ہیں۔ اور کون زیادہ بہتر ہے اللہ سے فیصلہ کرنے کے اعتبار سے اُس قوم کے لیے جو یقین رکھتی ہے

ربطِ آیات

اس سے پہلے تورات اور انجیل کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ اللہ نے فرمایا جب تورات نازل ہوئی تو اُس کے دور میں اُس کو ماننا اور اس پر عمل کرنا ضروری تھا، پھر جب انجیل نازل ہوئی، تو اُس پر ایمان لا کر اُس کے احکام کی تعمیل لازم تھی۔ مگر ان دونوں

گروہوں نے اپنی اپنی کتابوں کو پس پشت ڈال کر معاملات کے فیصلہ جات اپنی مرضی سے کرنے شروع کر دیے بلکہ الٹا اِن مقدس کتابوں میں تحریف کے مرتکب ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب پر دل سے یقین نہیں رکھتا، وہ قطعی کافر ہے اور جو اُن پر ایمان لانے کے باوجود اُن کے احکام پر عمل پیرا نہیں ہوتا وہ ظالم اور فاسق ہے۔ تورات و انجیل کا ذکر کرنے کے بعد اب اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی حقانیت کا تذکرہ کیا ہے اور اہلِ ایمان کو تاکید ہے۔ کہ وہ سابقہ کُتب کے حاملین والا رویہ اختیار نہ کریں بلکہ اللہ کی اِس آخری کتاب پر صدقِ دِل سے ایمان لائیں اور اِس کے احکام پر عمل کریں۔ یہود و نصاریٰ کی طرح تحریف جیسی قبیح چیز سے پرہیز کریں۔

نزولِ قرآن

ارشاد ہوتا ہے وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ اور ہم نے آپ پر حق کے ساتھ کتاب نازل فرمائی ہے۔ اس کتاب سے مراد قرآن پاک ہے، کیونکہ یہ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہو رہا ہے اور آپ پر اللہ کی اس آخری کتاب قرآن پاک کا نزول ہوا ہے۔ اس کتاب کے نزول کے ساتھ ہی سابقہ تمام کتب کا زمانہ ختم ہوا اور قرآن پاک کا دور شروع ہو گیا۔ اب تمام لوگوں کا فرض ہے۔ کہ وہ اس کتاب پر ایمان لائیں، اس کے احکام کا اتباع کریں اور اپنے تمام فیصلے اسی کے مطابق کریں۔

فرمایا اس کتاب کی حیثیت یہ ہے مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ کہ یہ تصدیق کرنے والی ہے اُن کتابوں کی جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہیں۔ یہ ایک اصولی بات ہے۔ کہ ہر بعد میں آنے والی کتاب پہلے آمدہ کتاب کی تصدیق کرتی ہے۔ اور اللہ کا ہر نبی اپنے سے پہلے ہونے والے نبی کی تصدیق کرتا ہے۔ چنانچہ جو

صحیفے حضرت داؤد علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام وغیرہم پر نازل ہوئے اور جو کتابیں زبور، تورات اور انجیل نازل ہوئیں۔ قرآن پاک ان سب کی تصدیق کرتا ہے کہ اللہ نے اُن تمام صحائف اور کُتب کو حق کے ساتھ نازل فرمایا من الکتب سے جنس کتاب مراد ہے، اور اس میں تمام آسمانی کتابیں شامل ہیں۔

قرآن جامع المضامین ہے

فرمایا کہ اس آخری کتاب کی دوسری صفت یہ ہے وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ کہ یہ تمام سابقہ کتب کا نگران، محافظ، امین اور نگہبان ہے۔ قرآن اس لحاظ سے بھی مہیمن ہے۔ کہ یہ تمام آسمانی کتب کی منجانب اللہ ہونے کی تصدیق کرتا ہے۔ اس کے علاوہ جو مضامین تمام سابقہ کُتب میں نازل ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے نہ صرف اُن کا خلاصہ قرآن پاک میں بیان فرما دیا ہے بلکہ اُن کے علاوہ بھی ہزاروں لاکھوں مضامین اس میں موجود ہیں۔ اس لحاظ سے یہ سابقہ کتب کا امین اور محافظ ہے۔ قرآن پاک کا حجم تو زیادہ نہیں ہے مگر یہ ایسی جامع کتاب ہے۔ جس میں تمام علوم سما گئے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی طرف یہ قول منسوب ہے۔ وہ فرماتے ہیں

جَمِيْعُ الْعِلْمِ فِي الْقُرْاٰنِ لٰكِنْ
تَقَاصَرَ عَنْهُ اَفْهَامُ الرِّجَالِ

تمام علوم کا ذخیرہ قرآنِ پاک میں موجود ہے مگر عام لوگوں کے ذہن اُس تک رسائی حاصل کرنے سے قاصر ہیں

قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا کلام اور اس کی صفت ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات لامحدود ہے اسی طرح اس کی صفات بھی غیر محدود ہیں۔ کوئی شخص اللہ کی صفات کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ تاہم وہ جس قدر محنت اور کوشش کریگا۔ اتنا ہی فیض حاصل کر سکے گا، جب یہ ایسی عظیم المرتبت کتاب ہے فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ

تو آپ لوگوں کے درمیان اسی منزل من اللہ کتاب کے ذریعے فیصلہ کریں قرآن حکیم کی صداقت وحقانیت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالےٰ نے اہل کتاب کی بد دیانتی اور خیانت کا ذکر بھی کیا ہے۔ پہلے صراحت کے ساتھ گذر چکا ہے کہ اہل کتاب نے احکام الٰہی کو تبدیل کر دیا تھا۔ چنانچہ زنا کا جو کیس حضور علیہ السلام کی خدمت میں پیش ہوا تھا اس میں بھی یہودیوں کی خیانت کارفرما تھی۔ انہوں نے اللہ کی طرف سے مقرر کردہ زنا کی سزا کو چھپا دیا تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کے ذریعے اُس کو واضح کر دیا۔ قصاص اور دیت کے معاملات میں بھی اُن لوگوں نے خرابیاں پیدا کر رکھی تھیں انہوں نے امیر اور غریب کے لیے مختلف سزائیں مقرر کر لی تھیں حالانکہ اللہ تعالےٰ کے نزدیک قانون سب کے لیے یکساں ہے اسمیں ادنیٰ اور اعلیٰ کی کوئی تفریق نہیں۔ جو کوئی کسی کو زخمی کریگا یا قتل ناحق کا مرتکب ہوگا، اس کو قانون کے مطابق سزا دی جائیگی۔

عمل بالقرآن

اب جب کہ قرآن پاک کا دور ہے تو سب کا فرض ہے کہ اسی کا اتباع کریں۔ اسی لیے اللہ نے حضور علیہ السلام سے فرمایا کہ آپ اسی کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ اور اُن کی خواہشات کی پیروی نہ کریں عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ اُس حق کو چھوڑ کر جو آپ کے پاس آچکا ہے، اس حصہ آیت کا شان نزول یہ ہے کہ اہل کتاب کے بعض علما حضور علیہ السلام کی خدمت میں اپنا کوئی معاملہ تصفیہ کے لیے لائے اور عرض کیا کہ ہم اپنی قوم کے مقتدا ہیں اگر آپ اس تنازعہ کا فیصلہ ہماری مرضی کے مطابق کر دیں تو ہم لوگ آپ کا اتباع کر لیں گے اور یہودیوں کی کثیر تعداد اسلام لے آئے گی۔ ظاہر ہے کہ حضور علیہ السلام کو اسلام سے بڑھ کر کوئی چیز عزیز نہ تھی۔ آپ کی ہمیشہ یہ خواہش ہوتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ لوگ دائرہ اسلام

یں داخل ہوجائیں۔ اب یہودیوں نے قبولِ اسلام کے لیے ایسی شرط پیش کردی جو خود اسلامی اصولوں کے منافی تھی، لہٰذا حضور علیہ السلام نے یہودی علماء سے فرمایا کہ میں تمہاری اس پیش کش کے بدلے میں کوئی غلط فیصلہ کرنے پر تیار نہیں۔ اگر تم نے اس طریقے سے اسلام قبول کیا تو یہ رشوتی اسلام ہوگا لہٰذا ہمیں ایسے اسلام کی ضرورت نہیں ہے۔ اسلام وہی قابلِ قبول ہے جو اسکی صداقت اور حقانیت کی بنا پر اختیار کیا جائے اس کے بغیر نجات کی کوئی صورت نہیں "اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ" اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے جو اس کو اختیار کریگا وہی کامیاب ہوگا۔ "وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ" جو کوئی اسلام کے علاوہ دین اختیار کریگا، تو وہ ناقابل قبول ہوگا ایسا شخص آخرت میں نقصان اٹھانے والا ہوگا۔ بہرحال فرمایا کہ اب جبکہ قرآن پاک کا دور ہے تو اب قابلِ عمل بھی یہی کتاب ہے ہر معاملہ میں اسی کے مطابق فیصلہ ہوگا۔

آخری شریعت

اللہ تعالیٰ نے آخری کتاب قرآن پاک اور آخری شریعت محمدی نازل فرمائی۔ اب قیامت تک تمام معاملات کے فیصلے کتاب اللہ اور شریعت محمدی کے مطابق ہی ہوں گے، پہلی شریعت اور موجودہ شریعت میں قدرے اختلاف ہے مگر وہ پہلی تمام شرائع منسوخ ہو چکی ہیں اور اب صرف یہی قابلِ عمل ہے۔ سورۃ جاثیہ میں موجود ہے "ثُمَّ جَعَلْنٰکَ عَلٰی شَرِیْعَۃٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْھَا وَلَا تَتَّبِعْ اَھْوَآءَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ" سب سے آخر میں ہم نے آپ کو ایک شریعت پر مقرر کیا ہے، لہٰذا اب اس کا اتباع کریں اور جاہل لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ لگیں۔ اسی طرح یہاں پر بھی فرمایا لِکُلٍّ جَعَلْنَا مِنْکُمْ شِرْعَۃً وَّمِنْھَاجًا ہم نے تم میں سے ہر ایک

کے لیے ایک شریعت اور واضح راستہ مقرر کیا۔ بنیادی دین تو تمام انبیاء کا ایک ہی رہا ہے تاہم دین کی فرع یعنی شریعت مختلف انبیاء کے لیے مختلف تھی۔ سورۃ شوریٰ میں موجود ہے شَرَعَ لَکُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوْحًا یعنی تمہارے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے دین کے قطعی ضابطے اور قوانین وہی مقرر فرمائے ہیں۔ جو نوح علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کے لیے مقرر فرمائے تھے۔ تاہم ہر ایک کی شریعت جدا جدا تھی۔ خود حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بھی یہی فرمان ہے نحن معاشر الانبیاء بنو علات دیننا واحد ہم سارے نبی علاتی بھائی ہیں یعنی ہمارا دین ایک ہے، البتہ شرائع علیحدہ علیحدہ ہیں۔ علاتی بھائی وہ ہوتے ہیں جن کا باپ ایک ہو مگر مائیں جُدا جُدا ہوں۔ تو حضور علیہ السلام نے مختلف انبیاء کے درمیان دین اور شریعت کو اس مثال کے ذریعے سمجھایا۔ بعض چیزیں ایک شریعت میں حرام ہوتی ہیں تو دوسری میں حلال تاہم دین کے بنیادی اصول ہمیشہ یکساں رہے ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہی فرمایا تھا وَلِاُحِلَّ لَکُمْ بَعْضَ الَّذِیْ حُرِّمَ عَلَیْکُمْ میری بعثت کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ تم پر بعض وہ چیزیں حلال قرار دے دوں جو تم پر حرام تھیں۔ مقصد یہ ہے کہ شریعت میں حلت و حرمت اور دیگر فروعی احکام بدلتے رہتے ہیں۔

تفریق بین شرائع

اب آگے اللہ تعالیٰ نے مختلف شرائع میں تفریق کی حکمت بھی بیان فرمائی ہے۔ وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا لَجَعَلَکُمْ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً تو تمہیں ایک ہی امت بنا دیتا یعنی پوری نسلِ انسانی کے لیے ایک ہی شریعت مقرر کر دیتا۔ مگر یہ اللہ کی حکمت کے خلاف ہے۔ زمان و مکان کا اختلاف انسانی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ ان کے فرائض اور ضروریات مختلف ہوتی ہیں لہٰذا ہر مقام

۱؎ [illegible] تفسیر ص ۱۹۶ (فیاض)

اور ہر زمانے کے لیے یکساں احکام نازل کرنا خلاف فطرت ہے۔ کسی ایک انسانی زندگی پر بھی مختلف دور گزرتے ہیں۔ اس کے بچپن کے حالات اور اس کی ضروریات۔ اسکی جوانی کی عمر سے مختلف ہوتی ہیں۔ اکثر غذائیں صحت کی حالت میں مفید ہوتی ہیں مگر بیماری کی حالت میں وہی چیزیں نقصان دہ ثابت ہوتی ہیں۔ اسی طرح مختلف ادوار و اقوام کے اجتماعی حالات بھی مختلف ہوتے ہیں اور ان کے فرائض و ضروریات بھی جدا ہوتی ہیں۔ چنانچہ تمام انسانی تقاضوں کی تکمیل کے لیے مختلف زمانوں اور مختلف اقوام کے لیے اللہ نے علیحدہ علیحدہ شرائع نازل فرمائیں۔

شریعت کا لفظی معنی گھاٹ ہے۔ جس طرح گھاٹ سے انسان اور جانور اپنی ضروریات کے مطابق پانی حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح تشنگان علم و عمل شریعت سے احکام اور ہدایات حاصل کرتے ہیں۔ چونکہ شریعت دین کی فرع ہے۔ اس لیے اس کا ایک حالت میں قائم رہنا غیر فطری عمل ہے۔ دین کے معاملہ میں اختلاف کیا جائے تو وہ گمراہی ہوگا البتہ شریعت میں اجتہاد کے ذریعے مسائل کے حل دریافت کرنا فطرت کے عین مطابق ہے فروعات میں اختلاف کو ختم نہیں کیا جاسکتا۔ ایسا کرنے سے تو اجتہاد کا دروازہ بند کرنا پڑے گا جس کی وجہ سے قوم و ملت کی ترقی کسی ایک نہج پر پہنچ کر رک جائیگی۔ یہی چیز خلاف فطرت ہے۔ انسانی نشو و ارتقا کا تقاضا ہے کہ ہر زمانے اور ہر خطے کی ضروریات شریعت کے احکام کی روشنی میں پوری —— کی جائیں۔ لہٰذا شریعت کا اختلاف بالکل درست ہے، البتہ دین میں اختلاف مہلک ہے۔ یہود و نصاریٰ اسی بنیادی اختلاف کی وجہ سے گمراہ ہوئے۔

فرمایا اگر اللہ چاہے تو تمام لوگوں کو ایک ہی شریعت کا پابند کردے مگر وہ ایسا نہیں کرتا وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِىْ مَآ اٰتٰكُمْ

بلکہ اختلاف شریعت سے اس کا مقصود یہ ہے۔ کہ تمہیں اُس چیز میں آزمائے جو اُس نے تمہیں دی ہے۔ اللہ تعالیٰ مختلف احکام شریعت نازل فرما کر آزمائش کرنا چاہتا ہے کہ کیا اُس کے بندے انہیں قبول کرنے کے لیے تیار ہیں یا نہیں۔ اللہ تعالیٰ کسی سے جبراً کوئی چیز نہیں منوانا چاہتا بلکہ وہ موقع فراہم کرتا ہے اور پھر دیکھتا ہے کہ اس کے احکام پہ کون عمل پیرا ہوتا ہے

نیکی میں سبقت

فرمایا جب یہ بات ہے فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ تو نیکیوں کی طرف سبقت کریں۔ نیکی میں ایک دوسرے سے سبقت حاصل کرنے کی کوشش کریں اور شریعت کے ہر حکم پر عمل کرنے کے لیے تیار رہیں۔ آخرت کی گھاٹیاں عبور کرنے کے لیے نیکی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا بالآخر تم سب کو خدا کی طرف لوٹ کر جانا ہے فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ پھر اللہ تعالیٰ وہ تمام چیزیں تمہارے سامنے رکھ دیگا جن میں تم اختلاف کرتے تھے۔ وہاں پر حق و باطل کا قطعی اور اٹل فیصلہ ہو جائے گا۔ نیز فرمایا کہ جب یہ احکام من جانب اللہ ہیں وَأَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ تو آپ ان کے درمیان اسی منزل من اللہ احکام کے مطابق فیصلہ کریں۔ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ آپ ان یہودی علما کی خواہشات کی پیروی نہ کریں۔ وہ جو بھی مقدمہ لائیں اس کا فیصلہ احکام الٰہی کے عین مطابق کر دیں۔ وَاحْذَرْهُمْ آپ ان سے چوکنا رہیں أَنْ يَفْتِنُوكَ عَنْ بَعْضِ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ إِلَيْكَ کہ کہیں آپ کو بعض اُن چیزوں کے بارے میں فتنے میں ڈال دیں جنکو اللہ نے آپ پہ نازل کیا۔ یہودیوں نے یہ سازش کی تھی کہ اسلام لانے کا وعدہ کر کے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی مرضی کا فیصلہ کرالیں اور پھر اسی چیز کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈا

ہتھیار استعمال کریں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو خبردار کر دیا کہ آپ سے غلط فیصلے کرا کر آپ کو کہیں یہ فتنے میں مبتلا نہ کر دیں، آپ ان سے ہوشیار رہیں۔ آپ پہلے بھی ان کی سازشوں سے بچتے رہے ہیں اور آئندہ بھی محتاط رہیں۔

جرم وسزا

فرمایا فَاِنْ تَوَلَّوْا پس اگر یہ یہودی روگردانی کریں۔ آپ کے فیصلے کو تسلیم نہ کریں فَاعْلَمْ تو آپ اچھی طرح جان لیں اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ اَنْ یُّصِیْبَھُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِھِمْ اللہ تعالیٰ ان کو اُن کے بعض گناہوں کی وجہ سے سزا دینا چاہتا ہے۔ حق واضح ہو جانے کے باوجود اگر کوئی شخص ہٹ دھرمی، ضد اور عناد پر قائم رہتا ہے، تو پھر وہ قابلِ رحم نہیں ہے۔ اُسے لازماً سزا ملنی چاہیئے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک سزا ہے کہ انسان کا عقیدہ خراب ہو جائے۔ نیکی کی توفیق سلب کر لی جائے اور برائی میں مبتلا کر دیا جائے، لہٰذا انسان کو ہر وقت محتاط رہنا چاہیئے اور دُعا کرنی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ فتنے اور گمراہی سے محفوظ رکھے۔ انسان بعض ایسی غلطیاں کرتا ہے جن کا انہیں احساس تک نہیں ہوتا مگر ان کے نتائج اسی زندگی میں نکلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اور اسی دنیا میں سزا ملنے لگتی ہے لہٰذا اگر یہ لوگ اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں، حق کو قبول کرنے سے مسلسل انکاری ہیں تو سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو سزا دینا چاہتا ہے فرمایا وَاِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ لوگوں کی اکثریت نافرمان ہے، وہ احکامِ الٰہی کو تسلیم کرنے اور ان پر عمل کرنے کیلیے تیار نہیں ہیں اللہ کے نافرمان ہر دور میں اکثریت میں رہے ہیں حضور علیہ السلام کے اپنے زمانۂ مبارک میں بھی یہی حال تھا اور اُس کے بعد بھی مسلسل اکثریت بے دینوں کی ہے آج بھی دنیا کی کل پانچ ارب کی آبادی میں سے چار ارب سے زیادہ لوگ قطعی طور پر کفر، شرک اور گمراہی میں مبتلا ہیں، پانچویں حصے کے لوگ ہدایت یافتہ ہونے کے دعویدار ہیں ان میں بھی

بہت سی خرابیاں پائی جاتی ہیں۔ بالکل صحیح اعتقاد رکھنے والے اور اللہ تعالےٰ کے حکم کی تعمیل کرنے والے بہت کم ہیں۔ ان میں اکثریت نافرمانوں اور ناشکرگزاروں کی ہے۔ سورۃ مومن میں موجود ہے وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ اکثر لوگ ناشکرگزار ہی ہوتے ہیں اسی طرح سورۃ سبا میں بھی آتا ہے وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ یعنی میرے شکرگزار بندے بہت کم تعداد میں ہیں۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے یہاں پر یہود و نصاریٰ کی سازش کو واضح کر کے ان کی مذمت بیان فرمائی ہے۔

جاہلیت کا فیصلہ

فرمایا اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ کیا جاہلیت کے زمانے کا فیصلہ چاہتے ہو۔ جاہلیت کا قانون تو یہ تھا کہ احکام الٰہی کو پس پشت ڈال کر اپنی مرضی کا فیصلہ کیا جائے۔ تو اب جب کہ قرآن پاک نازل ہو چکا ہے۔ اسلام کی روشنی پھیل چکی ہے تو اب واپس ظلمت کی طرف جانا چاہتے ہو، یہ تو بہت ہی بُری بات ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ تین شخص سخت مبغوض ہیں۔ پہلا شخص ملحد فی الحرم ہے یعنی وہ شخص جو پاک خطے حرم میں گناہ کا ارتکاب کرتا ہے وہ اللہ کی سخت ترین ناراضگی کو دعوت دیتا ہے۔ دوسرا شخص فرمایا متبع فی الاسلام سنۃ الجاهلیۃ جو اسلام میں جاہلیت کے دستور کا اتباع کرتا ہے۔ اور تیسرا مبغوض شخص وہ ہے جو بے گناہ کا خون بہاتا ہے۔ خونِ ناحق کے لیے کوشش کرتا ہے اُس کے حق میں گواہی دیتا ہے ناحق شکایت کرتا ہے کہ اُس کا خون ہے۔ یہود کا بھی یہی حال ہے۔ وہ اپنی کتاب کے فیصلہ کو تسلیم کرتے ہیں اور نہ وہ نبی آخرالزمان سے صحیح فیصلہ چاہتے ہیں بلکہ اسلام کے روشن زمانے میں بھی جاہلیت کے ظلمت والے فیصلے کے متلاشی ہیں۔ فرمایا یاد رکھو! وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ایمان و یقین رکھنے

والی قوم کے لیے اللہ کے فیصلے سے بڑھ کر کس کا فیصلہ ہو سکتا ہے۔ خدا تعالے
کا فیصلہ وہی ہے جو اس کی نازل کردہ کتاب و شریعت کا فیصلہ ہے
لہٰذا ان کے مطابق کیا گیا فیصلہ ہی بہترین فیصلہ ہے۔ اللہ کے فیصلے
کو چھوڑ کر زمانۂ جاہلیت کے فیصلے کی طرف رجوع کرنا نہایت ہی
بدبختی اور اللہ کے غضب کا نشانہ بننا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى
اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ
مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ
الظّٰلِمِيْنَ ﴿٥١﴾ فَتَرَى الَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ
يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا
دَآئِرَةٌ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِىَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ
فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِىْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ﴿٥٢﴾ وَيَقُوْلُ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ
اَيْمَانِهِمْ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ
فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿٥٣﴾

ترجمہ اے ایمان والو نہ بناؤ یہود و نصاری کو اپنا دوست
بعض اُن کے دوست ہیں بعض کے ، اور جو شخص اُن سے روستانہ
کرے گا تم میں سے پس بیشک وہ بھی ان میں سے ہوگا ۔ بیشک
اللہ تعالیٰ نہیں راہنمائی کرتا اُس قوم کی جو ظلم کرنے والی ہے ﴿٥١﴾
پس دیکھے گا تو (اے مخاطب) اُن لوگوں کو جن کے دلوں میں روگ
ہے (نفاق کی بیماری ہے) کہ وہ دوڑتے ہیں اُن کے اندر جانے
کے لیے کہتے ہیں کہ ہم ڈرتے ہیں کہ کہیں ہمیں زمانے کی گردش

نہ پہنچے۔ پس امید ہے کہ اللہ تعالیٰ فتح لائیگا یا اپنی جانب سے کوئی اور معاملہ پس ہو جائیں گے یہ لوگ نادم اس چیز پر جو انہوں نے اپنے نفسوں میں چھپائی ہے (۵۲) اور کہیں گے وہ لوگ جو ایمان لائے کیا یہ وہی لوگ ہیں جو اللہ کے نام کی قسمیں اٹھاتے تھے کہ وہ تمہارے ساتھ ہیں۔ اُن کے اعمال ضائع ہو گئے پس ہو گئے وہ نقصان والے (۵۳)

ربط آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی مذمت بیان فرمائی ہے۔ اور ان کی خباثتوں کا ذکر کیا۔ دین کی تحریف، کتمانِ حق، نقض عہد اور تغیر احکام اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔ منافقین کے متعلق بھی پہلے گزر چکا ہے کہ اللہ نے فرمایا وہ اپنی زبانوں سے ایمان لانے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر در پردہ اسلام کے دشمنوں کے ساتھ رابطہ ہے۔ اب آج کی آیات میں یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستی قائم کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ ان کی واضح خباثتوں کے بعد یہ لوگ دوستانے کے قابل نہیں ہے اسی طرح ان منافقین کے ساتھ بھی دوستانہ روابط سے منع فرمایا گیا ہے۔

اہل کتاب سے دوستی کی ممانعت

ارشاد ہوتا ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اے لوگو! جو ایمان لائے ہو۔ لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِیَآءَ یہود اور نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ اولیاء جمع ہے ولی کی اور اس کا معنی دوست، رفیق، ساتھی قریبی رشتہ دار، معاون، مددگار، سرپرست اور آقا ہوتا ہے۔ اس مقام پر ولایت سے مراد دوستی اور رفاقت ہے۔ سورۃ بقرہ میں آتا ہے اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یعنی اللہ ایمان والوں کا ولی ہے۔ وہاں پر متولی اور سرپرست مراد ہے۔ فرمایا یہود و نصاریٰ سے دوستی نہ رکھو، یہ بڑے بددیانت خائن اور اسلام دشمن ہیں۔ علاوہ ازیں جملہ کفار کی دوستی سے بھی منع کیا گیا ہے۔ سورۃ ہذا، سورۃ آل عمران، سورۃ نساء اور بعض دیگر سورتوں میں اس قسم کے احکام موجود ہیں۔ خاص طور پر "مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ" کے الفاظ ہیں کہ مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کی دوستی

کسی صورت میں بھی درست نہیں۔

رواداری — البتہ اللہ تعالیٰ نے بعض حدود و قواعد کا ذکر فرما دیا ہے جن کے تحت میل ملاپ، تجارت اور دیگر لین دین جائز ہے۔ ظاہری طور پر خوش اخلاقی اور اچھی روش اختیار کی جا سکتی ہے مگر دلی دوستی نہ اہل کتاب سے ہو سکتی ہے، نہ منافقین سے اور نہ کفار سے جو غیر مسلم اقوام مسلمانوں سے آمادہ بر جنگ ہوں ان سے ظاہری رواداری کی بھی اجازت نہیں۔ سورۃ ممتحنہ میں یہ مسئلہ بیان ہوا ہے۔ کہ جو کفار اہل اسلام سے برسرِ پیکار نہیں اور نہ ہی ان کی مخالفت کرتے ہیں، اُن کے ساتھ حسنِ سلوک کی اجازت ہے۔ اسی سورۃ میں پہلے گزر چکا ہے۔ کہ انصاف کے معاملہ میں سب برابر ہیں۔ اپنا ہو یا غیر سب کے ساتھ انصاف کرو۔ کیونکہ ناانصافی دشمن کے ساتھ بھی روا نہیں البتہ جو شخص اللہ اور رسول پر ایمان رکھتا ہے اور قرآن کو اللہ کا آخری پیغام سمجھتا ہے، اس کے لیے کفار کے ساتھ دلی دوستی کی اجازت ہرگز نہیں ہے

البتہ اپنے اور بیگانے کے ساتھ کیے گئے عہد و پیمان کا پورا کرنا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ کافروں سے صلح کی اجازت بھی دی گئی ہے "وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا" اگر وہ صلح پر مائل ہوں تو اُن سے صلح کر لیں۔ اور جو لوگ مسلمانوں سے لڑائی نہیں کرتے۔ ان کے ساتھ حسن سلوک اور مروت سے پیش آنے کی اجازت ہے ان کے ساتھ نیکی کا سلوک کرو گے تو اُس سے بھی اسلام کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص مسلمانوں کے حسن سلوک کو دیکھ کر ایمان لے آئے۔ البتہ موالات یعنی پکی دوستی کسی بھی صورت میں روا نہیں ہے۔ کوئی یہودی ہو یا نصرانی مجوسی ہو یا دہریہ، ہندو ہو یا سکھ اس کا دوستانہ اہل ایمان کے ساتھ ممکن نہیں ہے کیونکہ دونوں فریقوں کی منزل جُدا جُدا ہے۔ دوستی اور تعلقات کے لیے کوئی بنیاد ہونی چاہیے مگر یہ بنیاد موجود نہیں، ایک فریق اللہ تعالیٰ

کا فرمانبردار ہے اور دوسرا غیر اللہ کا پجاری، دونوں کے نظریات میں زمین و آسمان کا فرق ہے، لہٰذا دلی دوستی ممکن نہیں۔

سورۃ آلِ عمران میں گزر چکا ہے۔ کہ اگر کسی مقام پر مسلمان مجبور ہو جائیں کفار اس قدر غالب ہوں کہ مسلمانوں میں اپنے دفاع کی قوت بھی نہیں ہے تو ظاہری طور پر کفار سے دوستی کا اظہار کرنا بھی باتحہ ہے اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً اُن سے بچاؤ کے لیے وقتی طور پر ایسا کیا جا سکتا ہے۔ ایک روایت میں آتا ہے۔ کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضؓ نے اپنا کاتب (سکریٹری) کسی یہودی یا عیسائی کو رکھ لیا۔ حضرت عمرؓ کو خبر ہوئی تو آپ نے سخت ڈانٹ پلائی اور کہا خدا کے بندے! تمہیں کوئی مسلمان کاتب میسر نہ آسکا۔ کاتب تو رازداں ہوتے ہیں اس لیے غیر مسلم کو ایسی ذمہ داری نہیں سونپی جا سکتی۔

یہود و نصاریٰ کا گٹھ جوڑ

فرمایا، اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ان میں سے بعض دوست ہیں بعض کے۔ یہود نصاریٰ کے دوست ہیں اور نصاریٰ یہود کے۔ انہوں نے اسلام کے خلاف آپس میں گٹھ جوڑ کر رکھا ہے حالانکہ یہ آپس میں بھی ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ عیسائیوں کے اصل عقیدہ کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام کو سولی پر لٹکانے والے یہودی ہیں، مگر اب مشترکہ مفاد کی خاطر یہودیوں کو اس الزام سے بری کر دیا گیا ہے۔ جب فلسطین کا مسئلہ پیدا ہوا تو عیسائیوں نے عدالتی بیان کے ذریعے یہودیوں کو قتل مسیح کے الزام سے بری قرار دے دیا مگر یہ دونوں گروہ اہل اسلام کے خلاف اکٹھے ہیں۔ اَلْكُفْرُ مِلَّةٌ وَّاحِدَةٌ پوری دنیا کے کفر ایک ہی ملت کے افراد ہیں۔ تاریخ عالم سے پتہ چلتا ہے کہ یہودیوں کی نسبت اسلام کو نقصان پہنچانے میں عیسائیوں کا زیادہ ہاتھ ہے یہودی تو عرصہ دراز تک غریب الوطنی کی زندگی بسر کرتے تھے مگر نصاریٰ کی

بڑی جلیل القدر سلطنتیں تھیں جن کے بل بوتے پر یہ مسلمانوں کو ہمیشہ نقصان پہنچاتے رہے، یہودیوں کو تو اب آکر ٹھکانا میسر آیا ہے، وہ بھی عیسائیوں اور دنیا کی چار خبیث طاقتوں کی وجہ سے، یہودی ان بین الاقوامی طاقتوں کے سائے میں پروان چڑھے ہیں مگر نصاریٰ کا معاملہ شروع سے معاندانہ رہا ہے۔ حضور علیہ السلام نے اہل ایمان سے فرمایا تھا کہ تمہاری ٹکر رومی یعنی عیسائی طاقتوں کے ساتھ ہمیشہ رہیگی کبھی اُن کو غلبہ حاصل ہوگا اور کبھی تمہیں۔ یہاں تک کہ مسیح علیہ السلام کا دور آجائے گا۔ اور پھر یہ تمام فتنے ختم ہو جائیں گے۔ اُس وقت یہود و نصاریٰ بالکل ختم ہو جائیں گے اور اسلام اور اہلِ اسلام ہی باقی رہ جائیں گے۔

موجودہ زمانے میں بھی پوری دنیا کے مسلمان عیسائیوں کے ہاتھوں نقصان اٹھا رہے ہیں۔ فلسطین کا قصہ، قبرص اور فلپائن کے معاملات، کشمیر کا قضیہ یہ سب انگریزوں کے پیدا کردہ مسائل ہیں، کہیں برطانوی عیسائی ملوث ہیں اور کہیں امریکی عیسائی۔ قبرص میں چالیس ہزار ترک مسلمان شہید ہوئے، فلپائن میں ہزاروں مسلمانوں کا قتل عام سب انگریز عیسائیوں کی کارروائی ہے۔ مسلمانوں کے دشمن عیسائی اور یہودی ہیں یا بگڑے ہوئے یہود و نصاریٰ۔ زار روس نصرانی تھا مگر روسی بگڑ کر اشتراکی یا ملحد بن گئے اور پھر یہ لوگ مزید سنگدل ہوتے چلے گئے۔ بہر حال مسلمانوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ ان لوگوں سے کبھی خیر خواہی کی امید نہیں رکھنی چاہیئے۔ یہ ہمیشہ اسلام کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے، لہٰذا ان سے بچنے کی کوشش کریں، نہ کہ دوستانہ قائم کرنے کی۔

امریکہ کی نئی دوستی

امریکہ اور پاکستان کے سیاسی روابط ہیں جن کی وجہ سے امریکہ کو پاکستان کا خیر خواہ سمجھا جاتا ہے، حالانکہ ایسی بات نہیں ہے۔ غیر مسلم اقوام مسلمانوں کے ساتھ جتنے بھی معاہدے کرتی ہیں وہ سب اپنے مقصد کے

حصول کے لیے کرتی ہیں۔ جب تک ان کا مقصد پورا ہوتا رہے گا معاہدہ قائم رہیگا۔ اور جب انہیں فائدہ نہیں ہوگا معاہدہ ختم ہو جائے گا۔ امریکہ کی پاکستان سے دوستی اور ہمدردی کا مظاہرہ پاک بھارت جنگوں کے دوران ہو چکا ہے۔ ۱۹۶۵ء میں ہندوستان نے پاکستان پر صریحاً جارحیت کا ارتکاب کرتے ہوئے شب خون مارا مگر امریکہ تماشا دیکھتا رہ گیا۔ اس نے پاکستان کی کیا امداد کی، یہ تو اللہ تعالیٰ کا خاص فضل تھا کہ اپنے سے چھ گنا بڑی طاقت کے سامنے پاکستان ڈٹا رہا اور معاملہ برابر سرابر ہی چھوٹ گیا، ورنہ امریکہ کی دوستی کس کام آئی۔ ۱۹۷۱ء میں پھر موقع آیا جس میں پاکستان دولخت ہوگیا تیس لاکھ بنگالی قتل ہوئے، ہندوستان براہ راست دخیل ہوا مگر امریکہ خلیج بنگال میں بحری بیڑے دوڑاتا رہا۔ اس نے پاکستان کی کوئی مدد نہ کی حالانکہ اس کے ساتھ مدد کا معاہدہ موجود تھا۔ اہل کتاب اور کفار اسلام کے ازلی دشمن ہیں، ان پر بھروسہ کرنا بجائے خود دھوکا ہے یہ لوگ قرآن پاک کے پروگرام کی مخالفت میں کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے مسلمانوں کو کمزور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ عربوں کو بے دین بنانے میں عیسائیوں اور یہودیوں کی سازش ہے۔ انہیں عیش و عشرت کا سامان فراہم کر کے دین سے غافل کر رہے ہیں۔ بڑی بڑی عمارات کے ڈیزائن بڑی بڑی کاروں کی درآمد، ٹیلیویژن اور وی سی آر کی بھرمار، یورپ کی فحش فلمیں عربوں سے دینی لگاؤ ختم کر رہی ہیں مگر مسلمان ہیں کہ انہیں اس سازش کا احساس تک نہیں ہے۔

اسلامی اور غیر اسلامی فلسفہ

فرمایا وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ جو اغیار سے دوستی کرے گا۔ وہ انہی میں سے ہوگا۔ جو شخص جس قوم کا فلسفہ اختیار کرے گا، جن کے نظریات اپنائے گا۔ انہی کے سانچے میں ڈھل رہ جائے گا۔ آج پورے عالم اسلام کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ انہیں خلفائے راشدین

کا فلسفہ پسند نہیں، وہ امام ابُوحنیفہؒ، شافعیؒ، مالکؒ اور احمدؒ کا فلسفہ پڑھنے کے لیے تیار نہیں، نہ انہیں امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کے فلسفہ سے کچھ تعلق ہے بلکہ وہ تو کانٹ، فرائیڈ اور ہیگل کا فلسفہ پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ یہود و نصاریٰ کے فلسفہ اور دہریوں کے نظریات کو اپنانے والے قرآن کے پروگرام کو کیسے پا سکتے ہیں۔ جو قوم اپنے قومی نظریہ کو چھوڑ دیتی ہے وہ اپنے مرکزیت سے علیحدہ ہو جاتی ہے۔ پھر وہ جس قوم کے نظریات کا مطالعہ کرتی ہے، اُسی میں مدغم ہو جاتی ہے۔ آج مسلمان قوم اس طرف جا رہی ہے۔ اس کی مرکزیت انگریز نے ختم کر دی ہے۔ یہ مسلمان ممالک کو آپس میں لڑا کر ان کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں مگر مسلمان غفلت کی نیند سو رہے ہیں۔ ایران و عراق جنگ یہودیوں کی سازش ہے دونوں طرف مسلمان کمزور ہو رہے اور غیر اقوام ان میں دخیل ہو رہے ہیں۔ امریکہ اور روس ایک طرف اپنا اسلحہ فروخت کر رہے ہیں اور دوسری طرف مسلمانوں کو کمزور کرنے کے پروگرام پر عمل پیرا ہیں۔ اِن سے دوستانہ کرنے کا یہی نتیجہ ممکن ہے۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا کہ ان کو دوست نہ بناؤ، جو ایسا کرے گا، انہی جیسا ہو جائے گا۔

گردشِ زمانہ کا خوف

فرمایا اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ اللہ تعالیٰ ظالموں کی راہنمائی نہیں کرتا۔ نصاریٰ کافر اور مشرک ہونے کی وجہ سے ظالم ہیں مگر مسلمان اُن کے ساتھ دوستانہ کر کے اپنی مرکزیت کو بھول چکے ہیں۔ یہود و نصاریٰ کی سازشوں کا سلسلہ اس سورۃ میں ابھی مزید بیان ہو گا۔ فرمایا فَتَرَی الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ اے مخاطب تو دیکھے گا اُن لوگوں کو جن کے دلوں میں بیماری ہے یُسَارِعُوْنَ فِیْھِمْ وہ اغیار کی طرف دوڑ دوڑ کر جاتے ہیں اور ان سے دوستی کرتے ہیں مدینہ کے منافقین کا بھی یہی شیوہ تھا یَقُوْلُوْنَ نَخْشٰی اَنْ تُصِیْبَنَا دَآئِرَۃٌ وہ کہتے تھے کہ ہم یہودیوں کے ساتھ میل ملاپ اس لیے رکھتے

ہیں کہ کہیں ہم تک زمانے کی گردش نہ پہنچ جائے۔ عبداللہ بن ابی کہتا تھا انی رجل اخاف الدوائر میں زمانے کی گردش سے ڈرتے ہوئے اُن سے تعلق رکھتا ہوں کہ اگر کسی وقت مسلمان مغلوب ہو گئے۔ یا قحط پڑ گیا تو ہمیں تکلیف پہنچے گی۔ لہذا یہودیوں کے ساتھ بھی تعلقات قائم رہنے چاہئیں۔ یہاں ہمارے ملک میں بھی ایسا ہی ہوا تھا ۱۹۵۲ء میں جب قادیانیوں کے خلاف تحریک چلی تو خواجہ ناظم الدین نے کہا تھا کہ ان کو غیر مسلم قرار دیکر ہم امریکہ کو ناراض نہیں کرنا چاہتے۔ اگر امریکہ خفا ہو گیا تو مشکل وقت میں ہماری مدد کون کریگا۔ یہی بات منافقین مدینہ کہتے تھے، جسے اس حصہ آیت میں بیان کیا گیا ہے۔

فتح کی اُمید: اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ خواہ مخواہ حوادث زمانہ سے خوف کھاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ پس اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے لیے فتح لائے گا اور یہود و کفار ذلیل ہو کر رہ جائیں گے پھر ایسا ہی ہوا۔ اللہ نے مکہ والوں کو مغلوب کر دیا۔ مدینے کے یہودی ذلیل و خوار ہو کر رہ گئے، اُن کے لیے کوئی جائے پناہ نہ رہی۔ اس لیے اللہ نے فرمایا کہ یہ خواہ مخواہ خوف کھاتے ہیں۔ اُمید ہے کہ عنقریب فتح کی خوشخبری آئیگی اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ یا اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے کوئی اور معاملہ لائیں گے فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ پس منافقین اپنے دلوں میں پوشیدہ بات پر نادم ہو جائیں گے یعنی اہلِ اسلام کی پے در پے کامیابیوں کو دیکھ کر ان کے تمام منصوبے ناکام ہو جائیں گے اور وہ پشیمان ہو کر رہ جائیں گے۔ چنانچہ فتح مکہ کے بعد اُن کی رہی سہی اُمید بھی ختم ہو گئی۔ مدینے کے یہود مغلوب ہو گئے، کچھ جلاوطن کر دیے گئے حتیٰ کہ حضرت عمرؓ کے زمانے تک پورا عرب

یہودیوں سے پاک ہوگیا۔

منافقین کا انجام

اللہ نے فرمایا کہ یہود و منافقین کا برا انجام دیکھ کر وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا اہل ایمان کہیں گے أَهَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ أَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ کیا یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ کے نام کی پختہ قسمیں اٹھاتے تھے إِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ کہ وہ تمہارے ساتھ ہیں۔ حالانکہ وہ دوسروں سے ساز باز رکھتے تھے۔ ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ ان کے اعمال ضائع ہو چکے ہیں۔ کفر شرک اور نفاق اعمال کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح گھُن غلے کو کھا جاتا ہے۔ فَأَصْبَحُوا خَاسِرِينَ۔ پس ہو گئے وہ نقصان اٹھانے والوں میں اس سے دُنیا اور آخرت کے دونوں نقصان مراد ہیں۔ منافقین نے جن لوگوں سے اس دنیا میں ساز باز کیا، وہ مغلوب ہو گئے اور اُن کی دوستی کچھ کام نہ آئی بلکہ الٹا رسوائی کا باعث بنی۔ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو کامیابی سے ہمکنار کیا اور ان کی طاقت دنیا میں پھیل گئی، لہٰذا اس دنیا میں بھی منافقین نقصان میں رہے اور آخرت میں نقصان تو بہر حال ہے۔ اُن کے نفاق کی وجہ سے اللہ نے ان کے لیے دائمی عذاب مقرر کر دیا۔ اُن کی ظاہری طور پر ادا کردہ نمازیں، روزے اور دوسری نیکیاں برباد ہو گئیں۔ اور وہ سراسر نقصان میں رہے۔

الغرض! اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو یہ بات سمجھا دی کہ یہود و نصاریٰ یا کفار کے ساتھ تمہاری دوستی کچھ کام نہ آئیگی۔ ان کے اعمال دنیا و آخرت دونوں جگہ برباد ہو جائیں گے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَاۗىِٕمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۴﴾ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۵۶﴾

ع ۸ / ۱۲

ترجمہ: اے ایمان والو! جو شخص پھر گیا تم میں سے اپنے دین سے، پس عنقریب لائے گا اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو جن سے وہ محبت کرتا ہے اور وہ اس سے محبت کرتے ہیں۔ وہ ایمان والوں پر نرم ہیں اور کفر کرنے والوں پر غالب (زبردست) ہیں۔ وہ اللہ کے رستے میں جہاد کرتے ہیں اور نہیں خوف کھاتے کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، وہ دیتا ہے جس کو چاہے۔ اللہ تعالیٰ وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے (۵۴) بیشک تمہارا

دوست اللہ اور اس کا رسُول ہے اور وہ لوگ جو ایمان لئے
ہیں قائم کرتے ہیں نماز اور ادا کرتے ہیں
زکوٰۃ اور وہ رکوع (عاجزی) کرنے والے ہیں (۵۵) اور جو شخص دوستی
کریگا اللہ سے اور اُس کے رسول سے اور ایمان والوں سے
پس بیشک جماعت اللہ تعالیٰ کی وہی غالب ہے (۵۶)

ربطِ آیات

پہلے منافقین اور اہلِ کتاب کی برائیوں کا ذکر ہوچکا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اُن کے نقضِ عہد، احکاماتِ الٰہی کی خلاف ورزی اور بُرے اُمور کی انجام دہی کی وجہ سے اُن کی مذمت بیان فرمائی۔ پھر گذشتہ آیات میں اُن کے ساتھ دوستانہ کرنے سے منع فرمایا۔ اللہ نے فرمایا کہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین ایک دوسرے کے دوست تو ہوسکتے ہیں مگر اہلِ ایمان کے ساتھ مخلص نہیں ہوسکتے۔ اللہ نے واضح فرمایا کہ ان میں اسلام کے خلاف شدید نفرت پائی جاتی ہے اور ہمیشہ اسلام اور اہلِ اسلام کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں لہٰذا اِن کے ساتھ دوستی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اب آج کی آیات میں اہلِ ایمان کو یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ دینِ حق کو ماننا اور اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا انسان کے لیے باعثِ سعادت ہے۔ اور اور اس کی صلاحیت کا ثبوت ہے فرمایا — اگر بالفرض تم بھی دینِ اسلام کو چھوڑ دو۔ یعنی تم میں سے کوئی شخص اگر مرتد ہوجائے تو اس سے اللہ اور اس کے دین کو نقصان نہیں ہوگا بلکہ اِس میں تمہارا اپنا ہی نقصان ہے۔ سابقہ آیت کے ساتھ اس آیت کا ربط اس طرح ہے کہ منافقین کی طرح تم بھی دل میں یہ خیال نہ لانا کہ اسلام کی مفروضہ مغلوبیت سے شاید تم گردشِ زمانہ کا شکار ہوجاؤ۔ لہٰذا اہلِ کتاب اور مشرکین سے روابط قائم رکھنا چاہیئے، فرمایا ایسی بات نہیں ہے۔ اگر تم نے خدا کی ذات پر توکل کیا اور ایمان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے تب بھی اللہ کے دین کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی حفاظت کا کوئی اور بندوبست فرمائے گا۔

دین سے برگشتہ ہونا

ارشاد ہوتا ہے یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اے ایمان والو! مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ تم میں سے جو شخص برگشتہ ہو گیا اپنے دین سے، یعنی اُس نے اپنا رُخ دینِ اسلام سے دوسری طرف پھیر لیا۔ تو اس دین کو کچھ نقصان نہیں پہنچے گا، نہ اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان ہو گا، بلکہ نقصان دین سے پھر جانے والے مرتد کا ہی ہو گا۔ مرتد اُس شخص کو کہا جاتا ہے جو ایک دفعہ دینِ اسلام کو قبول کر کے پھر اُس سے منحرف ہو جائے۔ کوئی دوسرا دین اختیار کرے یا محض دہریہ اور بے دین بنے۔ وہ بہر حال مرتد کی تعریف میں آئے گا۔ جس طرح قرآن و سنت میں کافر، مشرک، منافق وغیرہ کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے، اسی طرح مرتد کا لفظ بھی بطور اصطلاح استعمال ہوتا ہے

بہر حال فرمایا کہ اگر تم میں سے کوئی شخص اسلام کو چھوڑ دے تو اس دین کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی تائید و حفاظت اس طرح فرمائے گا۔ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ کہ وہ تمہاری جگہ ایسی قوم کو لے آئے گا یُّحِبُّھُمْ جن سے وہ محبت کرتا ہے وَیُحِبُّوْنَہٗ اور وہ لوگ اُس سے محبت کرتے ہیں۔ اور پھر آگے اُن لوگوں کے اوصاف بھی بیان فرمائے ہیں۔

فتنۂ مرتدین

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وفات کے بعد مرتدین کا ایک فتنہ کھڑا ہو گیا۔ عرب کے بہت سے قبائل مرتد ہو گئے مگر اُن کے مقابلے میں مہاجرین رض اور انصارِ مدینہ رض دین کی حمایت و حفاظت پر ثابت قدم تھے۔ مرتدین میں یمن کے لوگ پیش پیش تھے چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رض نے ان کے خلاف جہاد کیا۔ اُن میں سے کچھ پلٹ کر اسلام میں دوبارہ داخل ہو گئے اور باقیوں کو قتل کر دیا گیا۔ اسی زمانے میں بعض لوگوں نے نبوت کا دعویٰ بھی کر دیا، ان میں صنعا کا رہنے والا اسود بن کعب عنسی بڑا بداخلاق آدمی تھا۔ اُس کو حضور علیہ السلام کے ایک صحابی فیروز دیلمی رض نے قتل کیا تھا۔ رات

کو قتل نہ ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا تھا کہ رات اسود قتل ہو گیا ہے
آپ نے فیروزؓ کے متعلق فرمایا فَازَ فَیْرُوْز یعنی فیروز کامیاب ہو گیا۔
کیونکہ اُس نے دشمنِ رسول اور دشمنِ انسانیت کو قتل کر دیا۔ جس رات آپ
نے یہ خبر دی اُس سے اگلے دن چاشت کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا
وصال ہو گیا۔ پھر مہینہ کے آخر میں کچھ لوگ یمن سے آئے تو انہوں نے حضور علیہ السلام
کی خبر کی تصدیق کی کہ فلاں تاریخ کو اسود عنسی قتل ہو گیا تھا۔

مسیلمہ کذاب بھی مشہور مدعی نبوت تھا۔ اہلِ ایمان نے اس کے خلاف بھی
جہاد کیا اور اُسے شکست دی، وہ خود مارا گیا۔ ——— ——— اُس کی بیوی نے بھی نبوت کا دعوےٰ کیا، مگر بعد میں
وہ تائب ہو گئی۔ اس کے علاوہ طلیحہ اسدی نامی شخص نے بھی نبوت کا دعوےٰ
کیا مگر تائب ہو گیا۔ ان کے علاوہ کچھ دوسرے لوگوں نے بھی ایسے دعوے
کیے۔ بعض مارے گئے اور بعض دوبارہ ایمان لے آئے۔ بہرحال انصار و
مہاجرین اور دیگر مخلص قبائل نے فتنۂ ارتداد کا خوب مقابلہ کیا۔ بالآخر یہ فتنہ ختم ہو گیا۔

محبانِ خدا کے اوصاف

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس آیت کا مصداق حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ
——— ہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آپ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا تھا
کہ یہ اور اُسکی قوم کے لوگ مرتدین کا مقابلہ کریں گے۔ ابوموسیٰ اشعریؓ یمن
کے رہنے والے تھے اور فتنۂ ارتداد بھی زیادہ تر وہیں ابھرا اور پھر وہیں ان کا
صفایا بھی ہوا۔ لہذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی سچی ثابت ہوئی اور
یمن ہی کے لوگوں نے اس فتنہ کو ختم کرنے میں مدد دی۔ چنانچہ یہی وہ لوگ
ہیں جن کے متعلق فرمایا کہ اللہ اُن سے محبت کرتا ہے اور وہ اللہ سے محبت
کرتے ہیں اُن کے دلوں میں خدا تعالیٰ کی محبت کا جذبہ موجزن ہے، اُن کی
دوسری صفت یہ ہے اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ وہ ایمان والوں
کے سامنے بڑے نرم ہیں۔ اذلہ یا ذلیل کا معنیٰ حقیر بھی ہوتا ہے اور نرم اور

ہموار بھی۔ چنانچہ ناقۃ ذلول کا معنیٰ ہموار اونٹنی کیا جاتا ہے جو اپنے سوار کو تکلیف نہ پہنچائے تو یہاں پر یہی معنیٰ ہے اللہ تعالیٰ کی محبت سے سرشار لوگ ایمان والوں کے ساتھ نرم ہیں اور اُن کے ساتھ شفقت سے پیش آتے ہیں۔ نیز اَعِزَّۃٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ کفر کرنے والوں پر غالب اور زبردست ہیں۔ یعنی کفار پر اس طرح جھپٹتے ہیں جس طرح شاہین یا باز شکار پر جھپٹتا ہے اور پھر ان پر غالب آتے ہیں۔ اعزۃ کا یہ معنیٰ ہے۔

فرمایا ان لوگوں کی ایک صفت یہ بھی ہے یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وہ اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہیں۔ اُن کا واحد مقصد اللہ کی خوشنودی اور ان کے دین کی سربلندی ہوتا ہے۔ غرضیکہ محبوبانِ خدا جانُ مال کی قربانی دینے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں قربانی تو دوسرے لوگ بھی کرتے ہیں، قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرتے ہیں اور بعض اوقات تختہ دار پر بھی لٹک جاتے ہیں مگر اُن کے پیش نظر وطنیت، ملوکیت زبان، نسل یا پارٹی بازی ہوتی ہے وہ محض اقتدار حاصل کرنے کے لیے مالی اور جانی قربانی کرتے ہیں۔ مگر اہل ایمان اور دیگر اقوام کے درمیان طرۂ امتیاز یہ ہے کہ ایمان والوں کے پیش نظر رضائے الٰہی کے علاوہ کوئی ذاتی غرض نہیں ہوتی۔ تو فرمایا کہ یہ لوگ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں۔

فرمایا، اُن کی ایک صفت یہ بھی ہے وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ وہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے یعنی اگر کوئی شخص اُن کے دین پر طعن کرے تو وہ اُس کی پرواہ نہیں کرتے بلکہ دین کا کام جاری رکھتے ہیں۔ غرضیکہ کسی باطل پرست کا طعن و تشنیع ان پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوتا اور وہ خلوصِ دل کے ساتھ اپنے دین پر قائم رہتے ہیں۔ ابن عربیؒ نے کہا ہے ؎

اذا اعترف علی الرشاد لنفسہ　　ھانت علیہ ملامۃ العذال

انسان اپنے نفس کی ہدایت کو خوب پہچانتا ہے۔ ملامت کرنے والوں کی ملامت اُسے معمولی چیز معلوم ہوتی ہے اور وہ اس کی کچھ پرواہ نہیں کرتا۔ غرضیکہ اگر کوئی شخص خلوص نیت سے دین کا کام کرتا ہے تو اغیار کا طعن و ملامت اُس پر کچھ اثر نہیں کرتا، وہ اپنے کام میں محو رہتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص حضور علیہ السلام کی کسی سنت پر عمل کرتا ہے اور لوگ اُسے استہزا کا نشانہ بناتے ہیں، اُسکو ملامت کرتے ہیں تو وہ ان چیزوں سے لاپرواہ ہو کر سنت پر عمل جاری رکھتا ہے۔ اسی چیز کو فرمایا کہ محبانِ خدا کی ایک صفت یہ بھی ہے۔ کہ وہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی کچھ پرواہ نہیں کرتے۔

ساتویں اصول

مسند احمد اور بیہقی میں حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے جسے امام ابن کثیرؒ نے بھی نقل کیا ہے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ فرماتے ہیں۔ اَمَرَنِیْ خَلِیْلِیْ میرے پیارے دوست اور پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے سات چیزوں کا حکم دیا۔ پہلا حکم یہ تھا بِحُبِّ المساکین وزلفا منہم یعنی میں مساکین کے ساتھ محبت کروں اور ان کے قریب رہوں حضور علیہ السلام کو خود بھی غربا و مساکین سے بڑی محبت تھی اور آپ کو اُن کی رفاقت محبوب تھی چنانچہ دعا میں فرمایا کرتے تھے اللھم ارزقنی حب المساکین اے اللہ مجھے مساکین کی محبت عطا فرما، اِن سے نفرت نہ ہو۔ آپ یہ بھی فرماتے تھے واحشرنی فی زمرۃ المساکین مولا کریم! میرا حشر بھی مساکین کے ساتھ ہی کرنا۔ آپ دنیا میں بھی غربا و مساکین کے پاس بیٹھتے اور وہ اس بات پر فخر کرتے تھے کہ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس بیٹھتے ہیں اور بہت محبت کرتے ہیں۔

صحابی رسول فرماتے ہیں کہ محبوب خدا نے مجھے دوسری نصیحت یہ فرمائی۔ ان انظر علی ما دونی ولا انظر من ھو فوقی یعنی یہ اپنے سے نیچے والے کی طرف دیکھوں اور اوپر والے کی طرف نہ دیکھوں، ترمذی شریف

کی روایت میں آتا ہے۔ جو شخص اس نصیحت پر عمل کرے گا وہ خدا تعالیٰ کی کسی نعمت کو حقیر نہیں جانے گا۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اپنے سے امیر آدمی کو دیکھے گا، وہ اپنے آپ کو غریب سمجھ کر ناشکری کا مرتکب ہوگا، اور جو شخص اپنے سے کمزور آدمی کی طرف دیکھے گا۔ وہ خود کو بہتر پاکر اللہ کا شکر ادا کرے گا اور اللہ کی عطا کردہ کسی نعمت کو حقیر نہیں سمجھے گا

تیسری چیز فرمایا ان اصل الرحم وان ادبرت یہ کہ میں صلہ رحمی کروں چاہے میرے قرابتدار مجھ سے دوری اختیار کریں۔ حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے چوتھی بات یہ فرمائی ان لا اسئل احداً یہ کہ میں کسی سے سوال نہ کروں واذا سئلت فاسئل اللہ اور جب بھی سوال کروں تو خدا تعالیٰ سے کروں۔ چونکہ ہر چیز کا داتا وہی ہے۔ سب کچھ اسی کے اختیار میں ہے لہٰذا سوال بھی اسی سے کرنا چاہیئے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے پانچواں حکم یہ دیا ان اقول الحق وان کان مرّاً یہ کہ میں سچی بات کہوں اگرچہ یہ تلخ ہی کیوں نہ ہو۔ حضرت عمرؓ کا بھی یہ خاص صفت کہ وہ بالکل سچی بات کرتے تھے اگرچہ لوگ گھبرا جاتے تھے۔ فرمایا چھٹی بات یہ ہے الا اخاف فی اللہ لومۃ لائم یعنی میں اللہ اور اس کے دین کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے خوف نہ کھاؤں اور اپنی بات پر قائم رہوں۔ حضور علیہ السلام نے ساتویں اور آخری بات یہ فرمائی کہ میں کثرت سے لاحول ولا قوۃ الا باللہ کا ورد کرتا رہوں۔ یہ توحید کا حکم ہے اور نیکی بجا لانے اور برائی سے بچنے کی توفیق کو اللہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ یہ کلمات اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہیں حضور علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا انھن کنز من کنز تحت العرش یہ کلمات عرش کے خزانوں سے ایک خزانہ ہے۔ اگر یہ عقیدہ راسخ ہو جائے تو بہت بڑی بات ہے۔ ایسا شخص کامل الایمان بن جاتا ہے۔

---

[1] ابن کثیر ص ۲۰ ج ۲ (بیانی)

الغرض! فرمایا کہ وہ لوگ اللہ کے دین کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خوف نہیں کھاتے ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، وہ جسے چاہے عطا کرے۔ عقیدے کی پختگی، اللہ سے محبت، ایمان والوں کے لیے نرمی، کفار کے لیے سختی۔ اللہ کے راستے میں جہاد اور ملامت کرنے والوں سے لاپرواہی، یہ سب اللہ کے فضل میں داخل ہیں۔ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ اور اللہ تعالیٰ وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ وہ ہر شخص کی صلاحیت اور استعداد کو جانتا ہے۔ اسی استعداد کے مطابق وہ عطا کرتا ہے۔

سچے دوست

فرمایا اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ بیشک تمہارا دوست اور رفیق حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اور اہل ایمان بھی تمہارے دوست ہیں۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دوستی اللہ، اس کے رسول اور اہل ایمان سے ہونی چاہیے۔ اگر تم اس معیار پہ پورے اترے تو اللہ تعالیٰ غلبے کی صورت بھی پیدا کرے گا اور یہود و نصاریٰ اور مرتدین تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ تمہارا کام یہی ہے کہ تعلق باللہ قائم رکھو، انہی کے مطیع و فرمانبردار بن جاؤ، خداوند تعالیٰ کو اپنا کارساز، متولی اور مالک سمجھتے ہوئے تمام کام اسی کی رضا کے مطابق انجام دو۔ اللہ کے رسول کے ساتھ محبت کرنا بھی جزوِ ایمان ہے ________

________ اور اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ آپ کے بتلائے ہوئے طریقہ کو اپنا لو اور آپ کی سنت کو زندہ رکھو۔ اسی طرح اندرونی طور پہ ربط و ضبط اور دوستی ایمان والوں کے ساتھ ہونی چاہیے۔ ان کے ساتھ اتحاد و اتفاق ہی کے ذریعے دشمن کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے اگر ان امور کی انجام دہی کرتے رہو گے تو دشمن کبھی غالب نہیں آ سکتا اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ اگر تم مومن

ہو گے، تو غلبہ تمہارا ہی ہوگا۔

اہل ایمان کی صفات

آگے اللہ نے اُن مومنین کی صفات بیان فرمائی ہیں جن کی دوستی کی ترغیب دی گئی ہے۔ فرمایا تمہارے دوست وہ ہونے چاہئیں۔ اَلَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ جو نماز قائم کرتے ہیں۔ نماز تعلق باللہ کا بہترین ذریعہ ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کا قرب دلانے والی عبادتوں میں سے بہترین عبادت ہے۔ فرمایا تمہارے مومن دوست وہ ہوں وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ جو زکوٰۃ ادا کرتے ہوں۔ ظاہر ہے کہ زکوٰۃ کے دو فائدے ہیں۔ اس کی وجہ سے انسان کے ذہن سے حرص و بخل کا مادہ خارج ہوتا ہے یعنی انسان کو مہذب بنانے والی چیز یہی زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس سے غرباء و مساکین کی حاجات پوری ہوتی ہیں۔ یہ انسان کو پاکیزگی دلانے والی چیز ہے۔ نماز بدنی عبادت ہے اور زکوٰۃ مالی عبادت دونوں چیزوں کا آپس میں ربط ہے۔ سورۃ توبہ میں کفار و مشرکین کے متعلق فرمایا کہ اگر وہ توبہ کریں "وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَاِخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ" اور وہ نماز ادا کرنے لگیں اور زکوٰۃ دینے لگیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔ غرضیکہ ایمان لانے کے بعد نماز و زکوٰۃ کی ادائیگی اولین عمل ہے جس کے بغیر ایمان کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

فرمایا اہل ایمان کی ایک صفت یہ بھی ہے وَھُمْ رٰکِعُوْنَ وہ رکوع کرنے والے ہیں۔ صاحب روح المعانیؒ امام بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ یہاں رکوع سے مراد صرف نماز والا رکوع نہیں بلکہ اس سے مراد عاجزی اور انکساری ہے۔ بعض دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہاں پہ رکوع کا خصوصی تذکرہ یہودیوں کے ساتھ امتیاز کی وجہ سے ہے۔ یہودیوں کی نماز میں رکوع نہیں ہوتا، اس لیے یہاں خاص طور پر فرمایا کہ ان کے ایمان لانے کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ وہ رکوع کرنے لگیں۔ رکوع و سجود دونوں ارکان عاجزی کی علامت ہیں مگر رکوع کی نسبت سجدے میں اعلیٰ درجے کی عاجزی

پائی جاتی ہے۔ اسی لیے ہر رکعت میں رکوع ایک ہے مگر سجدے دو ہیں رکوع و سجود دونوں چیزیں فرض ہیں ان کے بغیر نماز نہیں ہوتی، لہٰذا یہاں پر رکوع کا خصوصی ذکر فرمایا۔

حزب اللہ

فرمایا وَمَنْ يَتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ دوستانہ کرے گا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اور ان اہل ایمان سے دوستی کرے گا۔ جن کی صفات بیان ہو چکی ہیں یعنی جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کو لازم پکڑتے ہیں اور پھر اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی کا سلوک کرتے ہیں فرمایا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ تو یہی اللہ کی پارٹی اور اس کے گروہ کے ممبران ہیں۔ اور یہی غالب ہوں گے۔ آخری کامیابی انہی کے مقدر میں ہے۔ سورۃ مومن میں فرمایا ہے "اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ" ہم اپنے انبیاء اور اہل ایمان کی دنیا میں بھی مدد کریں گے اور قیامت والے دن بھی مدد کریں گے جب کہ مدد کی سب سے زیادہ ضرورت ہوگی۔ اس طرح اللہ کے دوستوں کو دنیا و آخرت ہر دو مقامات پر کامیابی حاصل ہوگی اور انہی کا ٹشن غالب رہیگا۔ آخرت میں خاص طور پر ان کے حق میں گواہیاں ہوں گی، ان کے درجات بلند ہوں گے اور وہ عذاب سے بچ جائیں گے۔ غرضیکہ اللہ کا گروہ ہی غالب رہیگا۔

اگر دنیا میں کبھی مسلمانوں کو شکست آجائے، یا کسی معاملہ میں کمزوری واقع ہو جائے تو سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ اس آیت میں بیان کردہ صفات میں کمی واقع ہو گئی ہے۔ مومن اپنے معیار پر پورے نہیں اترتے ہیں۔ مثلاً نماز زکوٰۃ میں کوتاہی واقع ہو گئی ہے یا دوسرے اہل ایمان کیلئے جذبہ محبت کو ٹھیس پہنچی ہے یا جہاد فی سبیل اللہ سے جی چرایا ہے۔ اگر مومنین کی تمام شرائط پوری کی جائیں گی تو پھر اللہ تعالیٰ کی نصرت ضرور شامل حال ہوگی اور دنیا و آخرت میں غلبہ

ہی غالب ہوں گے۔

بعض اوقات اہل ایمان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش بھی آجاتی ہے اور کامل الایمان لوگوں کو بھی شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے، مگر وہ مغلوب نہیں کہلاتے کیونکہ اُن کا ایمان بہرحال قائم ہوتا ہے۔ وہ ایسی آزمائشوں میں کندن بن کر نکلتے ہیں اور پھر نئے جوش اور جذبہ کے ساتھ اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے ہمہ تن مصروف ہو جاتے ہیں۔ انہیں اللہ کی توحید اور اس کے وعدے پر پختہ یقین ہوتا ہے۔ امام محمد بن ابی بکر بن عبدالقادر رازیؒ بھی فرماتے ہیں، کہ بعض اوقات اہلِ ایمان مادی لحاظ سے کمزور ہوتے ہیں مگر حقیقت میں وہ مغلوب نہیں ہوتے کیونکہ دلیل، برہان، اور عقیدے کو ہمیشہ غلبہ حاصل ہوتا ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ
هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ
وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَاۤءَ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾
وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴿۵۸﴾ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ
هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْنَا
وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۵۹﴾

ترجمہ:۔ اے ایمان والو! نہ بناؤ اُن لوگوں کو جنہوں نے
ٹھہرایا ہے تمہارے دین کو ٹھٹھا اور کھیل، ان لوگوں میں سے
جن کو کتاب دی گئی تم سے پہلے، اور کافروں کو بھی نہ
بناؤ دوست۔ اور اللہ سے ڈرو اگر تم ایمان والے ہو ﴿۵۷﴾ اور
جب تم پکارتے ہو نماز کی طرف تو ٹھہراتے ہیں اس کو ٹھٹھا
اور کھیل۔ یہ اس وجہ سے کہ بیشک یہ بے عقل لوگ ہیں ﴿۵۸﴾
اے پیغمبر! (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب! تم
ہم میں کیا عیب پاتے ہو سوائے اس کے کہ ہم ایمان لائے
ہیں اللہ پر، اور جو چیز اتاری گئی ہے ہماری طرف اور جو نازل
کی گئی ہے اس سے پہلے اور بیشک تم میں سے اکثر لوگ
نافرمان ہیں ﴿۵۹﴾

ربط آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کی دوستی سے منع فرمایا تھا اور اس کے ساتھ منافقین کی مذمت بیان کی تھی۔ اس کے بعد مرتدین کے بارے میں فرمایا کہ اگر وہ دین سے برگشتہ ہو جائیں تو اس میں اُن کا اپنا ہی نقصان ہوگا، اللہ تعالیٰ اور اُس کے دین کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ پھر ایمان والوں کو تلقین کی گئی کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی کارسازی پر اعتماد ہونا چاہیئے اور اُس کے رسُول اور مسلمانوں سے حقیقی دوستانہ اور محبت ہونی چاہیئے۔ اہل ایمان کی صفات بھی بیان فرمائیں کہ وہ نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور خدا تعالیٰ کے سامنے عاجزی اور انکساری کا اظہار کرتے ہیں۔ فرمایا ایسے لوگ اللہ کے گروہ میں شامل ہیں، اُس کی پارٹی کے ممبر ہیں اور بالآخر انہی کو غلبہ حاصل ہوگا۔

اب آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہود، نصاریٰ، کفار اور مشرکین کے ساتھ دوستی کرنے سے منع فرمایا ہے اور وہ وجہ بھی بیان فرمائی ہے جس کی بنا پر ایک حقیقی مومن ایسے لوگوں کے ساتھ دوستانہ روابط قائم نہیں کر سکتا۔

دین کی حفاظت

ارشاد ہوتا ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اے ایمان والو! لَا تَتَّخِذُوا الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا نہ بناؤ (دوست) اُن لوگوں کو جنہوں نے تمہارے دین کو ٹھٹا اور کھیل بنا رکھا ہے۔ یعنی جو لوگ تمہارے دین کا تمسخر اڑاتے ہیں، شعائر اللہ کو کھیل کود سے زیادہ حیثیت نہیں دیتے، اُن لوگوں کے ساتھ تمہارا دوستانہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اگر دین کے مخالفین سے گٹھ جوڑ قائم رہا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دراصل تمہارا دین کے ساتھ تعلق کمزور پڑ گیا ہے اور تمہارے دل میں دین کی وقعت باقی نہیں رہی، حالانکہ دین کی حفاظت سب سے اہم معاملہ ہے اللہ کے رسول نے دین کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے آپ دُعا فرمایا کرتے تھے اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلِ الدُّنْيَا اَكْبَرَ هَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا[1]

[1] ترمذی ص۵۰۲ (فیاض)

وَلَا غَايَةَ رَغْبَتِنَا وَلَا تَجْعَلْ مُصِيبَتَنَا فِي دِينِنَا
اے اللہ! دنیا کو ہی ہمارا مقصود اور منتہائے علم نہ بنا کہ ہم دنیا کی خاطر
ہی تمام توانائیاں صرف کر دیں اور عقبیٰ سے بالکل غافل رہ جائیں۔ اے اللہ!
ہمارے دین میں ہمارے لیے مصیبت نہ بنا کیونکہ دنیا کی مصیبت تو ختم
ہو سکتی ہے مگر دین کی مصیبت آگے چل کر سخت نقصان دہ ثابت ہوگی
مومن دین کو ہر چیز پر ترجیح دیتا ہے وہ دین کی حفاظت کے لیے تمام توتیں
بروئے کار لاتا ہے۔ مَنْ قُتِلَ دُونَ دِينِهِ فَهُوَ شَهِيدٌ
جو دین کا دفاع کرتے ہوئے قتل ہوا، وہ شہادت کا مرتبہ پا گیا غرضیکہ ایک مومن
کے لیے دین کو ہر چیز پر فوقیت حاصل ہے

بہرحال اللہ تعالیٰ نے کافر و مشرک اور یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستی
نہ کرنے کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ وہ شعائرِ دین کا تمسخر اڑاتے ہیں۔ اور وہ کون ہیں؟
مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وہ اُن لوگوں میں
ہیں جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی۔ اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں جنہیں عام
اصطلاح میں اہلِ کتاب کہا جاتا ہے۔ وَالْكُفَّارَ أَوْلِيَاءَ اور کفار کو
بھی اپنا دوست نہ بناؤ، وہ بھی اسلام دشمنی میں اہلِ کتاب کے ساتھ برابر کے
شریک ہیں۔ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ اور
خدا تعالیٰ سے ڈرو اگر تم ایمان والے ہو۔ گویا ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ دین کے
ساتھ ٹھٹھا کرنے والوں کو ہرگز دوست نہ بنایا جائے۔

اذان کے ساتھ استہزاء

آگے اللہ تعالیٰ نے اذان کے ساتھ استہزاء کی خاص طور پر نشاندہی فرمائی
ہے۔ وَإِذَا نَادَيْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ جب تم نماز کے
لیے پکارتے ہو یعنی اذان دیتے ہو اتَّخَذُوهَا هُزُوًا وَلَعِبًا
تو یہ لوگ اسے ٹھٹھا اور کھیل بناتے ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ
مدینے کے ایک نصرانی کو اذان سے بہت چڑ تھی۔ جس وقت مؤذن اشہد

اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ تو وہ بدبخت بددعا کرتا اَحْرَقَ اللّٰہُ الْکَاذِبَ (جھوٹا جل جائے) جھوٹا تو وہ خود ہی تھا اللہ نے اس کی دعا اُس طرح قبول کی کہ ایک دن اُس کی لونڈی گھر میں آگ لائی۔ اُس کی چنگاری کسی چیز پر گر گئی جس سے سارے مکان کو آگ لگ گئی اور وہ عیسائی وہیں جل کر راکھ ہو گیا۔ اللہ نے اُسے گستاخی کی سزا دیدی۔

ابومحذورہؓ کی اذان

ابومحذورہؓ کے متعلق بھی اذان کے ساتھ استہزاء کرنے کی روایت آتی ہے۔ جب اذان ہوتی تو یہ دوسرے لڑکوں کے ساتھ مل کر اذان کی نقلیں اتارتے اور چیخ و پکار کرتے۔ اتفاق سے ایک دن حضور علیہ السلام کا اُن پر گزر ہوا۔ آپ نے حکم دیا کہ ان لڑکوں کو پکڑ کر لے آؤ، باقی سب لڑکے بھاگ گئے مگر ابومحذورہؓ قابو آ گئے۔ حضور علیہ السلام کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپ نے فرمایا اَب میرے سامنے اذان کے الفاظ بلند آواز سے دہراؤ۔ مگر وہ ہچکچایا شہادت کے کلمات تو کفار و مشرکین پر بہت گراں گزرتے تھے۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہُ تو اُن کے لیے موت تھی اپنی زبان سے اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ کہنے سے بھی اُن کے عقیدے پر زد پڑتی تھی۔ اس لیے وہ یہ کلمات کہنے سے گریز کر رہا تھا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی سے حکم دیا تو انہوں نے یہ کلمات آہستہ آواز سے کر دیے مگر آپ نے فرمایا بلند آواز سے کہو۔ جب انہوں نے پوری آواز کے ساتھ شہادتین کے کلمے کہے تو اللہ نے اُن کا دل نورِ ایمان سے منور کر دیا۔ اور وہ اُسی وقت مسلمان ہو گئے۔ اس کے بعد آپ نے ابومحذورہؓ کو مکہ میں مؤذن مقرر فرما دیا۔ آپ شہادتین کے کلمات اسی طرح کہتے تھے جس طرح حضور علیہ السلام نے خود اُن سے کہلوائے تھے یعنی دو دفعہ آہستہ آواز سے اور دو دفعہ بلند آواز سے۔ یہیں سے اذان میں ترجیع کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے جو فقہاء شہادتین کے کلمات مکرر کہنے کے حق میں ہیں وہ اسی ابومحذورہؓ کی اذان سے استدلال کرتے ہیں جو ساری عمر اسی طریقے

سے اذان دیتے ہے۔ البتہ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اذان میں ترجیع جائز ہے مگر اسے سنت کا درجہ حاصل نہیں کیونکہ حضور علیہ السلام نے محض جھجکنے کی وجہ سے شہادتین کے کلمات دوبارہ کہلائے تھے، لہذا یہ عام حکم نہیں ہے۔

استہزاء کی ممانعت

اذان شعائر اللہ میں سے ہے۔ اس کے کلمات میں عقیدہ توحید و رسالت اور اللہ کی عظمت کا اقرار ہے، ایسی بے مثال عبادت کا تمسخر اڑانا بہت بری بات ہے۔ استہزاء تو کسی انسان کے ساتھ بھی کرنا شریعت میں قطعی حرام ہے۔ سورۂ حجرات میں موجود ہے "لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ" ایک دوسرے کو ٹھٹھا مت کرو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں آتا ہے کہ جب آپ نے بنی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تو وہ کہنے لگے أَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا کیا تو ہم سے ٹھٹھا کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا أَعُوذُ بِاللّٰهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ "پناہ بخدا اس بات سے کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں۔ مطلب یہ کہ ٹھٹھا کرنا جاہلوں اور بے وقوفوں کا کام ہے کوئی شریف آدمی کسی سے استہزاء نہیں کرتا جب انسان ایک دوسرے سے تمسخر نہیں کر سکتے تو اذان یا کسی دیگر شعائر اللہ سے تمسخر کرنا تو بطریق اولیٰ حرام ہے۔

استہزاء کی بیماری اب یہود و نصاریٰ سے نکل کر مسلمانوں میں بھی آچکی ہے۔ مختلف موضوعات پر کارٹون بنانا، ڈرامے پیش کرنا، نمازیوں کا تمسخر اڑانا اور عبادت کو کھیل کے طور پر پیش کرنا اس کے سوا کیا ہے کہ دین کے ساتھ استہزاء ہے۔ حج جیسی بلند عبادت کو فلم کی صورت میں پیش کرنا شعائر اللہ سے تمسخر ہی تو ہے۔ صدر ایوب کے زمانے میں روزنامہ مشرق میں پڑھا تھا کہ مظفر نزالا نامی فلم ایکٹر کے ہاں لڑکا پیدا ہوا تو اس نے اس بچے کے کان میں مرغ کی اذان دلوائی۔ نومولود کے کان میں اذان کہنا سنت ہے مگر اس شخص نے اس سنت کا مذاق اڑایا۔ اسی طرح لافنگ گیلری والوں نے

داڑھی کو استہزا کا نشانہ بنایا ہے۔ حالانکہ داڑھی سنت انبیاء ہے۔ جو خود تارک سنت ہے اُسے خود کم از کم سنت کا مذاق تو نہیں اڑانا چاہیئے۔ پہلی صدی ہجری کا واقعہ ہے کہ گورنر عباد خراسان کے سفر پر روانہ ہوا تو اس کے ساتھ ایک مزاحیہ شاعر بھی تھا۔ چلتے وقت عباد کی لمبی داڑھی خوب ملتی تھی اس پر شاعر نے مزاحیہ شعر کہہ دیا۔ گورنر کو علم ہوا تو اس نے شاعر کی سخت سرزنش کی اور اُسے پانچ ماہ تک پنجرے میں بند رکھنے کی سزا دی گورنر اگرچہ خود زیادہ عادل تو نہیں تھا مگر اس نے داڑھی کی توہین کو برداشت نہ کیا۔ وہ شعر یہ تھا ؎

الا لیت اللحی کانت حشیشاً فنعلفها خیول المسلمین

کاش یہ داڑھیاں گھاس ہوتیں تو ہم انہیں مسلمانوں کے گھوڑوں کو کھلاتے

یہودیوں کا یہ خاص شیوہ ہے کہ وہ اسلام اور اہل اسلام کی تضحیک کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ انہوں نے سیمن اینڈ ڈیلائلہ کے نام سے پیغمبروں کی فلم بنا دی، کہیں حضرت سلیمان علیہ السلام کو فلم میں پیش کر دیا یہ اللہ کے برگزیدہ بندوں کے ساتھ استہزا ہے جو کہ بہت ہی قبیح حرکت ہے بدر کی جنگ کو فلم کے ذریعے پیش کیا، ارکان حج فلمائے گئے اور لوگ خوش ہیں کہ یہ بہت اچھی چیز ہے، اس سے ٹریننگ ہوتی ہے، اہل اسلام کے لیے رغبت پیدا ہوتی ہے مگر یہ سب یہود و نصاریٰ کے نقش قدم پر شعائر اللہ کے ساتھ کھیلنے کے مترادف ہے۔ یہ کام خود مسلمان انجام دے رہے ہیں جو کہ دین کے ساتھ ٹھٹھا کرنے والی بات ہے۔

تو فرمایا، جب تم نماز کی طرف بلاتے ہو، تو یہ اُس کو ٹھٹھا اور کھیل بناتے ہیں۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ یہ اس وجہ سے کہ یہ بے عقل لوگ ہیں۔ یہ اچھے اور بُرے میں تمیز کرنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتے، وگرنہ دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں جو شعائر اللہ کی تعظیم نہ کرتا ہو اذان، نماز، حج وغیرہ تو شعائر اللہ ہیں، ان کی بے حرمتی تو احمق لوگ ہی

کرسکتے ہیں۔ دوسرے مقام پر فرمایا، مَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ جو اللہ کے شعائر کی تعظیم کرتا ہے اُس کا دل تقویٰ سے لبریز ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جو تمسخر کرے گا۔ وہ تقویٰ سے بالکل عاری ہوگا۔

امریکہ اور کینیڈا کے یہودیوں نے اسلامی شعائر کو بہت حد تک تضحیک کا نشانہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے کپڑے پہ کلمہ طیبہ پرنٹ کر دیا، جوتے کی ڈبیہ پر لکھ دیا تاکہ اس کی بے حرمتی ہو۔ قمیص کے پچھلے حصے پہ آیت الکرسی چھاپ دی جو بیٹھنے کے وقت نیچے آجائے۔ ایک بدبخت نے اونٹ کا نام محمد رکھ دیا۔ ایک انگریز نے حضرت علیؓ کو لنگور کے نام سے موسوم کیا۔ غرضیکہ یہ لوگ اسلام اور اہل اسلام کی توہین، تمسخر اور ٹھٹھا کرنے سے باز نہیں آتے۔ اور مسلمان بھی ان کے دیکھا دیکھی اُسی روش پر چل نکلے ہیں۔ یہ بے عقل لوگ ہیں۔

مسلمانوں کی عیب جوئی

ارشاد ہوتا ہے قُلْ اے پیغمبر علیہ السلام آپ ان سے کہہ دیں یٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ اے اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ تم ہم میں کیا عیب پاتے ہو۔ تنقمون دراصل انتقام سے ہے جس کا معنیٰ بدلہ لینا ہوتا ہے۔ مگر یہاں پر اس سے مراد عیب جوئی ہے۔ یعنی ہمارا عیب صرف یہ ہے اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں۔ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا اور اس چیز پہ ایمان لائے ہیں جو ہماری طرف نازل کی گئی وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ اور اس چیز پر ایمان لائے جو پہلے اتاری گئی۔ یعنی زبور، تورات، انجیل اور صحائف انبیاء۔ اللہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا، ذرا آپ ان بدبختوں سے یہ تو پوچھیں کہ کیا ہمارا ایمان باللہ اور ایمان بالکتب تمہارے نزدیک عیب کی بات ہے حالانکہ یہ تو کمال کی بات ہے جسے نصیب ہو جائے۔ تم ہمیں کس قصور کی بنا پر طعن و ملامت کرتے ہو۔ تمہارے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے اور تمہاری اپنی

حقیقت یہ ہے کہ وَاَنَّ اَکْثَرَکُمْ فٰسِقُوْنَ تمہاری اکثریت نافرمانوں کی ہے۔ تم بے ایمان ہو، نقضِ عہد کرتے ہو، دین کا تمسخر اڑاتے ہو، دینِ حق کے خلاف سازشیں کرتے ہو، تم اپنی خفت کو مٹانے کے لیے اہلِ حق پر طعن کرتے ہو۔ سورۃ توبہ میں موجود ہے اگر یہ لوگ بدعہدی کریں اور تمہارے دین میں طعن کریں فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ تو ان اکابرینِ کفر کی سرکوبی کریں یہ بے ایمان لوگ ہیں۔ جب تک ان کے ساتھ سختی نہیں کی جائیگی یہ سازشوں سے باز نہیں آئیں گے۔ ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے اور انہیں قرار واقعی سزا دی جائے۔ تو یہ اہلِ کتاب کی بات ہے، آج مسلمانوں کی حالت بھی اُن سے مختلف نہیں۔ ان میں بھی ہر طرح کی خرابیاں پائی جاتی ہیں۔ وعظ و نصیحت کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ لہٰذا ان کا علاج بھی تعزیر کے ذریعے ہی ممکن ہے جب تک ان کا محاسبہ نہیں ہو گا ان کی قبیح حرکات میں اضافہ ہی ہوتا رہیگا امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ اخلاقی تعلیم اور تعزیر دونوں چیزیں ہمارے دین کا جزو ہیں۔ اگر تعلیم و تربیت کے ذریعے اصلاحِ احوال نہیں ہوتی تو پھر تعزیر ضروری ہو جاتی ہے کیونکہ اس کے بغیر امن قائم نہیں ہو سکتا اور جب تک معاندین کی سرکوبی نہیں ہو گی دین کے ساتھ استہزا بند نہیں ہو گا اور دین کے تحفظ کے لیے مسلمانوں اور کافروں سے بیک وقت نبرد آزما ہونا پڑے گا۔ دینِ اسلام کو استہزا اور کھیل کود سے بچانے کے لیے دونوں محاذوں پہ جد و جہد کرنا ہو گی۔

قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذَٰلِكَ مَثُوبَةً عِنْدَ اللَّهِ ۚ مَنْ لَعَنَهُ اللَّهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوتَ ۚ أُولَٰئِكَ شَرٌّ مَكَانًا وَأَضَلُّ عَنْ سَوَاءِ السَّبِيلِ ﴿٦٠﴾ وَإِذَا جَاءُوكُمْ قَالُوا آمَنَّا وَقَدْ دَخَلُوا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوا بِهِ ۚ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوا يَكْتُمُونَ ﴿٦١﴾ وَتَرَىٰ كَثِيرًا مِنْهُمْ يُسَارِعُونَ فِي الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۚ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٦٢﴾ لَوْلَا يَنْهَاهُمُ الرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْإِثْمَ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۚ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ ﴿٦٣﴾

ترجمہ:- اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے، کیا میں بتاؤں تم کو کہ اس سے زیادہ بدتر باعتبار جزا اللہ کے نزدیک وہ ہے جس پر اللہ نے لعنت کی ہے اور اس پر غضب کیا ہے اور بنایا ہے اُن میں سے بعض کو بندر اور خنزیر اور وہ جنہوں نے شیطان کی پوجا کی یہی لوگ ہیں بدترین درجے کے اعتبار سے اور زیادہ بہکے ہوئے ہیں سیدھے راستے سے ﴿٦٠﴾ اور جب آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان

آتے ہیں حالانکہ وہ کفر کے ساتھ داخل ہوتے ہیں اور وہ کفر کے ساتھ نکلے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں (٦١) اور دیکھے گا تو بہتوں کو ان میں سے کہ وہ دوڑتے ہیں گناہ اور تعدی کی طرف اور حرام کھانے کی طرف بہت بُرا ہے جو کچھ وہ کر رہے ہیں (٦٢) کیوں نہیں ——— منع کرتے اُن کو درویش اور عالم اُن کی گناہ کی بات کہنے سے اور اُن کے حرام کھانے سے ۔ البتہ بہت بُری ہے وہ کارگزاری جو وہ کرتے ہیں (٦٣)

ربطِ آیات

گذشتہ درس میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب اور مشرکین کے ساتھ دوستانہ کرنے سے منع فرمایا اور پھر اس کی وجہ بھی بیان فرمائی کہ جو لوگ تمہارے دین اور شعائر اللہ کو ہنسی مذاق اور کھیل کود کا نشانہ بناتے ہیں تم اُن کو دوست کیسے بنا سکتے ہو ۔ پختہ ایمان کا حامل آدمی تو ایسا نہیں کر سکتا ۔ اور اگر ایمان ہی کمزور پڑ جائے یا بالکل ضائع ہو جائے تو پھر اغیار کے ساتھ دوستی بھی ممکن ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر اذان کا ذکر کیا کہ یہ لوگ دین کے اس شعار کو استہزاء کا نشانہ بناتے ہیں ۔ یہ کام بے عقل لوگ ہی کر سکتے ہیں ۔ کوئی سمجھدار آدمی ایسی حرکت نہیں کر سکتا ۔ اذان ایک اچھی چیز ہے ۔ اس میں توحید و رسالت کا اقرار اور دعوت الی الخیر پائی جاتی ہے ۔ اس میں تمسخر والی کوئی چیز موجود نہیں ، لہٰذا اذان کی توہین کرنا نہایت بے وقوفی کا کام ہے ۔

پھر اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کو خصوصی خطاب فرمایا کیونکہ یہ لوگ انبیاء کی تعلیمات کے وارث تھے ، حاملین ، کُتبِ سماویہ تھے ، شرائع الٰہیہ سے واقف تھے ، برخلاف اس کے مشرکین کے پاس نہ کوئی آسمانی کتاب تھی اور نہ ہی ہدایت کا کوئی دوسرا ذریعہ تھا لہٰذا اہلِ کتاب کے مقابلہ میں وہ کسی حد تک معذور تھے ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب ہی کو فرمایا کہ تم اہلِ ایمان کی محض اس لیے عیب جوئی کرتے ہو کہ وہ اللہ اور اس کی نازل کردہ

کتاب قرآن حکیم پر ایمان لاتے ہیں۔ تمہاری یہ قبیح حرکت تمہارے فسق کی وجہ سے ہے کیونکہ تمہاری اکثریت نافرمانوں پر مشتمل ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی ایک مزید قباحت بیان فرمائی کہ وہ اہل حق پر طعن کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کی اپنی اصلیت یہ ہے کہ یہ دنیا کے بدترین لوگ ہیں۔

بدترین لوگ

ارشاد ہوتا ہے۔ قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذَٰلِكَ مَثُوبَةً عِنْدَ اللّٰهِ اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے کیا میں بتلاؤں تمہیں اس سے زیادہ برائی بلحاظ جزا کے اللہ کے نزدیک۔ امام بیضاویؒ، امام رازیؒ اور بعض دیگر مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہاں پر ذٰلِكَ سے پہلے اَهْلِ محذوف ہے۔ یعنی پوری عبارت اس طرح ہے بِشَرٍّ مِّنْ اَهْلِ ذٰلِكَ اور مطلب یہ ہے۔ کہ کیا میں تمہیں اُن لوگوں کے متعلق نہ بتاؤں جو بُرائی میں فاسقوں یعنی اہل کتاب سے بھی بڑھے ہوئے ہیں بعض مفسرین یہاں پر دِیْنُ محذوف مانتے ہیں اور معنیٰ یہ کرتے ہیں، کیا میں تمہیں ان لوگوں کے متعلق نہ بتاؤں جن کا دین فساق سے بھی زیادہ بڑا ہے۔ گذشتہ درس میں اہل کتاب اور کفار کا ذکر ہوا تھا کہ اہل ایمان کو اُن کے ساتھ دوستی نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ وہ شعائر اللہ سے استہزاء کرتے ہیں۔ پھر انہیں بے عقل اور فاسق بھی کہا گیا۔ تو اب نبی علیہ السلام کو حکم ہو رہا ہے کہ آپ کہہ دیں کہ کیا میں تمہیں ان بیوقوفوں اور فاسقوں سے بھی بدتر لوگوں کے متعلق نہ بتاؤں۔ وہ کون ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے خود ہی اُن کے بُرے خصائل کا ذکر کر دیا ہے کہ بدتر لوگ وہ ہیں مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ جن پر اللہ نے لعنت کی وَغَضِبَ عَلَيْهِ اور غضب کیا وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ اور اُن میں سے بندر اور خنزیر بنا دیئے وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ اور وہ بھی بدترین ہیں جو شیطان کے پجاری بن گئے۔ یہ تمام بُرے خصائل بنی اسرائیل پر ہی صادق آتے ہیں وہی ان اوصاف

کے حاملین ہیں۔ پہلے گزر چکا ہے۔ کہ اللہ نے فرمایا فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيثَاقَهُمْ لَعَنَّاهُمْ اُن کے نقضِ عہد کی وجہ سے ہم نے اُن پر لعنت کی اور اُن کے دل سخت کر دیے۔ پھر اُن پر خدا تعالیٰ کا غضب ہوا یہ یہودی تھے اور نصاریٰ کے متعلق فرمایا کہ یہ بھٹکے ہوئے لوگ ہیں، انہوں نے توحید کو چھوڑ کر شرک کو اختیار کیا۔ فرمایا یہ لوگ اہل ایمان کے ساتھ استہزا کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ اللہ کے نزدیک بدترین لوگ ہیں۔ یہاں بھی فرمایا کہ بدترین لوگ وہی ہیں جن پر اللہ کی لعنت اور غضب ہوا اور بندر اور سور بنا دیا اور وہ جو شیطان کے پجاری بن گئے۔

سورۃ اعراف اور دوسرے مقامات پر موجود ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں تعدی و تجاوز کرنے والے بنی اسرائیل ہی تھے۔ اللہ نے اُن کی نافرمانیوں پر انہیں بار بار تنبیہ کی مگر جب وہ باز نہ آئے تو اللہ نے اُن کی شکلیں تبدیل کر کے بعض کو بندر بنا دیا اور بعض کو خنزیر۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانے میں بھی ایسا ہی ہوا تھا، اِن کو کہا گیا تھا کہ مائدہ آسمانی کو ذخیرہ بنا کر نہ رکھنا مگر یہ لوگ باز نہ آئے تو اللہ تعالیٰ نے اِن کی شکلیں تبدیل کر دیں۔

اور فرمایا کہ بدترین لوگوں میں وہ بھی ہیں جنہوں نے توحید کو چھوڑ کر شیطان کی پرستش شروع کر دی۔ شیطان کے نقش قدم پر چلنا اور اُس کی بات کو ماننا یہی شیطان کی پوجا ہے۔ یہ پرستش محض سجدہ کرنے سے ہی عبارت نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر کسی کی فرمانبرداری کرنا اس کی عبادت میں ہی شامل ہے۔ تو اِن لوگوں نے اللہ کے احکام کو نظر انداز کر دیا اور شیطان کی باتوں پر عمل کرنے لگے۔ فرمایا أُولَٰئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا یہ لوگ مرتبے کے لحاظ سے بھی بدترین ہیں وَأَضَلُّ عَن سَوَاءِ السَّبِيلِ اور سیدھے راستے سے بالکل بھٹکے ہوئے ہیں۔

ایمان کا باطل دعویٰ

اہل کتاب خاص طور پر یہودیوں میں کچھ منافق قسم کے لوگ بھی تھے! جو

بظاہر کلمہ بھی پڑھتے تھے مگر در پردہ ان کے تعلقات یہودیوں کے ساتھ بھی تھے۔ آگے ان کے متعلق ارشاد ہوتا ہے وَإِذَا جَآءُوكُمْ قَالُوٓا ءَامَنَّا جب وہ تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لا چکے ہیں حالانکہ یہ محض زبانی دعوے ہے اور حقیقت یہ ہے "وَمَا هُم بِمُؤْمِنِينَ" کہ وہ ایمان والے نہیں ہیں۔ ان کا دعویٰ غلط ہے۔ "يُخَٰدِعُونَ ٱللَّهَ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوا" یہ اللہ اور اہل ایمان کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ دل میں کفر بھرا ہوا ہے اور زبان سے ایمان کا اظہار کرتے ہیں۔ فرمایا یہ اپنے دعوے میں بالکل جھوٹے ہیں۔ ان کی اصلیت یہ ہے وَقَد دَّخَلُوا بِٱلْكُفْرِ کہ وہ کفر کے ساتھ آپ کے پاس آتے ہیں وَهُمْ قَدْ خَرَجُوا بِهِۦ اور اسی کفر کے ساتھ ہی واپس چلے جاتے ہیں۔ یہ اپنے کفر پر بدستور قائم ہیں ان کے دلوں میں ایمان داخل نہیں ہو سکا۔ فرمایا وَٱللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوا يَكْتُمُونَ اللہ تعالیٰ اس چیز کو خوب جانتا ہے، جس کو یہ چھپاتے ہیں۔ وہ علیم کل ہے، اس کی نظروں سے کوئی چیز مخفی نہیں۔ جب منافق اہل ایمان کی مجلس میں آکر ایمان کا جھوٹا دعویٰ کرتے ہیں تو اللہ کو علم ہوتا ہے کہ یہ محض اپنے مفاد کی خاطر ایمان کا زبانی دعویٰ کر رہے ہیں حقیقت میں ان کے دل کفر سے لبریز ہیں

برائی کی طرف رغبت

فرمایا وَتَرَىٰ كَثِيرًا مِّنْهُمْ يُسَٰرِعُونَ فِى ٱلْإِثْمِ اے مخاطب! تو ان میں سے بہتوں کو دیکھے گا کہ وہ گناہ کی طرف دوڑ کر جاتے ہیں۔ ان کی رغبت نیکی کی بجائے گناہ کی طرف ہے وَٱلْعُدْوَٰنِ اور یہ تعدی کی طرف بھی دوڑتے ہیں وَأَكْلِهِمُ ٱلسُّحْتَ اور حرام کھانے میں بھی جلدی کرتے ہیں۔ یعنی ان تین چیزوں کی طرف راغب ہیں۔ یہ بُری خصلتیں بھی اہل کتاب میں پائی جاتی ہیں۔ گناہ سے مراد وہ برائی ہے جس کا وبال انسان کی اپنی ذات تک محدود ہوتا ہے

عدوان وہ برائی ہے جس کا اثر دوسروں پر پڑتا ہے جن کے ساتھ ظلم و زیادتی کی جاتی ہے اور اکل حرام ایسی چیز ہے۔ جس سے انسان کی روح ناپاک ہو جاتی ہے۔

ماہرینِ نفسیات اور محققین کہتے ہیں کہ جب انسان کی قوت نطقیہ یعنی گویائی جیسی پاکیزہ طاقت خراب ہو جاتی ہے تو وہ گناہ کی طرف دوڑتا ہے، جھوٹ بولتا ہے، وعدہ خلافی کا ارتکاب کرتا ہے۔ اور جب انسان کی قوت غضبیہ میں فتور آجائے، تو وہ دوسروں پر زیادتی کرنے لگتا ہے۔ کسی کی جان کو نقصان پہنچاتا ہے، کسی کا مال ہضم کرتا ہے اور کسی کو بے آبرو کر دیتا ہے، یہ عدوان ہے اگر انسان اس قوت کو برمحل استعمال کرے تو وہ مظلوم کی مدد کر سکتا ہے کفر کے خلاف جہاد کر سکتا ہے ——— اس کی قوت عدل و انصاف کے قیام میں مدد دے سکتی ہے اور وہ کمال درجے کا با اخلاق آدمی بن سکتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ جب انسان کی قوت شہوانیہ میں فساد آتا ہے تو وہ حرام کاری کرنے لگتا ہے۔ یہ تمام بری خصلتیں یہودیوں میں پائی جاتی ہیں۔ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ عہد شکنی کے مرتکب ہوتے ہیں، تعدی اور تجاوز کرتے ہیں، حرام خور ہیں، دھوکہ باز اور سود خور ہیں۔ رشوت، نیاز لغیر اللہ سحر اور تعویز گنڈوں کی کمائی کھا جاتے ہیں۔ فرمایا لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ بہت ہی برا ہے جو کچھ یہ کرتے ہیں۔ نتیجہ کے اعتبار سے ان لوگوں کے مذکورہ افعال ان کے لیے نہایت ہی نقصان دہ ثابت ہوں گے۔

علماء و مشائخ کی ذمہ داری

یہودیوں کے پیر اور علماء بھی اکل حرام میں ملوث ہو چکے تھے۔ سورۃ توبہ میں موجود ہے اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ" یہ لوگوں کا مال باطل طریقے سے کھاتے تھے، جیسا کہ پہلے عرض کیا کہ حرام خوری اُن کی قوت شہوانیہ کے فتور کا نتیجہ تھی۔ جب وہ خود حرام خوری اور کذب بیانی کے مرتکب ہوتے تھے تو وہ اپنے متبعین کو ان قبیح حرکات سے کیسے روک

سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں پر فرمایا لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ان کے درویش اور عالم ان کو کذب بیانی اور اکلِ حرام سے کیوں نہیں روکتے وہ جانتے ہیں کہ ان کی قوم فلاں فلاں جرم میں ملوث ہے، سب کچھ انکی آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے مگر وہ انہیں روکنے کی ہمت نہیں پاتے کیونکہ وہ خود بھی انہی گناہوں میں ملوث ہیں۔ اللہ نے فرمایا کہ علماء اور مشائخ کا فرض تھا کہ وہ گناہ کی باتوں اور حرام خوری سے قوم کو منع کرتے مگر وہ ایسا نہیں کرتے، لہٰذا قوم کے راہِ راست پر آنے کا کوئی امکان نہیں۔

سید علی ہجویریؒ اور بعض دوسرے بزرگانِ دین فرماتے ہیں کہ کسی قوم کے اکابرین ہی اس قوم کے لیے اچھائی یا برائی کی بنیاد ہوتے ہیں۔ انہی کے عمل پر سوسائٹی کا طرزِ عمل مرتب ہوتا ہے۔ اگر امراء اور حکام درست ہونگے تو سوسائٹی صحیح سمت میں رواں دواں ہوگی اور اگر وہی بگڑ گئے تو ساری سوسائٹی ہی تباہ ہو جائیگی کیونکہ اَلنَّاسُ عَلٰى دِيْنِ مُلُوْكِهِمْ کے مصداق لوگ بھی اپنے امراء کی پیروی میں بُرے راستے پر ہی چلیں گے۔ فرماتے ہیں اگر پیر اور درویش لوگ ٹھیک ہوں گے تو سوسائٹی میں اعلیٰ اخلاق پیدا ہوں گے جتنے بھی بزرگانِ دین اور نیک لوگ گزرے ہیں انہوں نے عوام کی اصلی تربیت کی ہے اور لوگ ان کی تعلیم سے فیضیاب ہوئے ہیں۔ اور یہی لوگ حرام خوری کرنے لگیں اچھائی اور برائی کی تمیز اٹھ جائے تو سوسائٹی کیسے درست ہو سکتی ہے۔ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی تشریح تو علمائے امت کے ذمہ ہے، اگر وہی ان برائیوں میں ملوث ہو جائیں تو پھر قوم کی تربیت کون کریگا؟

اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب یہود و نصاریٰ کی خرابیوں کا تذکرہ فرمایا ہے اور ان کی مذمت بیان کی ہے مگر جب ہم اپنے آپ کی طرف دیکھتے ہیں تو اپنے آپ کو اہل کتاب سے کم تر نہیں پاتے۔ یہودیوں کے علماء

مشائخ کی طرح امت مسلمہ کے علماء و مشائخ بھی اسی ڈگر پر چل نکلے ہیں۔ امراء اور حکام بگڑ گئے ہیں۔ قوم کی نہ تو معیشت اچھی ہے اور نہ اخلاق بہتر ہے۔ کوئی چیز اپنے ٹھکانے پر قائم نہیں رہی۔ چنانچہ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ اس آیت میں علماء و مشائخ کو سخت تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو پہچانیں ان کا فرض ہے۔ کہ وہ خود بھی احکام الٰہی پر عمل پیرا ہوں اور لوگوں کو بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا درس دیں۔ انہیں لازم ہے کہ وہ جائز ناجائز اور حلال و حرام سے عوام کو روشناس کرائیں انہیں نیکی کی طرف راغب کریں اور بُرے اعمال کے نتائج سے خبردار کریں۔ کذب بیانی اور حرام خوری کے خلاف جہاد کریں مگر افسوس کہ وہ اپنا فرض بھول چکے ہیں اور خود بھی ان خرابیوں کا شکار ہو چکے ہیں۔ فرمایا لَبِئۡسَ مَا كَانُوۡا يَصۡنَعُوۡنَ بہت بُرا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔ برائی کے مرتکب خواہ اہل کتاب اور ان کے علماء ہوں یا امت مسلمہ کے لوگ اور ان کے علماء و مشائخ، برائی بہرحال برائی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کی مذمت بیان فرمائی ہے۔ اور ساتھ ساتھ سخت تنبیہ بھی کی ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُولَةٌ غُلَّتْ أَيْدِيهِمْ
وَلُعِنُوا بِمَا قَالُوا بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ يُنْفِقُ
كَيْفَ يَشَاءُ وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُمْ مَّا أُنْزِلَ
إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا وَأَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ
الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ كُلَّمَا أَوْقَدُوا
نَارًا لِّلْحَرْبِ أَطْفَأَهَا اللّٰهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا
وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ﴿٦٤﴾ وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْكِتٰبِ
آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ
وَلَأَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيمِ ﴿٦٥﴾ وَلَوْ أَنَّهُمْ
أَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ
مِّنْ رَّبِّهِمْ لَأَكَلُوا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ
تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ مِنْهُمْ أُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ
وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ سَاءَ مَا يَعْمَلُونَ ﴿٦٦﴾

ترجمہ :- اور یہودیوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ جکڑ
دیے گیے ۔ ان یہودیوں کے ہاتھ جکڑ دیے گئے ہیں ، اور اُن پر
لعنت کی گئی ہے اس وجہ سے جو انہوں نے کہا ۔ بلکہ اللہ

کے ہاتھ تو کشادہ ہیں ، وہ خرچ کرتا ہے جس طرح چاہے
اور البتہ ان میں سے بہتوں کے لیے زیادہ کریگی وہ چیز جو اُتاری
گئی ہے آپ کی طرف آپ کے رب کی طرف سے ، ان کے لیے
سرکشی اور کفر کو ۔ اور ہم نے ڈال دی ہے ان کے درمیان
عداوت اور دشمنی قیامت تک ۔ جب بھی یہ لڑائی کی آگ
بھڑکاتے ہیں ، اللہ اس کو بجھا دیتا ہے اور یہ کوشش کرتے
ہیں زمین میں فساد کی ۔ اور اللہ تعالیٰ نہیں پسند کرتا فساد کرنے
والوں کو (۶۴) اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور ڈرتے ۔ البتہ ہم
اُن کو معاف کر دیتے اُن کی بُرائیاں اور ہم ضرور داخل کرتے
اُن کو نعمتوں کے باغوں میں (۶۵) اور اگر یہ لوگ قائم کرتے
تورات اور انجیل کو اور جو چیز نازل کی گئی ہے اُن کی طرف
اُن کے رب کی طرف سے البتہ کھاتے وہ اُوپر سے اور
پاؤں کے نیچے سے ان میں سے ایک امت میانہ روی والی
ہے اور بہت سے ان میں سے وہ ہیں جو بہت بُرے کام
کرتے ہیں (۶۶)

بارگاہِ الٰہی میں بے ادبی

یہود اور منافقین کی بہت سی بُری خصلتوں کا تذکرہ گذشتہ دروس میں ہو چکا ہے
انکی کی شرارتیں ، سرکشی ، حرام خوری اور حق کی مخالفت وغیرہ کے متعلق سیر حاصل بحث
ہو چکی ہے ۔ اُن کی طرف سے اللہ کے نبیوں اور ایمان والوں کی ایذا رسانی ان کا
عام معمول ہے اور اب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اُن کی گستاخی اور بے ادبی کا تذکرہ ہو
رہا ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ یہودیوں
نے کہا کہ اللہ کے ہاتھ بند کر دیے گئے ہیں یعنی خدا تعالیٰ اب معاذ اللہ بخیل ہو گیا ہے
کیونکہ وہ ہمیں ہماری ضروریات بہم نہیں پہنچاتا ۔ اُن کا کام یہ تھا کہ جب ذرا تنگی آتی تو

اللہ تعالیٰ کا گلہ شکوہ کہنے لگتے اور اس طرح اُس کی شان میں گستاخی کے کلمات کہتے۔ اس سے پہلے سورۃ آل عمران میں گزر چکا ہے کہ جب یہودیوں کو کہا گیا کہ اللہ کے راستے میں خرچ کرو، تو کہنے لگے "اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ" اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ محتاج ہو گیا اور پھر ہم غنی ہیں کیونکہ وہ ہم سے مانگتا ہے۔ اسی طرح جب قرض حسنہ کا ذکر آیا وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا یعنی اللہ کو قرض حسنہ دو، تو کہنے لگے نعوذ باللہ خدا محتاج ہو گیا ہے جو قرض مانگتا ہے۔ ابتدا میں یہودی پورے علاقے میں تجارت پر چھائے ہوئے تھے اور آسودہ حال تھے۔ جب مسلمانوں کو عروج حاصل ہوا اور یہود کی مالی حالت کچھ کمزور ہوئی تو گستاخی کے کلمات کہنے لگے کہ اللہ کے ہاتھ جکڑ دیے گئے ہیں، اب وہ اپنے بندوں کے لیے وسعتِ رزق پر قادر نہیں رہا۔

یہودیوں کی اس گستاخی اور بے ادبی کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ انہی کے ہاتھ جکڑ دیے گئے ہیں کیونکہ تمام بری خصلتوں، بخل، کمینگی، کذب بیانی وغیرہ میں وہی مبتلا ہیں وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا اور اس طرح کہنے کی وجہ سے ان پر لعنت کی گئی ہے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کی ہے، کبھی اُس کو فقیر کہا ہے اور کبھی کنجوس، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے۔ فرمایا حقیقت یہ ہے بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ اللہ کے دونوں ہاتھ کشادہ ہیں۔ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ وہ خرچ کرتا ہے جیسے چاہتا ہے۔ وہ مالک اور مختار ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے روک لیتا ہے اُس کی حکمت میں کوئی دخل اندازی نہیں کر سکتا۔

اللہ کے ہاتھ

اس مقام پر اللہ تعالیٰ کے ہاتھوں کا ذکر آیا ہے۔ دوسرے مقامات پر اللہ کے چہرے اور پنڈلی کا ذکر بھی آتا ہے۔ یہاں پر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی

چاہیے کہ یہ چیزیں متشابہات میں آتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے چہرے ہاتھ یا پنڈلی کا اطلاق انسانی اعضا پر نہیں کیا جاسکتا۔ خدا تعالیٰ کے ہاتھ ہیں مگر انسان یا کسی دوسری مخلوق کے ہاتھوں کی طرح نہیں بلکہ اُس طرح کے ہاتھ مراد ہیں جیسے اُس کی شان کے مناسب ہیں۔ اللہ کے ہاتھوں کے متعلق ہماری طرح دائیں بائیں کا تصور بھی نہیں رکھنا چاہیئے بلکہ بے کیف ہاتھوں پر ایمان ہونا چاہیئے۔ شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ دونوں ہاتھوں سے مراد اللہ کی مہر اور قہر کے ہاتھ ہیں۔ فرمانبرداروں اور اطاعت گزاروں کے لیے مہر کا ہاتھ ہے اور نافرمانوں کو سزا دینے کے لیے قہر کا ہاتھ ہے بہرحال شاہ صاحب نے مہر اور قہر کے یہ مجازی معنی بیان کیے ہیں اس لحاظ سے اللہ تعالےٰ کے مہر اور قہر کے دونوں ہاتھ پھیلے ہوئے ہیں اور وہ اپنی مشیت کے مطابق جیسے چاہتا ہے ویسے ہی کرتا ہے۔

اور اگر ہاتھ کا معنیٰ بعینہٖ ہاتھ ہی لیا جائے تو پھر وہ بے کیف ہے اللہ تعالےٰ عرش پر مستوی ہے مگر بے کیف۔ ہم اُس کیفیت کو نہیں سمجھ سکتے۔ صرف ایمان لانا ضروری ہے۔ "لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ" مخلوق میں کوئی چیز اس سے مشابہت نہیں رکھتی لہٰذا ہم اللہ تعالیٰ کے ہاتھوں، چہرے، پنڈلی، آنکھوں اور کانوں وغیرہ کو اپنے تصور میں نہیں لا سکتے کیونکہ خدا تعالیٰ بے مثل ہے جب ہم سبحان اللہ کہتے ہیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے اُس کی ذات ہر نقص اور عیب سے پاک ہے اس کے ہاتھ کشادہ ہیں اور وہ جس طرح چاہے خرچ کرتا ہے۔

سرکشی اور کفر میں اضافہ

فرمایا یہودیوں کا حال تو یہ ہے وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُم مَّآ أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا ان میں سے بہتوں کے لیے آپ کے رب کی طرف سے آپکی طرف نازل کردہ چیز سرکشی اور کفر میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔ جب بھی قرآن پاک کا کوئی حصہ

نازل ہوتا ہے تو وہ یہودیوں پر گراں گزرتا ہے، وہ اس سے چڑتے ہیں، اور اس کی مخالفت پر اتر آتے ہیں کیونکہ وہ ان کی کذب بیانی اور تحریف فی الکتاب کا پردہ چاک کرتا ہے۔ منافقین کے متعلق بھی آتا ہے کہ جب قرآن پاک کی آیات نازل ہوتی ہیں فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا إِلَىٰ رِجْسِهِمْ تو اُن کی گندگی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اُن کے دِلوں میں کفر، شرک اور نفاق کی نجاست پہلے ہی موجود ہوتی ہے، جب مزید آیتیں نازل ہوتی ہیں تو اُن کی نجاست میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَزَادَتْهُمْ إِيمَانًا جو ایمان والے ہیں، قرآن کی نازل ہونے والی آیات اُن کے ایمان میں مزید اضافہ کر دیتی ہیں۔ اسی طرح یہاں پر فرمایا کہ یہودیوں کے دلوں میں سرکشی اور کفر تو پہلے ہی موجود ہے نئی نازل ہونے والی آیات کی وجہ سے اُن کی نجاست مزید بڑھ جاتی ہے

آپس کی عداوت

آگے اللہ تعالیٰ نے اُس سزا کا ذکر کیا ہے جو بنی اسرائیل پر مسلط کی گئی ہے ارشاد ہے وَأَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ اور ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لیے عداوت اور دشمنی ڈال دی ہے۔ یہ لوگ اندرونی طور پر ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریباں رہیں گے۔ ان میں کبھی فرقہ وارانہ منافرت پیدا ہو گی، کبھی ذاتی مفاد پیشِ نظر ہو گا اور کبھی سیاسی امور ان میں اختلاف کا باعث ہوں گے، اللہ نے فرمایا قیامت تک ان میں اتحاد و اتفاق کی فضا قائم نہیں ہو سکے گی۔

فرمایا كُلَّمَا أَوْقَدُوا نَارًا لِّلْحَرْبِ أَطْفَأَهَا اللَّهُ جب بھی یہ جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں، اللہ تعالیٰ اُسے بجھا دیتا ہے۔ اسلام کے ابتدائی دور میں انہوں نے مسلمانوں کا راستہ روکنے کی بڑی کوشش کی، مشرکین مکہ کو بار بار لڑائی کے لیے میدان میں لائے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے

ہر بار انہیں ناکام کیا اور اسلام کی شمع کو گل کرنے کی اُن کی خواہش پوری نہ ہو سکی
اُس زمانے میں مسلمان میں جذبہ ایمان موجزن تھا، اُن پر بڑی بڑی آزمائشیں بھی
آئیں مگر اُن کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی اور یہودیوں کی تمام تر سازشوں
کے باوجود وہ کامیاب ہی ہوتے چلے گئے۔ اور دنیا نے دیکھ لیا کہ اِنَّ اللّٰہَ
مَعَ الْمُؤْمِنِیْنَ اللہ تعالیٰ مومنوں کے ساتھ ہے، یہود و نصاریٰ اور
کفار و مشرکین کی کوئی چال کامیاب نہ ہو سکی۔

فساد فی الارض

فرمایا ان کا حال یہ ہے وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا
یہ زمین میں فساد برپا کرتے ہیں لوگوں کو گمراہ کرنا، اسلام سے بدظن کرنا۔
پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف پراپیگنڈا کرنا، قرآن کے متعلق غلط بیانی
کرنا اور اپنی کتابوں میں تحریف کرنا ان کا کام ہے اور یہی فساد فی الارض ہے
اس طرح کفر و شرک کا ارتکاب کرنا، اکل حرام، بدعات کی ترویج وغیرہ بھی
زمین میں فساد پیدا کرنے کے مترادف ہے۔ جب تک شرائع الٰہیہ پر کما حقہٗ
عمل نہیں ہوتا اس نوع انسان کو امن نصیب نہیں ہو سکتا۔ امام بیضاویؒ فرماتے
ہیں کہ شرائع الٰہیہ کے خلاف کام کرنا دین الٰہی کو توڑنا اور اس کے برخلاف
چلنا فساد فی الارض ہے۔

آج کل فساد فی الارض کی بیماری میں خود مسلمان بھی ملوث ہو چکے ہیں۔
شرائع الٰہیہ کو معطل کر رکھا ہے، نہ حدود اللہ جاری ہیں اور نہ حقوق العباد کا
تحفظ ہے، انگریز کا مرتب کردہ قانون ابھی تک نافذ ہے۔ اس سرزمین
سے انگریز کی جڑ تو چالیس سال ہوئے اکھڑ چکی ہے لیکن اس کا لایا ہوا قانون
ابھی تک ہمارے سروں پر مسلط ہے۔ آج ہائی کورٹ کا چیف جسٹس کہتا ہے
کہ موجودہ انگریزی قانون عدل کے خلاف نہیں۔ ایک ریٹائرڈ جج نے بھی
انہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اگر یہی بات ہے تو مسلمانوں نے اسلام کے
نام پر علیحدہ ملک حاصل کرنے کی کیوں جدوجہد کی اور اس کے لیے لاکھوں

جانوں کی قربانی کیوں پیش کی ۔ انگریزی قانون کی بنیاد سراسر ظلم و زیادتی پر ہے خود یورپ کے انگریزوں نے تسلیم کیا ہے کہ اس قانون کے ذریعے عدل نصیب نہیں ہوسکتا۔ یہ تو شیطان کا جال ہے کمزوروں کو پھانستا ہے اور طاقتوروں کو چھوڑ دیتا ہے اس کے ذریعے انصاف کیسے حاصل ہوسکتا ہے آج مسلمان اغلال بالشرائع کر رہے ہیں۔

فرمایا وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔ بلکہ ایسا آدمی اللہ کی نگاہ میں برا ہے۔ جو شخص بدعقیدگی اور بدعت کو رواج دیتا ہے، کفر اور شرک کو پھیلاتا ہے، اسلام کے راستے میں رکاوٹ بنتا ہے قوانین الٰہیہ کے سامنے دیوار بن گیا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ کیسے ہوسکتا ہے۔ اللہ کو محبوب وہ شخص ہے جو کفر کی بجائے ایمان والا ہے۔ جو نفاق کی بجائے اخلاص کا حامل ہے اور زمین میں فساد کی بجائے اصلاح کی کوشش کرتا ہے۔ یہی اللہ کا پسندیدہ بندہ ہے۔ ملاء اعلیٰ اس کے حق میں دعائیں کرتے ہیں۔

یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ جب تک انگریز کا دودھ پینے والا نوکر شاہی طبقہ برسر اقتدار ہے، نہ انگریزی قانون سے نجات مل سکتی ہے اور نہ اسلامی قانون آسکتا ہے۔ اسلامی قانون کے نفاذ سے انگریزی ذہنیت کے لوگوں کے مفاد پر زد پڑتی ہے، لہٰذا یہ حتی الامکان اس کی مخالفت کریں گے۔ یہودیوں کا منشد بھی یہی تھا۔ اگر وہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت قبول کر لیتے تو ان کے ذاتی مفاد کو نقصان پہنچتا تھا، انہیں حلال و حرام کی تمیز کرنا پڑتی۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کا خیال کرنا پڑتا، ان کی جائدادیں، جاگیریں اور وظیفے ختم ہوجاتے۔ لہٰذا انہوں نے ہمیشہ اسلام کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کی کوشش کی اور فساد فی الارض کے مرتکب ہوئے جنہیں اللہ پسند نہیں کرتا۔

ایمان کی برکات

فرمایا وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور کفر، شرک اور معاصی سے ڈر جاتے لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ

ہم اُن کی برائیوں اور غلطیوں کو معاف کر دیتے، بالکل اُسی طرح جس طرح مخلص مومنوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے۔ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ اور اللہ تعالیٰ انہیں نعمت کے باغوں میں داخل کرتے اور وہ فلاح پا جاتے۔ فرمایا وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ اور اگر وہ تورات اور انجیل کو قائم کرتے۔ مگر اپنے دور میں تو انہوں نے اُسے قائم نہیں کیا۔ بلکہ اسمیں تحریف کے مرتکب ہوئے اور اس کے احکام کو چھپانے کی کوشش کرتے رہے اگر یہ اپنی کتابوں پر عمل درآمد کرتے وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ اور اس چیز کو بھی قائم کرتے جو اُن کے رب کی طرف سے اُن پر اتاری گئی ہے۔ یعنی قرآن پاک۔ تو اللہ تعالیٰ کی مہربانیاں اُن کے شامل ہوتیں اور اُس کا نتیجہ یہ ہوتا لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ تو وہ کھاتے اپنے اوپر سے۔ یعنی اُن کے لیے آسمانوں سے رحمت کے دروازے کھول دیے جاتے۔ آسمانی برکات میں نفع بخش بارش اور اچھی آب و ہوا شامل ہے جس سے اِن کی کھیتیاں اور باغ لہلہاتے اور یہ خوب خوشحال ہوتے۔ پیداوار وافر ہوتی۔ خوب کھاتے پیتے اور اُن کی صحت بھی اچھی ہو جاتی۔ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ اور اپنے پاؤں کے نیچے سے بھی کھاتے۔ یعنی ان کے لیے زمینی اسباب بھی مہیا ہوتے۔ انسانی ضروریات کی تمام چیزیں زمین سے پیدا ہونے لگتیں اور انہیں کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہوتی۔ اس طرح گویا یہ لوگ آسمانی اور زمینی ہر قسم کی برکات سے فیضیاب ہوتے مگر ان کا حال یہ ہے کہ معمولی سی تکلیف آگئی تو اللہ رب العزت کی شان میں بے ادبی اور گستاخی کے کلمات بولنے لگے، جو ان کے لیے کسی طرح بھی روا نہیں تھا۔ اور اس طرح یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی برکات سے محروم ہو گئے۔

امت مقتصدہ

یہ تمام خرابیاں بیان کرنے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ سارے

یہودی ایک جیسے نہیں۔ سورۃ آلِ عمران میں بھی گزر چکا ہے "لَیْسُوْا سَوَآءً" کہ یہ سب برابر نہیں۔ یہاں پر بھی فرمایا مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ان میں کچھ میانہ روی والے لوگ بھی موجود ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی بعض اچھے لوگ موجود تھے اور ایسے آدمی ہر زمانہ میں ہوتے رہے ہیں۔ عدی ابن حاتم طائی حضور علیہ السلام کے زمانہ میں عیسائیت کو چھوڑ کر اسلام لائے۔ تمیم داریؓ بھی پہلے عیسائی مذہب رکھتے تھے مگر مسلمان ہو گئے۔ یہودی عالم حضرت عبداللہ بن سلامؓ ایمان لائے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عشرہ مبشرہ کی طرح انہیں بھی قطعی جنتی قرار دیا۔

ملکہ وکٹوریہ کے زمانے میں عبداللہ کوئلمؒ اسلام سے مشرف ہوئے ان کے ساتھ ان کے خاندان کے چالیس آدمی مسلمان ہوئے۔ آپ پر انگریزوں نے مقدمہ قائم کیا اور بڑی اذیت پہنچائی مگر آپ کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ جرمنی کا یہودی لیوپولڈ اسلام لایا جس کا اسلامی نام محمد اسد رکھا ہے۔ اب بھی زندہ سلامت ہے۔ اسی سال سے زیادہ عمر ہو چکی ہے۔ اب تک اچھی کتابیں لکھ رہا ہے۔ مقصد یہ کہ ہر دور میں صاحب فہم و فراست لوگ موجود رہے ہیں جنہوں نے اسلام کی حقانیت کو تسلیم کیا ہے۔ انہی کو امتِ مقتصدۃ فرمایا گیا ہے۔ فرمایا وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ البتہ ان کی اکثریت ایسی ہے جو بہت برے کام کرتے ہیں۔ وہ بلاشبہ مذمت کے قابل ہیں، تاہم اچھے لوگوں کی قدر کرنی چاہیئے۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ ان کو ساتھ لے کر چلیں، ان کی حوصلہ افزائی کریں۔ قرآن کریم کا پروگرام ان تک پہنچائیں۔ مگر افسوس کا مقام ہے کہ مسلمان خود صراطِ مستقیم سے ہٹ چکے ہیں۔ آج قرونِ اولیٰ کے مسلمان کہاں سے آئیں جو دین کے پودے کی آبیاری کریں۔ آج تو خود مسلمان کفر

شرک اور بدعات میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ اِن کا منتہائے مقصود کھیل تماشہ بن چکا ہے، آرام طلبی، عیش وعشرت، بدمعاشی، فحاشی کے دلدادہ ہیں اِن میں پہلے سا جوش و جذبہ کہاں سے آئے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم پر رحم کرے اور ہمیں قرونِ اولیٰ کے مسلمان بننے کی توفیق عطا فرمائے۔

يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۷﴾ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَىْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۸﴾

ترجمہ : اے رسول ! پہنچا دیں وہ چیز جو نازل کی گئی ہے آپ کی طرف آپ کے پروردگار کی جانب سے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا ، تو گویا آپ نے اُس کی رسالت کا حق ادا نہیں کیا ۔ اور اللہ تعالیٰ آپ کو بچانے گا لوگوں سے ۔ بیشک اللہ تعالیٰ نہیں راہ دکھاتا کفر کرنے والی قوم کو ﴿۶۷﴾ اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے اے اہل کتاب ! نہیں ہو تم کسی چیز پر حتیٰ کہ تم قائم کرو تورات اور انجیل کو اور اُس چیز کو جو نازل کی گئی ہے تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے اور البتہ زیادہ کریگی اُن میں سے اکثریت کے لیے جو چیز اُتاری گئی ہے آپ کی طرف آپکے رب کی جانب سے ، سرکشی اور کفر ۔ پس نہ افسوس کریں آپ اُن لوگوں پر جو کفر کرنیوالے ہیں ﴿۶۸﴾

ربط آیات

گذشتہ آیات میں اہل کتاب کی مذمت بیان ہوئی تھی ان کی سرکشی، کفر اور فساد فی الارض کا ذکر تھا۔ وہ لڑائی کی آگ بھڑکانا چاہتے تھے مگر اللہ نے انہیں ناکام بنا دیا اور بطور نصیحت فرمایا کہ اگر تم تورات و انجیل کو قائم کرتے اور نازل شدہ ہدایت پر عمل کرتے تو آسمان و زمین کی برکات تمہارے شامل حال ہوتیں مگر یہود و نصاریٰ کی اکثریت نافرمان تھی۔ اللہ تعالےٰ نے یہ بھی بیان فرمایا کہ ان میں کچھ باصلاحیت لوگ بھی موجود ہیں جو میانہ روی اختیار کرتے ہیں، ان کو ہدایت نصیب ہو جاتی ہے اور اہل ایمان کا بھی فرض ہے کہ وہ ہدایت کی بات محنت اور کوشش سے ان تک پہنچائیں۔ اب آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو مخاطب کر کے فرمایا کہ وہ اپنا فریضہ تبلیغ دین انجام دیتے رہیں اور مخالفین کی پروا نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ خود دشمنوں سے آپ کی حفاظت کرے گا۔

فریضہ تبلیغ دین

ارشاد ہوتا ہے يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ اے رسول! بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ آپ پہنچا دیں وہ چیز جو آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے نازل کی گئی ہے۔ اور وہ قرآن پاک اور اس کی تشریح ہے تشریح میں احادیث کا پورا ذخیرہ آ جاتا ہے جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قول اور عمل ہے۔ امام بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ اس چیز سے مراد وہ تمام احکام ہیں جو انسانوں کی مصلحت اور بہتری سے تعلق رکھتے ہیں۔ چنانچہ حضور علیہ السلام کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ تمام چیزیں جن کا تعلق انسان کے عقیدے اور عمل کے ساتھ ہے، وہ لوگوں کے سامنے بیان کر دیں۔ البتہ بعض بہت باریک نکات جو اسرار الٰہیہ کہلاتے ہیں انہیں ظاہر کرنے کا حکم نہیں ہے۔ کیونکہ ایسی چیزوں کا بندوں کی مصلحت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ایسے رموز و نکات کو خواص تو سمجھ لیتے ہیں مگر ان کا سمجھنا عوام کے بس میں نہیں ہوتا۔ لہٰذا انہیں تمام لوگوں تک پہنچانا مناسب نہیں ہوتا۔ مسلم شریف میں حضرت

عبداللہ بن مسعودؓ کا قول موجود ہے "مَا اَنْتَ بِمُحَدِّثٍ قَوْمًا حَدِيْثًا لَا تَبْلُغُهُ عُقُوْلُهُمْ اِلَّا كَانَ لِبَعْضِهِمْ فِتْنَةً" جس بات کو عام لوگوں کی عقلیں سمجھنے سے قاصر ہوتی ہیں، اُن کا بیان کرنا بعض لوگوں کے لیے فتنے اور گمراہی کا ذریعہ بن جائے گا۔ لہٰذا اُن کا عام بیان درست نہیں ہے۔ اس کی ممانعت فرمائی گئی ہے۔ البتہ جو باتیں انسانوں کی صلاح کے لیے ضروری ہیں اُن میں سے کسی ایک کو بھی ترک کرنے کی اجازت نہیں وہ سب کی سب لوگوں تک پہنچانا ہوں گی۔ اس بات کی وضاحت اُس حدیث شریف سے ہوتی ہے جسے امام بیہقیؒ نے نقل کیا ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا ما من شی یقربکم الی الجنۃ و یباعدکم من النار الا انبئتکم بہ جنت سے قریب کرنے والی اور دوزخ سے دور کرنے والی کوئی ایسی چیز نہیں جو میں نے تمہیں نہ بتائی ہو۔ میں نے ہر چیز تمہیں ٹھیک ٹھیک پہنچا دی ہے مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ کا یہی مفہوم ہے۔

اس حدیث سے اُن لوگوں کا رد ہوتا ہے، جن کا عقیدہ یہ ہے۔ کہ نبی علیہ السلام نے ساری کی ساری باتیں امت کو نہیں بتلائیں، بعض چیزیں بعض خاص آدمیوں کو بتائیں۔ رافضی کہتے ہیں کہ یہ خاص باتیں حضور علیہ السلام نے صرف حضرت علیؓ کو بتائیں۔ یہ باطل عقیدہ ہے۔ اللہ کا رسول اس بات کا پابند ہے کہ وہ انسانی اصلاح کی تمام باتیں لوگوں کے سامنے بیان کر دے۔ "وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ" عالم غیب کے اللہ تعالیٰ کے دین کے جو احکام اور خاص اصول آتے ہیں، اللہ کا نبی انہیں ظاہر کرنے میں بخل نہیں کرتا، وہ سب باتیں پہنچا دیتا۔ لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ قرآن پاک کی بعض آیات بھی حضور علیہ السلام نے حضرت علیؓ کو بتائیں اور باقی لوگوں کے سامنے پیش نہیں کیں۔ بہرحال یہ غلط عقیدہ ہے۔ نبی کے

فرائض منصبی میں داخل ہے کہ وہ تمام احکام و قوانین لوگوں تک بے کم و کاست پہنچا دے۔

حق رسالت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ اگر آپ نے ایسا نہ کیا، تمام احکام لوگوں تک نہ پہنچائے فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ تو آپ نے اللہ تعالیٰ کی رسالت کو نہیں پہنچایا، گویا آپ نے حق رسالت ادا نہیں کیا۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں احکام الٰہی میں سے اگر کسی ایک چیز کو بھی آگے نہیں پہنچایا تو گویا کہ سب باتوں کو ترک کر دیا۔ کسی ایک حکم کو چھپانا، تمام احکام کو چھپانے کے مترادف ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص نماز میں سے کوئی ایک رکن ترک کر دے تو پوری نماز ترک کرنے کے برابر ہے امام صاحب فرماتے ہیں کہ اللہ کا نبی فریضہ رسالت پورے طریقے سے ادا کرتا ہے اور اس میں بال برابر بھی کوتاہی نہیں کرتا

کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ میں سخت وعید فرمائی ہے۔ ہر نبی نے قوم کو یہی کہا اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ میں پیغام خداوندی پورے طریقے سے تم تک پہنچاتا ہوں اور اس میں کوئی کمی بیشی نہیں کرتا غرضیکہ اللہ کے احکام امت تک بلا کم و کاست پہنچانا نبی کے فرائض منصبی میں داخل ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ نبی اپنے فرائض ابلاغ میں کوتاہی کرتا ہے۔ تو وہ شخص گمراہ ہوگا۔

مولانا مودودی مرحوم نے اپنی تفسیر میں لکھا تھا کہ حضرت یونس علیہ السلام سے فریضہ رسالت میں کچھ کوتاہیاں ہوگئی تھیں، یہ نظریہ درست نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے فرض منصبی میں بال برابر بھی کوتاہی نہیں کی۔ اُن کی لغزش فریضہ رسالت کی کوتاہی نہ تھی۔ انہیں توقع تھی کہ اللہ کا حکم آنے والا ہے، چنانچہ انہوں نے قدرے بے صبری کا اظہار کیا اور اللہ کا حکم آنے سے پہلے ہی اپنی بستی سے نکل گئے یہ اُن کی لغزش ضرور تھی، جہاں تک

ابلاغ رسالت کا تعلق ہے، آپ عرصہ دراز تک قوم کو سمجھاتے رہے اور عذاب الٰہی سے ڈراتے رہے اور اپنا فرض منصبی ادا کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ تمام انبیاء کو صغائر اور کبائر سے خود بچاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں گارنٹی حاصل ہوتی ہے البتہ چھوٹی موٹی بھول یا لغزش ہو جاتی ہے جیسے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی ہوئی مگر یہ گناہ نہیں ہوتے۔ چونکہ انبیاء علیہم السلام بڑی حیثیت کے مالک ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کی طرف سے معمولی چیز بھی برداشت نہیں ہوتیں اور انہیں ہر لغزش پر متنبہ کر دیا جاتا ہے۔

مسلم شریف اور دیگر کتب احادیث میں موجود ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر کم و بیش ایک لاکھ چالیس ہزار کے جم غفیر کے سامنے آپ نے فرمایا تھا۔ وَاَنْتُمْ تُسْاَلُوْنَ عَنِّیْ تم سے میرے بارے قیامت کو پوچھا جائے گا۔ فَمَاذَا اَنْتُمْ قَائِلُوْنَ تو بتاؤ تم کیا جواب دو گے تو صحابہ نے عرض کیا قالوا نشهد انك قد بلغت وادیت و نصحت حضور آپ نے امانت پورے طریقے سے ادا کر دی، پیغام خداوندی کو پورے طریقے پر پہنچا دیا اور امت کی خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔ یہ تین الفاظ آپ نے فرمائے۔ اس کے بعد آپ تین بار آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر کہتے تھے اللهم اشهد۔ اللهم اشهد۔ اللهم اشهد اے اللہ! گواہ ہو جا، اے اللہ! گواہ ہو جا، اے اللہ گواہ ہو جا۔ غرضیکہ حضور علیہ السلام نے فریضہ رسالت پورے طریقے پر ادا کر دیا اور اپنی امت کو اس پر گواہ بنا لیا۔

قرآن پاک وحی جلی ہے جس کے الفاظ منجانب اللہ ہیں۔ اس کی تشریح اللہ تعالیٰ نے وحی خفی یعنی حضور علیہ السلام کے ارشادات کے ذریعے کر دی۔ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کے دل میں وہ باتیں ڈال دیں جن کے ذریعے آپ نے قرآن پاک کی توضیح و تشریح کی۔ اس کام کے لیے

اللہ تعالیٰ نے آپ کو پابند کر دیا تھا۔ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ آپ لوگوں پر
واضح کر دیں مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ (سورۃ نحل) جو کچھ بھی اُن کی طرف نازل کیا
گیا ہے۔ اور اس طرح حضور علیہ السلام نے اپنے فرض منصبی کو بطریق احسن انجام
دیا۔ جہاں تک قرآن کے الفاظ کی حفاظت کا تعلق ہے۔ اللہ نے فرمایا
وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔ اور ان الفاظ کی تشریح
کے متعلق بھی فرمایا ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ اس کا بیان
بھی ہمارے ذمہ ہے۔ یہ کام آپ نے اپنے نبی کی زبان سے کرایا اور یہی
نبی کے فرض منصبی کی ادائیگی ہے۔

حفاظتِ جان کی ذمہ داری

باقی یہ بات کہ حضور علیہ السلام کے دشمن بہت زیادہ تھے اور وہ ہر وقت
آپ کو ایذا پہنچانے کے درپئے ہوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی
دیتے ہوئے فرمایا کہ آپ اپنا کام جاری رکھیں اور کفار، مشرکین، یہود و
نصاریٰ سے خوفزدہ نہ ہوں وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ
اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں سے بچائے گا۔ وہ آپ کو ہلاک نہیں کر سکتے۔
حدیث شریف میں آتا ہے کہ ابتدائے اسلام کے زمانہ میں آپ پر ایمان
لانے والے قلیل تعداد میں تھے جب کہ دشمنوں کی اکثریت تھی۔ ایک روز
آپ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا لیت رجلا صالحا یحرسنی اللیلۃ
کاش میرے صحابہ میں سے کوئی ہوتا جو میری حفاظت کے لیے پہرہ دیتا
آپ نے ابھی یہ بات زبان سے نکالی تھی کہ اُدھر سے حضرت سعد بن
ابی وقاصؓ ہتھیار بند ہو کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ حضرت
سعدؓ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں اور ساتویں نمبر پر ایمان لانے والے ہیں
آپ برادری میں حضور علیہ السلام کے ماموں ہوتے ہیں۔ غرض! حضور علیہ السلام
نے حضرت سعدؓ سے فرمایا، کیسے آنا ہوا؟ عرض کیا، میرے دل میں یہ بات
آئی کہ دین کے دشمن چاروں طرف موجود ہیں۔ لہٰذا بہتر ہو کہ میں آپ کے

گھر پہ پہرہ دیں۔ چنانچہ آپ نے اس پہ بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ کبھی حضرت سعدؓ اور کبھی حضرت حذیفہؓ حضور علیہ السلام کی پاسبانی کا فریضہ انجام دیتے رہے پھر ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف رکھتے تھے کہ یہ آیت نازل ہوئی وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور پہریداروں سے کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ نے میری جان کی حفاظت کا ذمہ لے لیا ہے اب پہرے کی ضرورت نہیں لہٰذا تم جا سکتے ہو۔

حفاظتِ جان کی ذمہ داری صرف حضور علیہ السلام کے لیے تھی ایک عام مبلغ کو یہ گارنٹی حاصل نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی تائید ہر نیکی کرنے والے کے شامل حال ضرور ہوتی ہے، مگر اللہ نے حفاظتِ جان کی ذمہ داری قبول نہیں کی۔ چنانچہ اللہ کے دین کے کتنے مبلغ ہوئے جنہیں شہید کر دیا گیا۔ حتیٰ کہ بنی اسرائیل کے ہزاروں انبیاء کو بھی شہید کیا گیا۔ یہاں پہ لوگ ایک اعتراض بھی اٹھاتے ہیں کہ اگر پیغمبر آخرالزماں علیہ السلام کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اٹھائی تھی تو آپ کو تکالیف کیوں آئیں، آپ زخمی ہوئے دانت مبارک شہید ہوئے اور بے شمار ذہنی و جسمانی پریشانیاں لاحق ہوئیں اس کے جواب میں مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی جان کی حفاظت کا ذمہ اٹھایا تھا، تاہم دیگر تکالیف، بیماری، زخم وغیرہ معمول کی چیزیں ہیں جو ہر انسان کا لازمی حصہ ہیں۔ نیک بندوں کو تکالیف پہنچنے میں بھی حکمت ہوتی ہے اس کے ذریعے اللہ ان کی لغزشیں معاف فرماتا ہے اور انہیں اعلیٰ درجے عطا کرتا ہے۔

فرمایا آپ بے خوف ہو کر تبلیغ دین کا کام کرتے رہیں۔ انکار کرنے والوں کی وجہ سے آپ رنجیدہ خاطر نہ ہوں کیونکہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ اللہ تعالیٰ کافروں کے لیے اپنی ہدایت کے دروازے

ہدایت محروم

نہیں کھولتا مسلسل انکار کی وجہ سے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ
اللہ ان کے دلوں پر ٹھپے لگا دیتا ہے۔ دوسرے مقام پر "بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ
عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ" کے الفاظ بھی آتے ہیں۔ ایسے لوگ ہدایت
سے قطعی طور پر محروم ہو جاتے ہیں۔ البتہ معتدل لوگ جو حق کے طلبگار ہوتے
ہیں اور اُن کے دل میں صحیح بات معلوم کرنے کی خواہش موجود ہوتی ہے
اللہ تعالیٰ اُن کے لیے ہدایت کی کوئی سبیل پیدا فرما دیتا ہے اور وہ راہِ راست
پر آجاتے ہیں۔ فرمایا یہود و نصاریٰ مُصر علی الکفر ہیں۔ آپ اِن سے کوئی
توقع نہ رکھیں کیونکہ انہیں ہدایت نصیب نہیں ہوگی۔ ظالموں کے متعلق
بھی اللہ نے فرمایا کہ انہیں ہدایت نہیں حاصل ہوگی۔ دوسرے مقام پر
فاسقوں کے متعلق بھی ہدایت سے محرومی کی خبر دی۔

قومی اور بین الاقوامی نبی

بہرحال فرمایا کہ اے نبی کریم! آپ اپنا حقِ رسالت ادا کرتے رہیں۔
اور اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچاتے رہیں۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ
فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کی نبوت و رسالت دو حیثیت سے ہے۔
آپ نے اپنی تبلیغ کا آغاز اپنے خاندان قریش سے کیا اور پھر اس کا دائرہ
باقی عرب قوم تک وسیع کیا۔ اس لحاظ سے آپ قومی نبی ہیں کہ قریش کی
سعادت آپ کے ساتھ وابستہ ہے اور پھر باقی عرب بھی اس میں شامل ہو
جاتے ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ آپ کی نبوت کا دوسرا مرحلہ یہ
ہے۔ کہ آپ تمام عالم کے لیے ہادی اور راہنما بنا کر بھیجے گئے اور اس لحاظ
سے آپ بین الاقوامی نبی ہیں آپ نے اپنی زندگی میں جہاں تک ممکن تھا
اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچایا۔ اب باقی دنیا تک یہ پیغام پہنچانے کی ذمہ داری
آپ کے صحابہؓ کے واسطے سے ہر اُس فرد اور جماعت پر ہے جو اللہ کی
وحدانیت اور حضور علیہ السلام کی رسالت پر ایمان لایا۔ چنانچہ یہ فریضہ امت
محمدیہ کے افراد تا قیامت انجام دیتے رہیں گے اور پوری دنیا کو اللہ

کے اس آخری پروگرام سے روشناس کراتے رہیں گے تبلیغ دین کا کام کرنے والی جماعتیں اور افراد اگر خلوصِ نیت کے ساتھ اس مشن کو آگے بڑھائیں تو اللہ ان کی بھی اسی طرح مدد فرمائے گا جس طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ اور بعد میں آنے والے لوگوں کی مدد فرمائی۔

ملوکیت اور ڈکٹیٹرشپ

اس وقت تبلیغ دین کے سامنے ملوکیت اور ڈکٹیٹرشپ دو بڑی رکاوٹیں ہیں۔ یہ ہمیشہ سے رہی ہیں اور آج بھی موجود ہیں۔ پہلے زمانے میں اسلام کا مقابلہ قیصر اور کسریٰ کی ملوکیت سے تھا اور آج امریکہ اور روس جیسی بڑی طاقتیں ان کی جانشین ہیں آج اہل حق کو ان طاقتوں کے ظلم و استبداد کا مقابلہ کرنا ہے۔ مگر جب تک جماعت حقہ کا کردار مضبوط نہ ہو اور ارادے میں پختگی موجود نہ ہو دشمن کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ اب مسلمانوں میں نہ اپنے مشن سے دلی لگاؤ ہے۔ نہ یہ علم سے روشناس ہیں اور نہ کردار بلند ہے، تو دشمنانِ دین کا مقابلہ کیسے کیا جاسکتا ہے؟ فکر بلند، اعتقاد درست اور عمل صحیح ہو تو ان طاغوتی طاقتوں کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے مگر آج ان علاقوں کے مسلمان سانس بھی نہیں لے سکتے، اُن کے دم گھٹ چکے ہیں روس نے کتنے مسلم اکثریت کے علاقوں پہ قبضہ کر کے مسلمانوں کو اقلیت میں بدل دیا۔ چین کے ایک صوبہ میں مسلمانوں کی آبادی سات کروڑ تھی مگر اب ایک کروڑ سے بھی کم رہ گئے ہیں کچھ ختم کر دیئے گئے باقی تتر بتر ہو گئے۔ مسلمانوں کی آبادی پر کنٹرول کیا جاتا ہے اور انہیں بڑھنے سے روکا جاتا ہے۔ ان حالات میں وہ تبلیغ دین کا فریضہ کیسے انجام دے سکتے ہیں۔

ملوکیت اس سے بھی بڑی لعنت ہے۔ عیسائی اور یہودی کہلانے والے اگرچہ خدا تعالیٰ کا تصور بھی رکھتے ہیں مگر حقیقت میں یہ کچھ بھی نہیں۔ یہ بدترین قسم کے رہبر بیٹے ہیں، خود غرضی، عیاشی اور ظلم ان کا وطیرہ ہے۔ اسلام کے ساتھ نفرت جس قدر روس کو ہے اسی قدر امریکہ کو ہے جس

طرح روس مسلمانوں کو ترقی کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا، اسی طرح امریکہ بھی مسلمانوں کو پنپتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ امریکہ کو عربوں، مصریوں یا لبنانیوں کی ترقی سے کوئی دلچسپی نہیں، وہ جس دوستی کا دم بھرتا ہے محض اپنے مفاد کے لیے۔ یہ لوگ انسانیت کے دشمن اور جہنم کے کندہ ناتراش ہیں۔ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے بڑے وسائل اور بڑی تیاری کی ضرورت ہے۔ بہرحال اللہ نے اپنے نبی کو تسلی دی کہ کفر پر اڑنے والے ہدایت سے فیضیاب نہیں ہو سکتے آپ ان کی زیادہ فکر نہ کریں بلکہ اپنے مشن پہ رواں دواں رہیں۔

کتب سماویہ سے روگردانی

آگے اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب سے خصوصی خطاب فرمایا ہے قُلْ اے پیغمبر! آپ کہہ دیں يَآ أَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ اے اہل کتاب تم کسی صحیح نظریے پر نہیں ہو۔ نہ تمہارا عقیدہ درست ہے اور نہ کردار حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْإِنْجِيْلَ وَمَآ أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ جب تک تم تورات و انجیل کو قائم نہیں کر دیتے اور اس چیز کو قائم نہیں کر دیتے جو تمہاری طرف تمہارے پروردگار کی جانب سے نازل کی گئی ہے تب تک تم راہ راست پر نہیں آ سکتے ظاہر ہے کہ اگر تورات و انجیل کو صدقِ دل سے تسلیم کر لیں تو اِن کتب میں تو نبی آخر الزمان علیہ السلام اور اللہ کی آخری کتاب اور آخری امت کی پیشن گوئیاں موجود ہیں لہٰذا ان سب کو ماننا پڑے گا۔ وہ تو موجود ہے کہ بنی اسرائیل کی طرح بنی اسماعیل کو بھی دنیا میں عروج حاصل ہو گا۔ اگر اس چیز کو تسلیم کر لیں تو انہیں اپنی فوقیت ختم کرنا پڑتی ہے اور یہی اُن کے اقتدار کی موت ہے لہٰذا وہ جان بوجھ کر دینِ حق کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں اسی لیے اللہ نے فرمایا کہ اے اہل کتاب تم کسی چیز پر نہیں ہو جب تک کہ تمام کتب سماویہ پر ایمان نہ لے آؤ۔

اہل کتاب کی یہی خامی آج مسلمانوں پر بھی صادق آتی ہے یہ بھی اسلام کے دعوے دار ہیں مگر حقیقت میں یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح لَسْتُمْ عَلٰى

شَیۡءٍ کی منہ بولتی تصویر ہیں۔ آج مسلمانوں نے قرآن کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے۔ کفر کے شعائر اور بدعات کو دین کا درجہ دے دیا ہے، رسم و رواج، قبر پرستی اور بدعات کو دین بنا لیا ہے۔ ان کا حال بھی یہ ہے کہ جب تک قرآن پاک کے احکام پر من وعن عمل نہیں کریں گے اسے اپنا راہنما تسلیم نہیں کریں گے، یہ کسی چیز پر نہیں ہیں، اہل کتاب اور مسلمانوں میں کوئی فرق نہیں۔

سرکشی اور کفر میں اضافہ

اللہ نے فرمایا وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُم مَّا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا اہل کتاب کا حال یہ ہے کہ جب قرآن پاک کی آیات نازل ہوتی ہیں تو ان میں سے اکثریت کی سرکشی اور کفر میں اضافہ کا باعث بنتی ہیں۔ وہ اللہ کے کلام سے نصیحت پکڑنے کی بجائے مزید سرکش اور باغی ہو جاتے ہیں۔ یہ ان کی بدبختی کی علامت ہے۔ اگر انسان صاحبِ صلاحیت ہو تو اسے حق کی پہچان میں کوئی دقت پیش نہیں آنی چاہیئے مگر اللہ کی طرف سے نازل ہونے والی ہدایت سے یہ لوگ الٹا اثر قبول کرتے ہیں اور مزید سرکشی اور کفر میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ فرمایا فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ اے پیغمبر (علیہ السلام)! اہل کتاب کی اس روگردانی پر افسوس نہ کریں۔ آپ اپنا فریضہ ادا کرتے رہیں اور انکی ہدایت کے لیے پریشان نہ ہوں۔ نبی علیہ السلام کو خطاب کر کے عام مبلغین اسلام کو بھی تسلی دی گئی ہے۔ کہ آپ اپنا کام کرتے رہیں اور جو شخص کفر پر مصر ہے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ اللہ تعالیٰ خود اس کی گرفت کرے گا اور پھر وہ اس کی سزا سے بچ نہیں سکے گا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـُٔوْنَ وَالنَّصٰرٰى
مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا
فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۹﴾
لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَاَرْسَلْنَآ
اِلَيْهِمْ رُسُلًا ؕ كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا
لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَفَرِيْقًا
يَّقْتُلُوْنَ ﴿۷۰﴾ وَحَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا
وَصَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا
وَصَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا
يَعْمَلُوْنَ ﴿۷۱﴾

ترجمہ :۔ بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے اور جو یہودی
ہوئے اور صابی فرقے والے اور نصرانی جو شخص ان میں
سے ایمان لایا اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور اُس
نے اچھا عمل کیا پس نہ خوف ہو گا اُن پر اور نہ وہ
غمگین ہوں گے ﴿۶۹﴾ البتہ تحقیق ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ
عہد لیا اور ہم نے اُن کی طرف بہت سے رسول بھیجے
جب بھی اُن کے پاس کوئی رسول آیا ایسی چیز کو لے کر

جس کو ان کے نفس نہیں چاہتے تھے تو انہوں نے ایک گروہ کو جھٹلایا، اور ایک گروہ کو قتل کر ڈالا (۷۰) اور انہوں نے یہ خیال کیا کہ کوئی فتنہ نہیں ہوگا، پھر وہ اندھے اور بہرے ہو گئے، پھر توبہ قبول کی اللہ نے ان کی پھر اندھے اور بہرے ہوئے بہت سے ان میں سے اور اللہ دیکھتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں (۷۱)

ربط آیات

گذشتہ درس میں پیغمبر علیہ السلام کو تاکیداً فرمایا گیا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام لوگوں تک پہنچائیں اور لوگوں کی طرف سے خوف نہ کھائیں، اللہ خود آپ کو دشمنوں سے محفوظ رکھے گا۔ پھر اہل کتاب کے متعلق فرمایا کہ اُن سے کہ دیں کہ تمہارا دین اور مذہب کچھ نہیں۔ جب تک تم کتب سماویہ کو قائم نہ کرو۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے قرآن پاک کا جو حصہ نازل ہوتا ہے وہ اُن اہل کتاب کے لیے مزید سرکشی اور کفر کا باعث بنتا ہے۔ نیز فرمایا کہ آپ ان کی حالت پر افسوس نہ کریں۔ بلکہ اپنا فریضہ تبلیغ دین ادا کرتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ خود ان لوگوں کو سزا دے گا۔

اب آج کے درس میں اہل کتاب اور دیگر فرقوں کے لیے ترغیب ہے کہ ان کی فلاح صرف ایمان اور نیک اعمال پر ہے، کامیابی کا مدار کوئی فرقہ یا پارٹی نہیں۔ تمام لوگوں کا فرض ہے کہ وہ ایمان اختیار کرنے کے بعد اعمال صالحہ پر کاربند ہو جائیں، اسی میں سب کی نجات ہے اس کے ساتھ ساتھ بنی اسرائیل کی مذمت بھی بیان کی گئی ہے۔ کہ جب بھی ان کے پاس اللہ کے رسول آئے انہوں نے ان کے ساتھ بدسلوکی کی، اُن کو جھٹلایا اور بعض کو قتل کر دیا۔

اہل ایمان

ارشاد ہوتا ہے اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کے بعد جو اللہ تعالیٰ اور آپ کی رسالت پر ایمان لائے اللہ تعالیٰ پر ایمان

لانے کا مطلب یہ ہے کہ اُس کی وحدانیت کو مانے، اُس کی صفات کمال پر یقین اور

اُس کے اسمائے مبارکہ کی تصدیق کرے۔ یہاں پر ایمان کا اجمالاً ذکر کیا گیا ہے جب کوئی شخص اللہ پر ایمان لاتا ہے، تو اُسے اُس کے رسولوں پر بھی ایمان لانا ہوگا کیونکہ رسولوں کو بھیجنا اللہ تعالیٰ کی صفات میں شامل ہے اور جو اللہ کی وحدانیت پر ایمان لائے گا وہ اس کی صفات کو بھی مانے گا، لہٰذا اللہ پر ایمان لانے میں رسولوں پر ایمان لانا بھی شامل ہے۔ سورۃ بقرہ کی آخری سے پہلی آیت میں موجود ہے کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ گویا ایمان باللہ میں اس کے ملائکہ، کتب اور رسولوں پر ایمان لانا بھی شامل ہے۔ رسولوں کی بعثت کے متعلق خاص طور پر فرمایا رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ (النساء) ہم نے رسولوں کو بھیجا جو کہ بشارت دینے والے اور ڈرانے والے ہیں۔ بعض لوگ تقدیر کا انکار کرتے ہیں مگر یہ بھی اللہ کی صفات میں شامل ہے۔ جیسے فرمایا "خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا" (فرقان) اُس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اس کا اندازہ ٹھہرایا۔ جو شخص تقدیر کا انکار کرے گا وہ بھی ایمان سے خالی سمجھا جائے گا۔

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ جو شخص جزائے عمل کا انکار کرے، وہ بھی کافر ہے۔ اور اگر کسی کا اعتقاد یہ ہو کہ اللہ نے پیدا تو کیا ہے مگر اُس نے انسانوں کی راہنمائی کے لیے نہ کوئی رسول بھیجا اور نہ کتاب نازل کی ہے اور نہ وہ انسانوں پر گرفت کرتا ہے، تو پھر بھی کافر ہوگا، کیونکہ قرآن پاک میں صریحاً موجود ہے "وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا" (النساء) یعنی جو اللہ تعالیٰ، اس کے ملائکہ، کتابوں، رسولوں اور یوم جزا کا انکار کرتا ہے، وہ گمراہی میں دور جا پڑا۔ ملائکہ اللہ کے مخبر ہیں، وہ خالق اور مخلوق کے درمیان پیغام رسانی کا ذریعہ ہیں۔ لہٰذا اُن پر ایمان لانا بھی لازمی ہے۔ یہ سب چیزیں اجزائے ایمان ہیں۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے کہیں ایمان

کا اجمالاً ذکر کیا ہے اور کہیں تفصیلاً۔ ایمان کی جزیات میں سے کسی ایک جزء کا انکار بھی مکمل انکار کے مترادف ہے تو یہاں پہ فرمایا کہ بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے۔ اور اس سے مراد خالی دعوے ایمان نہیں بلکہ جو صحیح طور پہ تمام اجزا پہ ایمان لانے گا اور پھر آگے اعمال صالحہ کا ذکر ہے۔

یہودی فرقہ

فرمایا جو لوگ ایمان لائے وَالَّذِیْنَ هَادُوْا اور وہ لوگ جو یہودی ہوئے یعنی جو لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں اُن کی شریعت پہ ایمان لائے۔ آپ کی قوم کا نام یہودی دو وجوہات کی بنا پہ ہے پہلی اور زیادہ صحیح وجہ یہ ہے کہ جب امت کے لوگوں سے غلطی ہوگئی۔ انہوں نے کوہ طور پر اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تو اللہ تعالیٰ نے ستر آدمیوں کو ہلاک کر دیا، پھر موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور عرض کیا اِنَّا هُدْنَآ اِلَیْكَ (اعراف) اے اللہ ہم تیری طرف رجوع کرتے ہیں تو ہماری توبہ قبول فرمالے۔ چنانچہ لفظ هُدْنَا سے ان کا لقب یہودی مشہور ہو گیا بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ یہودی چونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بڑے بیٹے یہوداہ کی اولاد سے ہیں اس لیے انہیں یہودی کہا جاتا ہے۔ بہرحال فرمایا کہ خواہ وہ اہل ایمان ہوں یا یہودی ہوں۔

صابی فرقہ

وَالصّٰبِئُوْنَ اور جو صابی فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں اس فرقے کا نام قرآن پاک میں متعدد بار آیا ہے مگر اس گروہ کے ٹھیک ٹھیک تعین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ستاروں میں کرشمہ ماننے والے اور اُن کی پرستش کرنے والے صابی ہیں اور بعض کی تحقیق یہ ہے کہ یہ فرقہ ہندوستان کے برہمو سماج فرقہ سے ملتا جلتا فرقہ ہے۔ انہوں نے مختلف مذاہب سے اچھی اچھی چیزوں کا انتخاب کر کے ایک نیا مذہب ایجاد کر لیا ہے۔ اس مذہب کی اپنی بنیاد کچھ نہیں۔ بنگال کا نوبل انعام یافتہ فلسفی ٹیگور اس فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ ہندوؤں میں بہت سے فرقے

ہیں۔ جیسے جین۔ سناتن دھرمی، آریہ سماجی وغیرہ مگر یہ سب کے سب مشرک ہیں۔
آریہ سماجیوں نے شرک سے بچنے کی بہت کوشش کی مگر پھر بھی وہ تین
معبودوں پر آکر ٹھہر گئے۔ عیسائیوں کی طرح وہ بھی تثلیث کے چکر میں پھنس
گئے ہیں۔ اُن کے تین خداؤں میں سے مادہ اور روح قدیم ہیں اور تیسرے
خدا پرماتما جی مہاراج ہیں۔ بہرحال صابی فرقہ بھی ان سے ملتا جلتا ہے۔

امام جلال الدین سیوطیؒ نے بھی لفظ صابی کی تحقیق کی ہے وہ اپنی کتاب
"حسن المحاضرۃ فی احوال المصر والقاھرہ" میں رقمطراز
ہیں۔ کہ حضرت شیث علیہ السلام کی اولاد میں سے جو تھے پانچویں درجے پر اُن
کا پڑپوتا ہرد نامی تھا۔ اس کے ہاں اخنوخ پیدا ہوئے۔

جنہیں ہرمس بھی کہا جاتا ہے۔ قرآنِ پاک نے اُن کا نام ادریس علیہ السلام
بتایا ہے۔ آپ کو چالیس سال کی عمر میں نبوت ملی اور اُن پر کئی صحیفے بھی نازل
ہوئے۔ آگے اُن کی اولاد میں صابی نامی ایک شخص ہوا، جس کے نام پر صابی
مذہب جاری ہوا۔ ابتداً یہ مذہب صحیح تھا مگر دیگر مذاہب کی طرح بعد میں
اس میں بھی بگاڑ پیدا ہوگیا۔ اُس وقت کے صابی مذہب کے چار بنیادی اصول
تھے یعنی توحید، طہارت، نماز اور روزہ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دور
تک بگڑتے بگڑتے اس مذہب کے لوگ ستارہ پرستی میں ڈوب چکے تھے
اصل توحید غائب ہو چکی تھی اور شرک کا دور دورہ تھا۔ پھر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام
کا زمانہ آیا تو صابی دور ختم ہو کر دورِ حنیفیت کا آغاز ہوا۔ "قُلْ بَلْ مِلَّةَ
إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ" (بقرہ)
بعض لوگ کہتے ہیں کہ صابی زبور کی تلاوت کرتے تھے اور بعض کہتے ہیں
کہ ان کا تعلق ستارہ پرستی کے ساتھ تھا، اسی لیے بعض لوگ صابی کا ترجمہ
ستارہ پرست کر دیتے ہیں بہرحال یہ بھی ایک باقاعدہ فرقہ تھا جس کا ذکر یہاں
پر اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔

یہاں پر امام جلال الدین سیوطیؒ کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ آپ نویں اور دسویں صدی ہجری کے حافظ الحدیث ہیں۔ آپ کو ایک لاکھ حدیثیں سند اور متن کے ساتھ زبانی یاد تھیں آپ سے پہلے ہر دور میں ہزاروں حافظ الحدیث ہوئے ہیں مگر آپ کے بعد کوئی حافظ الحدیث دنیا میں نہیں ملا، جسے ایک لاکھ حدیثیں ازبر ہوں۔ البتہ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کو تیس ہزار حدیثیں زبانی یاد تھیں۔ ہمارے دارالعلوم دیوبند کے سابق صدر مدرس مولانا انور شاہ کشمیریؒ کو مکمل بخاری شریف نوکِ زبان تھی مگر حافظ الحدیث وہ بھی نہ تھے۔ آپ (امام جلال الدین سیوطیؒ) کی عمر تو ساٹھ پینسٹھ سال سے زیادہ نہیں مگر آپ نے پانچسو سے زیادہ ضخیم کتابیں لکھی ہیں۔ اللہ نے بے پناہ صلاحیت سے نوازا تھا حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ بھی ہمارے اسی دور میں ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عمر بھی اسی یا چوراسی سال عطا کی۔ آپ کی چھوٹی موٹی تمام تصانیف پندرہ سو کے قریب ہیں جن میں تفسیر، حدیث، قرأت، تجوید، تصوف، سلوک وغیرہ کے مضامین شامل ہیں آپ نے کئی شرحیں بھی لکھی ہیں یہ اللہ کی خاص توفیق ہے جسے عطا کر دے۔ آپ ہر روز دس پاروں کی تلاوت بھی فرماتے تھے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کا بھی یہی معمول تھا۔ یہی دستور امام محمدؒ کا بھی تھا۔ آپ بھی ہر روز دس پارے تلاوت کرتے تھے۔

عیسائی فرقہ

اہل ایمان، یہودی اور صابی فرقہ کے بعد فرمایا وَالنَّصٰرٰی اور نصرانی فرقہ والے بھی۔ نصاریٰ، نصرانی کی جمع ہے اور اسکی بھی دو وجوہات تسمیہ بیان کی جاتی ہیں۔ نصرانی نصرت سے ہے جس کے معنیٰ امداد کرنے کے ہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ جب لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تکلیف پہنچاتے تو آپ لوگوں کو مخاطب فرما کر کہتے "مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ" (سورۃ صف) اللہ کے راستے میں کون میری مدد کرے گا" قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ تو حواریوں نے کہا کہ ہم اللہ کے

راستے میں مدد کے لیے تیار ہیں۔ چنانچہ اسی لفظ سے اُن کو نصاریٰ کا نام دیا گیا یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مدد کرنے والے۔ مفسرین اس نام کی دوسری وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ جس بستی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام رہتے تھے اُس بستی کا نام ناصرہ تھا۔ چنانچہ اس بستی کی نسبت سے اس گروہ کو نصرانی کا لقب دیا گیا بالکل اسی طرح جس طرح شام کے رہنے والے کو شامی یا مدینے کے رہنے والے کو مدنی کہا جاتا ہے۔

مذاہب کا بگاڑ

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان، یہودی، صابی اور نصرانی فرقے کا ذکر کیا ہے، البتہ سورۃ حج میں اللہ تعالیٰ نے بعض دیگر فرقوں کا تذکرہ بھی کیا ہے اور مجوسیوں اور مشرکوں کو بھی اس فہرست میں شامل کیا ہے۔ اہل ایمان کے علاوہ باقی فرقے اپنے اپنے ابتدائی دور میں صحیح دین پر تھے مگر بعد میں ان میں بگاڑ پیدا ہوتا چلا گیا اور یہ اپنے اصل دین سے ہٹ کر کفر، شرک اور گمراہی میں مبتلا ہو گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور تورات پر ایمان لانے والے اولین لوگ بالکل صحیح تھے مگر بعد میں آنے والوں نے تورات میں تحریف کر کے اصل چیزیں نکال دیں اور گمراہی کی باتیں داخل کر دیں اسی طرح انجیل بھی اللہ کی نازل کردہ کتاب تھی مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد یہ کتاب بھی تحریف کا شکار ہو گئی اور اس کے ماننے والے کفر اور شرک میں مبتلا ہو گئے اس کا تذکرہ قرآن میں موجود ہے۔ ان بگڑے ہوئے ادیان کو ماننے والے یہودی اور نصرانی کہلاتے ہیں۔ صابی فرقے کے متعلق بھی عرض کر دیا ہے کہ اس کے اصل چار اصول دین حق پر مبنی تھے مگر بعد کے آنے والوں نے اس میں طرح طرح کی خرابیاں داخل کر دیں اور اس میں ستارہ پرستی آگئی جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کی بجائے دین حنیف نازل فرمایا۔

نزول قرآن کے زمانہ میں شرک تو پوری دنیا میں پھیلا ہوا تھا۔ عرب اور ہندوستان شرک میں یکساں طور پر ملوث تھے۔ مجوسی یعنی آتش پرست

بھی ہزاروں سال سے پہلے آسکے تھے اور آج بھی موجود ہیں۔ یہ لوگ آگ میں کرشمہ مانتے ہیں اور اُسکی پوجا کرتے ہیں۔ اِن کو پارسی بھی کہا جاتا ہے۔ بمبئی اور کراچی میں آج بھی پائے جاتے ہیں۔ تاہم اِن کے اصل مذہب کا کچھ پتہ نہیں چلتا کہ یہ کیا تھا اور پھر کیونکر کس طرح موجودہ مجوسی فرقہ بن گیا۔ ہندوستان سے پیدا ہونے والے بدھ مذہب کی بھی اصلی تاریخ نامعلوم ہے۔ تین ہزار سال پرانا یہ مذہب شرق الہند، چین، ویت نام، تبت وغیرہ میں پایا جاتا ہے۔ اسی طرح کرشن جی مہاراج کے اصل مذہب کے متعلق بھی کچھ علم نہیں کیونکہ ہندوستان کی تاریخ تو بالکل نایاب ہے، حالانکہ یہودیوں، ایرانیوں اور پارسیوں کی تاریخ کا کچھ حصہ ملتا ہے جس سے ان کے اصل مذہب کا کچھ نہ کچھ پتہ چلتا ہے مگر ہندو مذہب اس معاملہ میں بالکل تاریکی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ کرشن جی مہاراج اور رام چندر پانچ ہزار سال پہلے ہوئے ہیں مگر ان کی اصل تعلیمات کے متعلق کوئی سند نہیں ملتی۔ اُن کی طرف منسوب کیے جانے والا ہندو مذہب تو بالکل شرک ہے مگر یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ کرشن اور رام چندر کا بھی یہی مذہب تھا یا کچھ اور تھا۔

اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان

الغرض! اللہ نے ان تمام فرقوں کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ان میں سے جو بھی اللہ تعالیٰ اور یوم جزا پر ایمان لایا۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا، اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اُس کی ذات، اُسکی صفات، اس کے اسماء پر ایمان لایا جائے۔ پھر اس کے رسولوں اور کتابوں کو برحق تسلیم کیا جائے اور اس کے فرشتوں پر ایمان لایا جائے جو پیغام رسانی کے لیے سفیر ہیں۔ گویا ایمان کے تمام اجزا پر مکمل یقین کیا جائے اور پھر سب سے آخر میں جزائے عمل یعنی قیامت کے دن مکمل ایمان ہو کہ ایک وقت آنے والا ہے جب اللہ کی بارگاہ میں ہر عمل کا محاسبہ ہوگا۔ گویا ایمان اور جزائے عمل لازم و ملزوم ہیں اس کے بغیر

ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ حدیث جبرائیل[1] میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔ ایمان، اسلام اور احسان کے متعلق سوال کے بعد جبرائیل علیہ السلام کا اگلا سوال یہ تھا۔ متی الساعۃ حضرت! یہ بتایئے قیامت کب آئے گی، یعنی جزائے عمل کب واقع ہوگی حضور علیہ السلام نے یہ جواب دیا تھا کہ قیامت کے آنے کے وقت کے متعلق جس طرح تجھے معلوم نہیں اسی طرح مجھے بھی معلوم نہیں۔ اللہ ہی کو اس کا علم ہے کہ قیامت کب آنے گی۔ مگر آئے گی یقیناً حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بعض نشانیاں بیان فرما دیں۔ محدثین کرام فرماتے ہیں کہ پورے دین کا خلاصہ ایمان۔ اسلام اور احسان میں ہے اور ان سب کا نتیجہ جزائے عمل ہے لہٰذا قیامت کے دن پر ایمان لانا بھی جزو ایمان ہے۔

جزائے عمل

فرمایا اِن تمام جزیات پر محض زبانی ایمان لے آنا ہی کافی نہیں بلکہ وَعَمِلَ صَالِحًا اُس کے ساتھ نیک عمل کرنے کی شرط بھی موجود ہے ایمان لانے کے بعد جو شخص اچھا عمل کرے گا، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، جہاد صدقہ خیرات وغیرہ اعمال حسنہ بھی انجام دے گا اور اس کے ساتھ ساتھ اعمال قبیحہ یعنی کفر، شرک، نفاق، بدعت، ریاکاری، ظلم، تعدی، زنا، چوری وغیرہ سے اجتناب کرے گا، اس کے لیے جزا کا ذکر آگے کیا گیا ہے۔ غرضیکہ ہر وہ عمل، عملِ صالح ہے جس کو عقلِ سلیم بھی اچھا سمجھتی ہے اور ہر وہ عمل عملِ قبیح ہے جو عقلِ سلیم کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔

غرضیکہ! فرمایا اہل ایمان ہوں یا یہودی۔ صابی ہوں یا نصاریٰ ان میں سے، جو بھی اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان لاکر صحیح راستے پر گامزن رہا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ اُن پر کوئی خوف نہیں ہوگا وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ جس شخص کی فکر پاک ہے اور وہ اعمال صالحہ انجام دے رہا ہے اُس کو آنے والے واقعات سے کوئی خطرہ نہیں ہوگا اور نہ وہ گذشتہ واقعات پر غمگین ہوگا۔ غمگین تو وہ ہوگا جو ایمان سے

[1] بخاری ص ۱۲ ج ۱ (فیاض)

خالی ہوگا۔ اور جس نے بُرے اعمال انجام دیئے ہوں گے۔ وہ اس وقت کفِ افسوس ملے گا کہ اللہ تعالیٰ نے زندگی میں موقع دیا صحت و تندرستی جیسی عظیم نعمت دی عقل و شعور بخشا، ہدایت کے تمام سامان مہیا کیے مگر وہ ان ذرائع سے کچھ فائدہ نہ اٹھا سکا، ایسے لوگ فی الواقع غمگین ہوں گے۔

معیارِ نجات

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کوئی شخص کسی بھی مذہب اور فرقے سے تعلق رکھتا ہو اصل چیز ایمان اور عملِ صالح ہے۔ جس کا ایمان درست ہے اور وہ عمال صالحہ بھی انجام دیتا ہے، نجات اُسی کا حق۔ ہے۔ محض کسی فرقے کے ساتھ نسبت ہونا نجات کا معیار نہیں ہے یہودی اور نصرانی کہتے تھے۔ لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْنَصٰرٰى (البقرۃ)

یعنی یہودیوں اور نصرانیوں کے علاوہ کوئی شخص جنت میں نہیں جائے گا۔ مگر اللہ نے فرمایا بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ (البقرہ) نجات اس کو نصیب ہوگی جس نے اللہ تعالیٰ کی مکمل فرمانبرداری اختیار کی اور وہ نیک اعمال انجام دینے والا ہو۔

خودساختہ اور باطل معیارِ نجات اب اِس آخری امت میں بھی رائج ہو چکا ہے، آج بھی لوگوں کا ایمان۔ ہے کہ امام حسینؓ کا نام لو اور تعزیہ نکال لو، تو جنت تمہارے مقدر میں ہے دوسرے لوگ کہتے ہیں۔ کہ محض محفلِ میلاد منعقد کرنے سے ہی بیڑا پار ہو جائے گا، کوئی کہتا ہے فلاں بزرگ کے ہاتھ میں ہاتھ دے دو یا فلاں بزرگ کا دامن پکڑ لو تو سیدھے جنت میں چلے جاؤ گے۔ کوئی عرس کرانے اور قوالی کرانے کو ہی نجات کا معیار سمجھتا ہے۔ مگر اللہ نے فرمایا۔ یہ کامیابی کے نہیں بلکہ ناکامی کے اسباب ہیں۔ جب تک صحیح ایمان اور عملِ صالح نہیں ہوگا، نجات کی اُمید محض سراب ہوگا۔

خواہشاتِ نفسانیہ

اصولِ نجات بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے

کردار کو بطور مثال پیش کیا ہے کہ دیکھو! لَقَدْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا وَاَرْسَلْنَآ اِلَیْهِمْ رُسُلًا اور اُن کی طرف رسول بھیجے۔ كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُهُمْ جب بھی ان کے پاس کوئی رسول ایسی چیز لے کر آیا جو کہ ان کے نفس پسند نہیں کرتے تھے فَرِیْقًا كَذَّبُوْا وَ فَرِیْقًا یَّقْتُلُوْنَ تو انہوں نے انبیاء کے ایک گروہ کو جھٹلایا، اور ایک گروہ کو قتل کر دیا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام اور زکریا علیہ السلام انہی بنی اسرائیلیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ اس سے پہلے وہ سینکڑوں نبیوں کو قتل کر چکے تھے مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ اصل بیماری خواہشات نفسانیہ ہے اگر یہ پوری ہو گئی تو مان لیا ورنہ انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ خواہش نفسانی بدترین معبود ہے جس کی جگہ جگہ پوجا ہو رہی۔ تمام اقوامِ عالم اور خود مسلمان اس بیماری میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ اللہ نے فرمایا کہ اُس کا نبی تو پاکیزہ چیز لے کر آیا ہے لہٰذا اپنی خواہشات کو ترک کر کے اُس کے دامن سے وابستہ ہو جاؤ۔ اُس کے لائے ہوئے دین کی اتباع کرو گے تو نجات حاصل ہو گی، ورنہ نہیں۔

فرمایا وَحَسِبُوْۤا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ یہ بدعقیدہ اور بدکردار لوگ خیال کرتے ہیں کہ وہ جو چاہیں کرتے پھریں، کوئی فتنہ نہیں ہوگا، اور پھر اسی زعم میں فَعَمُوْا وَ صَمُّوْا وہ اندھے اور بہرے ہو گئے۔ نہ اُن کی آنکھیں حق بات دیکھنے کے لیے تیار ہوئیں اور نہ اُن کے کان حق کا پیغام سننے کے لیے وا ہوئے۔ پھر اس کے بعد پے در پے اللہ کے نبی آتے رہے اور انہیں حق کا راستہ دکھانے کی کوشش کرتے رہے حتیٰ کہ مسیح علیہ السلام کا دور آ گیا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ اللہ تعالیٰ انہیں بار بار توبہ کا موقع دیتا رہا ثُمَّ عَمُوْا وَ صَمُّوْا كَثِیْرٌ مِّنْهُمْ

پھر بھی ان میں سے اکثر اندھے اور بہرے ہی رہے۔ اسی مضمون کو اللہ تعالیٰ نے سورۃ حج میں یوں بیان فرمایا ہے "فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ" فرمایا اکثر و بیشتر انکی ظاہری آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ ان کے دل کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ دراصل ان کی بصیرت ہی خراب ہو جاتی ہے۔ انسان حق کو قبول ہی نہیں کرتا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ انسان پھر نہ معروف کو معروف سمجھتا ہے اور نہ منکر کو منکر سمجھتا ہے۔ اُس کو وہی چیز اچھی معلوم ہوتی ہے جو اُس کی خواہش کے مطابق ہو۔ اُس کے نزدیک نیکی اور بدی کا معیار نفسانی خواہش کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اندھا اور بہرہ ہونے کا یہی مطلب ہے۔

فرمایا "وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ" اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔ وہ ہر فرقے اور پارٹی کا محاسبہ خود کریگا اور ان سے دریافت کریگا کہ حق بات کو چھوڑ کر تم نے خواہشات نفسانیہ کا اتباع کیوں کیا۔ اور میری رسالت کو وہ ہدایت کو کیوں تسلیم نہ کیا میں نے تو پہلے دن تمہیں آگاہ کر دیا تھا کہ میرے نبی آئیں گے اور وہ ہدایت کا پیغام تمہیں پہنچائیں گے اور پھر "فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ" (البقرۃ) جو میری ہدایت پر عمل کریں گے وہی خوف و خطر سے مامون ہوں گے اور وہی فلاح پانے والے ہوں گے مگر تم نے دوسرا راستہ اختیار کیا تو تمہارے تمام اعمال اللہ کی نگاہ میں ہیں، وہ خود وقت آنے پر محاسبہ کریگا۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۷۲﴾ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾ اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۷۴﴾

وقف لازم

ترجمہ: البتہ تحقیق کفر کیا اُن لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ بیشک اللہ تعالیٰ وہ مسیح ابن مریم ہی ہے ۔ حالانکہ مسیح (علیہ السلام) نے کہا ، اے بنی اسرائیل ! اللہ کی عبادت کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے ۔ بیشک جس شخص نے شرک کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ، تحقیق حرام کر دی اللہ نے اس پر جنت ۔ اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے ۔ اور نہیں ہے ظلم کرنے والوں کا کوئی مددگار ﴿۷۲﴾ البتہ تحقیق کافر ہوئے وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ بیشک اللہ تیسرا ہے تینوں میں ۔ حالانکہ نہیں ہے کوئی

الہ مگر ایک ہی الہ ۔ اور اگر یہ باز نہ آئیں گے اُس چیز سے
جو کہتے ہیں تو البتہ ضرور چھوئے گا اُن لوگوں کو جنہوں نے کفر
کیا ان میں سے عذابِ الیم (۷۳) یہ توبہ کیوں نہیں کرتے
اللہ کے سامنے اور کیوں نہیں اس سے بخشش طلب کرتے
حالانکہ اللہ تعالیٰ بہت بخشش کرنے والا اور از حد مہربان ہے (۷۴)

ربطِ آیات

اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی خرابیاں بیان کرتے ہوئے اُن کے تعصب عناد، سرکشی، تحریف، انبیاء کی مخالفت، حق پرستوں سے مخاصمت اور فساد فی الارض کا ذکر کیا۔ پھر پیغمبر علیہ السلام اور آپ کے متبعین کو تسلی بھی دی کہ آپ تبلیغ دین کا کام کرتے رہیں اور کوئی خطرہ محسوس نہ کریں، اللہ تعالیٰ خود تمہاری حفاظت کریگا۔ اللہ جل جلالہ نے یہ بھی حکم دیا کہ اہل کتاب کو برملا کہ دیں کہ جب تک وہ تورات، انجیل اور اللہ کی نازل کردہ ہدایت کو قائم نہیں کرتے اُن کا عقیدہ باطل ہے اور اُن کے دین کی کچھ حیثیت نہیں اللہ نے یہ بھی بتلا دیا کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے آنے والا ہر حکم اہل کتاب کی سرکشی اور کفر میں مزید اضافہ کرے گا، لہٰذا آپ ان پر زیادہ افسوس کرنے کی بجائے اپنے فریضۂ منصبی کو بجا لانے کی طرف زیادہ توجہ دیں۔

اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے اس باطل زعم کا بھی ذکر کیا کہ یہ لوگ اخروی نجات کو کسی خاص فرقے کے لیے مخصوص قرار دیتے ہیں۔ اس کی تردید کرتے ہوئے اللہ نے واضح کیا کہ کوئی مسلمان ہو، یہودی ہو یا نصرانی ہو۔ جب تک اللہ تعالیٰ پر صحیح طریقے سے ایمان نہیں لائے گا اور آخرت پر پوری طرح یقین نہیں رکھے گا، اُس کو فلاح نصیب نہیں ہو سکے گی۔ فرمایا یہ لوگ خواہشاتِ نفسانیہ کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں مگر انسان کو گمراہ کرنے والے عناصر میں سے سب سے بڑا عنصر یہی ہے۔ جب تک کوئی نفسانی خواہش کی پیروی کرتا ہے گا اُسے ہدایت نصیب نہیں ہو سکتی۔ یہ لوگ اسی بیماری میں مبتلا ہیں۔

اب اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے نصاریٰ کا باطل عقیدہ بیان کیا ہے اور پھر اس کا رد بھی فرمایا ہے۔ تبلیغ دین کے سلسلے میں یہ بات بھی آجاتی ہے کہ اہل ایمان کا فرض ہے۔ کہ وہ عیسائیوں کے مختلف فرقوں اور ان کے باطل عقیدے سے لوگوں کو خبردار کریں اور انہیں بتلایا جائے کہ ان کا عقیدہ بالکل کافرانہ ہے، یہ عقل کے بھی خلاف ہے اور فطرتِ انسانی کے بھی خلاف ہے۔ یہ عقیدہ حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیمات سے بھی بالکل متعارض ہے

عقیدہ عینیت کا ابطال

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ البتہ تحقیق کافر ہوئے وہ لوگ۔ عربی زبان میں ل تاکید کے لیے آتا اور قد بھی ماضی پر داخل ہوکر تاکید پیدا کرتا ہے۔ گویا یہ بات طے ہوچکی ہے کہ وہ لوگ یقیناً کافر ہوئے قَالُوْٓا جنہوں نے کہا، یعنی جنہوں نے اپنے اعتقاد کا اظہار اس طرح کیا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ کہ بیشک اللہ تعالیٰ بعینہٖ مسیح ابن مریم ہے، اس کے علاوہ کوئی اور ہستی یا ذات خدا نہیں ہے بلکہ یہی خدا ہے یہ ہندوؤں والا اوتاری یا حلولی عقیدہ ہے کہ خدا تعالیٰ کسی بھی روپ میں جلوہ گر ہو سکتا ہے۔ عیسائیوں نے بھی یہی کہا کہ اللہ تعالیٰ مسیح ابن مریم کی صورت میں ظاہر ہوا ہے اللہ نے فرمایا یہ لوگ پکے کافر ہیں انہوں نے خالق اور مخلوق کو ایک ہی چیز بنا دیا۔ حالانکہ خالق کا کسی مخلوق کے روپ میں ظاہر ہونا اس کی تنزیہہ کے خلاف ہے، لہٰذا ان لوگوں کے کفر میں کوئی کسر باقی نہیں رہی۔ عیسائیوں کے دو پرانے فرقے ملکانیہ اور یعقوبیہ بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں البتہ تیسرے فرقے نسطوریہ کا ذکر آئے گا۔ یہ دونوں گروہ حلولی عقیدہ کے قائل ہیں۔ اس وقت بھی عیسائی دنیا میں دو بڑے فرقے رومن کیتھولک اور پراٹسٹنٹ موجود ہیں

مسلمانوں میں بھی وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کا عقیدہ موجود ہے مگر یہ عقیدہ حلول سے بالکل مختلف ہے۔ وحدۃ الوجود کا مطلب یہ ہے کہ وجود

حقیقت میں صرف اللہ تعالیٰ کا ہے، ازلی ابدی اور مستقل وجود صرف ایک ہے، باقی سب عارضی اور فانی ہیں۔ "كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ" (القصص) اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا باقی ہر چیز فانی ہے، کسی کو بقاء حاصل نہیں اکثر بندگان دین اس عقیدے کے قائل ہیں، چنانچہ حضرت جنیدؒ، شبلیؒ سے لے کر۔ شاہ ولی اللہؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حاجی امداد اللہ وغیرہ اس کو مانتے ہیں، مگر یہ حلولی اور اتحادی عقیدہ نہیں ہے۔

مسلمانوں کی بدعقیدگی

حلولی طرز کے باطل عقائد بعض مسلمانوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی بندے کے رُوپ میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ آپ نے اکثر سُنا ہو گا ؎

وہی مستوی عرش ہے خدا ہو کر
اُتر پڑا ہے مدینے میں مصطفےٰ ہو کر

یہ بالکل عیسائیوں اور ہندوؤں والا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حضور علیہ السلام کے روپ میں ظاہر ہوا ہے۔ خواجہ غلام فریدؒ مٹھن کوٹ سے چاچڑاں منتقل ہو گئے تھے۔ اُن کے مریدین بھی کہتے ہیں۔

چاچڑ وانگ مدینہ، کوٹ مٹھن بیت اللہ
ظاہر دے وچ پیر فریدن، باطن دے وچ اللہ

یہ بھی وہی عقیدہ ہے۔ خواجہ غلام فریدؒ بڑے اچھے بزرگ ہوئے ہیں مگر بعد میں لوگوں نے کیا سے کیا بنا دیا، اُن کے پہلے مقام کو مکہ سے تشبیہ دی اور دوسرے کو مدینہ سے اور یہ بھی کہ دیا بظاہر تو یہ پیر صاحب تھے مگر حقیقت میں اللہ تعالیٰ آپ کے روپ میں آگیا تھا۔ اب غور فرمائیے إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ اور اس عقیدے میں کیا فرق رہ گیا ہے۔ پھر ایک غلو یہ کیا کہ پیر صاحب کے چہرہ کو ام الکتاب سے تشبیہ دی۔ ام الکتاب سورۃ فاتحہ کا دوسرا نام ہے

یا پھر لوح محفوظ کو بھی اس نام سے پکارا جاتا ہے لوح محفوظ اللہ تعالیٰ کا اجمالی یا تفصیلی علم ہے جسے خواجہ فرید کا چہرہ بنا دیا۔

ام الکتاب ہے چہرہ فرید کا

عقیدہ توحید اور فطرت انسانی

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جن لوگوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ بعینہٖ مسیح ابن مریم ہے انہوں نے صریحاً کفر کا ارتکاب کیا۔ ایسا عقیدہ عقل کے بھی خلاف ہے اور انسانی فطرت سے بھی مطابقت نہیں رکھتا۔ خدا کی وحدانیت انسانی فطرت میں داخل ہے۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی انسان پیدا ہوتے ہی کسی پہاڑ کی چوٹی پر یا کسی ایسے جزیرے پر پہنچ جائے جہاں کسی دوسرے انسان کا گزر نہ ہو۔ پھر وہ جوان ہو کر عقل و شعور کی عمر کو پہنچ جائے تو باوجود اس کے کہ اس کے پاس کوئی مبلغ دین نہیں آیا خود اس کی عقل سلیم کا تقاضا ہے کہ اُسے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر یقین رکھنے پر آمادہ کرے۔ ایسے شخص سے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کی باز پرس نہیں ہوگی، تاہم اگر وہ کفر اور شرک کا ارتکاب کرے گا تو عند اللہ ماخوذ ہوگا۔ کیونکہ اللہ نے اُسے عقل سلیم دے کر اس دنیا میں بھیجا تھا اور اُس عقل کا تقاضا ہے کہ وہ نشانات قدرت دیکھ کر اپنے مالک کو پہچانے اور اس کی یگانگت پر ایمان لائے۔

فرمایا وَقَالَ الْمَسِيحُ اور مسیح علیہ السلام نے کہا يٰبَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ اے بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔ مسیح علیہ السلام جب تک اس دنیا میں موجود رہے وہ اپنی قوم کو توحید باری تعالیٰ ہی کی تعلیم دیتے رہے۔ مگر آپ کے بعد انہوں نے خود مسیح علیہ السلام کو ہی خدا بنا دیا۔ مسیح علیہ السلام کی تعلیم تو یہ تھی کہ تم بھی اسی خدا کی عبادت کرو جس کی میں کرتا ہوں میں بھی اُسی کا بندہ اور تمہاری طرف بھیجا ہوا رسول ہوں۔" وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (آل عمران) یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ عیسیٰ علیہ السلام قومی

نبی تھے جو صرف بنی اسرائیل کی طرف منسوب ہوئے۔ آپ ساری دنیا کے لیے
بین الاقوامی نبی بن کر نہیں آئے۔ لہٰذا آج عیسائیوں کا پوری دنیا کو عیسائیت
کی دعوت دینا خود مسیح علیہ السلام کے مشن کے خلاف ہے۔ پوری دنیا کے
لیے دعوت صرف خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے جن کے بعد قیامت
تک کوئی نبی نہیں آئے گا۔ الغرض مسیح علیہ السلام نے بنی اسرائیل پر واضح کر
دیا کہ پوری کائنات کا پروردگار صرف اللہ ہے اور وہی عبادت کے لائق
ہے، اس لیے صرف اسی کی عبادت کرو۔

شرک ناقابل معافی ہے

فرمایا یہ بات اچھی طرح سن لو، اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ بیشک
جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کیا اور یہی عقیدہ لے کر اس دنیا سے چلا
گیا فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ پس تحقیق اللہ تعالیٰ نے
اس پر جنت حرام کر دی وَمَاْوٰىهُ النَّارُ اور اس کا ٹھکانا دوزخ
بن گیا۔ ایسا شخص اللہ کی رحمت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا دوسرے
مقام پر آتا ہے کہ ایسے شخص کے لیے رحمت کے دروازے نہیں کھلتے
حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ یہاں
تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں سے گزر جائے۔ مقصد یہ کہ جس طرح اونٹ کا سوئی کے
ناکے میں سے گزرنا ناممکن ہے، اسی طرح کافر کے لیے جنت جانا ناممکن ہے بہرحال یہاں پر اللہ نے عیسیٰ علیہ السلام کا
قول نقل کیا ہے کہ مشرک کبھی جنت میں نہیں جا سکتا اس قسم کی آیات آج
بھی انجیل میں موجود ہیں کہ سجدہ صرف خداوند کے سامنے ہی کرو۔ بعض آیات
میں شرک کا صریحاً رد بھی کیا گیا ہے۔

شرک کی بہت سی قسمیں ہیں مگر اکثر لوگ عبادت میں شرک کرتے
ہیں یا پھر خدا تعالیٰ کی صفات مختصہ اس کی مخلوق میں مان کر شرک کے مرتکب
ہوتے ہیں مسیح علیہ السلام کے متعلق بھی پرانے فرقے یہی کہتے تھے کہ انہیں
تصرف حاصل ہے وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں حالانکہ تصرف صرف اللہ تعالیٰ

کے ساتھ مختص ہے یا یہ کہ مسیح علیہ السلام عالم الغیب ہیں وہ سب کچھ جانتے
ہیں یہ صفت بھی اللہ کے ساتھ مخصوص ہے اور اگر عیسٰی علیہ السلام یا کسی اور ذات
میں مانی جائے گی تو اللہ کے ساتھ شرک ہوگا۔ یہودیوں کا عقیدہ بھی ہے کہ
حضرت ابراہیم علیہ السلام قیامت کے دن ہمیں چھڑالیں گے اور دوزخ میں
نہیں جانے دیں گے۔ یہ سب باطل عقائد ہیں اور ان کے معتقدین کافر ہیں۔
فرمایا یاد رکھو! وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ظلم کرنے والوں
کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ اور اللہ نے فرمایا ہے کہ سب سے بڑا ظلم شرک
باللہ ہے "اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ" (لقمان) دوسری جگہ فرمایا
وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (البقرہ) یعنی کافر ظالم ہیں مطلب
یہ ہوا کہ کفر اور شرک کرنے والے بدعقیدہ لوگ جنت سے ہمیشہ کے لیے
محروم ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں عقیدہ عینیت یا حلولی عقیدہ
کی تردید فرمائی ہے۔

عقیدۂ تثلیث

اب اگلی آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے عقیدہ تثلیث کی تردید فرمائی
یہ بھی عیسائیوں کا عقیدہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ البتہ
تحقیق کافر ہوئے وہ لوگ قَالُوْا جنہوں نے کہا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ
ثَلٰثَةٍ بیشک اللہ تعالیٰ تینوں میں تیسرا ہے عیسائیوں کے دونوں بڑے
فرقے رومن کیتھلک اور پراٹسٹنٹ یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے خدا کے
تین حصے بنا دیے۔ باپ، بیٹا اور روح القدس یا ذات، علم اور حیات
اس عقیدہ میں ذات سے مراد خدا تعالیٰ مسیح علیہ السلام کو علم کا مظہر اور
جبرائیل علیہ السلام کو حیات، کا مظہر قرار دیا ہے ایک عقیدہ کے لحاظ سے
تین اجزا باپ، بیٹا اور مریم ہیں۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ، مسیح علیہ السلام
اور ان کی والدہ ہیں۔ اس طرح انہوں نے مریم علیہ السلام کو مادر خدا تسلیم کیا۔
نصاریٰ کے ان باطل عقائد کے متعلق اسی سورۃ کے آخری رکوع میں آئیگا۔

کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھیں گے ۔
اَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰـهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو معبود بنا لو ۔ اُس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہایت ادب کے ساتھ عرض کریں گے ۔ اے مولا کریم! تیری ذات پاک ہے ۔ بھلا میں ایسی گندی بات کیسے کر سکتا ہوں ۔ اگر میں نے کوئی ایسی بات کی ہے تو تو میرے دل کی بات جانتا ہے مگر میں تیرے دل کی بات نہیں جان سکتا ۔ علام الغیوب تو ہی ہے ۔

پھر جب تثلیث کے ماننے والوں کو کہا جاتا ہے کہ تمہارا عقیدہ تو توحید کے خلاف ہے تو کہتے ہیں کہ نہیں خدا تو ایک ہی ہے ۔ کبھی تین ہو جاتے ہیں کبھی ایک بن جاتا ہے ، عجیب گورکھ دھندا بنا رکھا ہے ہر صاحب عقل جانتا ہے کہ تین ایک کیسے ہو سکتے ہیں اور ایک تین کیسے بن سکتا ہے یہ سب ان کی ذہنی اختراعات ہیں ۔ اگر کسی سے تین روپے قرض لے کر اُسے ایک روپیہ واپس کیا جائے کہ لو بھائی تمہارے تین روپے ایک بن گئے ہیں ، تو کیا کوئی صاحب عقل اس بات کو تسلیم کرے گا ۔ مگر یہ لوگ اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے تثلیث کے باطل عقیدے پر اڑے ہوئے ہیں ۔ فرمایا ایسا عقیدہ رکھنے والے پکے کافر ہیں ۔

معبود صرف اللہ ہے

فرمایا وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ نہیں ہے کوئی معبود مگر صرف اللہ ، مستحق عبادت ، متصرف فی الامور ، مشکل کشا ، حاجت روا ، ہمہ دان ہمہ بین ، خالق کل اور رب صرف وہی ایک ذات ہے ۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ کا یہی مطلب ہے کہ عبادت کے لائق صرف اور صرف وہی ذات خداوندی ہے دوسرے مقام پر فرمایا لِیَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ (البینۃ) خالص اسی کی عبادت کرو ، نذر و نیاز اسی کے نام کی دو ، دہائی بھی اسی کے نام کی دو ، اسی کو پکارو ، اسی کے سامنے رکوع و سجود بجا لاؤ ۔ نافع اور ضار

وہی ہے۔ وہ جو چاہے کر گزرنے پر حق بجانب ہے اُس کے علاوہ نہ کوئی علیم کل اور نہ کوئی نفع نقصان کا مالک۔ تمام اختیارات اُسی کے قبضہ قدرت میں۔ بیماری اور شفا، ترقی اور تنزل سب کچھ اُسی کے ہاتھ میں۔ ہے مسبب الاسباب بھی وہی ہے وہ جب تک چاہے کسی کو زندہ رکھے اور جب چاہے حیات چھین لے، اُس کے کاموں میں کسی کی دخل اندازی کی مجال نہیں لہذا تثلیث کا عقیدہ رکھنے والے پکے کافر ہیں

سزا اور معافی

فرمایا وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ اور اگر یہ اس باطل عقیدے سے باز نہ آئے۔ جو کچھ یہ کہتے ہیں اور اُس سے توبہ نہ کی، لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ تو ضرور پہنچے گا ان میں سے کفر کرنے والوں کو دردناک عذاب، جو لوگ اپنے خالق مالک اور معبود حقیقی کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں، وہ بلاشبہ سزا کے مستحق ہیں۔ فرمایا اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کیوں نہیں کرتے جب تک کوئی اِس دنیا میں زندہ ہے اس کے لیے موقع ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو پہچانے اور اس پر ایمان لائے اور مسیح علیہ السلام کو اس کا بندہ تسلیم کرے وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ اور پھر اللہ تعالیٰ سے سابقہ گناہوں کی معافی بھی مانگ لے۔ اپنی نادانی اور کوتاہی پر نادم ہو جائے تو فرمایا وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ اللہ تعالیٰ تو بہت ہی بخشنے والا اور از حد مہربان ہے جو کوئی سچے دل سے توبہ کر کے اُس کے دروازے پر آجاتا ہے تو بڑے سے بڑا مجرم بھی اس کی رحمت سے محروم نہیں رہتا، اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آکر اُس کی تمام خطائیں معاف کر دیتی ہے اور ایسا شخص اللہ کا مقرب بندہ بن جاتا ہے اسی لیے فرمایا کہ یہ لوگ کیوں توبہ نہیں کرتے اور کیوں اس سے معافی نہیں مانگتے، وہ مالک الملک تو بڑا ہی بخشنے والا اور نہایت ہی مہربان ہے۔ اب بھی موقع ہے کہ وہ راہ راست پر آجائے۔

مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۗ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ۗ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ۗ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۷۵﴾

ترجمہ :- نہیں ہیں مسیح ابن مریم مگر اللہ کے رسول تحقیق گزر چکے ہیں ان سے پہلے بہت سے رسول اور ان کی ماں صدیقہ (بہت راستباز خاتون) ہے ۔ وہ دونوں کھانا کھاتے تھے ، دیکھو ! ہم ان کے لیے کس طرح دلائل بیان کرتے ہیں ۔ پھر دیکھو ! یہ لوگ کدھر اُلٹے چلے جا رہے ہیں ﴿۷۵﴾

ربط آیات

گذشتہ کئی دروس سے اہل کتاب کے عقائد باطلہ کی تردید ہو رہی ہے ۔ اللہ نے فرمایا کہ نقض عہد کی وجہ سے یہ ملعون ٹھہرے ۔ انہوں نے اللہ کی کتابوں میں تحریف کی ۔ ان کی اکثریت نافرمانوں کی تھی مگر ان میں بعض با صلاحیت لوگ بھی موجود تھے ۔ وہ حق بات کو قبول کر کے ایمان کا راستہ اختیار کرتے تھے ۔ پھر اللہ تعالیٰ نے نصاریٰ کے مختلف فرقوں کے عقائد باطلہ کا رد فرمایا اور حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقاء کو یہ بات سمجھا دی کہ وہ اہل کتاب کی مخالفت سے خوفزدہ نہ ہوں بلکہ اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچاتے رہیں ۔ گذشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے ۔ کہ وہ لوگ پکے کافر ہوئے جنہوں نے کہا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ یعنی مسیح علیہ السلام بعینہٖ خدا ہیں ۔ یہ بات تو عقل کے بھی خلاف ہے اور نقل کے بھی خلاف ہے بلکہ خود

مسیح علیہ السلام کی تعلیمات کے بھی منافی ہے۔ آپ کی تبلیغ کا ذکر تو ہو چکا ہے
کہ انہوں نے کہا اے بنی اسرائیل اُعْبُدُوا اللّٰہَ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو
جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے اور جس نے اللہ تعالیٰ کے
ساتھ شرک کیا، اُس پر جنت حرام ہو گئی اور اُس کا ٹھکانا دوزخ میں ہو گا۔ اور
ایسے ظالموں کا کوئی مددگار بھی نہیں ہو گا۔ فرمایا یہ اتحادی عقیدہ رکھنے والے
بھی کافر ہیں اور وہ بھی کافر ہیں جنہوں نے کہا اِنَّ اللّٰہَ ثَالِثُ
ثَلٰثَۃٍ یعنی اللہ تین میں سے تیسرا ہے یہ عقیدۂ تثلیث بھی کفریہ عقیدہ
ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ صرف ایک وحدہٗ لاشریک ہے۔ فرمایا اب بھی
موقع ہے کہ یہ لوگ توبہ کر لیں اور سابقہ گناہوں کی معافی طلب کر لیں تو اللہ تعالیٰ
معاف فرما دے گا، بصورت دیگر دردناک عذاب کے مستحق ٹھہریں گے۔

مسیح علیہ السلام بحیثیت رسول

اب آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے نہایت مختصر الفاظ میں نصاریٰ کے
اس عقیدے کا رد فرمایا ہے جس کے مطابق وہ عیسٰی علیہ السلام کو متصرف فی الامور
اور خود مختار مانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس ضمن میں ایسے دلائل کی طرف اشارہ
کیا جنہیں دنیا کا کوئی صاحب شعور آدمی رد نہیں کر سکتا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے
مَا الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ نہیں ہیں مسیح ابن مریم مگر
اللہ کے رسول۔ یہ مَا اور اِلَّا یعنی نفی اور اثبات کے درمیان بات کی
گئی ہے اور مطلب یہ ہے کہ مسیح علیہ السلام اللہ کے رسول ہونے کے سوا
کچھ نہیں ہیں نہ وہ خدا ہیں نہ اوتار اور نہ خدا کے بیٹے اور نہ متصرف۔ اللہ کے
فرستادہ ہونے کے علاوہ اُن کی اور کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہ رسول کا لفظ
واضح کر رہا ہے کہ اُس کو بھیجنے والی کوئی دوسری ہستی ہے جو بلاشبہ بھیجے جانے
والے سے اعلیٰ وارفع ہے اور وہ خدا تعالیٰ ہے جس نے مسیح علیہ السلام کو اپنا
پیغام پہنچانے کے لیے مبعوث فرمایا۔ لہٰذا وہ خود خدا کیسے ہو سکتا ہے۔
ابن مریم کے الفاظ بھی بتا رہے ہیں کہ عیسٰی علیہ السلام حضرت مریم

سے بیٹے ہیں، جو پیدائش کے لیے ماں کا محتاج ہے اور اس کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے، خود الٰہ کیسے ہوا۔ اب مسیح کے نام پر بھی غور کیجئے۔ یہ مرکب ہے روح اور جسم کا، اور جو خود مرکب ہو یعنی روح اور جسم کا محتاج ہو، اُس پر الوہیت صادق نہیں آتی کیونکہ الٰہ تو وہ ہو سکتا ہے، جو ہر چیز سے بے نیاز ہو اور کسی کا محتاج نہ ہو بلکہ ہر چیز اُس کی محتاج ہو۔ گذشتہ سورۃ میں بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ کا تذکرہ بھی ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسیح علیہ السلام کا روح مع الجسم اپنی طرف اٹھا لیا۔ اس سے بھی آپ کا مرکب ہونا ثابت ہوتا ہے جو صفت الوہیت کے منافی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو باپ کے توسط کے بغیر پیدا کیا۔ مگر ماں کا توسط تو موجود ہے مسیح علیہ السلام مریم کے بیٹے ہیں اور اللہ کے رسول ہیں، اُس کے فرستادہ ہیں وہ نہ خود خدا ہیں اور نہ تینوں میں تیسرا ہیں۔ نصاریٰ کا حلولی اور اوتاری دونوں عقائد باطل ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا یہ قانون بھی اپنی جگہ اٹل ہے کہ انسانیت کی اصلاح اور فلاح کے لیے اُس نے ہمیشہ اپنے رسول بھیجے ہیں، وہ نہ خود آیا ہے اور نہ اس کا کوئی اوتار نازل ہوا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر مسیح علیہ السلام تک قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ کو اس سے پہلے رسول ہی گزرے ہیں۔ اور رسول انسان ہوتے ہیں کیونکہ انہیں انسانوں کی طرف مبعوث کیا جاتا ہے۔ مسیح علیہ السلام کے بعد صرف ایک رسول کی ضرورت تھی جس کے متعلق حضرت مسیح علیہ السلام بنی اسرائیل کو رفع الی السما تک بشارت سناتے رہے وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ (سورۃ صف) میرے بعد ایک رسول آنے والے ہے جس کا نام احمد ہوگا۔ انجیل میں احمد کا متبادل لفظ فارقلیط گزشتہ صدی تک موجود رہا ہے مگر اب انہوں نے کتاب اللہ میں تحریف کر کے اُسکی

جگہ مددگار کا لفظ دیا ہے۔ کیونکہ فارقلیط کے لفظ سے حضور علیہ السلام کی آمد کی بشارت ظاہر ہوتی تھی اور نصاریٰ آپ کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔

بہرحال فرمایا کہ مسیح علیہ السلام سے پہلے بھی اللہ کے رسول آتے رہے ہیں جو سب اللہ کے بندے اور انسان تھے اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَیْهِمْ اور پھر یہ بھی ہے کہ یہ رسول سارے کے سارے مرد تھے اور مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰی متمدن بستیوں سے آتے ہیں، دیہاتی لوگوں میں سے رسول نہیں آئے اللہ تعالیٰ ہمیشہ اعلیٰ اور متمدن انسانوں میں سے رسول کا انتخاب فرماتا رہا ہے تو فرمایا کہ مسیح علیہ السلام سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں آپ نہ تو خدا ہیں نہ خدا زادے اور نہ تینوں میں سے تیسرے، وہ تو مریم کے بیٹے اور اللہ کے رسول ہیں، وہ الٰہ ہرگز نہیں ہیں۔

صفات الوہیت

کسی ذات میں صفت الوہیت ماننے سے پہلے یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ آیا وہ ہستی ان صفات پر پورا اترتی ہے جو سابقہ کتب اور اہل خرد کے نزدیک مسلم ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ الٰہ وہ ہوتا ہے جو واجب الوجود ہو یعنی جس کا وجود خود بخود ہو، کسی دوسری ذات کا پیدا کردہ نہ ہو۔ مگر مسیح علیہ السلام میں یہ صفت نہیں پائی جاتی۔ ان کا وجود تو پیدا شدہ اور مربوب ہے، وہ نہ خالق ہیں اور نہ رب، لہٰذا وہ الٰہ نہیں ہو سکتے۔

الٰہ کی ایک صفت قادر مطلق ہونا بھی ہے۔ الٰہ وہ ہو سکتا ہے جسے ہر چیز پر تصرف حاصل ہو، مگر مسیح علیہ السلام میں یہ صفت بھی مفقود ہے وہ تو اللہ کے عاجز بندے ہیں ۔۔۔۔ انجیل میں موجود ہے کہ مسیح علیہ السلام اپنی عاجزی کی وجہ سے تختہ دار پر چڑھے اور جو عاجز ہو وہ الٰہ نہیں ہو سکتا۔ انجیل میں مسیح علیہ السلام کا یہ قول بھی موجود ہے کہ بیٹا یعنی مسیح اپنے آپ کچھ نہیں کر سکتا یہ بھی آپ کے عجز پر دلالت کرتا ہے اور صفت الوہیت کے منافی ہے حقیقی معبود کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ علیم کل ہو کوئی چیز اس سے

مخفی نہ ہو۔ قیامت کے وقت کے متعلق انجیل میں مسیح علیہ السلام کا فرمان موجود ہے کہ قیامت کی گھڑی کے متعلق نہ فرشتے جانتے ہیں اور نہ بیٹا یعنی خود مسیح۔ اس کا علم صرف باپ یعنی خدا تعالیٰ کو ہے، اور کسی کو نہیں اس طرح مسیح علیہ السلام کے علیم کل ہونے کی بھی نفی ہوگئی۔ الٰہ کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ غیر محدود اور غیر مرئی ہوگا۔ نہ تو اس کا احاطہ ہو سکتا ہے اور نہ وہ ان آنکھوں سے نظر آ سکتا ہے۔ مگر مسیح علیہ السلام چلتے پھرتے دکھائی دیتے تھے اور درمیانے قد کے مند انسان تھے، لہٰذا وہ ان صفات کے حامل بھی نہ تھے اس لیے بھی انہیں الوہیت سے متصف نہیں کیا جا سکتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ الٰہ وہ ہے جس میں معبودیت کی صفت پائی جائے مگر مسیح علیہ السلام تو عابد ہیں۔ معبود نہیں۔ جیسا کہ گذشتہ دروس میں گزر چکا ہے ان کی تو اپنی تعلیم یہ تھی۔ اُعْبُدُوا اللّٰهَ اللہ کی عبادت کرو جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی لہٰذا آپ الٰہ نہیں تسلیم کیے جا سکتے۔

حضرت مریم صدیقہ ہیں

یہودی حضرت مریم پر بدکاری کا الزام لگاتے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے انکی صداقت کی خود گواہی دی اور فرمایا کہ حضرت مسیح علیہ السلام اللہ کے رسول تھے وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ اور آپ کی والدہ صدیقہ یعنی راست باز تھیں اسلامی اصطلاح میں انبیاء علیہم السلام کے بعد صدیقین کا درجہ ہے۔ اور اس سے مراد خدا کی عبادت گزار، اس کا ذکر کرنے والی، پاکیزہ اخلاق، برائی سے دور رہنے والی، ہر لحاظ سے سچائی پر کاربند، اطاعت گزار اور عقیدے اور عمل میں راست باز ہے۔ جب حضرت مریم حضرت مسیح علیہ السلام کو گود میں میں اٹھا کر آئیں تو یہودیوں نے فوراً ان پر الزام لگایا لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا اے مریم، تو یہ بدکاری کا بچہ لے کر آئی ہے، تیرے والدین تو ایسے نہیں تھے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حضرت مریم راست باز خاتون تھیں۔

حضرت مسیحؑ زندگی کا احتیاج

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کے ذکر کے بعد آگے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی حیثیت کی مزید وضاحت فرمائی ہے کَانَا یَاْکُلٰنِ الطَّعَامَ وہ دونوں (ماں بیٹا) کھانا کھاتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت مسیح اور اُن کی والدہ کوئی عجیب وغریب مخلوق نہیں تھے بلکہ عام انسانوں کی طرح وہ بھی کھانے کے محتاج تھے، انہیں بھی بھوک پیاس لگتی تھی اور الٰہ وہ ہو سکتا ہے جو ان چیزوں سے پاک ہو۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص بھوک پیاس کے ازالے کے لیے کھانے پینے کا محتاج ہو۔ پاؤں رکھنے کے لیے زمین کا محتاج ہو، جسے جسم و روح کا تعلق قائم رکھنے کے لیے سانس کا احتیاج ہو اور جسے بول و براز کی حاجت لاحق ہو۔ وہ بھلا الٰہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ایسے ٹھوس دلائل بیان فرمائے ہیں کہ کوئی شخص ان کی تردید نہیں کر سکتا یہاں کھانا کھانے کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے اُن کے احتیاج کو واضح فرما دیا بلکہ یہ دلیل تو اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کے حق میں دی "وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا یَاْکُلُوْنَ الطَّعَامَ" اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کا جسم ایسا نہیں بنایا جو کھانے کا محتاج نہ ہو۔ کسی نبی کا وجود ازلی ابدی بھی نہیں ہے۔ ازلی ابدی اور تمام ضروریات سے مبرا اور منزہ ذات تو صرف اللہ تعالیٰ کی ہے فرشتے اگرچہ کھانا نہیں کھاتے مگر بقائے حیات کے وہ بھی محتاج ہیں وہ چلنے پھرنے کے محتاج ہیں اور صرف امر الٰہی سے ہی چلتے پھرتے ہیں اور حکم الٰہی کی تعمیل کرتے ہیں۔ اس طرح وہ رفع درجات کے محتاج ہیں اور انعام و اکرام کے بھی خواہشمند ہوتے ہیں۔ غرضیکہ جبرائیل، میکائیل، اسرافیل، عزرائیل علیہم السلام اور تمام فرشتے اور اللہ تعالیٰ کی باقی تمام مخلوق کسی نہ کسی چیز کی محتاج ہے حتیٰ کہ ہر ذی جان چیز سانس تک لینے کی محتاج ہے انبیاء، اولیا اور بزرگ سب اللہ تعالیٰ کے عاجز بندے اور اسی کے عابد ہیں۔ معبود صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اُس کے علاوہ نہ کوئی علیم کل ہے، نہ

قادرِ مطلق ہے اور یہی واجب الوجود۔ سب کے سب مرئی یعنی دکھائی دینے
والے اور محدود ہیں۔ لامحدود اور غیر مرئی صرف ذات خداوندی ہے۔ لہذا معبود
بھی وہی ہے۔ اس کے علاوہ بشمول مسیح علیہ السلام کوئی الہٰ نہیں ہے مسیح علیہ السلام
اس کے سوا نہیں کہ وہ اللہ کے برگزیدہ رسول ہیں۔ بنی نوع انسان میں یہ سب
سے بڑا شرف ہے مگر وہ الہٰ بہرحال نہیں ہیں۔

دعوت غور و فکر

یہ دلائل بیان کرنے کے بعد اللہ جل جلالہ نے فرمایا اُنْظُرْ كَيْفَ
نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ دیکھو ہم کس طرح واضح دلائل بیان کرتے ہیں
ہر ہر لفظ میں توحید کے اثبات اور شرک کے ابطال کی دلیل موجود ہے۔
تثلیث اور اتحادی عقیدے کی تردید ہے اگر اور کوئی دلیل بھی سمجھ میں نہ
آئے تو اتنی بات تو بالکل سیدھی سادھی ہے کہ جو کھانے پینے کا محتاج ہے
وہ الہٰ نہیں ہوسکتا۔ انسان تمام ضروریاتِ زندگی کا محتاج ہے اور عیسیٰ علیہ السلام
بھی ایک انسان ہیں لہذا وہ معبود نہیں ہو سکتے۔ فرمایا ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى
يُؤْفَكُوْنَ پھر دیکھو یہ کدھر الٹے پھرے جا رہے ہیں۔ یہ انہی اتحادی اور
تثلیث کے گندے عقیدے پر مصر ہیں۔ انہوں نے خالق اور مخلوق کو ایک
کر دیا ہے۔ اسی گمراہی میں مبتلا ہو کر کفر اور شرک کا ارتکاب کر رہے ہیں اتنے
واضح دلائل آنے کے باوجود یہ اس باطل عقیدے کو ترک کرنے کے لیے تیار
نہیں ہیں۔ اگلی آیات میں اللہ تعالے نے تصرف میں شرک کرنے کا خصوصی
رد فرمایا ہے۔

قُلۡ اَتَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمۡلِكُ لَكُمۡ ضَرًّا وَّلَا نَفۡعًا ؕ وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۷۶﴾ قُلۡ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لَا تَغۡلُوۡا فِىۡ دِيۡنِكُمۡ غَيۡرَ الۡحَـقِّ وَلَا تَتَّبِعُوۡۤا اَهۡوَآءَ قَوۡمٍ قَدۡ ضَلُّوۡا مِنۡ قَبۡلُ وَاَضَلُّوۡا كَثِيۡرًا وَّضَلُّوۡا عَنۡ سَوَآءِ السَّبِيۡلِ ﴿۷۷﴾ ع

ترجمہ: اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے کیا تم عبادت کرتے ہو اللہ کے سوا اُن چیزوں کی جو نہیں مالک تمہارے لیے نقصان کی اور نہ نفع کی۔ اور اللہ تعالیٰ ہی ہے سُننے والا اور جاننے والا ﴿۷۶﴾ اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے اے اہلِ کتاب! نہ تجاوز کرو اپنے دین میں ناحق اور نہ پیروی کرو اُن لوگوں کی خواہشات کی جو اس سے پہلے گمراہ ہو چکے ہیں اور انہوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا ہے اور وہ سیدھے راستے سے بہک گئے ہیں ﴿۷۷﴾

ربطِ آیات

گذشتہ دروس میں اہلِ کتاب کے باطل عقائد اور اُن کی خرابیوں کا ذکر ہوتا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نصاریٰ کے مختلف فرقوں کی تکفیر کا ذکر کیا جو یا تو عیسیٰ علیہ السلام کو بعینہٖ خدا مانتے ہیں یا پھر تین خداؤں میں سے تیسرا تسلیم کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ کفریہ عقیدہ ہے۔ یہ عقیدہ عقل اور نقل دونوں کے خلاف ہے بلکہ خود انبیاء کی تعلیم کے بھی منافی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نصاریٰ کو تلقین کی کہ وہ اس باطل عقیدہ سے باز آجائیں ورنہ عذابِ الیم کے مستحق ٹھہریں گے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کے

متعلق فرمایا کہ آپ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ کے رسول ہیں۔ آپ سے پہلے بھی بہت سے رسول گزرے ہیں اور حضرت مسیح علیہ السلام کی والدہ حضرت مریم صدیقہ تھیں یعنی نہایت ہی راست باز خاتون تھیں، وہ یہودیوں کی طرف سے لگائے گئے الزامات سے بالکل مبرا تھیں اور عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق مادرِ خدا بھی نہ تھیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام اور آپ کی والدہ دونوں کھانا کھاتے تھے کیونکہ اپنی زندگی کو قائم رکھنے کے لیے وہ کھانے کے محتاج تھے۔ انہیں حوائج بشریہ بھی لاحق ہوتی تھیں اور وہ کمزوری کی حالت میں بھی مبتلا ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جن ہستیوں کی زندگی کا انحصار دوسری اشیاء پر ہو وہ معبود کیسے ہو سکتی ہیں وہ تو خود محتاج تھے۔ اور معبود وہ ہستی ہے جو کسی کی محتاج نہیں بلکہ سب اس کے محتاج ہیں۔ معبود وہ ذاتِ خداوندی ہے جو تمام نقائص، احتیاج اور کمزوریوں سے پاک ہے۔

غیر اللہ کی عبادت

اب آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے نصاریٰ اور دیگر مشرکین کے عقائد کا رد فرمایا ہے اور نہایت لطیف پیرائے میں معبودانِ باطلہ کی پرستش سے روکا ہے، نیز دین میں غلو کرنے سے منع فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے قُلْ اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے أَتَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ کیا تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو اُن کی مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا جو تمہارے لیے کسی نقصان اور نفع کے مالک نہیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو ہستی نفع و نقصان پر قادر نہیں ہے وہ معبود کیسے ہو سکتی ہے؟ نافع اور ضار تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور وہی معبودِ برحق ہے، مسیح علیہ السلام نہ نفع و نقصان پر قادر ہیں اور نہ وہ عبادت کے لائق ہیں۔ انجیل میں بھی موجود ہے "بیٹا (مسیح علیہ السلام) آپ سے کچھ نہیں کر سکتا، جو کچھ اختیار ہے، اُس باپ (خدا) کے پاس ہے" بہرحال معبود وہ ہو سکتا ہے جو احتیاج سے پاک ہو، ہر قسم کے اختیار کا مالک ہو، قدرتِ تامہ

رکھتا ہو، واجب الوجود اور خالق ہو اور وہ علمِ محیط رکھتا ہو۔ یہ نصاریٰ کے عقائد باطلہ کی تردید ہوگئی

مشرکین بھی جن کی پرستش کرتے ہیں انہیں نفع ونقصان کا مالک سمجھ کر ہی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ خواہ ملائکہ ہوں یا انبیاء اور اولیا یا جنات وغیرہ اللہ نے کسی کو کوئی اختیار نہیں دیا۔ تمام اختیارات مالک الملک کے پاس ہیں ہر چیز کا تصرف بھی اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے۔ سورۃ الم سجدہ میں وضاحت کے ساتھ موجود "یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ" بلندیوں سے لے کر پستیوں تک ہر چیز کی تدبیر اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے ہر چیز اُسی کے قبضہ اور تصرف میں ہے۔ یہی بات اللہ تعالےٰ نے حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کہلوائی "قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ" (اعراف) میں اپنے لیے کسی نفع ونقصان کا مالک نہیں ہوں۔ تمام تصرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، وہ جو چاہے کرے ساری مخلوق اُس کی محتاج ہے۔ وہ اکیلا معبود ہے باقی سب عابد ہیں۔ مگر نصاریٰ کی عقل پر پردہ پڑگیا ہے جو مسیح علیہ السلام کو معبود بنالے بیٹھے ہیں حالانکہ آپ کو نفع نقصان کا کچھ اختیار نہیں۔

صفاتِ الوہیت

فرمایا یاد رکھو! "وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ" ہر ایک کی بات، دعا، اور فریاد کو سُننے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ اور ہر چیز کو جاننے والا بھی وہی ہے وہی ذات "بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ" ہے اور وہی ذات "بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ" ہے نہ کوئی چیز اُس کے احاطہِ قدرت سے باہر ہے اور نہ کوئی اُس کے علم سے باہر ہے یہ دونوں صفات صفاتِ الوہیت میں سے ہیں۔ پرسوں بھی عرض کیا تھا کہ واجب الوجود ہونا، کمال صفات کا مالک ہونا، مختارِ کل اور علیم کل ہونا، قدرتِ تامہ کا مالک ہونا۔ غیر محدود اور غیر مرئی ہونا، سب صفات الوہیت ہیں۔ عیسٰی علیہ السلام میں

اِن میں سے کوئی بھی صفت نہیں پائی جاتی، وہ تو نظر آتے تھے اور محدود جسم رکھتے تھے لہٰذا وہ الٰہ کیسے ہو سکتے ہیں۔ چونکہ وہ الٰہ نہیں ہیں لہٰذا اُن کی عبادت بھی نہیں ہو سکتی۔ عبادت کے لائق صرف وہ ذات ہے۔ مگر تم ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہو، جن میں یہ صفات نہیں پائی جاتیں۔ عیسیٰ علیہ السلام کو نہ تو کوئی اختیار ہے، نہ ہر چیز پر اُن کی نگاہ ہے اور نہ وہ ہر چیز کا علم رکھتے ہیں۔ لہٰذا اُن کی طرف الوہیت کی نسبت کرنا بالکل حماقت کی بات ہے جو عقل سے بالکل بعید ہے۔

غلو فی الدین

غلو فی الدین یعنی دین کے معاملہ میں افراط و تفریط کا پیدا ہو جانا ایک قدیم بیماری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کو اس سے باز رہنے کی تلقین کی اور فرمایا قُلْ يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ لَا تَغْلُوا۟ فِى دِينِكُمْ غَيْرَ ٱلْحَقِّ اے پیغمبر! آپ فرما دیں کہ اے اہل کتاب۔ اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو۔ غلو کا معنیٰ تجاوز کرنا یا حد سے بڑھنا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ غلو دونوں صورتوں میں واقع ہوتا ہے یعنی افراط اور تفریط میں۔ اگر کسی چیز یا ہستی کو اُس کے مرتبے سے بڑھا دیا جائے تو یہ افراط یا زیادتی ہوتی اور اگر اُس کے منصب میں کمی کر دی جائے تو تفریط کہلاتی ہے۔ مقصد یہ کہ دین اور شریعت میں کسی معاملہ کے متعلق جو حد مقرر کی گئی ہے اُس میں کمی بیشی کرنا افراط و تفریط ہے جس سے اللہ نے منع فرمایا ہے۔ یہودی تفریط کا شکار رہے۔ اللہ نے تو اپنے انبیاء کی اتباع کا حکم دیا تھا "وَمَآ أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ ٱللَّهِ" (النساء) ہم نے تو انبیاء کی اطاعت کا حکم دیا کیونکہ وہ اللہ کے معصوم بندے ہوتے ہیں اور انہیں مبعوث ہی اس لیے کیا جاتا ہے کہ ان کی فرمانبرداری کی جائے مگر یہودی اپنے انبیاء کی توہین و تذلیل کے مرتکب ہوئے اور انہیں قتل کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات میں بنی اسرائیل کی طرف سے بے ادبی اور گستاخی کے بیسیوں

امور کا ذکر ہو چکا ہے۔ اللہ کا نبی پوری مخلوق میں منتخب اور برگزیدہ بندہ ہوتا ہے
اُس کے ذمہ ہی نوع انسان کی ہدایت اور راہنمائی کا فریضہ ہوتا ہے۔ مگر یہودی
اپنے نبیوں کو عام انسانوں کا درجہ بھی نہ دے سکے اور اس طرح وہ تفریط کے
مرتکب ہوئے۔ برخلاف اس کے عیسائیوں نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کو
حضرت مسیح علیہ السلام کی تعظیم و تکریم میں اس حد تک غلو کیا کہ انہیں نبوت
کے مقام سے اٹھا کر الوہیت کی کرسی پر بٹھا دیا۔ اللہ کی صفات مختصہ کو
مسیح علیہ السلام میں ثابت کرنے کی کوشش کی اور اس طرح افراط کے مرتکب
ہوئے۔ حالانکہ دین کے معاملہ میں افراط اور تفریط دونوں ناپسندیدہ ہیں۔
اور دونوں گمراہی کا باعث ہیں۔ دین میں جس چیز کے متعلق جو حد مقرر کی گئی ہے
اس پر قائم رہنا ہی صحیح دینداری ہے۔ انسان کو انسان کے مرتبے پر ہی رکھنا صحیح
ایمان ہے۔ اگر کسی شخص کو الوہیت کی چادر اوڑھا دی گئی تو یہ غلو یعنی حد سے
تجاوز ہے۔

بڑھانا حد سے زیادہ مجھے تم

افراط یعنی حد سے تجاوز کرنے کی بیماری ہماری امت میں بھی پائی جاتی
ہے۔ حضور علیہ السلام نے خود اپنے متعلق فرمایا تھا لَا تُطْرُونِي كَمَا أَطْرَتِ
النَّصَارَى ابْنَ مَرْيَمَ ۔ کہ میری تعریف میں مبالغہ نہ کرنا جس طرح
عیسائیوں نے مسیح ابن مریم کی تعریف میں کیا اور انہیں بندے سے الٰہ
بنا دیا۔ ایسا محبت، عقیدت اور تعظیم میں تجاوز کی وجہ سے ہوا۔ فرمایا
إِنَّمَا أَنَا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ میں تو اس کا بندہ اور اُس کا رسول ہوں
لہٰذا مجھے اللہ کا بندہ اور اُس کا رسول ہی کہو۔ میری تعریف میں مبالغہ آرائی نہ
کرنا یہی افراط ہے اور یہی چیز انسان کو کفر تک پہنچاتی ہے۔ ہمارے ہاں
اہل بدعت ایسا ہی کرتے ہیں۔ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعریف و
توصیف میں اس حد تک مبالغہ آرائی کی کہ آپ کو خدا کے درجے تک
پہنچا دیا۔ بزرگوں کے لیے ایسے ایسے تعریفی کلمات اور القابات وضع

سے کیے جو افراط کی تعریف میں آتے ہیں۔ کہیں امام الاولیا بنا دیا اور کہیں امام المتقین کا خطاب دے دیا، حضرت اقدس اور نامعلوم کیا کیا القابات دئے کہ ان کو شریعت کی مقررہ حد سے بہت آگے لے گئے۔ حضور علیہ السلام کے سامنے جب کسی شخص نے دوسرے شخص کی تعریف میں مبالغہ کیا تو آپ نے فرمایا: وَيْحَكَ قَطَعْتَ عُنُقَهُ افسوس ہے تو نے تعریف میں مبالغہ کر کے اُس کی گردن توڑ دی۔ فرمایا جب کسی کی تعریف مطلوب ہو تو یوں کہا کرو وَاللّٰهُ حَسِيْبُهٗ اللہ تعالیٰ ہی حساب لینے والا ہے، وہ صورت حال کو جانتا ہے۔ آپ نے فرمایا بزرگوں پر ترحم کرو یعنی یوں کہو رَحِمَهُمُ اللّٰهُ اللہ تعالیٰ اُن پر رحم کرے۔ اسی طرح صحابہ کرام کا نام آئے تو رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ کہو یعنی اللہ تعالیٰ اُن پر راضی ہو گیا۔ مقصد یہ کہ افراط و تفریط کسی صورت میں بھی روا نہیں۔ یہ چیز کفر اور شرک تک لے جاتی ہے۔ اس سے اجتناب کرنا چاہیئے۔

مولانا ثناء اللہؒ پانی پتی اپنی تفسیر مظہری میں لکھتے ہیں۔ کہ غلو کبھی افراط سے ہوتا ہے اور کبھی تفریط سے۔ عیسائی تفریط میں مبتلا تھے۔ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کی والدہ کو الوہیت کے درجے تک پہنچا دیا۔ یعنی مولود بشری کو الٰہ بنا دیا۔ غرضیکہ اعمال میں نہ افراط گوارا ہے اور نہ تفریط پسندیدہ۔ یہودیوں نے اعمالِ شرع کی کچھ پرواہ نہ کی۔ اُدھر نصاریٰ کے اعمال میں تفریط ہوئی اور انہوں نے اصل اعمال کی بجائے رہبانیت کو ایجاد کیا، اور بدعات کے مرتکب ہوئے، بدعات کے تمام کام خود ساختہ ہوتے ہیں اور تفریط کے حکم میں داخل ہیں۔ دین میں اسی ایجاد بندہ کے متعلق آتا ہے رَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا یہ رہبانیت ہے جسے نکالا گیا۔ اور جو انسان کو کفر اور شرک تک لے جاتی ہے۔

ضلوا واضلوا   اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ نہ پیروی کرو

اُن لوگوں کی خواہشات کی قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ جو خود پہلے گمراہ ہو چکے ہیں وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا اور انہوں نے بہت سے دوسروں کو بھی گمراہ کر دیا ہے۔ یہود و نصاریٰ نے یہی کیا کہ وہ تو گمراہ ہوئے مگر انہوں نے دوسرے لوگوں کو بھی گمراہی کے گڑھے میں پھینک دیا۔ یہودیوں میں شرک کی بیماری صابیوں سے آئی اور نصاریٰ نے اُسے یونانیوں، رومیوں اور پرانے مصریوں سے اخذ کیا۔ ہمارے اس برصغیر میں بھی شرک اور بدعت کی لعنت ہندو مت اور بدھ مت سے آئی ہے۔ یہ سوئم، چالیسواں، قبروں پر پھول چڑھانا وغیرہ سب ہندوؤں سے اخذ شدہ رسوم ہیں۔ یہ اسلام کا طریقہ نہیں ہے بلکہ خالص بدعات ہیں مگر اللہ نے فرمایا کہ دوسری اقوام کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ بدعات میں خواہشات سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا، اِن میں کوئی دلیل نہیں ہوتی بلکہ محض ذاتی پسند ہوتی ہے کہ ہمارے ہاں یہ رواج ہے، ہمارا یہ دستور ہے۔ ہمارے بڑے ایسا کرتے تھے۔ ایسی چیزیں نہ تو کتاب و سنت میں ملتی ہیں اور نہ صحابہ کرام کے عمل اور ائمہ دین کے اجتہاد سے ثابت ہیں۔ ہمارے ہاں خوشی اور غمی کی تمام رسوم محض خواہشات کی پیروی کا نام ہیں جس سے اللہ نے منع فرمایا ہے۔ بدعات میں محض اپنی پسند کی تکمیل مطلوب ہوتی ہے نہ کہ اللہ اور اس کے رسول کی رضا۔

آج مسلمان بھی بدعات کا شکار ہو چکے ہیں، انہوں نے آسمانی کتابوں، وحی الٰہی اور انبیاء کا طریقہ چھوڑ دیا ہے وَضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ اور سیدھے راستے سے بھٹک چکے ہیں۔ آج یہ بھی انہی لوگوں کا اتباع کر رہے ہیں جو خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔ وہ لوگ بھی منکرات اور بدعات کے عمل سے گمراہ ہوئے اور آج یہ بھی انہی کے نقش قدم پر چل کر ضلالت کے گڑھے میں گر چکے ہیں۔

بدعات کی حوصلہ افزائی

بدعات کو جاری کرنے والے اکثر فاسق اور فاجر لوگ ہوتے ہیں یا پھر ملوک اور سلاطین انہی لوگوں کی حوصلہ افزائی سے بدعات پروان چڑھتی ہیں ہمارے ملک میں بھی بدعات کی حوصلہ افزائی اوپر سے ہوتی ہے، قبروں کا غسل اور ان پر چادریں چڑھانا، بہشتی دروازے کی کشادگی وغیرہ امراء اور وزراء اور اعلیٰ حکام ہی کرتے ہیں۔ جب بڑا آدمی خود قبروں پر پھول چڑھاتا ہے تو چھوٹے آدمی بھی انہی کا اتباع کرتے ہیں، وہ خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی کرتے ہیں یہ تمام چیزیں غلو فی الدین میں داخل ہیں۔ ذرا غور فرمائیں کہ قبروں کے ساتھ جو معاملہ آج ہو رہا ہے کیا حضور علیہ السلام نے ایسا کیا تھا یا صحابہ کرامؓ نے کیا تھا یا سلف صالحین میں سے کسی نے ترغیب دی تھی۔ کیا ان لوگوں کا دین مکمل نہیں تھا، جو ان چیزوں سے محروم رہ گئے۔ قبروں کی پختگی تو حضور علیہ السلام کے فرمان کے بالکل خلاف ہے۔ آپ نے تو فرمایا تھا لَا تُجَصِّصُوْا قبروں پر پکی اینٹ نہ لگاؤ۔ مگر اب بڑی عالیشان عمارتیں تعمیر ہو رہی ہیں، چپس لگ رہے ہیں۔ قبروں پر پنکھے چل رہے ہیں، بڑے بڑے گنبد بن رہے ہیں۔ یہ سب غیر اقوام کا اتباع اور غلو فی الدین ہے۔

ہندوستان میں قبروں پر گنبد بنانے کی بدعت بدھوں سے آئی ہے ہندوستان، چین، جاپان اور مشرق بعید کے بعض دیگر ممالک میں ایسا ہی بڑی بڑی یادگاریں بنائی جاتی ہیں۔ یہ دیو ہیکل اہرام مصر کیا ہیں؟ یہ قبرستان ہی تو ہیں۔ آج سے ساڑھے چھ ہزار سال قبل بننے والے یہ فرعونوں کے مزار ہیں۔ جس طرح مصری اور یونانی گمراہ ہوئے اسی طرح اب مسلمان بھی ہو رہے ہیں۔ جو بدعات صابی اور زرتشتی مذاہب میں تھیں وہی اب مسلمانوں میں بھی آ چکی ہیں جو چیزیں یہود و نصاریٰ نے اختیار کیں وہی مسلمان بھی اپنا رہے ہیں۔ اسی لیے تو حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ میری

امت کے لوگ بھی اہل کتاب سے اسی طرح مشابہت اختیار کریں گے جس
طرح ایک جوتا دوسرے جوتے کے مشابہ ہوتا ہے۔ غرضیکہ کہ اللہ نے
فرمایا کہ سابقہ قومیں بھی دین میں افراط و تفریط کی وجہ سے ہی گمراہ ہوئیں اور
وہ بہت سے دوسرے لوگوں کی گمراہی کا باعث بھی بنیں۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿٧٨﴾ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿٧٩﴾ تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿٨٠﴾ وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَاۗءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿٨١﴾

ترجمہ :- لعنت کی گئی اُن لوگوں پر جنہوں نے کفر کیا بنی اسرائیل میں سے داؤد (علیہ السلام) اور عیسیٰ ابن مریم (علیہ السلام) کی زبان پر، یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے گزرتے تھے ﴿٧٨﴾ وہ نہیں منع کرتے تھے ایک دوسرے کو برائی سے جو وہ کرتے تھے۔ البتہ بُری ہے کارگزاری جو وہ کرتے تھے ﴿٧٩﴾ دیکھے گا تو ان میں سے بہتوں کو کہ دوستانہ کرتے ہیں اُن لوگوں کے ساتھ جنہوں نے کفر کیا۔ البتہ بُری ہے وہ بات جو آگے بھیجا ہے اُن کے لیے اُن

کے نفسوں نے ، وہ یہ ہے کہ اللہ اُن پر ناراض ہوا ، اور
وہ عذاب میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے (۸۰) اور اگر یہ ایمان
رکھتے اللہ پر اور اللہ کے نبی پر اور اُس چیز پر جو اُتاری
گئی ہے اُس نبی پر ، تو نہ بناتے اُن کافروں کو اپنا دوست
لیکن بہت سے ان میں سے ایسے ہیں جو نافرمانی کرنے والے
ہیں (۸۱)

رابطہ آیات

گذشتہ آیات میں بنی اسرائیل کی خرابیوں اور ان کے باطل اعتقادات کا تذکرہ ہوتا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عیسائیوں کے مختلف فرقوں کے عقائد باطلہ کی تردید فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ مسیح علیہ السلام کو بعینہٖ خدا ماننا یا اُن کو تین خداؤں میں سے تیسرا تسلیم کرنا یا انہیں متصرف فی الامور خیال کرنا ، سب گمراہ کن عقائد ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مسیح علیہ السلام تو خالص توحید کی تبلیغ کرتے تھے ، کفر اور شرک سے روکتے تھے کیونکہ مشرک ابدی جہنمی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریمؑ کی پوزیشن بھی صاف کی کہ وہ تو اللہ تعالیٰ کی ایک نیک اور راست باز خاتون تھی اور وہ یہود کی طرف سے تفریط اور نصاریٰ کی افراط سے مبرا تھی۔ اس کے بعد اللہ نے دین میں غلو کرنے سے منع فرمایا۔ اللہ نے بنی اسرائیل پر جو ناراضگی کی اور جو دنیا میں اُن کو سزا دی ، اس کا تذکرہ بھی کیا اور عام لوگوں کو تنبیہ کی کہ وہ برائی سے باز آجائیں ورنہ انہیں بھی اُسی قسم کی سزا دی جائیگی ، جیسی بنی اسرائیل کے دو گروہوں کو دی گئی۔

بنی اسرائیل پر لعنت

آج کی آیات میں بنی اسرائیل کے دو گروہوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جنہوں نے اپنے انبیاء کی بار بار وعید کے باوجود اللہ کے احکام کی نافرمانی کی اور انہیں اس دنیا میں سزا دی گئی جس سے اُن کی شکلیں تبدیل ہو گئیں ارشاد ہوتا ہے لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ بنی اسرائیل میں اُن لوگوں پر لعنت کی گئی جنہوں نے کفر کیا۔ یہ بنی اسرائیل اپنے انبیاء کے اُمتی ہونے کے دعویدار تھے مگر انہوں نے نہ تو

شرائع الٰہیہ کو مانا اور نہ انبیاء کے کہنے پر برائیوں سے باز آئے، بلکہ اللہ کے
احکام کی صریح خلاف ورزی کی۔ فرمایا ایسے لوگوں پر لعنت کی گئی یعنی انہیں
خدا کی رحمت سے دور کر دیا گیا۔ وہ پھٹکار اور ذلت کا شکار ہو گئے مگر یہ
لعنت یکدم نہیں آئی بلکہ یہ سزا انہیں بار بار کی نافرمانیوں
اور سمجھانے کے باوجود نافرمانی پر اصرار کرنے کی وجہ سے دی گئی۔ دوسرے
مقام پر موجود ہے کہ اللہ کے نبی انہیں برے کاموں سے منع کرتے تھے
مگر وہ لوگ باز نہیں آتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر اللہ کی پھٹکار پڑی اور
وہ ملعون ٹھہرے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں

اللہ تعالیٰ نے یہاں پر جس لعنت کا تذکرہ کیا وہ دو مختلف زمانوں میں
دو مختلف انبیاء کی نافرمانی کی وجہ سے وارد کی گئی۔ پہلا واقعہ حضرت داؤد علیہ السلام
کے زمانہ کا ہے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر لعنت بھیجی عَلٰی لِسَانِ
دَاوٗدَ وَعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ یعنی حضرت داؤد علیہ السلام کی زبان سے اور عیسیٰ کی زبان سے اس گروہ کا تذکرہ سورۂ
اعراف میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام
کے ذریعے ان لوگوں کو حکم دیا تھا کہ وہ ہفتے کے دن مچھلی کا شکار نہ کریں
مگر یہ لوگ باز نہ آئے اور حیلے بہانے سے مچھلی کا شکار کرتے رہے۔ ان کی
حیلہ سازی یہ تھی کہ بظاہر تو ہفتہ کے دن مچھلیوں کو نہیں پکڑتے تھے مگر اس
دن انہیں حوض میں جمع کر لیتے تھے اور پھر اگلے دن سب کا شکار کر لیتے
تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے بار بار منع کرنے کے باوجود وہ لوگ باز نہ
آئے، آخر کار ان پر اللہ کا غضب نازل ہوا اور وہ اسی دنیا میں معتوب
ٹھہرے۔ اللہ نے ان کی شکلیں تبدیل کر کے انہیں بندر اور خنزیر بنا دیا اور
پھر تین دن کے بعد انہیں صفحۂ ہستی سے بالکل ناپید کر دیا اور یہ مسخ شدہ
شکلوں والے بنی اسرائیل ہلاک ہو گئے۔ اگرچہ ان کی تعداد کا ذکر قرآن و حدیث

میں نہیں ہے، تاہم تفسیری روایات کے مطابق اُن کی تعداد ہزاروں میں تھی۔
اس واقعہ کے مقام کے متعلق تورات میں ایلات کا ذکر آتا ہے۔ اور یہ بھی
جگہ ہے جو خلیج عقبہ کے پاس ہے اور آجکل اسرائیل کے قبضہ میں ہے۔ اس
مقام کے متعلق سورۃ اعراف میں حاضرۃ البحر کا ذکر آتا ہے۔ "وَسْئَلْهُمْ
عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ"
اور اُن سے اُس بستی کا حال پوچھو جو لب دریا واقع تھی۔

حضرت عیسٰی علیہ السلام کے زمانہ میں

دوسرا واقعہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے زمانہ کا ہے قوم کے کہنے پر حضرت
عیسٰی علیہ السلام نے اللہ سے درخواست کی تو اللہ نے آسمان سے مائدہ یعنی
دسترخوان اتارا۔ آپ نے بار بار تاکید کی کہ وقت ——— پر جتنا کھانا آئے
وہ سب میں تقسیم کردو اور اُسے ذخیرہ نہ بنانا مگر لوگ باز نہ آئے اور ذخیرہ اندوزی
شروع کردی۔ بعض لوگوں کو یہ کھانا کھانے سے منع کیا گیا تھا مگر وہ بھی
کھانے سے باز نہ آئے نتیجہ یہ ہوا کہ اُن پر اللہ کی لعنت نازل ہوئی۔ اس
واقعہ کا تذکرہ اسی سورۃ کے آخری حصے میں آئے گا۔ امام بیضاویؒ فرماتے
ہیں کہ جو لوگ بار بار منع کرنے کے باوجود باز نہ آئے اللہ نے اُن کی شکلیں
بگاڑ کر انہیں خنزیروں کی شکل میں تبدیل کردیا گیا ان لوگوں کی تعداد کا ذکر
بھی قرآن و حدیث میں نہیں ہے۔ تاہم تفسیری روایات کے مطابق ان کی
تعداد پانچ ہزار تھی۔

لعنت کی

فرمایا ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا یہ اس وجہ سے کہ وہ نافرمانی
کرتے تھے جس کے نتیجے میں اللہ کی ناراضگی نازل ہوئی اطاعت کے نتیجے
میں اللہ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے اور نافرمانی کی صورت میں اللہ کا
غضب ہوتا ہے۔ وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ وہ صرف نافرمانی ہی نہیں
کرتے تھے بلکہ حد سے تجاوز بھی کرتے تھے اور پھر اُن کا حال یہ تھا كَانُوْا
لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ وہ لوگ ایسے تھے

جو ایک دوسرے کو اس بُرائی سے نہیں روکتے جس کو وہ انجام دیتے تھے۔
تَنَاهِيْ يَتَنَاهِيْ باب تفاعل سے ہے یعنی ایک دوسرے کو منع کرنا۔ لوگوں کے سامنے برائی کا ارتکاب ہوتا تھا مگر وہ اُس سے روکتے نہیں تھے۔

غرضیکہ بنی اسرائیل پر لعنت دو وجوہات کی بنا پر ہوئی۔ پہلی یہ ہے کہ وہ لوگ نافرمانی کا ارتکاب کرتے تھے۔ ابتدا میں جب کوئی شخص برائی کا ارتکاب کرتا تو دوسرا کہتا اِتَّقِ اللّٰهَ اللہ سے ڈر جاؤ اور یہ فعل قبیح انجام نہ دو۔ پھر جب دوسرے دن وہی شخص برائی پر اصرار کرتا تو منع کرنے والا بھی اس کے ساتھ شریک ہو جاتا، وہ اکٹھے اٹھتے بیٹھتے اور اکٹھے کھاتے پیتے۔ چنانچہ برائی کرنے والا اور نہ کرنے والا اَکِيْلُهٗ وَشَرِيْبُهٗ وَ قَعِيْدُهٗ کے مصداق ہم نوالہ و ہم پیالہ ہو جاتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا غضب آیا اور ان کی شکلیں مسخ ہو کر بندروں اور خنزیروں کی بن گئیں اور وہ اس دنیا سے نیست و نابود ہو گئے۔

آخری امت کے لیے تنبیہ

بنی اسرائیل کی یہ خصلت بیان کرنے کے بعد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی امت کو بھی خطاب فرمایا اور کہا، بخدا لوگوں کو برائی سے منع کیا کرو اور حق پر قائم رہنے کی سخت تاکید کیا کرو، ورنہ تمہارا حشر بھی وہی ہوگا، جو بنی اسرائیل کا ہوا۔ تم پر بھی لعنت برسے گی اور بعض کے دل بعض کے ساتھ ٹکرائیں گے اور خرابیاں پیدا ہوں گی۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی سے وعدہ کیا ہے کہ آپ کی امت کے لوگوں کی شکلیں مسخ نہیں ہوں گی، اُن پر عمومی عذاب نازل نہیں کیا جائے گا، تاہم ان میں بنی اسرائیل والی ساری خرابیاں پیدا ہو جائیں گی۔

تفسیر مدارک والے ابوالبرکات نسفیؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اہل ایمان کے لیے سخت وعید ہے۔ انہیں چاہیئے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے رہیں ورنہ وہ بھی خدا کے معتوب، مغضوب اور ملعون ٹھہریں

گے۔ نیکی کا حکم اور برائی سے ممانعت کا کام بہت ضروری ہے اگر منع کرنے کے باوجود لوگ برائی سے باز نہیں آتے تو پھر ناصحین کا فرض ہے کہ ان سے علیحدگی اختیار کرلیں ورنہ خطرہ ہے کہ وہ بھی مغضوب علیہم میں شامل ہوجائیں گے اور ان پر بھی اللہ کا عتاب نازل ہوگا۔ حضور علیہ السلام نے اس بات میں سخت تاکید فرمائی ہے ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہایت ضروری ہے حسب استطاعت برائی کو طاقت سے روکے یا زبان سے اور اس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ برائی کو دل سے ہی برا جانے اور برے لوگوں کے ساتھ شامل نہ ہو۔ ابوداؤد شریف کی روایت میں آتا ہے کہ جو شخص برائی تو نہیں کرتا مگر برائی کو برا بھی نہیں سمجھتا، وہ ایسا ہی ہے جیسا خود برائی میں شریک ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص بالفعل نیکی کرنے پر قدرت نہیں رکھتا۔ مگر نیکی کو پسند کرتا ہے تو وہ بھی نیکی کرنے والوں کی مجلس میں حاضر سمجھا جائیگا۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

ایک حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں جسے امام ابن کثیرؒ نے بھی نقل کیا ہے۔ کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس امت کا خاصہ ہے اور یہ ترک ہوجائے اور برائی کرنے والوں کے ساتھ شرکت ہوجائے تو معتوب اور مغضوب ہونے والی بات ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا حضور! امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کب چھوڑ دی جائے گی۔ فرمایا جب تم میں وہی برائیاں پیدا ہوجائیں جو پہلی امتوں میں تھیں۔ صحابہؓ نے پھر عرض کیا۔ وہ پہلی امتوں والی باتیں کب پیدا ہوں گی فرمایا جب تمہاری بادشاہی اور حکومت رذیل لوگوں کے پاس چلی جائے گی اور بڑے لوگ فحاشی کا شکار ہوجائیں گے اور علم فاسق لوگوں کے پاس چلا جائے گا۔ فرمایا جب یہ حالات پیدا ہوجائیں گے تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ترک ہوجائے گا۔

حضور علیہ السلام کی پیش گوئی کے مطابق آج وہی حالات پیدا ہوچکے ہیں آج امراء اور حکام میں ذاتی اغراض اور تعیش پیدا ہوچکا ہے۔ سرکاری خزانے

کو باپ دادا کی جائداد تعلق برائی کے کاموں پر صرف کیا جا رہا ہے۔ کھیل
تماشے فحش اور فضول باتوں کا دور دورہ ہے۔ آج امر بالمعروف اور نہی المنکر
کا فریضہ کون ادا کر سکتا ہے؟ ہم سب مسلمان ہیں، ہم سب کا فرض تھا کہ
ایک دوسرے کو برائی سے روکتے۔ امراء تجار اور حکام کو برائی سے روکتے
اگر یہ روک ٹوک ہوتی تو وہ برائیوں میں مبتلا نہ ہوتے مگر ان کا خود [illegible] ایک
آدمی کو حرفِ شکایت بھی زبان پر لانے سے روکتے ہیں چہ جائیکہ انہیں
علی الاعلان بُرے کاموں سے روکا جائے۔ اب اس بُرائی کی کشتی میں سب
سوار ہیں پوری قوم معتوب اور مغضوب ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کی خصوصیات
ختم ہو گئی ہیں اور مسلمانوں کا شمار رذیل قوموں میں ہونے لگا ہے۔ حالانکہ یہ
ان کا امتیاز تھا کہ لوگوں کو برائی سے روکتے اور نیکی کی تلقین کرتے۔ برائی
سے منع تو وہ کرے گا جو خود اس برائی میں ملوث نہ ہو مگر یہاں تو معاملہ ہی
الٹ ہو چکا ہے آج برائی سے روکنے والا کون ہے؟ فرمایا جو لوگ برائی
سے نہیں روکتے لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ بہت ہی برا ہے
وہ کام جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ انہوں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ترک
کر دیا اور برے لوگوں کی ہم نشینی اختیار کی۔ برائیوں میں شریک ہوئے جس کا
نتیجہ یہ ہوا کہ خدا کا غضب نازل ہوا اور نبیوں کی زبان سے ان پر لعنت
بھیجی گئی۔

کفار سے دوستی

فرمایا آج بھی اہل کتاب کا حال یہ ہے تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ
يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا آپ ان میں سے بہتوں کو دیکھیں گے وہ
کافروں سے دوستی رکھتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان سے
دشمنی رکھتے ہیں حالانکہ یہ اپنے آپ کو اہل کتاب کہلاتے ہیں ان کی کفار مکہ
سے تو دوستی ہے مگر پاک دین والوں کے ساتھ نفرت ہے مدینے کے
یہودیوں میں سے کعب بن اشرف سخت دشمن اسلام تھا۔ وہ بہت بڑا

نادر تھا اور اس کی اپنی گڑھی تھی واقعہ بدر کے بعد مکے گیا اور مشرکوں کو مسلمانوں کے خلاف حمایت کا یقین دلایا۔ مشرکوں کی حوصلہ افزائی کی کہ ان مٹھی بھر مسلمانوں کا ایک ہی حملے میں صفایا کر دیا جائے گا۔ اس آیت میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔

بعض فرماتے ہیں کہ اس آیت کے مصداق منافقین مدینہ ہیں جو کافروں کے ساتھ دوستانہ رکھتے تھے اور ان تک مسلمانوں کے راز پہنچاتے تھے فرمایا لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ أَنفُسُهُمْ بہت برا ہے جو ان کے نفسوں نے آگے بھیجا ہے۔ اور وہ بری چیز کیا ہے؟ أَن سَخِطَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ یہ کہ اللہ تعالیٰ ان پر غضبناک ہوگیا۔ انہوں نے حق کو ترک کر کے باطل کی حمایت کی تو ان پر خدا تعالیٰ کی ناراضگی اور اس کا غضب نازل ہوا۔ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خَالِدُونَ اور وہ ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہیں گے۔ یہ ان کی کارگزاری کی سزا ہے کہ وہ ابدی جہنمی بن گئے۔

ایمان کا تقاضا

فرمایا وَلَوْ كَانُوا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ اور اگر یہ لوگ اللہ تعالیٰ پر صحیح طریقے سے ایمان لاتے۔ یعنی بظاہر تو کہتے ہیں کہ ہم مومن ہیں اور ہم موسیٰ علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام اور تورات اور انجیل پر ایمان رکھتے ہیں مگر فرمایا یہ صحیح ایماندار نہیں ہیں کیونکہ انہوں نے عقیدے خراب کر دیے ہیں، دین میں کفر اور شرک کی رسومات داخل کر دی ہیں اور جیسا کہ کل عرض کیا تھا برے لوگوں سے بری چیزیں اخذ کی ہیں۔ مجوسیوں، صابیوں، یونانیوں اور مصریوں سے کفر شرک کی باتیں سیکھی ہیں۔ غیر اللہ کی نیاز دی ہے، ان کی پرستش کی ہے، فال گیری اور جادو پر یقین رکھا ہے۔ رسومات باطلہ کو اختیار کیا ہے، بدعات کو جزو دین بنایا ہے اور اس لعنت میں گرفتار ہوئے ہیں۔ فرمایا اگر یہ صحیح طریقے سے اللہ پر ایمان لاتے وَالنَّبِيِّ اور نبی آخر الزمان پر بھی ایمان لاتے کیونکہ اس کے بعد کوئی نبی اور کوئی نیا پیغام

نہیں آئے گا۔ اور پھر اُس چیز پر بھی ایمان لاتے وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ جو اُس نبی کی طرف نازل کی گئی ہے مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ تو اُن کافروں کو دوست نہ بناتے۔ ایک سچا مومن ایمان والوں کو چھوڑ کر کافروں کے ساتھ دوستانہ نہیں کر سکتا۔

نافرمانوں کی کثرت

فرمایا وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ حقیقت یہ ہے کہ اہل کتاب کی اکثریت فاسق ہیں۔ ان میں بہت کم لوگ باصلاحیت ہیں جو ایمان کو قبول کرتے ہیں ورگرنہ اکثریت نافرمانوں کی ہے۔ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں مدینہ کے گرد و نواح میں دس بڑے یہودی عالم تھے۔ ایک موقع پر حضور علیہ السلام نے فرمایا تھا۔ کہ اگر یہ دس آدمی ایمان لے آئیں تو دنیا میں کوئی یہودی باقی نہ رہے۔ مگر ان میں سے صرف عبداللہ بن سلامؓ ایمان کی دولت سے مشرف ہوئے باقی سب باطل دین پر ہی رہے۔ اسی لیے فرمایا کہ ان میں بہت کم لوگ ہیں جنہوں نے ایمان قبول کیا، ان میں عدیؓ بن حاتم طائی اور تمیم داریؓ وغیرہ ہیں۔ جن کو اللہ نے توفیق بخشی اور وہ ایمان سے مشرف ہوئے تاہم نصاریٰ اور یہود کی اکثریت باطل پر قائم رہی اور چودہ صدیاں گزرنے کے باوجود یہ لوگ باطل پر ڈٹے ہوئے ہیں تو فرمایا ان میں اکثریت نافرمانوں کی ہے جو حق کی مخالفت کرتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ ابدی طور پر جہنم کے مستحق ٹھہرے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی لعنت کے مستوجب ہیں۔

یہود و نصاریٰ کا تذکرہ کر کے اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو بھی یہ بات سمجھا دی ہے کہ اگر تم میں بھی اہل کتاب والی برائیاں پائی گئیں۔ تو تم بھی اسی طرح معتوب و ملعون ٹھہرو گے جس طرح اہل کتاب اس لعنت میں گرفتار ہوئے۔

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿٨٢﴾ وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿٨٣﴾ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۙ وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٨٤﴾ فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٨٥﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿٨٦﴾

ترجمہ: البتہ پاؤ گے تم زیادہ شدید عداوت کے اعتبار سے مؤمنین کے حق میں یہود کو اور ان لوگوں کو جنہوں نے شرک کیا اور البتہ پاؤ گے تم زیادہ قریب دوستی میں اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ۔ اُن لوگوں کو جنہوں نے کہا کہ ہم نصاریٰ ہیں ۔ یہ اس واسطے کہ بیشک ان میں اہل علم اور

تارک الدنیا لوگ ہیں۔ اور بیشک وہ تکبر نہیں کرتے (۸۲) اور جس وقت سُنا انہوں نے اُس چیز کو جو اتاری گئی ہے رسول کی طرف۔ تو دیکھے گا اُن کی آنکھوں کو کہ وہ اشکبار ہو رہی ہیں، اس وجہ سے کہ انہوں نے پہچانا ہے حق کو اور کہتے ہیں، اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لائے ہیں پس لکھ دے ہمیں گواہی دینے والوں میں (۸۳) اور کیا ہے ہمیں کہ ہم نہ ایمان لائیں اللہ پر اور جو چیز ہمارے پاس آئی ہے حق سے اور کیوں نہ اُمید رکھیں اس بات کی کہ داخل کرے گا ہمیں ہمارا پروردگار نیک لوگوں کے ساتھ (۸۴) پس دیا اللہ تعالیٰ نے اُن کو بدلہ اس کا جو انہوں نے کہا جنتوں کا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں اُن میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اور یہی بدلہ ہے نیکی کرنے والوں کا (۸۵) اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور جھٹلایا ہماری آیتوں کو، یہی لوگ ہیں جہنم والے (۸۶)

ربط آیات

گذشتہ درس میں اہل کتاب کے دو گروہوں کے متعلق ذکر آچکا ہے کہ اُن کی نافرمانیوں، عصیان اور تعدی کی وجہ سے اللہ نے اپنے دو نبیوں کی زبان سے اُن پر لعنت بھیجی۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں یہودیوں نے مچھلی کے شکار سے متعلق اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کی اور حیلے بہانے سے ہفتے کے دن بھی شکار کرنے لگے۔ اس نافرمانی کی پاداش میں اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوا اور وہ لوگ خنزیروں اور بندروں کی شکلوں میں تبدیل ہوگئے۔ دوسرا گروہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے کا ہے جن کو منع کیا گیا تھا کہ آسمان سے نازل ہونے والے مائدہ کو کھاؤ پیو مگر اس کا ذخیرہ نہ کرو۔ انہوں نے اس حکم کی خلاف ورزی کی اور ذخیرہ اندوزی

شروع کر دی۔ پھر جن لوگوں کو مائدہ کھانے سے منع کیا گیا تھا، انہوں نے بھی اللہ کے حکم کی پرواہ نہ کی اور کھانا شروع کر دیا۔ ان پر بھی اللہ کا غضب نازل ہوا اُن کی شکلیں بھی مسخ ہوگئیں اور انہیں صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دیا گیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب کے عقاید باطلہ، اُن کے غلو اور تعصب کو بیان کر کے اُن کی مذمت فرمائی۔

یہود کی اسلام دشمنی

اب آج کی آیات میں یہود کی پھر سخت مذمت بیان کی گئی ہے۔ البتہ نصاریٰ کے حق میں کلماتِ خیر بھی کہے گئے ہیں۔ ان آیات کی روشنی میں بعض مفسرین نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اسلام دشمنی میں یہودی نصاریٰ کی نسبت زیادہ شدید ہیں اور عیسائی اسلام سے قریب تر ہیں۔ برخلاف اس کے مفسرِ قرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ آپ کے شاگرد حضرت سعید بن جبیرؒ اور حضرت قتادہؒ وغیرہم فرماتے ہیں کہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے تمام عیسائیوں کی مدح نہیں فرمائی بلکہ یہاں ایک خاص گروہ کی طرف اشارہ کر کے ان کی تعریف کی گئی ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی یہود و نصاریٰ کی اسلام دشمنی میں کوئی فرق نہیں جس طرح یہودی اسلام کو مٹانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں اسی طرح نصاریٰ نے بھی ہر دور میں اسلام دشمنی میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے۔ چنانچہ یہود کی عداوت کے متعلق ارشاد ہوتا ہے لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ مومنوں کے حق میں شدید ترین عداوت رکھنے والے تم یہود کو پاؤ گے، ان کی اسلام دشمنی کا حال تاریخ میں محفوظ ہے۔ حضور علیہ السلام کے اپنے زمانہ مبارک میں وہ جبنجی کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ ان بدبختوں نے پتھر گرا کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ہلاک کرنے کی کوشش کی مگر اللہ نے ان کی اس کوشش کو ناکام بنا دیا پھر انہوں نے آپ کو کھانے میں زہر دے دیا مگر اللہ نے وہاں بھی آپ کی حفاظت فرمائی انہوں نے پیغمبر اسلام اور اہلِ اسلام کو نقصان پہنچانے میں

کوئی کسر باقی نہ چھوڑی، جب اعلانیہ اسلام کے ساتھ ٹکر لینے میں ناکام ہوئے تو اندرونی سازشیں شروع کر دیں کچھ براہ راست مشرکین سے مل گئے اور بعض دوسروں نے زبان سے کلمہ پڑھ لیا مگر در پردہ منافقین کا کردار ادا کرتے رہے

مشرکین کی اسلام دشمنی

ایک تو یہود اسلام دشمنی میں شدید ہیں۔ دوسرے نمبر پر فرمایا وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا اور مشرکین بھی اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں میں پیش پیش ہیں مشرکین میں سے مکے کے مشرک خاص طور پر قابل ذکر ہیں مکی زندگی میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کے صحابہ کرام کے ساتھ مشرکین کی عداوت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان مکہ مکرمہ سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے، اہل اسلام کو دو دفعہ حبشہ کی طرف ہجرت کرنا پڑی مگر مشرکین نے وہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا بالآخر مسلمان مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کر گئے۔ وہاں بھی مکے والوں نے انہیں چین سے نہ بیٹھنے دیا اور پے در پے لڑائیاں ہوئیں جن میں بدر اور احد کے معرکے تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں حدیبیہ کا واقعہ بھی مشرکین مکہ کی اسلام دشمنی کا نتیجہ تھا۔ آخر جب مکہ فتح ہو گیا تو مسلمانوں کو چین نصیب ہوا۔ کچھ مشرکین ایمان لائے، کچھ مارے گئے اور کچھ بھاگ گئے۔

نصاریٰ کا کردار

جیسا کہ پہلے عرض کیا ہے اس آیت میں نصاریٰ کے جس گروہ کی تعریف کی گئی ہے، وہ حبشہ کا وفد تھا جو حضور علیہ السلام کی خدمت میں مدینہ طیبہ حاضر ہوا۔ اس وفد میں ستر آدمی تھے جن میں درویش اور عالم بھی تھے۔ حضور علیہ السلام نے ان کے سامنے سورۃ یٰس کی تلاوت فرمائی، ایمان تو پہلے ہی قبول کر چکے تھے، قرآن پاک کی آیات سن کر انہوں نے حقانیت کو پہچان لیا اور وہ خوب روئے۔ انہی لوگوں کے متعلق یہاں فرمایا وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى اور البتہ پائیں گے آپ اہل ایمان سے دوستی میں زیادہ قریب ان لوگوں کو جنہوں نے کہا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ وفد حبشہ کا یہی وہ خاص گروہ ہے جس کی اللہ تعالےٰ نے

تعریف بیان کی ہے۔ آگے اُس کی وجہ بھی بیان فرمائی ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا یہ اس وجہ سے کہ اس وفد میں کچھ عالم لوگ اور کچھ تارک الدنیا لوگ بھی تھے۔ ان میں یہودیوں کی نسبت فروتنی تھی۔ کسی قوم میں صاحب علم لوگوں کا ہونا نیک فال ہے اور عجز وانکساری اور درویشی بھی ایک اچھی صفت ہے اور ان لوگوں کی تعریف کی دوسری وجہ یہ تھی۔ وَاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ کہ وہ تکبر نہیں کرتے تھے۔ بلکہ یہودیوں کی اکڑ کے خلاف یہ لوگ عجز وانکساری کے حامل تھے۔ چوتھی صدی کے عظیم مفسر قرآن امام ابوبکر جصاصؒ اور مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ بھی فرماتے ہیں کہ اس آیت میں جن نصاریٰ کی مدح بیان کی گئی وہ یہی گروہ تھا اس تعریف کے مستوجب تمام نصاریٰ نہیں ہیں۔

اس وفد کے بعد نجاشی والیٔ حبشہ نے ایک دوسرا وفد بھی حضور علیہ السلام کی خدمت میں بھیجا تھا جس میں اسّی یا ایک سو تیس آدمی تھے۔ جن میں نجاشی کا بیٹا بھی شامل تھا مگر خدا کی قدرت راستے میں بحری سفر کے دوران یہ پورا قافلہ طوفان کی زد میں آگیا اور اُن میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچ سکا لہٰذا یہ وفد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نہ پہنچ سکا۔

حبشہ کی طرف ہجرت

اس سے پہلے خود مسلمان حبشہ کی طرف دو دفعہ ہجرت کر چکے تھے جس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور وہاں کا بادشاہ اصحمہ نجاشیؓ اپنے دیگر رفقا کے ہمراہ ایمان لے آیا۔ جب مکے کے مسلمانوں کو کافروں نے بہت زیادہ تکالیف دینا شروع کر دیں۔ تو حضور علیہ السلام نے اُن کو حبشہ کی طرف ہجرت کر جانے کی اجازت دے دی۔ نجاشی عیسائی مذہب رکھتا تھا اور قیصر روم کے تحت تھا۔ جب مسلمانوں کا دوسرا گروہ ہجرت کر کے حبشہ پہنچا تو نجاشی اُن کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آیا جب کفارِ مکہ کو علم ہوا کہ مسلمانوں کو حبشہ میں پناہ مل گئی ہے تو انہوں نے اپنا ایک وفد نجاشی کے پاس بھیجا تاکہ اُسے اس بات پر آمادہ کیا جاسکے کہ وہ مسلمانوں کو پناہ نہ دے۔ وفد کے ارکان نے نجاشی کو ورغلانے

کے لیے مختلف حربے استعمال کیے اور یہاں تک اُس کے کان بھر کر
مسلمان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نعوذ باللہ توہین کرتے ہیں اور انہیں غلام کہتے
ہیں نیز یہ کہ مسلمان عیسائی مذہب کے سخت مخالف ہیں۔ اگرچہ نجاشی پر اِس
بات کا خاطر خواہ اثر نہ ہوا، تاہم اُس نے مسلمانوں کو طلب کر کے ان کے دین
اور عقائد کے متعلق دریافت کیا اس کے جواب میں قائدِ وفدِ اسلامی حضرت
جعفر طیار رضؓ نے دربار نجاشی میں جو پر اثر تقریر کی وہ تاریخ میں محفوظ ہے
آپ نے فرمایا، شاہ! ہم ایک سخت جاہل قوم تھے، خود ساختہ بتوں کی پوجا
کرتے تھے۔ مردار کھاتے تھے، بدکاری اور بے رحمی ہماری معاشرت کا جزو
بن گیا تھا۔ ہم نہ ہمسایہ کے حقوق سے واقف تھے اور نہ اخوت و ہمدردی
سے واقف۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے ہم میں ایک ایسا عظیم الشان پیغمبر
مبعوث فرمایا جس کے حسب و نسب سے ہم واقف تھے اور جس کی عفت
و پاکدامنی ہمارے سامنے تھی، اس نے ہمیں جہالت کی تاریکی سے نکال کر ہدایت
کی روشنی عطا کی، ہم اس پر ایمان لائے، شرک سے توبہ کی۔ حلال و حرام میں
تمیز سیکھی۔ یہ ہمارا جرم ہے جس کی پاداش میں ہمیں آپ کے ملک میں پناہ
لینے پر مجبور کیا گیا۔ شاہ حبش پر اس کا بہت زیادہ اثر ہوا اور اس نے قریش
کے وفد کو بتا دیا کہ وہ ایسے نیکوکار لوگوں کو واپس کر کے ظلم و ستم کا نشانہ نہیں
بنانا چاہتا۔ نجاشی نے حضرت جعفرؓ سے پوچھا کہ جو کلام تمہارے نبی پر نازل
ہوتا ہے، وہ کیسا ہے؟ اس پر حضرت جعفرؓ نے سورۃ مریم تلاوت کی
جس کو سن کر نجاشی اور اس کے دربار کے علما آبدیدہ ہو گئے۔ نجاشی نے کہا
کہ یہ لوگ عیسیٰ علیہ السلام کی توہین نہیں کرتے بلکہ اُسی قسم کی بات کہتے ہیں
جو خود عیسیٰ علیہ السلام نے کہی تھی۔ سورۃ مریم میں صاف طور پر موجود ہے کہ
عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے رسول ہیں۔ بہر حال نجاشی نے فریقین کی بات سننے کے
بعد کہا کہ جاؤ امنت میں سیوم یعنی تم تو میرے ملک میں امن حاصل

سے اور تم اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے جہاں چاہو سکونت اختیار کر سکتے ہو۔
اس پر مشرکین مکہ ناکام واپس لوٹ آئے۔

نصاریٰ کی اسلام دشمنی

جیسا کہ پہلے عرض کیا کہ جن نصاریٰ کی یہاں تعریف کی گئی ہے وہ حبشہ کا وفد تھا، تاہم عام عیسائیوں کی اسلام دشمن رویوں سے کسی طرح کم نہیں یہ لوگ بھی ابتداء سے لے کر نزول مسیح تک اسلام کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ یہودیوں کے پاس تو اقتدار نہیں تھا مگر عیسائی ہمیشہ صاحب اقتدار رہے ہیں لہٰذا انہوں نے ہر دور میں عظیم عداوت کا مظاہرہ کیا ہے ترکوں نے چار سو سال تک عیسائیوں کا مقابلہ کیا۔ زار روس بھی عیسائی تھا۔ اس کے ساتھ بھی مسلمانوں کی ٹکر ہوتی رہی۔ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کے دور میں دو سو سال تک عیسائیوں اور مسلمانوں میں جنگیں ہوتی رہیں۔ جب عیسائیوں نے بیت المقدس پر قبضہ کیا تو چالیس ہزار بے گناہ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ان میں بچے بوڑھے اور عورتیں بھی شامل تھیں۔ پھر جب صلاح الدین ایوبیؒ نے بیت المقدس پر دوبارہ قبضہ کیا تو کسی عیسائی کو ناحق قتل نہیں کیا گیا۔ یہ بات تاریخ میں محفوظ ہے۔ اُس وقت سے لیکر آج تک نصاریٰ مسلمانوں کے خلاف اپنی پوری قوت استعمال کرتے رہے ہیں۔ لبنان میں فلانکس پارٹی کے لوگ سب عیسائی ہیں جنہوں نے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے جب یہاں پر ایوب کی حکومت تھی اُس وقت قبرص میں وہاں کے میکاریوس نے چالیس ہزار ترکوں کو ہلاک کیا۔ اُدھر فلپائن میں مارکوس نے وہاں کے پچاس لاکھ مسلمانوں کو تنگ کر رکھا ہے انہیں مورو یعنی قزاق مسلمان کہا جاتا ہے اور اُن پر طرح طرح کی مصیبتوں کے پہاڑ توڑے جاتے ہیں۔ وہاں پر بھی ہزاروں مسلمان عیسائیوں کے ہاتھوں قتل ہو چکے ہیں۔

انگریزوں کی اسلام دشمنی کی پوری تاریخ گواہ ہے۔ انہوں نے ایک ایک کر کے مسلمانوں کی کتنی حکومتیں ختم کیں۔ زار روس کے زمانے میں مسلمانوں

کیساتھ کیاسلوک کیا وہ بھی عیسائی تھے صلیبی جنگوں کے دو سو سالہ دور میں مسلمانوں کو جس طرح تباہ و برباد کیا گیا وہ عیسائیوں کی سفاکی کی منہ بولتی تصویر ہے امام شاہ ولی اللہ اپنی کتاب تفہیمات الٰہیہ میں لکھتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام کے نزول کا زمانہ جس قدر قریب آتا جائے گا مسلمانوں پر عیسائیوں کے مظالم بڑھتے جائیں گے۔ یہ اس بات کی دلیل ہوگی کہ نزول مسیح کا زمانہ قریب آگیا ہے۔ پھر جب آپ تشریف لے آئیں گے تو نہ کوئی یہودی باقی رہے گا اور نہ عیسائی، ہر طرف اسلام ہی کا کلمہ بلند ہوگا۔

بعض انگریز پرست مسلمان بھی کہتے ہیں کہ انگریزوں کا دامن صاف ہے حالانکہ یہ قوم مسلمانوں کی عظیم دشمن ہے جتنا نقصان اسلام کو اس قوم سے پہنچا ہے کسی دوسری قوم سے سرزد نہیں ہوا۔ انگریز نے گذشتہ چار صدیوں میں مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کی خلافت اور اس کے ساتھ اجتماعیت کو ختم کیا، اُن سے کئی ممالک چھین لیے اور انہیں غلام بنا لیا، امریکہ تو ابھی کل کا بچہ ہے، یہ پرانے انگریز ہیں جنہوں نے اسلام دشمنی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ بہرحال اس آیت کریمہ میں عیسائیوں کی جو تعریف کی گئی ہے وہ حبشہ کے وفد کے ارکان کی ہے، نہ کہ بحیثیت مجموعی عام عیسائیوں کی۔

آبدیدہ آنکھوں والے

سب لوگ ایک سے بھی نہیں ہوتے، سورۃ آل عمران میں گزر چکا ہے لَيْسُوْا سَوَآءً یعنی سارے یہود و نصاریٰ برابر نہیں۔ گذشتہ سورۃ میں بھی دو دفعہ اللہ کا یہ فرمان آچکا ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں میں بعض باصلاحیت لوگ بھی ہوتے ہیں مگر اُن کی تعداد بہت قلیل ہے، البتہ ان کی اکثریت نافرمانوں پر مشتمل ہے۔ یہاں بھی جن لوگوں کی تعریف بیان کی گئی ہے وہ باصلاحیت، متوازن، سادہ لباس اور عاجزی والے لوگ تھے۔ ان میں کتب آسمانی کے عالم اور درویش منش لوگ تھے اُن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَاِذَا سَمِعُوْا

مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ جس وقت وہ سنتے ہیں اس چیز کو جو اُتاری گئی ہے رسول کی طرف تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ آپ ان کی آنکھوں سے آنسو بہتے ہوتے دیکھتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ وفد کے ارکان نے جب ــــــ سورۃ یٰسٓ سنی تو آبدیدہ ہو گئے۔ حدیث شریف میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد مبارک ہے کہ دو قسم کی آنکھیں ایسی ہیں جن پہ دوزخ کی آگ حرام ہے ایک وہ آنکھ جو اللہ کے خوف سے روتی ہے اور دوسری وہ جو اللہ کے راستے میں حفاظت کے لیے پہرہ دیتی ہے۔ فرمایا ایسی آنکھوں والے کبھی دوزخ میں نہیں جائیں گے حتیٰ کہ اونٹنی کا دودھ اس کے تھنوں میں واپس آجائے، جس طرح دوہے ہوئے دودھ کا تھنوں میں واپس جانا ناممکن ہے۔ اسی طرح چشم تر کا دوزخ میں جانا محال ہے۔ خدا کے خوف سے آبدیدہ ہو جانا اللہ نے نبیوں کی صفت بیان کی ہے۔

حق کی پہچان

فرمایا اللہ کا کلام سن کر آبدیدہ ہو جانا اس وجہ سے تھا مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ کہ انہوں نے حق کو پہچان لیا تھا۔ سورۃ یٰسٓ میں اسلام کے تمام بنیادی عقائد کا بیان ہے اس میں توحید، رسالت، قیامت، قرآن کی حقانیت اور دیگر تمام اہم موضوعات اس سورۃ میں موجود ہیں، چنانچہ ارکان وفد یہ سچا کلام سن کر رو دیے۔ انہوں نے حق کو پہچان لیا يَقُوْلُوْنَ کہنے لگے رَبَّنَآ اٰمَنَّا اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لائے ہیں فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ پس ہمیں لکھ لے تو گواہی دینے والوں میں اور یہ گواہی دینے والے حضور خاتم المرسلین کی امت کے لوگ ہیں جو اپنے نبی کے حق میں گواہی دیں گے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر حضور علیہ السلام نے تمام لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ قیامت کے دن میرے متعلق تم سے سوال کیا جائے گا تو تم کیا جواب دو گے، سب نے کہا کہ ہم گواہی

دیں گے۔ اَدَّیْتَ الْاَمَانَۃَ وَبَلَّغْتَ الرِّسَالَۃَ وَنَصَحْتَ الْاُمَّۃَ آپ نے امانت کو پہنچا دیا، اور حق رسالت ادا کر دیا اور امت کے لوگ باقی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے حق میں بھی گواہی دیں گے کہ تمام انبیائے اللہ کے احکام اپنی اپنی امتوں تک پہنچا دیے۔ سورۃ بقرہ میں بھی اس آخری امت کو شاہدین کی امت کہا گیا ہے۔ بہرحال ارکانِ وفد نے کلام الٰہی سن کر کہا کہ اے مولا کریم! ہمیں بھی گواہی دینے والوں کی فہرست میں شامل کرے۔

نیکی و بدی کی جزا

وفد حبشہ کے ارکان نے یہ بھی کہا وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰہِ کیا وجہ ہے کہ ہم اللہ پر ایمان نہ لائیں وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ اور اس چیز پر ایمان نہ لائیں جو آئی ہے ہمارے پاس حق سے۔ گویا انہوں نے کہا کہ ایمان باللہ اور ایمان بالکتاب کے لیے ہماری ہر طرح سے تسلی ہو چکی ہے اور ایسا کرنے میں اب کوئی چیز مانع نہیں ہے وَنَطْمَعُ اَنْ یُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِیْنَ اور ہم کیوں نہ اُمید رکھیں کہ ہمارا پروردگار ہمیں بھی نیک لوگوں کے ساتھ داخل کرے گا۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَاَثَابَھُمُ اللّٰہُ بِمَا قَالُوْا پس دے دیا اللہ تعالیٰ نے ان کو بدلہ اُس چیز کا جو انہوں نے کہی۔ یعنی اُن کی طرف سے اعترافِ حق کے نتیجہ میں اللہ نے اُن سے وعدہ کر لیا جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ ایسے باغات کا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ وہ لوگ اللہ کے بہشت میں داخل ہو جائیں گے مگر کسی عارضی مدت کے لیے نہیں بلکہ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اور وہاں سے نکالے نہیں جائیں گے وَذٰلِکَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِیْنَ اور یہ بدلہ ہو گا نیکی کرنے والوں کا یعنی جو شخص ایمان لاتا ہے، حق کو پہچانتا ہے اور نیکی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی اور انکساری کا اظہار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایسا ہی بدلہ دیا کرتا ہے۔

اور اس کے برخلاف وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے بھیجے ہوئے پروگرام پہ ایمان لانے سے انکار کر دیا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا۔ شریعت الٰہیہ کی بات کو قبول ہی نہ کیا۔ ہمارے احکام کی تکذیب کی، ہمارے دلائل کو سچا نہ سمجھا، ہمارے بھیجے ہوئے رسولوں کا اور نازل کی گئی کتابوں کا انکار کر دیا، فرمایا اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ یہی لوگ جہنم والے ہیں۔ یہ ہمیشہ اسی میں جلتے رہیں گے۔ انکار کرنے والوں اور آیات الٰہی کو جھٹلانے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحَرِّمُوا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿٨٧﴾ وَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ حَلَالًا طَيِّبًا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي أَنتُم بِهِ مُؤْمِنُونَ ﴿٨٨﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! مت حرام ٹھہراؤ وہ پاکیزہ چیزیں جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے حلال قرار دی ہیں اور نہ حد سے آگے بڑھو بیشک اللہ تعالیٰ نہیں پسند کرتا حد سے آگے بڑھنے والوں کو ﴿۸۷﴾ اور کھاؤ اس چیز میں سے جو اللہ نے تم کو رزق دیا ہے حلال اور پاکیزہ چیزیں اور ڈرو اس اللہ تعالیٰ سے جس پر تم ایمان رکھتے ہو ﴿۸۸﴾

ربطِ آیات

پہلے اہل کتاب کی مذمت بیان ہوئی، پھر اللہ تعالیٰ نے ایک خاص گروہ کی تعریف بھی بیان فرمائی جنہوں نے ایمان قبول کیا اور وہ باصلاحیت لوگ تھے۔ اللہ نے یہ بھی سمجھا دیا کہ اہل ایمان کے ساتھ شدید ترین عداوت رکھنے والے یہودی اور مشرک ہیں البتہ نصاریٰ اس ضمن میں کم عداوت رکھتے ہیں پھر اللہ نے اس کی دو وجوہات بھی بیان فرمائیں کہ ان میں اہلِ علم، تارکِ دنیا اور متواضع لوگ بھی ہیں جس قوم میں یہ صفات پائی جائیں، وہ ایک اچھی سوسائٹی سمجھی جاتی ہے۔

یہاں پر رہبانیت کی مدح سے یہ شبہ گزرتا تھا کہ شاید یہ کوئی اچھی چیز ہے مگر اگلی آیت میں اس شبہ کا ازالہ کر دیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو خبردار کر دیا

ہے کہ رہبانیت کوئی اچھی چیز نہیں، بلکہ دینِ حق کے خلاف ہے گذشتہ آیات سے رہبانیت کا جو تعریفی پہلو نکلتا ہے وہ ایک ذیلی بات ہے اور اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ لوگ رہبانیت ـــــــ کو بطور قانون تسلیم کرکے ترکِ دنیا کا شیوہ اختیار کرلیں۔ آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے طیبات یعنی پاکیزہ چیزوں کا تذکرہ کرکے اُن کے استعمال کا حکم دیا ہے، اگر اِن حلال اور پاکیزہ چیزوں کو چھوڑ دیا جائے تو یہی رہبانیت اور ترکِ دُنیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ امر نہیں ہے۔

آج کی آیات کا ربط اسی سورۃ کی ابتداء میں متذکرہ قانونِ حلت و حرمت کے ساتھ ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ گذشتہ سورۃ نساء میں محرمات نکاح کا قانون تھا اور سورۃ مائدہ میں حلال و حرام چیزوں کا قانون بیان کیا گیا ہے۔ بنی اسرائیل نے اسی قانون حلت و حرمت کو توڑا تو اللہ نے اُن کی مذمت بیان فرمائی۔ یہودیوں میں یہ بُری خصلت خاص طور پر پائی جاتی تھی کہ وہ حیلے بہانے سے حرام چیزوں کو کھانے کی کوشش کرتے تھے۔ اور نصاریٰ نے رہبانیت کا راستہ اختیار کر لیا تھا، یہ دونوں طریقے غلط تھے، دونوں گروہ افراط و تفریط کا شکار ہو چکے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں پر درست سمت کی طرف راہنمائی فرمائی ہے۔

قانونِ حلت و حرمت

ارشاد ہوتا ہے۔ يَاۤ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اے ایمان والو! لَا تُحَرِّمُوا طَيِّبَاتِ مَاۤ أَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ مت حرام ٹھہراؤ، پاک چیزیں جو اللہ نے تمہارے حلال قرار دی ہیں وَلَا تَعْتَدُوا اور تعدی اختیار نہ کرو کیونکہ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ اللہ تعالےٰ تعدی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ لہٰذا افراط و تفریط سے بچ جاؤ اور غلو نہ کرو، بلکہ اللہ کی حلال کردہ اشیاء سے استفادہ حاصل کرو۔ طیبات

کا اطلاق حلال یعنی جائز اشیا پر بھی ہوتا ہے اور لذیذ یعنی مرغوب اشیا پر بھی، جو
چیزیں عام طور پر طبائع انسانیہ کے ساتھ موافقت رکھتی ہیں۔ وہ پاکیزہ اور حلال
ہیں اور جن کے طبائع انسانیہ متنفر ہیں وہ حرام اور ناجائز کی فہرست میں آتی ہیں
بہر حال اللہ تعالیٰ نے پاک اور حلال چیزوں کو حرام قرار دینے سے منع فرمایا ہے

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ کسی حلال چیز کو حرام قرار دینے کی تین مختلف
صورتیں ہیں اور اُن کے احکام بھی مختلف ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ جس چیز
کو اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے کوئی شخص اگر اعتقاداً اس کو حرام سمجھنے لگے
تو وہ کافر ہو گیا۔ کسی قطعی حلال چیز کو حرام سمجھنے والا آدمی دائرہ اسلام سے خارج
ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اللہ کی حرام کردہ چیز کو حلال سمجھتا ہے
تو وہ بھی کفر کا مرتکب ہوتا ہے۔ حلت و حرمت کی دوسری صورت یہ ہے
کہ کوئی شخص عقیدے کے طور پر تو حرام کو حلال یا حلال کو حرام نہیں سمجھتا مگر
اپنی زبان سے اس چیز کا اقرار کر لیتا ہے، جیسے قسم اٹھائے کہ اگر میں نے
فلاں چیز کھائی تو وہ میرے لیے خنزیر جیسی حرام ہے۔ یہ چیز قسم کے دائرہ
میں آتی ہے اور اس کا ذکر اگلی آیت میں آ رہا ہے بہر حال اگر کسی شخص نے
کسی حلال چیز کو استعمال نہ کرنے کی قسم اٹھائی ہے تو اُسے چاہیئے کہ وہ اپنی
قسم توڑ دے اور اُس کا کفارہ ادا کرے اور اگر قسم نہیں اٹھائی ویسے ہی کوئی
بیہودہ بات کر دی ہے تو اُسے توبہ کرنے کا حکم دیا جائے گا، کفارہ نہیں
ادا کرنا پڑے گا، قسم کے الفاظ صریح ہوں یا اُن سے قسم کا مطلب نکلتا
ہو، تب بھی کفارہ ادا کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ سورۃ تحریم میں اس کی مثال
موجود ہے حضور علیہ السلام نے شہد کے متعلق فرمایا دیا تھا کہ میں اسے استعمال
نہیں کروں گا، تو اللہ تعالیٰ کا حکم آگیا "یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ
مَآ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ" آپ ایسی چیز کو اپنے اوپر کیوں حرام قرار
دیتے ہیں جو اللہ نے آپ کے لیے حلال قرار دی ہے۔ اور پھر ساتھ ہی فرمایا

قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ اللہ نے تمہاری قسموں کا کفارہ مقرر کر دیا ہے۔ لہٰذا طیب چیزوں کو استعمال کرو اور قسم کا کفارہ ادا کرو۔

رہبانیت یا بدعت

حلت و حرمت کی تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص کسی حلال چیز کو کارِ ثواب سمجھ کر ترک کر دے اور سمجھے کہ ایسا کرنے سے تقرب الٰہی حاصل ہوگا تو اس کو رہبانیت اور بدعت کہا جاتا ہے، اور اس کا خلاف کرنا ضروری ہو جاتا ہے کیونکہ لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْاِسْلَامِ اسلام میں رہبانیت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ رہبانیت کی مثالی صورت یہ ہے کہ کوئی کارِ ثواب سمجھ کر یا اللہ کا قرب حاصل کرنے کی خاطر نکاح کرنے سے انکار کر دے یا کھانا پینا چھوڑ دے یا اچھا لباس پہننے سے انکار کر دے یہ سب رہبانیت کے دائرہ میں آتا ہے اور اسلام نے اس کی اجازت نہیں دی۔ بلکہ اس کی مذمت آئی ہے

ہاں ترکِ حلال کی جائز صورت یہ ہے۔ کہ انسان کسی چیز کے ترک کو ثواب سمجھے بغیر کسی جسمانی یا روحانی بیماری کے علاج کے لیے ایسا کرے۔ بعض آدمی بعض سبزیاں نہیں کھاتے کہ جسمانی طور پر ان کے لیے مضر ہوتی ہیں بعض لوگوں کو گائے کا گوشت موافق نہیں آتا۔ بعض بیماریوں میں گھی اور دودھ کا استعمال مضرِ صحت ہوتا ہے۔ لہٰذا ان چیزوں کو ترک کر دیا جاتا ہے مگر ثواب یا تقرب الی اللہ کے لیے نہیں بلکہ طبی نقطۂ نظر سے ایسا کیا جاتا ہے اسی طرح بعض روحانی بیماریوں کے لیے بھی بعض حلال چیزوں کو ترک کر دیا جاتا ہے۔ بزرگانِ دین جو اس قسم کے علاج تجویز کرتے ہیں۔ وہ جائز ہے اور اس سے قسم لازم نہیں آتی۔ بعض اوقات بزرگ عبادت میں انہماک کے لیے قلتِ طعام تجویز کرتے ہیں مگر نہ تو وہ طعام کو حرام سمجھتے ہیں اور نہ کم کھانے کو کارِ ثواب میں داخل کرتے ہیں۔ مولانا شاہ اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں کہ اس معاملہ میں بزرگانِ دین نے جو طریقہ اختیار کیا ... اسے اس تیسری صورت پر محمول کرنا چاہیئے

یہ بدعت نہیں بلکہ روحانی علاج ہے کہ انسان کھانا کم کردے یا سادہ لباس پہننے لگے۔

سادہ اور عمدہ لباس

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا معمول تھا کہ وہ سادہ لباس پہنتے تھے۔ خواجہ معین الدین اجمیریؒ بھی سادہ لباس کو پسند کرتے تھے۔ خلیفۃ المسلمین حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ شہزادگی کے زمانے میں پانچ پانچ سو درہم کا کرتہ یا چادر استعمال کرتے تھے مگر جب مسند خلافت پر متمکن ہوئے تو آپ کا لباس صرف دو درہم مالیت کا ہوتا تھا۔ لباس کے متعلق بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے البسوا ما شئتم تم جیسا چاہو لباس پہنو مالم یکن مخیلۃ ولا سرف جب تک وہ تکبر اور اسراف والا نہیں ہونا چاہیئے۔ بعض صحابہ کرامؓ پشمینہ جیسا قیمتی لباس زیب تن کرتے تھے، پشمینہ ریشم سے ملتا جلتا کپڑا ہے مگر ریشم نہیں۔ ریشم مردوں کے لیے قطعی حرام ہے امام ابوحنیفہؒ اور آپ کے شاگرد امام محمدؒ بہت قیمتی لباس پہنتے تھے۔ ہمارے بزرگوں میں مولانا اشرف علی تھانویؒ عمدہ لباس پہنتے تھے، البتہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا حسین احمد مدنیؒ سادہ اور معمولی لباس کو پسند فرماتے تھے۔ اچھا اور عمدہ لباس اگر حلال کمائی کا ہو اور اس میں تکبر اور اسراف نہ پایا جائے تو بالکل جائز ہے قرآن پاک میں موجود ہے۔ "قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ" (اعراف) اے پیغمبر آپ کہ دیجئے کہ کس نے حرام کر دیا ہے اللہ کی زینت کو جس کو اس نے اپنے بندوں کے لیے نکالا ہے۔ جائز زینت اختیار کرنا جائز ہے، البتہ ناجائز زینت مکروہ اور حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جائز زینت اور پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیا ہے، انہیں کھاؤ اور اس کا شکریہ ادا کرو۔ حد سے آگے نہ بڑھو۔ اسراف اور تبذیر سے پرہیز کرو۔

زہد کی تعریف

کسی حلال چیز کو اپنے اوپر حرام قرار دے لینا زہد کی تعریف میں نہیں آتا۔ ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے لیست الزھادۃ فی الدنیا

بتحریم الحلال ولا اضاعۃ المال دنیا میں زہد اس چیز کا نام نہیں کہ کسی حلال چیز کو حرام قرار دیدیا جائے اور نہ مال کو ضائع کرنے کا نام ہے۔ ولکن الزھادۃ فی الدنیا ان لا تکون مما فی یدیک اوثق مما فی ید اللہ زہد تو یہ ہے کہ جو کچھ تمہارے ہاتھ میں ہے اس پر زیادہ اعتماد نہ ہو اس چیز کی نسبت جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اپنی چیز کو فانی سمجھو۔ کوئی چیز پائیدار نہیں، جو چیز اللہ کے پاس ہے وہی مستقل ہے۔ اسی نظریے کا نام زہد ہے۔ بہرحال فرمایا اے ایمان والو! نہ حرام کرو وہ پاکیزہ چیزیں جو اللہ نے تمہارے لیے حلال قرار دی ہیں اور نہ حد سے بڑھو کیونکہ یہ چیز اللہ کو ہرگز پسند نہیں۔

حلال اور پاک روزی

آگے فرمایا وَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ حَلَالًا طَيِّبًا اور کھاؤ اللہ نے تمہیں جو روزی دی۔ ہے بشرطیکہ وہ حلال بھی ہو اور پاک بھی ہو۔ حلال چیز وہ ہے جسے شریعت نے حرام قرار نہیں دیا اور طیب اس لحاظ سے کہ طبع انسانی اس کی طرف مائل ہوتی ہے۔ کھانا عمدہ، لذیذ اور مرغوب ہو تو انسانی طبیعت خود بخود اس کی طرف مائل ہو جاتی ہے، یہی اس کی پاکیزگی کی علامت ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے۔ کہ ایسی چیز میں کسی کا حق متعلق نہ ہو بکری کا گوشت حلال اور طیب ہے اگر یہی گوشت کسی چوری یا غصب شدہ بکری کا ہے تو وہ پاک نہیں ہوگا۔ بکری کا گوشت صحیح ذبح کے ساتھ بالکل حلال ہے مگر جب تک حقدار کو اس کا حق یا اس کا بدلہ نہیں ادا ہوگا ایسا گوشت ناپاک رہے گا۔ اور اس کا کھانا درست نہیں ہوگا۔

طیب چیز میں ظاہری پاکیزگی کا ہونا بھی لازم ہے۔ گندی اور خبیث چیز کا استعمال جائز نہیں۔ قرآن پاک میں سورۃ اعراف میں نبی کی ایک تعریف یہ بھی بیان کی گئی ہے "يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ

عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ "وہ طیب چیزوں کو حلال اور خبیث چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے۔ اسی لیے محدثین اور فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ پکا ہوا سالن حلال اور طیب ہے لیکن اگر وہ گل سڑ جائے اور اس میں بدبو پیدا ہو جائے تو وہی سالن مکروہ تحریمی بن جائے گا کیونکہ وہ جسمانی صحت کے لیے مضر اور بیماری کا باعث ہو گا۔ اسی طرح سنکھیا یا زہر کے بارے میں فرمایا نھی عن الدواء الخبیث خبیث دوا کے استعمال سے منع فرمایا گیا ہے زہر ناپاک نہیں ہے مگر اپنے اثر کے اعتبار سے مہلک ہونے کی وجہ سے خبیث ہے اس کا استعمال جائز نہیں سنکھیا زہر ایسی صورت میں استعمال ہو سکتا ہے جب کہ اس کا کشتہ کر دیا ہو، اور اس کی نہایت قلیل مقدار استعمال کی جائے۔

تقویٰ اختیار کرو

شریعت نے جو چیزیں حرام قرار دی ہیں ان میں کوئی نہ کوئی جسمانی خرابی ہے یا روحانی۔ حلال کو حلال اور حرام کو حرام سمجھنا ملتِ ابراہیمی کا اہم اصول ہے۔ اگر حلال کو حرام قرار دے دیا جائے تو مصلحتِ عامہ خراب ہو جائے گی سوسائٹی پر اس کے بُرے اثرات مرتب ہوں گے، لہٰذا حلال چیزوں سے استفادہ کرنا چاہیئے۔ اور حرام چیزوں سے پرہیز لازم ہے اسی چیز کا نام تقویٰ ہے اور اس کے متعلق اللہ نے فرمایا وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ اللہ سے ڈرتے رہو۔ اس اللہ سے جس کے متعلق ایمان رکھتے ہو کہ وہ ہمارا خالق اور مالک ہے۔ حلت و حرمت کا قانون اسی کے دائرہ اختیار میں ہے اس کے قانون کی پابندی میں تمہاری ترقی کا راز مضمر ہے اور قانون کی خلاف ورزی تمہاری تنزلی کا پیش خیمہ ہے اس سے تمہاری دنیا اور عاقبت دونوں ضائع ہو جائیں گی۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ۭ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۸۹﴾

ترجمہ: اللہ تعالیٰ مؤاخذہ نہیں کرتا تم سے تمہاری خو بیہودہ قسموں کے بارے میں لیکن وہ مؤاخذہ کرتا ہے تم سے اس کے بارے میں جو تم نے پختہ طریقے پر قسمیں کھائی ہیں پس اس کا کفارہ کھانا کھلانا ہے دس مسکینوں کو درمیانے درجے کا جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو یا دس مسکینوں کو کپڑا پہنانا یا گردن یعنی غلام آزاد کرنا ہے پس جو شخص نہ پائے ان میں سے کوئی چیز، پس اس کی قسم کا کفارہ تین دن کے روزے رکھنے سے ہو گا۔ یہ کفارہ ہے تمہاری قسموں کا جب تم قسم اٹھا بیٹھو، اور محفوظ رکھو اپنی قسموں کو، اسی طرح اللہ تعالیٰ بیان کرتا ہے تمہارے لیے اپنے احکام تاکہ تم شکر ادا کرو ﴿۸۹﴾

حلت و حرمت کا قانون

یہود و نصاریٰ کی مذمت بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے تحلیل و تحریم کا

ذکر فرمایا۔ سورۃ کی ابتداء میں بھی کھانے پینے کی محرمات کا بیان تھا کسی حلال چیز کو حرام قرار دے لینے کی کئی ایک صورتیں ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص کسی حلال چیز کو اعتقاداً حرام سمجھے۔ ایسی صورت میں وہ اسلام سے خارج ہو کر کفر میں چلا جائے گا۔ کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیز کو از خود حرام قرار دے لیا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص کسی حلال چیز کو دل سے تو حرام نہیں سمجھتا مگر زبان سے اُسے حرام کہتا ہے آگے اس کی بھی دو شکلیں ہیں۔ اگر حلال چیز کو نیکی سمجھ کر حرام کہتا ہے یا تقرب الی اللہ کے لیے زبان سے حرام کہتا ہے تو یہ بدعت اور رہبانیت ہے، اس کا ترک واجب ہے اور اگر ایسی چیز کو زبان سے اس طور پر حرام کہتا ہے کہ اس میں قسم کا معنیٰ پایا جاتا ہے وہ قسم بلاضرورت ہے تو یہ گناہ کی بات ہے، چنانچہ آج کے درس میں ایسی ہی قسم کے ازالے کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے۔ حلت و حرمت کی تیسری قسم بھی پہلے بیان ہو چکی ہے۔ کہ اگر کوئی شخص جسمانی یا روحانی بیماری کے پرہیز کے طور پر کسی حلال چیز کو استعمال نہیں کرتا، تو اس میں کوئی برائی نہیں، ایسا کرنا درست ہے۔

جائز اور ناجائز قسم

بہرحال کسی حلال چیز کو از خود حرام قرار دے لینا درست نہیں ہے اگر اس میں قسم کا معنیٰ پایا جاتا ہے تو ایسی قسم کا توڑنا ضروری ہو جاتا ہے اور اس کا کفارہ ادا کرنا پڑتا ہے، جس کا ذکر اس آیت کریمہ میں کیا گیا ہے۔ ویسے بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قسم کے متعلق یہ بات سمجھائی ہے کہ مَنْ حَلَفَ عَلٰی یَمِیْنٍ فَرَاٰی غَیْرَھَا خَیْرًا مِّنْھَا فَلْیَاْتِ الَّذِیْ ھُوَ خَیْرٌ وَلْیُکَفِّرْ عَنْ یَمِیْنِہٖ جو شخص کسی بات پر قسم اٹھا لیتا ہے پھر دیکھتا ہے کہ یہ بات تو اچھی نہیں ہے اس کے علاوہ دوسری بات اچھی ہے تو اسے وہ کام کرنا چاہیئے جو بہتر ہے اور قسم توڑنے کا کفارہ ادا کر دینا چاہیئے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ میں خود

بھی کسی چیز پر قسم اٹھا لیتا ہوں مگر دیکھتا ہوں کہ دوسری بات بہتر ہے وَكَفَّرْتُ عَنْ يَمِيْنِيْ تو اپنی قسم کا کفارہ ادا کر دیتا ہوں یعنی ایسی قسم کو توڑ دیتا ہوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ کسی شخص کا قسم پر اصرار کرنا بہتر نہیں ہے اُسے قسم توڑ کر اُس کا کفارہ ادا کر دینا چاہیئے۔ ہاں اگر قسم کسی ایسی چیز پر اُٹھائی ہے جس میں کوئی قباحت نہیں تو پھر قسم کو پورا کرنا چاہیئے اور اگر وہ قسم معصیت سے متعلق ہے تو اُسے فوراً توڑ کر کفارہ ادا کرے ایسی ہی معصیت کی قسم کے متعلق امام مالکؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اُسے توڑ دینے پر کفارہ ادا کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے مگر امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ ایسی قسم کو توڑنا ضروری ہے کیونکہ وہ معصیت کی بات ہے البتہ اُس کا کفارہ ادا کرنا پڑے گا۔ قسم اور اس کے متعلقات کا تذکرہ سورۃ بقرہ میں بھی ہو چکا ہے۔ تاہم یہاں پر اس کے کفارے کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

قسم کی تین اقسام

قسم تین اقسام پر ہوتی ہے یعنی لغو، غموس اور منعقدہ۔ لغو کا معنیٰ بیہودہ ہوتا ہے یعنی ایسی قسم جو بغیر ارادہ اور نیت کے زبان سے نکل جائے عربوں کے ہاں یہ عام محاورہ تھا کہ وہ بات بات پر قسم اٹھاتے تھے لَا وَاللّٰهِ بَلٰى وَاللّٰهِ حالانکہ اُن کا ارادہ قسم اٹھانے کا نہیں ہوتا تھا محض زبان پر قسم کے الفاظ جاری ہو جاتے تھے۔ ایسی قسم پر نہ کوئی گرفت ہے اور نہ اس کا کفارہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ البتہ لغو ہی کی دوسری قسم غموس قابلِ مواخذہ ہے۔ البتہ اس پر کفارہ نہیں۔ اس قسم کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی گزرے ہوئے واقعہ کے متعلق جھوٹی قسم اٹھا جائے کہ زید آیا تھا۔ مگر فی الحقیقت وہ نہ آیا ہو۔ ایسی قسم میں جھوٹ کی وجہ سے گناہ سرزد ہوتا ہے اس لیے اسے یمین غموس کہتے ہیں کیونکہ غمس کا معنیٰ گناہ میں غوطہ مارنے کا ہے۔

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے شبہ کی بنا پر کوئی غلط قسم اٹھائی تو وہ بھی لغو ہی شمار ہوگی۔ مثلاً کوئی شخص دور سے کوئی کالی چیز دیکھ کر کہتا ہے واللہ یہ تو انجن ہے مگر کچھ دیر بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ انجن نہیں بلکہ بھینس ہے۔ تو یہ بھی لغو ہے، اشتباہ کی وجہ سے ایسا ہوا ہے لہٰذا ایسی قسم پر بھی کوئی کفارہ نہیں۔ البتہ گزری ہوئی بات پر اگر کوئی شخص عمداً قسم اٹھائے، تو ایسا شخص گنہگار ہوگا مگر اس پر بھی کفارہ نہیں۔

لغو قسم کے متعلق سورۃ بقرہ میں بھی آیت گزر چکی ہے۔ "لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ" اللہ تعالیٰ نہیں مؤاخذہ کرتا تمہاری لغو قسموں پر "وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ" مگر اُن قسموں پر مؤاخذہ ہے جو تم دل کے ارادے سے اٹھاتے ہو مؤاخذہ میں دنیاوی اور اُخروی دونوں مواخذے شامل ہیں دنیاوی مواخذہ یہ ہے کہ قسم اٹھانے والے کو کفارہ ادا کرنا پڑتا ہے اور اُخروی مؤاخذہ میں انسان گنہگار ہو جاتا ہے۔ بہر حال اس آیت میں بھی قسم کے متعلق ویسے ہی الفاظ ہیں "لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ" یعنی اللہ تعالیٰ تم سے تمہاری بیہودہ قسموں کے متعلق مؤاخذہ نہیں کرتا۔ "وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ" بلکہ اُن قسموں پر مؤاخذہ کرتا ہے جو پختہ طریقے یعنی دل کے ارادے سے اٹھاتے ہو۔ قسم کی یہی قسم تیسری ہے جسے قسم منعقدہ کہا جاتا ہے۔

اس قسم کا تعلق مستقبل سے ہوتا ہے کہ کوئی شخص یوں قسم اٹھائے کہ میں آنے والے زمانہ میں فلاں کام کروں گا یا نہ کروں گا۔ اگر ایسی قسم کسی جائز کام کے لئے ہے اور اُس شخص نے قسم کو پورا کر دیا تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ اور اگر اس جائز قسم کو از خود توڑ دیا ہے تو اس کا کفارہ ادا کرنا ہوگا، جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ اور اگر یہی قسم کسی ناجائز کام کے لیے ہے تو اس کا توڑنا واجب

ہو جاتا ہے۔ ایسی قسم کے کفارے کے متعلق امام مالکؒ اور امام شافعیؒ فرماتے
ہیں کہ ضرورت نہیں ہے۔ البتہ امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ
قسم توڑنے کے ساتھ کفارہ بھی واجب ہوگا۔

کفارہ اطعام مساکین

ایسی ہی قسم کے کفارے کے متعلق ارشاد ہوتا ہے فَكَفَّارَتُهُ
إِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسَاكِينَ اس کا کفارہ دس مسکینوں اور محتاجوں کو کھانا
کھلانا ہے مِنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعِمُونَ أَهْلِيكُمْ
درمیانے درجے کا کھانا جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو۔ مقصد یہ ہے
کہ کھانا اوسط درجے کا ہو۔ نہ ایسا کم تر کہ بالکل خشک روٹی ہے اور
نہ بہت اعلیٰ درجے کا جس میں کئی قسم کے کھانے ہوں۔ اوسط درجے
میں عام روٹی سالن آسکتا ہے جو عام طور پر لوگ گھروں میں کھاتے ہیں۔
تاہم دس مسکینوں کو دو وقت کھانا کھلانا ہوگا خواہ گھر بلا کر کھلا دے یا
اُن کے ٹھکانے پر پہنچا دے۔ اور مسکین میں وہ لوگ شمار ہوں گے جو زکوٰۃ کے
مستحق ہوں۔ اِن میں بلوغت کی شرط نہیں ہے۔ بالغ ہوں یا قریب البلوغ
اُن کو کھلانے سے کفارہ ادا ہو جائے گا۔ البتہ بہت چھوٹے بچے جو پورا
کھانا نہیں کھا سکتے وہ ان میں شامل نہیں ہوں گے۔ کفارہ کی دوسری
صورت یہ بھی ہے کہ کھانا پکا کر کھلانے کی بجائے ہر مسکین کو روزے
کے فدیہ کے برابر اناج دے دے۔ اس لیے نصف صاع گندم یا ایک
صاع کوئی دوسرا اناج دینا ہوگا۔ یعنی اگر گندم دے تو دو سیر اور اگر کوئی
دوسری جنس ہو تو چار سیر ادا کرے۔ حضور علیہ السلام کے فرمان کے مطابق
مذکورہ اناج یا اُس کی قیمت بھی ادا کی جا سکتی ہے۔ یہ کفارے کی پہلی صورت ہے

کپڑا پہنانا

کفارہ ادا کرنے کا دوسرا طریقہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا أَوْ كِسْوَتُهُمْ
یا ان دس مساکین کو کپڑا پہنا دے۔ کپڑے کی مقدار کے متعلق فقہائے کرام
اور محدثین عظام فرماتے ہیں کہ ہر مسکین کو اتنا کپڑا دینا چاہئے جس سے اس

کا بورا جسم ڈھک جائے۔ مثلاً ایک بڑا کرتہ یا بڑی چادر دے دے تو کفارہ
ادا ہو جائے گا۔ ایک بڑی شلوار سے بھی جسم کا اکثر حصہ ڈھک جاتا ہے۔ لہٰذا
یہ بھی دی جا سکتی ہے تاہم بہتر یہ ہے کہ ہر ایک کو ایک ایک جوڑا کپڑے
دیئے جائیں جسے پہن کر آدمی باسہولت نماز ادا کر سکے۔

غلام کی آزادی

فرمایا قسم کے کفارے کی تیسری صورت یہ ہے اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ
یا غلام آزاد کرنا۔ دنیا میں غلامی کا رواج صدیوں پرانا ہے نزولِ قرآن کے زمانے
میں بھی پوری دنیا میں موجود تھا۔ یہ شخصی غلامی ابھی گذشتہ صدی میں ختم ہوئی ہے
البتہ اس کی جگہ اب اجتماعی غلامی نے لے لی ہے۔ اب دنیا کی بڑی طاقتوں
امریکہ، روس اور انگریزوں نے پوری پوری قوموں اور ملکوں کو غلام بنا رکھا
ہے۔ کافر قوموں نے بڑے بڑے ملکوں پر بزور قبضہ کر کے انہیں اپنی
کالونیاں بنا لیا اور وہاں کے باشندوں کو اقتصادی لحاظ سے یا انسانی حقوق
کی نسبت سے غلام بنا لیا، نو آبادیات کے بادل اب بہت حد تک
چھٹتے جا رہے ہیں تاہم کچھ عرصہ قبل تک حالت یہ تھی کہ ریل کے ڈبے میں
گورا اور کالا اکٹھے سفر نہیں کر سکتے تھے۔ یہاں ہندوستان میں ایسا ہی ہوتا
رہا ہے۔ اس غلامی کا دوسرا بڑا نشانہ جنوبی افریقہ ہے۔ جس میں گاندھی نے
اس غلامی کے خلاف بہت تحریک چلائی۔ جب انگریزوں کے ڈبے میں
بیٹھتا تھا تو وہ اُس کا سامان باہر پھینک دیتے تھے اور وہ کئی کئی دن تک
ریلوے سٹیشن پر پڑا رہتا تھا۔ آخر بڑی جدوجہد کے بعد اُس نے انگریزوں سے
کچھ حقوق منوائے اور کالے لوگ بھی انگریزوں کے ساتھ کاڑی میں سفر کرنے لگے
جب اسلام کا ظہور ہوا تو اس انٹرنیشنل رواج کی اصلاح کا حکم دیا گیا۔
غلاموں پر ظلم و ستم کو حرام قرار دیا گیا۔ فرمایا یہ بھی تمہارے بھائی ہیں کسی وجہ
سے تمہارے زیرِ اثر آ گئے ہیں۔ اُن سے ہمدردی کا سلوک کرو جو خود کھاتے ہو
انہیں بھی کھلاؤ اور جو خود پہنتے ہو انہیں بھی پہناؤ۔

غلاموں سے زیادہ مشقت نہ لو۔ اگر کام مشکل ہو تو خود بھی ان کے ساتھ ہاتھ بٹاؤ
یہ حضور علیہ السلام کی تعلیم کا اثر تھا کہ اسلام میں داخل ہو کر غلاموں نے بڑی بڑی خدمات
انجام دیں۔ ان میں بڑے بڑے فقیہہ اور محدث پیدا ہوئے جنہیں نہایت
احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اسلام نے غلاموں کو نہ صرف ان کے حقوق دلائے
بلکہ کما حقہٗ ان کی عزت افزائی بھی کی۔

چونکہ اسلام کی نظر میں غلامی ایک غیر فطری چیز ہے اس لیے اسلام نے
مختلف طریقوں سے غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیب بھی دی۔ مسلم شریف
کی روایت میں آتا ہے کہ کسی غلام کو آزاد کرنے والے شخص کا ہر ہر عضو اس
آزادی کے بدلے میں جہنم کی آگ سے آزاد ہو جائے گا۔ مختلف جنایات
میں غلام کی آزادی کو کفارہ قرار دیا۔ چنانچہ روزہ کھا جانے کا کفارہ، قتل کا
کفارہ، ظہار کا کفارہ اور قسم کا کفارہ غلام کی آزادی میں رکھا۔ صرف قتل کے
کفارہ میں مومن غلام کی آزادی کی شرط ہے، دیگر جنایات میں مومن یا کافر،
بچہ یا بڑا، عورت یا مرد کوئی بھی کفارہ کے طور پر آزاد کیا جا سکتا ہے۔ غرضیکہ
قسم کے کفارہ کے متعلق فرمایا کہ دس مسکینوں کو کھانا کھلائے یا انہیں کپڑا پہنائے
یا ایک غلام آزاد کرے۔

تین روزے — کفارے کی تین صورتیں بیان کرنے کے بعد فرمایا فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ
جو شخص ان تین میں سے کوئی صورت نہ پائے۔ یعنی نہ تو وہ کھانا کھلانے کی استطاعت
رکھتا ہو اور نہ کپڑا پہنانے کی اور اس کے پاس غلام بھی نہ ہو جسے آزاد کر سکے
تو فرمایا فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ تو تین دن کے روزے رکھے۔ کفارہ کی یہ
چوتھی صورت ہوئی۔ بشرطیکہ پہلی تین صورتوں میں سے کسی پر بھی قادر نہ
ہو۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ حضرت ابی ابن کعبؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ
کی روایت میں آتا ہے فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ مُتَتَابِعَاتٍ
یعنی یہ تین روزے متواتر رکھنا ہوں گے۔ ان کے درمیان وقفہ نہیں ہونا

چاہیئے۔ رمضان کے روزوں کی قضا میں تو ایسی پابندی نہیں ہے، قضا
روزے آمدہ سال تک کسی وقت بھی رکھے جا سکتے ہیں۔ رمضان کے روزے
بعض اوقات سفر یا بیماری کی وجہ سے قضا ہو جاتے ہیں یا عورتوں کے حیض
ونفاس کے دوران چھوٹ جاتے ہیں، وہ پورے سال میں کسی بھی وقت رکھے
جا سکتے ہیں۔ تاہم قسم کے کفارے کے روزے پے درپے رکھنا ضروری ہے
فقہائے کرام یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے کفارے کے دو روزے
رکھے اور اس کے بعد اس کے پاس اتنا مال آگیا جس سے وہ دس مسکینوں کو
کھانا کھلا سکتا ہے یا کپڑا پہنا سکتا ہے یا ایک غلام آزاد کر سکتا ہے تو روزوں
سے کفارہ ادا نہیں ہوگا بلکہ اُسے پہلی تین صورتوں میں سے کوئی ایک پوری کرنا ہوگی

قسموں کی حفاظت

فرمایا ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ یہ تمہاری قسموں کا کفارہ
البتہ یہ سوال باقی رہتا ہے کہ کفارہ قسم توڑنے سے پہلے ادا کرنا چاہیئے یا
بعد میں۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ کفارہ قسم توڑنے سے پہلے بھی ادا کیا جا
سکتا ہے مگر امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ پہلے قسم توڑے اس کے بعد کفارہ
ادا کرے، تو فرمایا یہ کفارہ ہے تمہاری قسموں کا اِذَا حَلَفْتُمْ
جب تم قسم اٹھا بیٹھو۔ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ اور اپنی قسموں
کی حفاظت کرو۔ یعنی قسم اٹھانا کوئی اچھی بات نہیں ہے، اس سے بچنے کی
کوشش کرو اور اگر کسی معاملہ میں گواہ موجود نہ ہوں اور قسم کے بغیر چارہ نہ ہو تو پھر
اس کی اجازت بھی ہے اور اس کا پورا کرنا بھی ضروری ہے۔ اگر قسم اٹھا کر توڑ
دی جائے تو اس کے کفارہ کی ادائیگی لازم ہو جائے گی۔ قسم کی حفاظت کا یہ مطلب
ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی خیال رہے کہ قسم صرف اللہ کے نام
کی کھائی جا سکتی ہے، اس کے علاوہ کسی دوسرے کے نام کی قسم درست نہیں
ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو آدمی قسم اٹھاتا ہے، اس کے پاس دلیل نہیں ہوتی
اور نہ وہ گواہ پیش کر سکتا ہے۔ لہٰذا فریق ثانی کو یقین دلانے کے لیے

قسم اٹھاتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب والشہادت کا نام لے کر یا اس کی کوئی صفت بیان کرکے بات کرتا ہے کہ اگر وہ غلط بیانی کرتا ہے تو اس اللہ تعالیٰ کی سزا سے نہیں بچ سکے گا جو ہر چیز کو جانتا ہے۔

فرمایا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ اسی طرح اللہ تعالیٰ بیان کرتا ہے تمہارے لیے اپنی آیتیں۔ آیت کا معنیٰ، دلیل نشانی معجزہ یا حکم ہوتا ہے۔ یہاں پر حلت وحرمت کے احکام مراد ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں واضح طور پر بیان فرما دیا ہے کہ کون کون سی چیز حلال ہے اور کونسی حرام ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ تاکہ تم اللہ کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرسکو، اس نے تمہیں جہالت سے نکال کر واضح راستہ بتا دیا ہے کہ فلاں فلاں مشکل کا فلاں فلاں حل ہے۔ ان احکام کے ذریعے تم گناہ سے بچ سکتے ہو اور اپنے آپ کو پاک کرسکتے ہو۔ لہٰذا ان احکام پر عمل کرکے اللہ کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرو۔

کھانے پینے کی چیزوں کی حلت وحرمت کا ذکر اس سورۃ میں خاص طور پر کیا گیا ہے۔ سابقہ سورتوں میں خون، مردار، خنزیر کے گوشت اور نذر لغیر اللہ کا تذکرہ ہوچکا ہے۔ تحلیل وتحریم کی بعض چیزوں کا ذکر یہاں بھی آگیا ہے۔ اس کے بعد اگلی آیت میں بعض دیگر محرمات کا ذکر آرہا ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِنَّمَا ٱلْخَمْرُ وَٱلْمَيْسِرُ
وَٱلْأَنصَابُ وَٱلْأَزْلَٰمُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ ٱلشَّيْطَٰنِ
فَٱجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٩٠﴾ إِنَّمَا يُرِيدُ
ٱلشَّيْطَٰنُ أَن يُوقِعَ بَيْنَكُمُ ٱلْعَدَٰوَةَ وَٱلْبَغْضَآءَ
فِى ٱلْخَمْرِ وَٱلْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَن ذِكْرِ ٱللَّهِ
وَعَنِ ٱلصَّلَوٰةِ ۖ فَهَلْ أَنتُم مُّنتَهُونَ ﴿٩١﴾
وَأَطِيعُوا۟ ٱللَّهَ وَأَطِيعُوا۟ ٱلرَّسُولَ وَٱحْذَرُوا۟ ۚ فَإِن
تَوَلَّيْتُمْ فَٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا ٱلْبَلَٰغُ
ٱلْمُبِينُ ﴿٩٢﴾ لَيْسَ عَلَى ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَعَمِلُوا۟
ٱلصَّٰلِحَٰتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوٓا۟ إِذَا مَا ٱتَّقَوا۟
وَّءَامَنُوا۟ وَعَمِلُوا۟ ٱلصَّٰلِحَٰتِ ثُمَّ ٱتَّقَوا۟
وَّءَامَنُوا۟ ثُمَّ ٱتَّقَوا۟ وَّأَحْسَنُوا۟ ۗ وَٱللَّهُ يُحِبُّ
ٱلْمُحْسِنِينَ ﴿٩٣﴾ ع ۱۲/۷/۲

ترجمہ :۔ اے ایمان والو ! بیشک شراب اور جوا
اور بُت اور تقسیم کے تیر گندگی ہے اور شیطان کے کام
سے ہے ۔ پس بچو اس سے تاکہ تم فلاح پاؤ ﴿۹۰﴾

بیشک ارادہ کرتا ہے شیطان کہ ڈال دے تمہارے درمیان دشمنی اور نفرت شراب اور جوئے کے سلسلے میں اور روک دے تم کو اللہ کے ذکر اور نماز سے، پس کیا تم باز آؤ گے؟ (۹۱) اور فرمانبرداری کرو اللہ کی اور فرمانبرداری کرو رسول کی اور ڈرتے رہو۔ پس اگر تم روگردانی کرو گے تو جان لو کہ بیشک ہمارے رسول کے ذمے پہنچا دینا ہے کھول کر (۹۲) نہیں ہے اُن لوگوں پر جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے کوئی گناہ اس چیز میں جو انہوں نے کھایا جب کہ وہ ڈرتے رہے اور ایمان لائے اور اچھے کام کیے پھر وہ ڈرتے رہے اور ایمان پر قائم رہے پھر وہ ڈرتے رہے اور نیکی کے کام کیے انہوں نے، اور اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے نیکی کرنے والوں کو (۹۳)

ربطِ آیات

گذشتہ درس میں حلت و حرمت کا قانون بیان ہو چکا ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ جن پاک چیزوں کو اُس نے حلال قرار دیا ہے اُن کو حرام نہ بناؤ۔ نہ تو اعتقاداً انہیں حرام سمجھو اور نہ قسم اٹھا کر از خود اپنے لیے حرام قرار دو، بلکہ اُن سے استفادہ حاصل کرو اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرو۔ اب آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے کچھ مزید محرمات کا ذکر کیا ہے اور حرام کردہ اشیا سے بچنے کا حکم دیا ہے۔ حرام کردہ اشیا میں یقیناً کوئی دینی، دنیاوی، جسمانی یا روحانی نقصان ہے جس سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔ جس طرح حلال چیز کو حرام کر لینے سے فساد پیدا ہوتا ہے اور اجتماعی مصلحت خراب ہوتی ہے۔ اسی طرح حرام چیز کو استعمال کرنے سے ملی اور اجتماعی مصلحت کو نقصان پہنچے گا۔

شراب اور جوا

ارشاد ہوتا ہے۔ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ اے ایمان والو! إِنَّمَا ٱلْخَمْرُ وَٱلْمَيْسِرُ بیشک شراب اور جوا۔ یہاں اُن چیزوں کا ذکر آ رہا ہے۔ جنہیں اللہ تعالیٰ نے قطعاً حرام قرار دے کر اُن سے بچنے کا حکم دیا ہے۔ شراب اور جوئے کا ذکر سورۃ بقرہ

میں بھی ہو چکا ہے۔ "یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ" اے پیغمبر (علیہ السلام) لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے متعلق دریافت کرتے ہیں کہ ان کے متعلق کیا حکم ہے۔ تو وہاں پر اللہ نے صرف اتنا حکم دیا "قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ" ان دو چیزوں میں بڑا گناہ ہے مگر ان میں لوگوں کے لیے بعض فوائد بھی ہیں۔ نقصانات اور گناہ کا ذکر تو ابھی اگلی آیت میں آ رہا ہے تاہم شراب کا ایک فائدہ یہ ہے کہ یہ جسم میں حرارت پیدا کرتی ہے جس سے خون میں جوش پیدا ہوتا ہے اور انسانی جسم کے لیے سردی سے بچاؤ کا ایک ذریعہ بنتا ہے۔ اسی طرح جوئے میں بغیر مشقت اٹھائے مال حاصل ہوتا ہے اور اس سے صدقہ خیرات بھی کیا جاتا ہے۔ عرب لوگ جوئے کی کمائی سے صدقہ خیرات کو بڑا افضل جانتے تھے اسی لیے فرمایا کہ ان دو چیزوں میں گناہ بھی ہے اور کچھ فائدہ بھی ہے "وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا" تاہم ان دونوں اشیاء میں نفع کی نسبت گناہ کا عنصر غالب ہے۔ بہرحال اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے شراب اور جوئے کے فوائد و نقصانات کا تذکرہ کیا مگر ان کی قطعی حرمت کا حکم نہیں دیا تھا۔

اس سے پہلے سورۃ نحل میں بعض پھلوں کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے فرمایا "تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا" تم ان پھلوں سے نشہ آور اشیاء (شراب وغیرہ) اور اچھا رزق (چٹنی، اچار، مربہ، وغیرہ) بنا لیتے ہو۔ یہاں پر اگرچہ حلت و حرمت کا ذکر تو نہیں کیا مگر نشہ آور اشیاء کو "رِزْقًا حَسَنًا" سے علیحدہ کر کے ان کی حیثیت کو کمتر قرار دے دیا۔ شراب کے متعلق یہ سب سے پہلی آیت تھی اس کے بعد سورۃ بقرہ کی مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی جس میں شراب اور جوئے کے فائدے اور نقصان کا ذکر کیا گیا۔ تاہم اس کی حرمت کے متعلق قطعی حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ اس دوران حضرت عمرؓ دعا کیا کرتے تھے

اَللّٰهُمَّ بَیِّنْ لَنَا فِی الْخَمْرِ بَیَاناً شَافِیاً
اے اللہ! ہمارے لیے شراب کے متعلق کوئی واضح حکم نازل فرما۔ لوگ ابھی تک شراب پی رہے تھے۔ پھر سورۃ نساء کی یہ آیت نازل ہوئی یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ یعنی اے ایمان والو! نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ یہاں تک کہ تم جان سکو کہ کیا کہہ رہے ہو۔ اس آیت کریمہ کے پس منظر میں یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ کسی شخص نے بعض صحابہ کرامؓ کی دعوت کی۔ کھانے کے بعد شراب کا دور بھی چلا جس سے انہیں نشہ آگیا اتنے میں نماز کا وقت ہوگیا، نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو امام غلط پڑھ گئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نشے کی حالت میں نماز پڑھنے سے منع فرمادیا۔

چونکہ اس قبیح چیز کے متعلق ابھی واضح حکم نہیں آیا تھا۔ اس لیے حضرت عمرؓ کسی اٹل حکم کے لیے دعائیں مانگتے رہے حتیٰ کہ آج کی یہ آیت نازل ہوئی اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ..... الخ اور شراب، جوا، بت اور تقسیم کے تیر ہمیشہ کے لیے حرام قرار دے دیے گئے۔ گویا شراب کی حرمت بتدریج نازل ہوئی۔ سب سے پہلے سورۃ نحل میں نشہ اور اشیاء کی تیاری کی طرف اشارہ کیا۔ پھر سورۃ بقرہ کی آیت کریمہ نازل ہوئی جس میں فرمایا گیا کہ شراب اور جوئے میں فائدہ اور نقصان دونوں عناصر پائے جاتے ہیں مگر ان کا نقصان ان کے فائدے سے بڑا ہے۔ پھر تیسرے نمبر پر سورۃ نساء کی آیت نازل ہوئی جس میں نشے کی حالت میں نماز کے قریب جانے سے منع کیا گیا اور آخر میں سورۃ مائدہ کی اس آیت نے شراب اور دیگر اشیاء کو قطعی حرام قرار دے دیا۔ اس آیت کے نزول پر حضور علیہ السلام نے اعلان فرمایا کہ شراب کا پینا، بنانا، خریدنا اور بیچنا بالکل ممنوع ہوگیا ہے۔ پھر آپ نے شراب کے برتنوں کو استعمال کرنے سے بھی منع فرمادیا۔ اور صحابہ کرامؓ نے شراب

نشہ کرنے والے مٹکے اور پینے پلانے والے دیگر برتن توڑ ڈالے تاہم مزید کچھ عرصہ بعد شراب کے برتنوں کے استعمال کی اجازت دے دی البتہ فرمایا کُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ یعنی ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔ حضور علیہ السلام کا یہ بھی فرمان ہے اَلْخَمْرُ جِمَاعُ الْاِثْمِ یعنی شراب تمام گناہوں کی جامع ہے جو شخص شراب پیئے گا وہ دنگا فساد کرے گا، قتل اور زنا کا مرتکب ہوگا اور دیگر برائیاں انجام دے گا، اسی لیے اس قبیح چیز کو جامع الاثم کہا گیا ہے شراب کے مختلف ناموں میں سے ایک کا نام اثم بھی ہے جس کا معنی گناہ ہے۔ اس آیت میں اللہ نے جوا بھی قطعی حرام قرار دیا ہے۔ عربوں میں تیر کے ذریعے جوا کھیلا جاتا تھا مگر اب تاش، شطرنج، گھوڑ دوڑ، لاٹری وغیرہ اس کی مختلف صورتیں ہیں۔ جن کے ذریعے ہار جیت کا فیصلہ کیا جاتا ہے اور یہ سب شکلیں حرام ہیں۔

بُت پرستی اور تیر

فرمایا بیشک شراب اور جوا وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ اور بت اور تقسیم کے تیر۔ ظاہر ہے کہ بُت اور بُت پرستی تو اسلام میں قطعی حرام ہیں۔ بتوں کے نام پر ذبیحہ کو بھی حرام قرار دیا گیا ہے۔ تاہم مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ کے علاوہ جس چیز کی بھی عبادت کی جائے یا نذر و نیاز دی جائے وہ بھی اس حکم میں داخل ہو کر حرام ہے۔ یہاں پر دوسری چیز ازلام کا ذکر ہے جو زلم کی جمع ہے اور اس کا معنی تقسیم اور جوئے کے تیر ہیں۔ ان کا ذکر اسی سورۃ کی ابتداء میں بھی ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں دیگر چیزوں کو حرام قرار دیا وہاں ان کے متعلق بھی فرمایا اَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ کہ تم تیروں کے ذریعے کوئی چیز تقسیم کرو۔ تیروں کا استعمال دو طریقے سے ہوتا تھا۔ قسمت کا حال معلوم کرنے کے لیے کاہن لوگ یہی تیر استعمال کرتے تھے۔ ان کے پاس بہت سے تیر ہوتے تھے جب کوئی غرض مند سفر، تجارت یا شادی وغیرہ کے متعلق حال معلوم کرنا

جاتا تو وہ کاہن کے پاس جاتا جو تیر نکالتا۔ اس کام کے لیے عام طور پر تین تیر استعمال کیے جاتے تھے، ایک پر لفظ نعم لکھا ہوتا، دوسرے پر لا اور تیسرا خالی ہوتا۔ حسب ضرورت ان میں سے کوئی ایک تیر نکالا جاتا۔ اگر نعم والا تیر نکلتا تو کاہن کہتا کہ جس کام کا ارادہ کیا ہے وہ کر ڈالو، اس کا نتیجہ تمہارے حق میں نکلے گا۔ اگر لا والا تیر نکلتا تو اس شخص کو مسئولہ کام کرنے سے منع کر دیا جاتا کہ اس کا نتیجہ تمہارے حق میں بہتر نہیں ہے۔ اور اگر تیسرا خالی تیر نکل آتا تو پھر معاملہ ملتوی کر دیتے اور پھر کسی آئندہ موقع پر دوبارہ تیر نکلواتے۔

تیروں کے استعمال کی ایک اور صورت یہ تھی کہ کل دس تیروں میں سے سات تیروں پر ایک سے لے کر سات تک نمبر لکھے ہوتے اور تین تیر خالی ہوتے۔ عام طور پر قحط کے زمانے میں ایسا ہوتا کہ کوئی دس آدمی مل کر اونٹ خریدتے، پھر اس کو ذبح کر کے اس کے گوشت کے دس برابر حصے کرتے۔ اونٹ میں حصے دار ایک ایک کر کے تیر نکالتے۔ جس کے نام پر جتنے نمبر کا تیر نکل آتا وہ گوشت کے اتنے حصے لے جاتا۔ اس طرح بعض حصے داروں کو حصے سے زیادہ گوشت مل جاتا اور بعض بالکل محروم رہ جاتے۔ حصہ پانے والے گوشت خود بھی استعمال کرتے اور غربا میں بھی تقسیم کرتے۔ حصے سے محروم رہنے والے ترغیب دیتے کہ پھر دوبارہ اونٹ خریدیں اور ذبح کریں، پھر ایسا ہی کرتے۔ بعض کو حصہ مل جاتا اور بعض محروم رہ جاتے اور اس طرح یہ سلسلہ جاری رہتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے جوئے کے تیروں کو بھی حرام قرار دے دیا۔

شیطانی اللہ تعالیٰ نے چار چیزوں یعنی شراب، جوا، بت اور تقسیم کے تیروں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ یہ گندہ اور شیطانی کام ہے فَاجْتَنِبُوْهُ پس اس سے بچ جاؤ۔ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ تاکہ تمہیں فلاح نصیب ہو۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ عربی زبان میں رِجس

اُس گندی اور ناپاک چیز کو کہا جاتا ہے جس سے فطرتِ سلیمہ اور عقلِ سلیمہ نفرت کرے
اس آیت میں جن چار چیزوں کا ذکر کیا گیا وہ سب قابلِ نفرین امور ہیں اور شیطانی
کام ہیں۔ بظاہر تو یہ سب کام انسان ہی انجام دیتے ہیں مگر ان میں موجود برائی
کی وجہ سے مجازاً انہیں شیطانی کام کہا گیا ہے۔ شیطان ہی کی وسوسہ اندازی کی
وجہ سے ان قبیح امور کی طرف رغبت ہوتی ہے۔ اور پھر شیطان ایسے کاموں
پر خوش بھی ہوتا ہے۔ لہذا انہیں شیطانی افعال سے تعبیر کیا گیا ہے۔

بُت پرستی تو ویسے ہی حرام ہے۔ یہ شرک اور کفر ہے۔ اسی طرح قسمت
آزمائی کے تیر بھی شرک میں داخل ہیں۔ نسائی شریف کی روایت میں آتا ہے
مدمن الخمر کعابد وثن ہمیشہ شراب نوشی کرنے والا بُت پرستی
کرنے والے کے برابر ہے۔ اگر کوئی شخص شراب اور جوئے کو اچھا سمجھتا ہے
اور اُن کی حرمت کا قائل نہیں ہے تو اس میں اور بت پوجنے والے میں کوئی
فرق نہیں، دونوں کافر ہیں۔ ہاں اگر اُس کو حرام سمجھتے ہوئے پیتا ہے تو
گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ بہرحال ان چاروں چیزوں کو اکٹھا ذکر کرنے
کے بعد فرمایا ان سے اجتناب کرو۔ تاکہ تمہیں فلاح حاصل ہو جائے شراب
کو قابلِ تعزیر جرم قرار دیا گیا ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ شراب کی حد چالیس
کوڑے ہیں جب کہ امام ابوحنیفہؒ اسی کوڑوں کے قائل ہیں۔ خود حضور علیہ السلام
اور خلفائے راشدین کے زمانے میں شرابیوں پر یہ حد جاری ہوتی رہی۔

عداوت اور نفرت

فرمایا اِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ
وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ شیطان چاہتا ہے کہ تمہارے
درمیان شراب اور جوئے کے ذریعے عداوت اور نفرت ڈال دے جب
انسان نشے میں ہوتا ہے تو گالی گلوچ بکتا ہے جس کی وجہ سے دوسرے کے
دل میں نفرت پیدا ہو جانا قدرتی امر ہے۔ جوئے میں بھی ایسا ہی ہے۔ ہارنے

والے کے دل میں جیتنے والے کے خلاف نفرت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ کوشش کرتا ہے کہ کس طرح اس سے بازی جیت لے۔ اس طرح عداوت اور دشمنی کا یہ سلسلہ جاری ہو جاتا ہے۔ پھر دنگا فساد، لڑائی اور ایک دوسرے کی بے عزتی ہوتی ہے، اسی لیے فرمایا کہ شراب اور جوئے کے ذریعے شیطان تمہارے درمیان عداوت اور نفرت پیدا کرنا چاہتا ہے اور اس کا دوسرا عمل یہ ہوتا ہے وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ وہ چاہتا ہے کہ تمہیں اللہ کے ذکر اور نماز سے روک دے۔ شراب پینے والا تو ویسے ہی نماز کے قریب نہیں جا سکتا جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے اور جوا بھی ایسی بُری لت ہے کہ اس میں مگن ہو کر انسان فرائض تک کو بھول جاتا ہے۔ کھیلنے والے کھیل میں مگن رہتے ہیں حتیٰ کہ اذان ہو جاتی ہے، نماز کا وقت گزر جاتا ہے اور وہ اپنے کھیل میں مشغول رہتے ہیں نہ انہیں اللہ کے ذکر کی فکر رہتی ہے اور نہ نماز کا خیال رہتا ہے اور شیطان کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ انسان کو اُس کے فرائض سے روک دے فرمایا جب شراب نوشی اور جوئے کے شیطانی فعل ہونے میں کوئی شبہ نہ رہا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ پس کیا تم باز آجاؤ گے۔ شراب اور جوئے کے متعلق اللہ نے اپنا آخری حکم صادر فرما دیا ہے لہذا اب ان کو جاری رکھنے کا کوئی بہانہ باقی نہیں رہا۔ جو شخص اب بھی باز نہیں آئے گا وہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوگا۔

احکام کی بجا آوری

یہ احکام بیان کرنے کے بعد فرمایا وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ فرمانبرداری کرو اللہ تعالیٰ کی اور فرمانبرداری کرو رسول کی وَاحْذَرُوْا اور ان کی نافرمانی سے بچتے رہو۔ ان احکام کی تعمیل میں کوتاہی نہ کرنا فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ پس اگر تم روگردانی کرو گے، احکام خداوندی کے خلاف کرو گے فَاعْلَمُوْۤا تو اچھی طرح جان لو کہ اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا

الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ بیشک ہمارے رسول کے ذمے تو کھول کر پہنچا دینا ہے ہمارا رسول ہمارے احکام تم تک پہنچا دے گا پھر ان کی تعمیل کے متعلق ہم خود مؤاخذہ کر لیں گے۔

شراب اور جوئے کی تحریم کے بعد بعض اذہان میں یہ خیال آیا کہ ہم نے تو اسے ترک کر دیا مگر جو لوگ اس حکم سے پہلے شراب نوشی کرتے تھے اور اب فوت ہو چکے ہیں ان کا کیا ہو گا۔ تو اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس شبہ کا ازالہ فرمایا ہے۔ اس سے پہلے سورۃ بقرہ میں تحویل قبلہ سے متعلق بھی اسی قسم کے شبہ کا ذکر ہو چکا ہے کہ جو لوگ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے اور انہیں زندگی میں بیت اللہ شریف کی طرف رُخ کرنے کا موقع ہی نہ ملا، کیا ان کی نمازیں قبول ہوں گی یا نہیں۔ وہاں پر بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ اللہ تعالیٰ تمہاری نمازوں کو ضائع نہیں کرتا۔ پہلا قبلہ بھی اسی کے حکم سے تھا اور جب وہ تبدیل ہوا تو اسی کے حکم سے، لہٰذا سابقہ اعمال ضائع نہیں ہوں گے۔ اسی طرح یہاں پر بھی فرمایا کہ جو لوگ حرمت شراب کے حکم سے پہلے پیتے رہے ہیں، ان سے کوئی مؤاخذہ نہیں ہو گا۔ لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا جو لوگ اس سے پہلے ایمان لانے اور اچھے اعمال انجام دیے انہیں ان کے کھانے یعنی اس حالت میں شراب نوشی پر کوئی گناہ نہیں ہے اِذَا مَا اتَّقَوْا جب کہ وہ ڈرتے رہے اور کفر و شرک سے بچتے رہے۔ وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اور ایمان لائے اور اعمال صالحہ انجام دیے۔ پھر فرمایا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا پھر وہ ڈرتے رہے اور ایمان پر قائم رہے ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا پھر وہ ڈرتے رہے اور ان کے دل پر احکام خداوندی کی خلاف ورزی کا خوف طاری رہا اور انہوں نے نیکی

کے کام انجام دیے۔ یہاں پر اتقی کا لفظ تین دفعہ استعمال ہوا ہے۔ پہلے تقوے
کا مقصد یہ ہے کہ انسان عقائد میں پختہ ہے۔ دوسرے تقوے سے مراد
یہ ہے کہ انسان محرمات کی پابندی اختیار کرے اور تیسرے تقوے کا مطلب
یہ ہے کہ انسان تقویٰ پر مستقیم ہے۔ یہاں پر آخر میں احسنوا کا لفظ
استعمال کیا گیا ہے جو کہ ایمان اور اسلام کے بعد نیکی کا آخری درجہ ہے۔ حدیث
جبریل کے مطابق حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے احسان کا معنیٰ یہ بتایا تھا۔
اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس خلوص
و انہماک کے ساتھ کرو گویا کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔
فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ اور اگر تم پر اللہ تعالیٰ
کو دیکھنے کی کیفیت طاری نہ ہو سکے تو کم از کم یہ تو سمجھو کہ وہ تمہیں ضرور
دیکھ رہا ہے۔ گویا احسان سے مراد اعلیٰ درجے کی نیکی ہے جو پورے خلوص
کے ساتھ انجام دی جائے، تو اللہ نے فرمایا کہ جن لوگوں کو ایمان کی دولت
نصیب ہوئی اور پھر انہوں نے نیکی کے کام نہایت خلوص کے ساتھ انجام
دیے، اگر انہوں نے تحریم سے پہلے کوئی ایسا کام کیا ہے۔ تو ان پر کوئی حرج
نہیں ہے۔ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ اور اللہ تعالیٰ کو نیکی کے کام
کرنے والے لوگ بہت محبوب ہیں۔ اللہ کی نگاہ میں اعلیٰ درجے کی نیکی
کرنے والے پسندیدہ لوگ ہیں۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِّنَ
الصَّيْدِ تَنَالُهٗ اَيْدِيْكُمْ وَرِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ
اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ ۚ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ
ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۴﴾ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ وَمَنْ قَتَلَهٗ
مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ
مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ
هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ
اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ؕ
عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ؕ وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ
مِنْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۹۵﴾ اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ
الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۚ وَحُرِّمَ
عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ
الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۹۶﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! البتہ ضرور آزمائے گا تمہیں
اللہ تعالیٰ کسی چیز کے ساتھ شکار میں سے کہ پہنچیں گے اُس

تک تمہارے ہاتھ اور نیزے تاکہ معلوم کرے (یا تمیز کرے)
اللہ تعالیٰ اُس شخص کو جو خوف کھاتا ہے اُس سے بغیر دیکھے
پس جو شخص تعدی کریگا اس کے بعد، پس اُس کے لیے دردناک
عذاب ہوگا (۹۴) اے ایمان والو! نہ مارو شکار کو اس حالت
میں کہ تم احرام میں ہو اور جو شخص قتل کریگا اُس شکار کو
تم میں جان بوجھ کر، پس بدلہ ہے اُس کے قتل کیے ہوئے کے
برابر مویشیوں میں سے فیصلہ کریں گے اس کے ساتھ دو انصاف
والے تم میں سے اور یہ ہدی ہے کعبے تک پہنچنے والی یا کفارہ
اس کا طعام ہوگا مسکینوں کا یا اس کے برابر روزے ہوں تاکہ وہ
شخص چکھے وبال اپنے کام کا۔ اللہ نے معاف کر دیا جو پہلے
گزر چکا۔ اور جو شخص پلٹ کر کریگا تو اللہ تعالیٰ اُس سے
انتقام لے گا۔ اور اللہ غالب ہے انتقام لینے والا (۹۵)
حلال قرار دیا گیا ہے تمہارے لیے دریا کا شکار اور اس
کا کھانا۔ یہ فائدہ ہے تمہارے لیے اور قافلے کے مسافروں کے
لیے۔ اور حرام قرار دیا گیا ہے تم پر خشکی کا شکار جب تک
تم احرام کی حالت میں ہو اور ڈرو اللہ تعالیٰ سے جس کی
طرف تم سب اکٹھے کیے جاؤ گے (۹۶)

ربط آیت

اللہ تعالیٰ نے طیبات کا ذکر کرکے فرمایا کہ پاک اور حلال چیزوں کو از خود حرام
نہ ٹھہراؤ اور اس سلسلہ میں قسم بھی اٹھالی ہے تو اُسے توڑ کر اُس کا کفارہ ادا کرو اور حلال
چیزوں کو استعمال کرتے رہو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے محرمات کا ذکر کیا اور فرمایا کہ جن چیزوں
کو دائمی حرام قرار دیا گیا ہے اُن سے اجتناب کرو، شراب، جوا، بت اور جوئے کے تیر
گندی چیزیں ہیں۔ یہ سب شیطانی افعال ہیں لہٰذا ان سے بچتے رہو۔ سورۃ کے ابتدائی

حصے میں بھی محرمات اور محللات کا ذکر تھا اور گذشتہ دروس میں بھی موضوع سخن یہی رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تلقین فرمائی ہے کہ حلال چیزوں سے استفادہ حاصل کرتے رہو کیونکہ اسی میں تمہاری بہتری ہے اور حرام چیزوں سے پرہیز کرو۔ اگر حلت وحرمت کے اس قانون کو توڑو گے تو اجتماعیت انسانیہ میں خرابی واقع ہو جائیگی۔

اب آج کے درس میں بعض محرمات وقتیہ کا ذکر ہے۔ خون، مردار، خنزیر کا گوشت وغیرہ دائمی حرام چیزیں ہیں مگر بعض حلال چیزیں خاص وقت کے لیے حرام ہو جاتی ہیں جو کہ وقت گذرنے کے بعد پھر سے حلال ہو جاتی ہیں۔ مثلاً جب کوئی شخص تکبیر تحریمہ کہہ کر نماز میں مشغول ہو جاتا ہے تو اس کے لیے بولنا، کھانا پینا وغیرہ حرام ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی شخص حج یا عمرہ کا احرام باندھ لیتا ہے تو اس کے لیے حجامت بنانا، خوشبو لگانا، سلا ہوا کپڑا پہننا اور خشکی کا شکار کرنا حرام ہو جاتا ہے۔ چنانچہ آج کے درس میں محرم کے لیے شکار کی ممانعت اور اس کے متعلقات کا ذکر ہے۔

شکار کی مری حلت

اسلام میں حلال جانور کا شکار کرنے اور اسے کھانے کی عام اجازت ہے بلکہ عرب کے بعض خطوں میں تو ذریعہ معاش ہی یہ تھا۔ آج بھی دنیا میں کئی ایسے خطے ہیں جن کی گذران صرف شکار پر ہے۔ جنگلوں اور صحراؤں میں رہنے والے لوگ جنگلی جانوروں کے شکار سے پیٹ پالتے ہیں۔ بعض برفانی علاقوں میں بھی شکار ہی ذریعہ معاش ہے۔ ساحل سمندر کے اکثر باشندے مچھلی کے شکار پر گزر بسر کرتے ہیں۔ چنانچہ شکار کی عام اجازت دی گئی ہے۔ اسی سورۃ میں شکار کے بعض مسائل پہلے بھی بیان ہو چکے ہیں۔ خود حضور علیہ السلام نے بھی شکار کے بعض مسائل بیان فرمائے ہیں۔ چنانچہ حدیث کی ہر کتاب میں باب الصید کے نام سے باب موجود ہے جس میں صرف شکار کے مسائل کا تذکرہ ہے البتہ اس میں زیادہ انہماک رکھنے سے منع کیا گیا ہے۔ ترمذی شریف کی روایت

میں آتا ہے من اتبع الصید لھی ومن اتی باب السلطان افتتن یعنی جو شکار کا پیچھا کریگا وہ غفلت میں مبتلا ہو جائے گا اور جو ہمیشہ حاکم کے دروازے پر جائیگا فتنہ میں ڈالا جائے گا۔

کھیل کود کی طرح شکار بھی غافل کرنے والی چیز ہے جس طرح تاش اور شطرنج اور آجکل کرکٹ وغیرہ بڑے ذوق وشوق سے کھیلا اور دیکھا جاتا ہے اسی طرح شکاری بھی ہر طرف سے بے نیاز ہو کر شکار کرنے میں محو ہو جاتے ہیں۔ پھر نہ انہیں کھانا یاد رہتا ہے اور نہ نماز کی فکر باقی رہتی ہے۔ کپڑے پھٹ جاتے ہیں بدن زخمی ہو جاتا ہے مگر وہ اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں۔ اسی لیے شکار میں زیادہ انہماک ناپسند کیا گیا ہے تاہم خشکی اور تری کے تمام حلال جانوروں کا شکار جائز ہے۔

احترام مرکز

حج وعمرہ کا احرام دراصل احترام مرکز ہے۔ چونکہ یہ شخص حج یا عمرہ کے لیے بیت اللہ شریف کی طرف جا رہا ہے، اس لیے اللہ کے اس گھر اور مرکز اسلام کے احترام کا تقاضا ہے کہ وہاں احرام کی حالت میں جائے جیسا کہ پہلے عرض کیا عازم حرم کے لیے بعض پابندیاں میں جو اس پر عائد ہو جاتی ہیں اور ان میں خشکی کے شکار کی ممانعت بھی ہے۔ احرام کی حالت میں شکار کرنا یا شکار کو ذبح کرنا حرام ہو جاتا ہے۔ اور ایسے شخص کا ذبیحہ مردار کے موافق ہوتا ہے۔ بہر حال یہ احرام کی خصوصیات اور حرم کے احترام کی وجہ سے ہے۔

حرمت شکار آزمائش ہے

ارشاد باری تعالیٰ ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اے ایمان والو! لَیَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَیْءٍ مِّنَ الصَّیْدِ البتہ آزمائے گا اللہ تعالیٰ تمہیں کسی چیز کے ساتھ شکار میں سے۔ تَنَالُهٗۤ اَیْدِیْكُمْ وَ رِمَاحُكُمْ جس تک تمہارے ہاتھ اور نیزے پہنچتے ہیں۔ شکار انسانی ہاتھوں سے بھی ہوتا ہے اور نیزے یا دیگر اوزار کے ساتھ بھی۔

چونکہ نزولِ قرآن کے زمانے میں نیزہ ایک مؤثر ہتھیار کے طور پر استعمال ہوتا تھا، اس لیے اُس کا ذکر کیا گیا تھا، مگر مراد یہ ہے۔ کہ احرام کی حالت میں خشکی کے جانور کا شکار خواہ ہاتھ سے کیا جائے یا تیر، تلوار یا بندوق وغیرہ سے۔ اہلِ ایمان کے لیے یہ آزمائش ہے۔ کہ وہ احکام الٰہی کی کس حد تک پابندی کرتے ہیں۔ اگر وہ اِس حالت میں شکار کرنے سے باز رہے تو آزمائش میں پورے اتریں گے اور اس کے خلاف کیا تو ناکام ہو جائیں گے۔ لَيَبْلُوَنَّكُمُ کا یہی مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں حج یا عمرہ کا موقع فراہم کرتا ہے اور اس کے ساتھ یہ حکم دیتا ہے۔ کہ احرام کی حالت میں خشکی کا شکار نہیں کرنا، اب آزمائش یہ ہے کہ کون اس حکم کی تعمیل میں شکار سے باز رہتا ہے۔

اس قسم کی آزمائش سابقہ امتوں پر بھی آچکی ہے۔ بنی اسرائیل کے لیے ہفتے کے دن کو اللہ تعالیٰ نے شکار کرنے کے لیے حرام قرار دیا تھا، مگر وہ اس حکم کی پابندی نہ کر سکے۔ انہوں نے حیلے بہانے سے ہفتے کے روز بھی شکار شروع کر دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن پر اللہ کا غضب ہوا اور اُن کی شکلیں تبدیل کر دی گئیں۔ پھر انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ بغرضیکہ بنی اسرائیل امتناعِ شکار کی آزمائش پر پورے نہ اُتر سکے۔ حضور علیہ السلام کے زمانے میں بھی اس طرح کی آزمائش آئی۔ حدیبیہ کے مقام پر جب صحابہ نے پڑاؤ کیا تو وہ احرام کی حالت میں تھے۔ شکار اُن کے خیموں کے آس پاس دوڑتے پھرتے تھے مگر صحابہ کرامؓ کے ہاتھ اُن تک نہیں پہنچتے تھے کیونکہ اس حالت میں شکار ممنوع ہے۔ چنانچہ وہ اس آزمائش میں پورے اُترے۔ بہر حال فرمایا کہ احرام کی حالت میں شکار کا امتناع آزمائش کے لیے ہے، وہ مالک الملک ہے، جس طرح چاہے اپنے بندوں کی آزمائش کرتا ہے "وَنَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً" (الانبیاء) وہ خیر کے ساتھ بھی آزماتا ہے اور شر کے

ساتھ بھی، لہٰذا بندوں کا کام ہے کہ اُس کی طرف سے آنے والی ہر آزمائش پر پورا اُتریں۔

بعض لوگ شکار کے بڑے شوقین ہوتے ہیں اور وہ صبر نہیں کر سکتے ایسا آدمی اگر احرام کی حالت میں شکار کرے گا تو اُسے تاوان ادا کرنا پڑیگا۔ اور اگر پھر بھی باز نہیں آتا تو اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آئے گا۔ آگے اس بات کی وضاحت فرما دی کہ تمہیں آزمائش میں اس لیے ڈالا جا رہا ہے لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ تاکہ اللہ تعالیٰ جان لے کہ کون شخص اس سے بغیر دیکھے ڈرتا ہے۔ بعض اوقات علم کا اطلاق امتیاز پر بھی ہوتا ہے۔ اور یہاں پر اللہ کے جان لینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ڈرنے والے متقی اور غیر متقی میں امتیاز پیدا کر دے۔ بغیر دیکھے ڈرنا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ان ظاہری آنکھوں سے تو نظر نہیں آتا۔ مگر اپنی قدرت، علم اور وجود سے ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے، تاہم آزمائش یہ ہے کہ اللہ کو دیکھے بغیر اُس کے احکام کی تعمیل کر کے آزمائش میں کون پورا اترتا ہے۔ فرمایا فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ اس کے بعد جو کوئی تعدی کریگا اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کر کے آزمائش میں ناکام ہو جانے گا فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وہ دردناک عذاب کا مستحق ٹھہرے گا، لہٰذا ہر متعلقہ شخص کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اُس پر شکار کی پابندی عاید کر کے اُسے امتحان میں ڈالا ہے جس میں اُسے پورا اُترنا ہے۔

خشکی کا شکار

آزمائش کا تمہیداً ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے احرام کی حالت میں امتناعِ شکار کا واضح حکم دیا يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اے ایمان والو۔ لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ شکار کو قتل نہ کرو جب کہ تم احرام کی حالت میں ہو۔ فرمایا وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا اور تم میں سے جو شخص جان بوجھ کر شکار کرے گا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ

تو اُس کا بدلہ شکار کیے گئے جانور کی مثل ہے۔ یعنی جس قسم کا جانور شکار کیا ہے اُس
قسم کا جانور خود خرید کر اللہ کی راہ میں قربانی کرے۔ مثل کی تشریح میں امام شافعیؒ
فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے کبوتر کا شکار کیا ہے تو اُس کے بدلے میں مرغی صدقہ
کرے۔ اگر ہرن کو مار دیا ہے تو ایک بکری۔ نیل گائے کا شکار کیا ہے
تو اُس کے تاوان میں گائے یا بیل ذبح کرے اور اگر شترمرغ کو مار دیا ہے
تو ایک اونٹ قربانی کرے۔ تاہم امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ جو جانور شکار
میں مارا گیا ہے اُس کی قیمت کا تعین کر کے اُس قیمت کے برابر کوئی دوسرا
جانور بطورِ تاوان ذبح کرنا ہوگا۔

باقی رہا یہ سوال کہ شکار شدہ جانور کی مثل یا اُس کی قیمت کا تعین کون
کریگا، تو فرمایا يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ تم میں سے
دو عادل شخص یعنی شکار کے مقام سے قریبی بستی کے دو معزز آدمی شکار کی
مثل یا اُسکی قیمت کا تعین کریں گے اور تاوان کے طور پر حاصل شدہ جانور کو
هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ بطور ہدی یعنی قربانی کے جانور کو حرم شریف
میں پہنچایا جائے گا۔ بکری، مرغی، گائے یا اونٹ جس جانور کا تعین بطورِ مثل شکار
کیا گیا ہے۔ اُسے حرم میں اللہ کی راہ میں ذبح کیا جائے گا۔ اور اگر شکار شدہ جانور
کی قیمت متعین کی گئی ہے اور اس کے بدلے میں جانور مہیا نہیں کیا گیا تو فرمایا
اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ تو اس رقم میں سے مساکین کو کھانا کھلایا
جائے۔ اور اس کی صورت یہ ہوگی کہ ہر مسکین کو دو سیر گندم دی جائے
اب رہا یہ سوال کہ کتنے مسکینوں کو دو سیر گندم دی جائے گی۔ تو اس کا انحصار
تاوان کی کل رقم پر ہے۔ مثال کے طور پر اگر تاوان کی رقم سے ایک من گندم
خریدی گئی ہے تو دو سیر فی کس کے حساب سے بیس مسکینوں میں تقسیم ہو جائیگی
اور اگر اس رقم سے صرف بیس سیر گندم مہیا ہوئی ہے تو وہ دس مسکینوں
کے لیے کافی ہوگی۔ علیٰ ہذا القیاس۔

اور اگر حالات ایسے ہیں کہ شمار کے تاوان میں نہ تو جانور حرم میں ذبح کیا جا سکتا ہے اور نہ مسکینوں کو اناج فراہم کیا جا سکتا ہے۔ تو پھر کفارے کی تیسری صورت یہ ہے اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا کہ ہر مسکین کے بدلے ایک ایک روزہ رکھے۔ مثال کے طور پر اگر تاوان بیس سیر گندم ہے جو دو سیر کے حساب سے دس مسکینوں کو قابل تقسیم ہے تو وہ گندم ادا کرنے کی بجائے دس روزے رکھے گا اور اس طرح شکار کردہ جانور کا کفارہ یا فدیہ ادا ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ تین صورتیں بیان فرمائی ہیں جن کے ذریعے کفارہ ادا ہو سکتا ہے۔ پھر فرمایا یہ تاوان اس لیے ڈالا گیا ہے لِيَذُوقَ وَبَالَ أَمْرِهِ تاکہ احرام کی حالت میں شکار کرنے والا آدمی اپنے فعل کے وبال کا مزہ چکھ لے اُسے معلوم ہو جائے کہ اس نے حکم الٰہی کی خلاف ورزی کر کے حالت احرام میں شکار کیا ہے تو اب اُسے اس کا تاوان بھی ادا کرنا ہوگا۔

فرمایا عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا ہے جو اس سے پہلے ہو چکا۔ یعنی یہ احکام نازل ہونے سے پہلے اگر کسی شخص نے احرام کی حالت میں شکار کیا تھا، تو اُسے اللہ نے معاف کر دیا ہے، اُس پر کوئی گرفت نہیں۔ البتہ اب آئندہ اگر کوئی شخص اس جنایت کا مرتکب ہوگا تو پھر اُسے مقررہ تاوان ادا کرنا ہوگا۔ اسی لیے فرمایا وَمَنْ عَادَ جو پھر بھی ایسا کریگا فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ وَاللّٰهُ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ تو اللہ اس سے انتقام لیگا۔ اللہ تعالیٰ غالب ہے۔ اور انتقام لینے پر قادر ہے وہ ایسے شخص کو ضرور اپنی گرفت میں لے گا اور اُسے آخرت میں اس کا حساب چکانا ہوگا۔

دریائی شکار کی اجازت

خشکی کے شکار کی ممانعت اور اس کا فدیہ بیان کرنے کے بعد فرمایا أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ حلال قرار دیا گیا ہے تمہارے لیے دریا کا شکار اور اس کا کھانا۔ اس آیت میں مطلق بحر کے لفظ سے بعض ائمہ کرام یہ مراد لیتے کہ پانی کا ہر قسم کا جانور حلال ہے سوائے

خنزیر کے تاہم امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ تمام جانور حلال نہیں بلکہ صرف مچھلی اپنی تمام اقسام کے ساتھ حلال ہے۔ ایک شخص نے حضور علیہ السلام سے سمندر کے پانی کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا ھوالحل میتته و طھور ماءہ اس کا مردار حلال ہے اور اس کا پانی پاک ہے دوسری روایت میں آتا ہے اُحِلَّ لَنَا مَیْتَتَانِ ہمارے لیے دو قسم کے مردار حلال قرار دیے گئے ہیں اَلسَّمَکُ وَالْجَرَادُ یعنی مچھلی اور ٹڈی۔ مچھلی کا خود شکار کیا جائے یا سمندر کا پانی اُسے باہر پھینک دے اور وہ مر جائے تو وہ ہر حال حلال ہے۔ اسی طرح ٹڈی بھی بغیر ذبح کیے حلال قرار دی گئی ہے۔ اسی طرح حضور نے فرمایا اُحِلَّ لَنَا دَمَانِ ہمارے لیے دو خون بھی حلال ہیں اَلْکَبِدُ وَالطِّحَالُ یعنی جگر اور تلی۔ یہ دونوں اعضا منجمد خون ہیں مگر حلال ہیں البتہ دم مسفوح یعنی رگوں سے بہنے والا خون حرام ہے۔ بہرحال فرمایا کہ تمہارے لیے دریائی شکار کو حلال قرار دیا گیا ہے مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ اس میں فائدہ ہے تمہارے لیے اور قافلے اور مسافروں کے لیے۔

اس مقام پر لفظ سیارۃ سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ احرام کی حالت میں سمندر کا سفر ہو تو اس دوران شکار کی کتنی اہمیت ہے خشکی کے سفر کے دوران اگر خوراک کا ذخیرہ ختم بھی ہو جائے تو انسان کسی نہ کسی طرح سے جان بچا سکتا ہے۔ اگر شکار نہ بھی کرے تو درختوں کے پتے اور جڑی بوٹیاں کھا کر بھی کچھ عرصہ تک جسم و روح کا تعلق قائم رکھا جا سکتا ہے۔ اور اگر یہی صورت بحری سفر کے دوران پیش آ جائے تو وہاں سوائے دریائی جانوروں کے خوراک کا کوئی اور ذریعہ میسر نہیں ہوتا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے احرام کے دوران دریائی شکار کی اجازت دے دی ہے مگر خشکی کے شکار سے منع فرما دیا

خشکی کا شکار — وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا اور تمہارے لیے خشکی کا شکار حرام قرار دیا گیا ہے جب تک کہ

تم احرام کی حالت میں ہو۔ یہ محرماتِ وقتیہ کا تذکرہ ہے۔ خشکی کا شکار صرف احرام تک کے لیے حرام ہوتا ہے، جب انسان احرام سے باہر آجاتا ہے تو یہ شکار پھر حلال ہو جاتا ہے۔ یہ احکام بیان کرنے کے بعد فرمایا وَاتَّقُوا اللّٰهَ اس اللہ تعالیٰ سے ڈر جاؤ الَّذِیْٓ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ جس کی طرف تم سب اکٹھے کیے جاؤ گے۔ جب قیامت کے دن سب لوگ اللہ رب العزت کی عدالت میں حاضر ہوں گے تو ہر ایک کو اپنے عمل کا بھگتان کرنا ہوگا۔ اللہ سے خوف دلانے کا مقصد یہ ہے کہ اس کے عائد کردہ قانون کی پابندی کرو اس نے احرام کی حالت میں شکار کی ممانعت کر کے تمہیں آزمائش میں ڈالا ہے، تمہیں اس آزمائش میں پورا اترنے کی کوشش کرنا ہوگی۔ کیونکہ آخرت میں اللہ کے سامنے جواب دینا ہے۔

ہو کہ اللہ سخت عذاب والا ہے۔ اور یہ بات بھی کہ بیشک اللہ تعالیٰ بخشش کرنے والا اور مہربان ہے (۹۸) نہیں ہے رسول کے ذمے مگر پہنچا دینا۔ اللہ جانتا ہے جس چیز کو تم ظاہر کرتے ہو ——————— اور جس چیز کو تم چھپاتے ہو (۹۹) اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے۔ نہیں برابر خبیث چیز اور پاک چیز اگرچہ تم کو تعجب میں ڈالے خبیث چیز کی کثرت۔ پس ڈرو اللہ تعالیٰ سے اے عقلمندو! تاکہ تم فلاح پا جاؤ (۱۰۰)

ربطِ آیات

پہلی آیات میں احرام کی حالت میں خشکی کے شکار کی ممانعت کا ذکر تھا اور اس کے ساتھ تاوان کا بیان تھا جو ایسی حالت میں شکاری کو ادا کرنا پڑتا ہے جیسا کہ گذشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے۔ شکار کی حرمت بیت اللہ شریف کی تکریم اور وہاں کے قصد کے لیے احرام پہننے کی وجہ سے ہے۔ شکار کے یہ احکام بیان کرنے کے بعد اب آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ شریف کی فضیلت اور اُس کی مرکزیت کا ذکر کیا ہے ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ شریف کی حیثیت اور اس میں جہان بھر کے لیے جو مصلحت ہے اُس کا ذکر بھی کیا ہے۔

بیت اللہ ذریعہ قیام ہے

ارشاد ہوتا ہے جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ اللہ تعالیٰ نے عزت اور بزرگی والے گھر کعبہ شریف کو قیام کا ذریعہ بنایا ہے عربی زبان میں کعبہ ابھری ہوئی جگہ اور چوکور گھر کو کہتے ہیں بیت اللہ شریف اگرچہ حجم کے لحاظ سے بہت بڑا نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ نے اُسے عزت و شرف کا بہت بڑا مقام عطا کیا ہے اور اسے ہی کعبہ کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کعبے کے تذکرہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے تین مزید چیزوں کا بھی ذکر کیا ہے یعنی وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ حرمت کے مہینے وَالْهَدْيَ کعبے کی طرف جانے والے اللہ کی نیاز کے جانور

وَالْقَلَائِدَ اور پٹے ڈالے گئے جانور جو قربانی کی نشانی کے طور پر ہوتے ہیں کعبہ شریف کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان تین چیزوں کو بھی لوگوں کے قیام کا ذریعہ فرمایا ہے۔ اور یہ ذریعہ قیام دینی اور دنیاوی ہر دو لحاظ سے فرمایا گیا کیونکہ اس کا اطلاق دونوں طریق پر ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے لے کر نزولِ قرآن تک کے ہزاروں سالہ دور میں عرب کے خطہ میں کوئی منظم حکومت نہیں تھی۔ یہاں پر قبائلی نظام رائج تھا۔ مصر، شام، روم، ایران اور ہندوستان وغیرہ میں تو باقاعدہ حکومتیں تھیں مگر جزیرہ نمائے عرب میں کوئی مرکزی تنظیم نہیں تھی۔ اس افراتفری اور نفسا نفسی کے عالم میں بھی اللہ تعالیٰ نے حرم پاک کو لوگوں کے قیام اور بقا کا ذریعہ بنا رکھا تھا۔ سال بھر میں چار حرمت والے مہینوں کے دوران لڑائی بند رہتی تھی۔ قافلے بلا روک ٹوک سفر کر سکتے تھے، خوب تجارت ہوتی تھی اور لوگوں کو امن چین ہوتا تھا، اور یہ سب کچھ بیت اللہ شریف کے احترام کی وجہ سے ہوتا تھا۔ یہاں پر لوگوں کے قیام سے مراد یہ ہے کہ اس محترم گھر کی وجہ سے لوگ قائم ہو سکتے تھے یعنی اپنی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ اگر امن و امان کے یہ چار مہینے بھی لوگوں کو میسر نہ ہوتے تو جنگ و جدال اور لوٹ مار کی وجہ سے ہر قسم کا کاروبار، کھیتی باڑی اور تجارت ٹھپ ہو کر رہ جاتے اور لوگوں کو زندگی گزارنا محال ہو جاتا۔ قیام کا یہ لفظ انہی معانی میں سورۃ نساء میں بھی گزر چکا ہے۔ "وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا" اپنے مال بیوقوفوں کے سپرد نہ کرو، اللہ نے تمہارے لیے یہ گزران کا ذریعہ بنائے ہیں۔ بیت اللہ شریف بھی اسی لحاظ سے ذریعہ معاش ہے اور اس کی بدولت لوگ گزر اوقات کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا بھر کے لوگوں کو حکم ہے "وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا" کہ وہ صاحب استطاعت

ہیں تو زندگی بھر میں کم از کم ایک دفعہ بیت اللہ شریف کا حج کریں جب لوگ وہاں جاتے ہیں تو کعبہ شریف کا طواف کرتے ہیں۔ نماز پڑھتے ہیں، تلاوت کرتے ہیں، صفا و مروہ کی سعی کرتے ہیں اور قربانی کرتے ہیں۔ اور یہی چیزیں ہیں جن کی بدولت عازمین حج و عمرہ کو جسمانی، روحانی، علمی اور اخلاقی فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ اس کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ حج میں بھی فرمایا ہے کہ حج کے موقع پر "لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ" لوگوں کو بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے بیت اللہ شریف کو لوگوں کے قیام یعنی گذران کے ذریعے سے تعبیر کیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ جب تک وہاں عبادت ہوتی رہیگی طواف اور قربانی ہوتی رہیگی۔ نمازیں ادا ہوتی رہیں گی، دنیا بھی قائم رہے گی اور جب یہ چیزیں ختم ہو جائیں گی تو دنیا بھی قائم نہیں رہیگی سورۃ آل عمران میں بھی گزر چکا ہے "إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا" اللہ تعالیٰ کا اس سرزمین پر سب سے پہلا گھر یہی ہے جو لوگوں کی عبادت کے لیے مکہ معظمہ میں تعمیر کیا گیا اور یہ بڑی برکتوں والا گھر ہے۔ بعض احادیث میں آتا ہے کہ حرم شریف میں ہر روز اللہ تعالیٰ کی ایک سو بیس ۱۲۰ رحمتیں نازل ہوتی ہیں جن میں سے ساٹھ طواف کرنے والوں کے لیے اور باقی ساٹھ دیگر عبادت گزاروں کے لیے مخصوص ہیں۔ اللہ کی یہ خصوصی رحمتیں ہیں دیگر مہربانیوں کے علاوہ ہیں انہی کثرت فضائل کی وجہ سے دنیا بھر سے لوگ کھنچ کھنچ کر آتے ہیں اور گزران کا ذریعہ بنتے ہیں۔

شعائر اللہ کی تعظیم

بیت اللہ شریف کے علاوہ جن باقی تین چیزوں کا بیان ذکر کیا گیا ہے یعنی حرمت کے مہینے، ہدی کے جانور اور پٹے والے جانور سب شعائر اللہ میں داخل ہیں۔ بیت اللہ شریف خود بھی شعائر اللہ میں داخل ہے اس کے علاوہ حج، طواف، زیارات، صفا و مروہ، منیٰ، عرفات، مزدلفہ وغیرہم شعائر اللہ میں ہی شمار ہوتے ہیں اور شعائر اللہ کی تعظیم ہمارے دین کا

ایک اہم اصول ہے۔ سورۃ حج میں موجود ہے "وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ" یعنی اللہ کے شعائر کی تعظیم دلوں کے تقوے کی نشانی ہے۔ حضرت امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ اعظم شعائر اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کے چار بڑے شعائر، قرآن کریم، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات مبارکہ، بیت اللہ شریف اور نماز ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ دین کے باقی اہم اصولوں میں اللہ کی وحدانیت کو ماننا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ذکر بھی ایک اہم اصول ہے "فَاذْكُرُوْنِيْ اَذْكُرْكُمْ" یعنی تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد کروں گا۔ اس کے علاوہ اللہ کا شکر ادا کرنا بھی جزوِ دین ہے جیسا کہ ارشاد ہے "وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ" یعنی میرا شکریہ ادا کرو اور ناشکری نہ کرو۔ اور پھر صبر بھی انہی اہم اصولوں میں سے ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے "فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ" (احقاف) صاحبِ عزم رسولوں کی طرح صبر کرو۔ نیز فرمایا "اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ" (البقرہ) اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ غرضیکہ تعظیم شعائر اللہ دین اسلام کے اہم اصولوں میں سے ہے۔ جب تک شعائر اللہ کی تعظیم دنیا میں باقی ہے، دنیا قائم ہے، جب یہ ختم ہو جائے گی تو دنیا بھی فنا ہو جائے گی۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب زمین پر اللہ اللہ کرنے والا کوئی نہیں رہے گا تو پھر قیامت برپا ہو جائے گی۔

بیت اللہ بطور مرکز

بیت اللہ شریف ظاہری طور پر بھی پوری انسانیت کا مرکز ہے اور روحانی طور پر بھی یہ اہلِ اسلام کا مرکز ہے۔ جب تک مسلمان اس کی مرکزیت کو قائم رکھیں گے، خود انہیں دنیا میں مرکزی حیثیت حاصل رہے گی۔ اور جب یہ مرکزیت ٹوٹ گئی تو مسلمان بھی دنیا میں ذلیل ہو کر رہ جائیں گے۔ مقامِ افسوس ہے کہ اہلِ اسلام کی یہ مرکزیت ایک عرصے سے ختم ہو چکی ہے جس کے نتیجے میں مسلمان ہر مقام پر ذلت کی علامت بن چکے ہیں۔ بیت اللہ شریف

کو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی اصلاح تکمیلِ اخلاق، روحانیت اور علومِ ہدایت
کا مرکز بنایا ہے۔ اسی زمین میں پیغمبر آخر الزمان کی نشأۃ ہوئی، قرآن کریم یہیں
نازل ہوا، اسی بیت اللہ کو ہمیشہ کے لیے نمازوں کا قبلہ مقرر کیا گیا، اسے
حج و عمرہ کا مرکز بنایا گیا لہٰذا یہ لوگوں کے قیام کا ذریعہ اور اللہ تعالیٰ کے شعائر
میں سے ہے۔ اس کی شرف و عزت قربِ قیامت تک قائم رہے گی۔
حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ حبشہ کا موٹی پنڈلیوں والا ایک ظالم انسان
اس پر حملہ آور ہو کر اسے گرا دے گا اور اس کے بعد جلد ہی قیامت برپا ہو جائیگی[1]
اسی لیے فرماتے ہیں کہ جب تک کعبہ شریف اور دیگر شعائر اللہ کی عزت و
حرمت اور مرکزیت قائم ہے دنیا قائم ہے اور جب یہ نہ رہیگی تو دنیا بھی باقی
نہیں رہے گی۔

فرمایا یہ ایسی بات ہے ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْا تاکہ تم جان لو کہ اللہ تعالیٰ
نے یہ چیزیں اپنے علم و حکمت کے ساتھ مقرر کی ہیں اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ
مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ اللہ تعالیٰ زمین و آسمان
کی ہر چیز کو جانتا ہے۔ وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ اور بیشک اللہ تعالیٰ
ہر شے کو جاننے والا ہے وہ ان کی مصلحتوں سے بھی واقف ہے، اسی لیے
اس نے بیت اللہ کو مرکزیت عطا فرمائی ہے۔ جب تک مسلمان اس مرکز سے
وابستہ رہیں گے۔ ان کو عزت حاصل رہیگی۔ جب اس مرکز کا تصور دلوں سے
خارج ہو جائے گا، تو خدا تعالیٰ کی وحدانیت اور اسکی بندگی کا حقیقی تصور بھی جاتا
رہے گا اور مسلمان ذلیل ہو کر رہ جائیں گے۔ غرضیکہ بیت اللہ شریف تمام جہان
کے لوگوں کے لیے ذریعہ قیام ہے۔ اسے دنیا میں مرکزی حیثیت حاصل ہے
اللہ تعالیٰ کی عبادت اس کی روح ہے اور جب تک یہ روح قائم ہے
ڈھانچہ بھی قائم رہے۔

اتمام حجت

فرمایا اِعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ یہ بھی یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ

[1] بخاری ص۲۱۹ ج ۱ (فیاض)

سخت گرفت کرنے والا ہے۔ اگر اس کے اصولوں کو توڑو گے تو اس کی زد بھی آئے گی۔ جس طرح احرام کے قانون توڑنے پر تاوان عائد کیا گیا۔ اسی طرح کعبہ کی ہر کیفیت کو نظر انداز کرنے سے اللہ تعالیٰ کی گرفت آ سکتی ہے۔ ہاں! اگر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو گے، اُس کے احکام کی پیروی کرو گے، اُسی وحدانیت پر ایمان لاؤ گے تو پھر وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ تو اللہ تعالیٰ چھوٹی موٹی غلطیوں کو معاف کرنے والا اور نہایت مہربان بھی ہے۔ گویا وہ دونوں صفات کا مالک ہے، وہ شدید العقاب بھی ہے اور غفور و رحیم بھی ہے۔

اور فرمایا یہ بھی یاد رکھو۔ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ اللہ کے رسول کے ذمے تو پہنچا دینا ہے اور تمہارا کام عمل کرنا ہے اللہ کے رسول نے دین، ہدایت، قرآن، وحی، پاکیزہ اصول اور شرائع سب کچھ تمہارے پاس پہنچا دیا ہے، اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ ان پر عمل پیرا ہو جاؤ۔ اگر ایسا نہیں کرو گے تو پھر خدا تعالیٰ خود تم سے بازپرس کرے گا کیونکہ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ وہ تمہاری ہر ظاہر اور پوشیدہ چیز اور عمل کو خوب جانتا ہے۔ ظاہر و باطن کا پورا علم اُس کے پاس ہے۔ اُس نے انبیاء اور کتب کے ذریعے اپنے احکام تم تک پہنچا کر حجت تمام کر دی ہے۔ اب نتائج کے تم خود ذمہ دار ہو۔

کثرت تعداد معیارِ حق نہیں

قلت و کثرت کا مسئلہ اکثر انسانی اذہان میں کھٹکتا رہتا ہے۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے اس کی حقیقت کو بھی واضح کر دیا ہے۔ ارشاد ہے قُلْ اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے لَا يَسْتَوِى الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ خبیث اور طیب چیز برابر نہیں ہو سکتی۔ یعنی یہ ایک بڑی حقیقت ہے کہ پاک اور ناپاک چیز یکساں نہیں وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ اگرچہ خبیث کی کثرت تمہیں تعجب میں کیوں نہ ڈالے۔ اگر دنیا میں کفر

شرک، معاصی اور گندے نظام کا غلبہ ہو، دنیا میں ملوکیت اور ڈکٹیٹرشپ کا دور دورہ ہو تو یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ اچھی اور خدا کی پسندیدہ چیزیں ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کلمہ حق ہی اچھا ہے اگرچہ دنیا میں اس کی تعداد کتنی ہی قلیل کیوں نہ ہو مثال کے طور پر اگرچہ دنیا کا بیشتر حصہ حرام سے بھرا ہوا ہے اور حلال کا حصہ بالکل کم ہے تو حرام کی کثرت اُس کے جواز کی دلیل نہیں ہے۔ بلکہ اللہ کے نزدیک حلال ہی پسندیدہ ہے خواہ وہ کتنی قلت میں ہو۔ اگر ایک مومن آدمی اپنی محنت کے ذریعے پانچ روپے رزقِ حلال کماتا ہے تو وہ اس سو روپے سے زیادہ بہتر ہیں جو رشوت کے ذریعے حاصل کیے گئے ہوں۔ اسی طرح جائز کمائی کے دس پیسے سود کے ایک لاکھ روپے سے اچھے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو یہ دس روپے ہی محبوب ہیں۔ اس طرح اگر دنیا میں اچھے اخلاق والے قلیل تعداد میں ہیں تو اکثریت کے مقابلے میں وہی کامیاب ہیں عقلمندوں کی قلیل تعداد بیوقوفوں کے جمِ غفیر سے بدرجہا بہتر ہے۔

یورپ کی جمہوریت کا بھی یہی حال ہے۔ اُس میں انسانوں کی قابلیت کی بجائے اُن کی تعداد کو معیار بنایا گیا ہے۔ جو زیادہ ووٹ حاصل کرے وہی کامیاب ہے اگرچہ خود ووٹر معیار سے گرے ہوئے لوگ کیوں نہ ہوں۔ علامہ اقبال مرحوم نے یہی تو کہا تھا۔ ؎

از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

یعنی دو سو گدھے ایک انسانی دماغ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اگرچہ وہ غالب اکثریت میں ہیں ہاں اگر طیب اور پاک چیز کی کثرت ہے تو وہ نور علیٰ نور ہے۔ اور اگر گندی چیز یا گندہ نظام اکثریت میں ہے تو اس سے گھبرانا نہیں چاہیے، بُری چیز بہرحال بُری ہے، محض اکثریت کی بناء پر اُسے اچھائی کا سرٹیفکیٹ نہیں دیا جا سکتا۔ اس وقت پوری دنیا کی پانچ ارب آبادی میں سے سوا چار ارب کفر، شرک اور معاصی میں مبتلا ہے۔ ہر طرف بربریزم،

ملوکیت، اور ڈکٹیٹر شپ کا دور دورہ ہے مگر کلمہ جامع نہیں ہے۔ ترکوں میں خلافت کے زمانے تک مسلمانوں میں کسی قدر اجتماعیت موجود تھی مگر انگریز نے بالآخر اسے ختم کر کے چھوڑا۔ اب مسلمانوں کا اجتماعی نظام بالکل ناپید ہے، حق مغلوب ہو چکا ہے اور باطل غالب ہے مگر یہ اُسکی صداقت کی دلیل نہیں ہے۔ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ کے ہاں کلمہ حق، ایمان، اسلام اور پاکیزہ اخلاق ہی صداقت کا معیار ہیں، اسی لیے فرمایا کہ ناپاک چیز بہرحال ناپسندیدہ ہے اگرچہ وہ تمہیں کتنا بھی تعجب میں ڈال دے انجام انہی لوگوں کا اچھا ہوگا جو حق پر ہیں خواہ وہ کس قدر قلیل تعداد میں ہوں۔

معیارِ شرافت

صحیحین کی حدیث میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام ایک مجلس میں تشریف فرما تھے قریب سے ایک اعلیٰ حیثیت کا آدمی گزرا۔ آپ نے صحابہؓ سے دریافت کیا، یہ کیسا آدمی ہے۔ آپ کو بتایا گیا کہ یہ اشراف میں سے ہے۔ جہاں جائیگا، ہر شخص اس کے لیے گھر کا دروازہ کھولے گا، اگر کہیں نکاح کا پیغام دے گا تو فوراً قبول کیا جائے گا۔ لوگ اس کے رشتہ پر فخر کریں گے اگر یہ شخص کسی کی سفارش کرے گا تو قبول کی جائیگی۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ایک دوسرے شخص کا گزر ہوا۔ حضور علیہ السلام نے اس کے متعلق بھی دریافت فرمایا تو لوگوں نے عرض کیا کہ یہ فقراء میں سے ہے، اس کو کوئی پوچھتا نہیں اور نہ کوئی اس کا احترام کرتا ہے۔ اگر کہیں جاتا ہے تو لوگ گھر کا دروازہ نہیں کھولتے، اگر یہ کسی کو نکاح کا پیغام دے تو کوئی قبول نہیں کرے گا۔ کسی کی سفارش کرے تو کوئی پروا نہیں کرتا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یاد رکھو! پہلے آدمی جیسے لوگوں سے اگر پوری زمین بھری ہوئی ہو تو اللہ کے نزدیک یہ دوسرا آدمی اُن سب سے بہتر ہے، کیونکہ اس کے ہاں عزت و شرف کا معیار دنیاوی جاہ و جلال اور کثرت نہیں بلکہ ایمان اور تقویٰ ہے۔

بہر حال فرمایا کہ آپ کہہ دیجئے کہ خبیث اور طیب برابر نہیں اگرچہ کثرت کتنی ہی خوش کُن کیوں نہ ہو۔ ایک چلو بھر پاک پانی مٹکا بھر پیشاب سے بہتر ہے۔ حلال و حرام کا بھی یہی اصول ہے۔ حلال اور طیب کی قلیل مقدار حرام کی کثیر مقدار سے بہر صورت بہتر ہے۔ اللہ کے ہاں پسندیدگی کا معیار حق و صداقت ہے نہ کہ کثرتِ تعداد یا کثرتِ مقدار فرمایا فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ اے صاحب عقل و خرد لوگو! اللہ سے ڈر جاؤ۔ اس کی وحدانیت کے خلاف کوئی بات نہ کرو۔ اُس کے بتلائے ہوئے پاکیزہ اصولوں پر عمل کرو لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ تاکہ تمہیں فلاح و کامیابی نصیب ہو جائے۔ ان اصولوں پر عمل کرنے سے دنیا میں بھی کامیابی حاصل ہو گی اور آخرت میں بھی نجات کا دار و مدار اسی پہ ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَسْـَٔلُوا۟ عَنْ أَشْيَآءَ إِن تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَإِن تَسْـَٔلُوا۟ عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلُ ٱلْقُرْءَانُ تُبْدَ لَكُمْ عَفَا ٱللَّهُ عَنْهَا ۗ وَٱللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿۱۰۱﴾ قَدْ سَأَلَهَا قَوْمٌ مِّن قَبْلِكُمْ ثُمَّ أَصْبَحُوا۟ بِهَا كَٰفِرِينَ ﴿۱۰۲﴾ مَا جَعَلَ ٱللَّهُ مِنۢ بَحِيرَةٍ وَلَا سَآئِبَةٍ وَلَا وَصِيلَةٍ وَلَا حَامٍ ۙ وَلَٰكِنَّ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ يَفْتَرُونَ عَلَى ٱللَّهِ ٱلْكَذِبَ ۖ وَأَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿۱۰۳﴾

ترجمہ :- اے ایمان والو ، نہ سوال کرو ایسی چیزوں کے بارے میں کہ اگر وہ ظاہر کر دی جائیں تمہارے لیے تو تم کو ناگوار گذریں اور اگر تم سوال کرو گے اُن کے بارے میں جب کہ قرآن نازل کیا جا رہا ہے تو وہ تمہارے لیے ظاہر کر دی جائیں گی ۔ اللہ نے معاف کر دیا ہے جو اس سے پہلے گذر چکا اور اللہ تعالیٰ بہت بخشش کرنے والا اور تحمل والا ہے (۱۰۱) بیشک پوچھ چکے ہیں ایسی باتوں کے بارے میں اُن لوگوں نے جو تم سے پہلے گذرے ۔ پھر ہو گئے وہ اُن کے ساتھ کفر کرنے والے (۱۰۲) نہیں ٹھہرایا اللہ تعالیٰ

نے کوئی بحیرہ اور نہ کوئی سائبہ اور نہ کوئی وصیلہ اور نہ کوئی حام ۔ لیکن وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا وہ افتراء باندھتے ہیں اللہ پر جھوٹ اور ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو عقل نہیں رکھتے (۱۰۳)

ربطِ آیات

گذشتہ درس میں بہت سے دینی احکام کا تذکرہ ہو چکا ہے ۔ دین میں غلو اختیار کرنے سے منع فرمایا گیا ۔ یہود و نصاریٰ نے حد سے تجاوز کیا تو وہ گمراہی میں مبتلا ہو گئے ۔ پھر فرمایا طیبات اور محرمات میں تغییر و تبدل نہ کرو ۔ اللہ نے جن چیزوں کو حلال قرار دیا ہے انہیں حرام نہ بناؤ اور جو چیزیں ناپاک اور خبیث ہیں اُن سے بچنے کی کوشش کرو کیونکہ اسی میں دُنیوی اور اُخروی فائدہ ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے کعبۃ اللہ کی مرکزیت ، اِس کے عز و شرف اور اس کے احکام بیان فرمائے پھر قلت و کثرت کا مسئلہ واضح کیا اور فرمایا کہ پاک اور خبیث برابر نہیں ہو سکتے ۔ خباثت کی کثرت اُس کے مفید ہونے کی دلیل نہیں بلکہ پاک اور طیب چیز ہی انسان کے لیے مفید ہے ۔

اَب آج کی آیات میں فضول سوال کرنے سے منع فرمایا گیا ہے اس بات سے خاص طور پر مطلع کیا گیا ہے کہ اگر تم نزولِ قرآن کے زمانہ میں لایعنی سوالات پوچھو گے تو اللہ تعالیٰ اُن کا جواب وحی الہٰی سے دے دیگا اور پھر ہو سکتا ہے کہ وہ جواب تمہیں بُرا محسوس ہو ، تمہیں ناگوار گذرے اور تمہاری بدنامی کا باعث ہو ، لہٰذا بے معنی سوالات کرنے سے گریز کرو ۔ اشارتاً یہ بھی بتلا دیا گیا ہے کہ تم سے پہلے لوگوں نے کثرت سے سوال کیے تھے ، پھر جب اُن کے جواب آئے تو وہ اُن کی تعمیل نہ کر سکے اور اس کا نتیجہ خسران اور ضلالت کی صورت میں برآمد ہوا ۔ پھر آج ہی کی اگلی آیت میں اللہ نے تحریمات العباد یعنی انسانوں کی از خود حرام کردہ چیزوں کا ذکر کر کے اُن کا رد فرمایا ہے

فضول سوالات کی ممانعت

ارشاد ہوا ہے يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اے ایمان والو ، لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ایسی چیزوں کے بارے

میں نہ پوچھو کہ اگر وہ تمہارے لیے ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں بُری لگیں وَاِنْ تَسْئَلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ اور اگر یہ ایسے دور میں پوچھی جائیں جب کہ قرآن پاک نازل ہو رہا ہے تُبْدَ لَكُمْ تو تمہارے لیے ظاہر کر دی جائیں گی اور اس طرح تمہارے لیے مشکل پیدا ہو جائیگی مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہاں پر ہر سوال پوچھنے سے منع نہیں فرمایا گیا بلکہ صرف فضول اور لایعنی سوالات کی ممانعت کی گئی ہے۔ اس کی مثال حدیث شریف میں اس طرح آئی ہے۔ کہ ایک مرتبہ حضور علیہ السلام غصے کی حالت میں مسجد میں تشریف لائے منبر پر بیٹھے اور فرمایا، جب تک میں یہاں بیٹھا ہوں، مجھ سے جو سوال کرو گے اس کا جواب دوں گا اس پر ایک شخص نے سوال کیا مَنْ اَبِیْ یعنی میرا باپ کون ہے ؟ اُس نے یہ سوال اس لیے کیا تھا کہ لوگ اُسے نسب کے معاملے میں بدنام کرتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غصے کی حالت میں فرمایا تیرا باپ فلاں ہے۔ اسی طرح ایک اور شخص نے ایسا ہی فضول سوال کیا تو حضور علیہ السلام کا غصہ مزید بڑھ گیا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے آگے بڑھ کر کہا رَضِيْنَا بِاللّٰهِ رَبًّا وَبِالْاِسْلَامِ دِيْنًا وَبِمُحَمَّدٍ نَّبِيًّا تو آپ، کا غصہ فرو ہوا۔

بہرحال نسب کے متعلق یہ سوال نہایت بیہودہ تھا۔ کیونکہ شریعت کا ایک عام ضابطہ یہ ہے اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ یعنی بچہ اُس کا سمجھا جائیگا جس کے بستر پر پیدا ہُوا۔ بچہ جننے والی عورت جس مرد کی منکوحہ ہے، اولاد اُسی کی تصور ہوگی خواہ حقیقت اس کے خلاف ہو۔ کسی اولاد کو زانی کی طرف منسوب نہیں کیا جاتا۔ اس سوال کے متعلق جب سائل کی والدہ کو علم ہُوا تو وہ بھی سخت ناراض ہوئی کہ تم نے ایسا سوال کیوں پوچھا۔ کہنے لگی ہم جاہلیت کے دور سے گزر کر آئے ہیں، اگر تیرا نسب درست نہ ہوتا تو یہ بات میرے لیے کس قدر بدنامی کا باعث بنتی۔ بہرحال اس قسم کے فضول سوال کرنے سے منع کیا

گیا ہے۔

حضور علیہ السلام سے ایک منافق شخص نے بھی سوال کیا کہ میری اونٹنی گم ہو گئی ہے، وہ کہاں ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اَدْرِیْ میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے۔ اس پر اُس شخص نے پراپگنڈا شروع کر دیا کہ دیکھو جی! اس نبی نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے، آسمان تک کی خبریں دیتا ہے مگر میری اونٹنی کا علم نہیں رکھتا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی۔ اُس شخص کو بلایا گیا وہ آیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، مجھے واقعی علم نہیں تھا۔ اب جبرائیل نے آکر بتایا ہے کہ تمہاری اونٹنی، فلاں درخت کے ساتھ لٹک رہی ہے۔ اُس کے گلے میں قلادہ کہیں اٹک گیا ہے اور وہ درخت کی ٹہنیوں میں منہ مار رہی ہے ایک اور شخص نے سوال کیا اَیْنَ اَنَا یعنی میں مرنے کے بعد کہاں ہوں گا۔ آپ نے فرمایا فِی النَّارِ یعنی جہنم میں، اس پر حضرت عمرؓ نے پھر رَضِیْنَا بِاللّٰہِ ... پڑھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا غصہ فرو ہوا۔

کثرتِ سوال کی ممانعت

جس طرح فضول سوالات سے منع کیا گیا ہے، اسی طرح کثرتِ سوال سے بھی منع کیا گیا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر بال کی کھال اتارنا، باریکیاں دریافت کرنا عام فہم مسائل کی جزئیات کے متعلق پوچھنا کبھی سود مند نہیں ہوتا۔ اس قسم کے سوال کرنے والے اکثر بے عمل لوگ ہوتے ہیں۔ وہ مسائل تو بہت زیادہ دریافت کرتے ہیں مگر عمل کسی پر نہیں کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سیدھے سادے معاملہ میں بھی پابندیاں لگ جاتی ہیں اور پھر اُن سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال بنی اسرائیل کی گائے والا واقعہ ہے جسے سورۃ البقرہ میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک آدمی کے قتل پہ اللہ نے حکم دیا کہ ایک گائے ذبح کر کے گوشت کا ایک ٹکڑا مقتول کو لگاؤ تو وہ اپنے قاتل کی نشاندھی کر دیگا۔ مگر متعلقہ لوگوں نے طرح طرح کے سوال کرنے شروع کر دیے یعنی اس کا رنگ کیا ہو، عمر کیا ہو، اس کی صفت کیسی ہونی چاہیئے۔ وغیرہ وغیرہ، اس کا نتیجہ

یہ ہوا کہ ایک عام گائے ذبح کرنے کی بجائے انہیں مسئولہ صفات کی حامل گائے تلاش کرنا پڑی۔ اور تفسیری روایات کے مطابق اس گائے کی قیمت اُس کی کھال بھر دینار ادا کرنے پڑے۔ یہ ساری مشقت انہیں کثرتِ سوال کی وجہ سے اٹھانا پڑی۔ مسلم شریف میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد بھی موجود ہے۔ نهی عن قیل وقال وکثرۃ السوال وعن اضاعۃ المال یعنی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فضول قیل قال اور کثرت سوال سے منع فرمایا۔ اس کا کیا فائدہ؟ بات تو وہ ہونی چاہیئے جس سے دنیا میں بھی فائدہ ہو اور آخرت میں بھی فائدہ ہو۔ اسی طرح مال کے ضیاع سے بھی منع فرمایا گیا ہے۔ حلال مال کو بے بنیاد رسوم کی نذر کر دینا تعیش اور زیب و زینت میں اڑا دینا نہایت ناپسندیدہ بات ہے۔

کثرتِ سوال کے ضمن میں حضور علیہ السلام کا یہ ارشاد بھی موجود ہے کہ مسلمانوں میں بڑا مجرم وہ ہے جس کے سوال کی وجہ سے غیر حرام چیز بربنائے وضاحت حرام قرار دیدی گئی ہو اور اس پر لوگوں پر تنگی پیدا ہوگئی ہو مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے۔ کہ جب حج کا حکم نازل ہوا تو ایک شخص نے کھڑے ہو کر سوال کیا، کیا حج ہر سال فرض کیا گیا ہے؟ حضور علیہ السلام بہت ناراض ہوئے۔ اور فرمایا، اگر میں کہ دیتا کہ ہاں حج ہر سال کرنا ہے، تو تمہیں کرنا پڑتا اور پھر کتنی دشواری پیش آتی۔ لہٰذا تعمیلِ حکم کیا کرو۔ اس قسم کے سوال مت کیا کرو۔ دوسری اصولی بات اس میں یہ ہے۔ کہ جب کسی کام کے کرنے کا مطلق حکم ہوتا ہے تو وہ تکرار نہیں چاہتا۔ اگر ایک دفعہ تعمیلِ حکم کر لی جائے تو کافی ہے۔ جب کسی عمل کا تکرار آتا ہے تو وہ اس کے اسباب کی وجہ سے آتا ہے۔ جیسے نماز بار بار اس لیے ادا کی جاتی ہے کہ اس کے اوقات بار بار آجاتے ہیں۔ وگرنہ درود شریف کے مسئلہ میں غور فرمایئے اللہ تعالیٰ کا مطلق ارشاد ہے "یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا" (احزاب)

یعنی اے ایمان والو! حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پہ درود و سلام پڑھو۔ اس حکم کی تعمیل میں اگر کوئی مسلمان زندگی بھر میں ایک دفعہ بھی درود پاک پڑھ لیتا ہے تو اس کا فریضہ ادا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رض کہتے ہیں کہ میں نے اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بہتر کسی قوم کو نہیں دیکھا کہ وہ زیادہ سوال نہیں کیا کرتے تھے۔ قرآن پاک میں یَسْـئَلُوْنَكَ (اے پیغمبر! لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں) کا لفظ تقریباً ۱۳ مقامات پہ آیا ہے۔ ان میں زیادہ تر یہود اور مشرکین کے سوالات ہیں اور مسلمانوں کی طرف سے بہت کم سوال کیے گئے۔ صحابہ کرام رض سوال کرنے کی بجائے آپ کے ارشادات سنتے تھے اور پھر جو کچھ سنتے تھے اس پر عمل شروع کر دیتے تھے۔ حضور علیہ السلام کے حاضر باش صحابہ رض کی تو یہ حالت تھی، البتہ دیہات کے رہنے والے صحابہ رض چونکہ حضور کی اکثر مجالس میں شریک نہیں ہو سکتے تھے، اس لیے ان کی تعلیم کے لیے ہر قسم کے سوالات پوچھنے کی اجازت تھی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اب تک جو سوال ہو چکے ہیں عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کر دیا ہے وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ اور اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا اور بردبار ہے۔ پھر فرمایا قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ اس قسم کے سوالات تم سے پہلی قوموں نے بھی کیے۔ وہ لوگ اپنے انبیاء علیہم السلام سے صرف سوال کرتے تھے ان کے احکام کی تعمیل نہیں کرتے تھے۔ قرآن پاک میں بنی اسرائیل کے کثرتِ سوال کا ذکر موجود ہے۔ وہ لوگ سوالات دریافت کرنے کے باوجود اپنے انبیاء کی مخالفت کرتے تھے۔ اور اس کثرتِ سوال کا نتیجہ یہ نکلا ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ کہ وہ لوگ کافر ہو گئے۔ جب حکم معلوم ہو جانے کے بعد اس پر عمل نہ کیا تو گویا عملی طور پر اس حکم کا انکار کر دیا پھر یا تو صریحاً انکار کر کے کافر ہوئے یا عمل سے گریز کر کے عملی

منافی ٹھہرے۔

بحیرہ اور سائبہ

اس سورۃ میں تحریمات الٰہیہ کا بہت حد تک ذکر ہو چکا ہے جن جن چیزوں کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے، اُن سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے اب اگلی آیت میں تحریمات العباد یعنی ان محرمات کا ذکر ہے جو بندوں نے از خود اپنے اُوپر حرام قرار دے لی ہیں۔ چنانچہ یہاں پر اُن چیزوں کا تذکرہ ہے جو مشرکین نے نزولِ قرآن کے زمانہ میں اپنے اُوپر حرام کر رکھی تھیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔ مَا جَعَلَ اللّٰہُ مِنْ بَحِیْرَۃٍ اللہ تعالیٰ نے کوئی بحیرہ نہیں بنایا بلکہ یہ تو مشرکین کی طرف سے اللہ تعالیٰ پر افترا ہے۔ مفسرین کرام بحیرہ کی تفسیر دو طرح پر کرتے ہیں۔ امام بخاریؒ نے کتاب التفسیر میں نقل کیا ہے کہ مشرکین جس جانور کا دودھ اپنے معبودانِ باطلہ کے نام پر وقف کر دیتے تھے اس کا دودھ اپنے اوپر حرام کر لیتے تھے۔ اور پھر ایسے جانور کا کان بھی چھید دیتے تھے جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اس جانور کا دودھ کوئی شخص استعمال نہیں کر سکتا۔ ایسے جانور کو بحیرہ کہتے تھے۔ بحیرہ کی دوسری تفسیر یہ ہے۔ کہ یہ نام اُس مادہ جانور کو دیا جاتا تھا جو مسلسل دس مادہ بچے جنے اور اس کا آخری بچہ نر ہو۔ اُسے بھی معبودانِ باطلہ کے نام پر وقف کر دیتے تھے اور اُس کا دودھ استعمال نہیں کرتے تھے۔

فرمایا وَلَا سَآئِبَۃٍ اور سائبہ بھی اللہ نے نہیں بنایا۔ سائبہ اُس جانور کو کہتے تھے جو کسی منت کے پورا ہونے پر بتوں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا، نہ اُس کا دودھ استعمال کیا جاتا، نہ اُس پر سواری کی جاتی اور نہ اُس سے باربرداری یا کوئی دوسرا کام لیا جاتا۔ جیسے برصغیر میں ہندو گائے کو چھوڑ دیتے ہیں

وصیلہ اور حام

فرمایا وَلَا وَصِیْلَۃٍ اللہ تعالیٰ نے کسی کو وصیلہ بھی نہیں بنایا بلکہ یہ بھی مشرکین کی اپنی اختراع ہے۔ وصیلہ اس اونٹنی کو کہتے تھے جو مسلسل مادہ بچے جنتی اور درمیان میں کوئی نر بھی پیدا ہو جاتا تو کہتے یہ وصیلہ ہے کہ

اس نے نر اور مادہ کو ملا دیا ہے۔ مشرکین اُس کا استعمال بھی درست نہیں سمجھتے تھے
مسلسل مادہ بچے جننے والی اونٹنی کو بھی وصیلہ بنا کر بتوں کے نام پر وقف کر دیتے
تھے اور پھر نہ اس کا دودھ پیتے تھے اور نہ اس سے کوئی دیگر کام لیتے تھے
و لا حام اور اللہ نے کوئی حام بھی مقرر نہیں کیا۔ حام کا معنی بچا لینے والا
ہے۔ جس اونٹ کی جفتی سے دس بچے پیدا ہو جائیں اُسے حام بنا دیتے
تھے۔ پھر نہ اُس سے باربرداری کا کام لیتے تھے اور نہ اُسے کسی دوسرے
کام میں استعمال کرتے تھے۔

بہرحال مشرکین نے جاہلیت کے زمانہ میں اس قسم کی رسومات جاری
کر کے بعض جانوروں کو اپنے اوپر حرام کر رکھا تھا۔ اللہ نے فرمایا کہ ہم نے
تو ایسا کوئی حکم نہیں دیا، یہ ان کی اپنی اختراع ہے اور پھر بتوں کے نام پر
جانوروں کو وقف کر دینا تو ویسے ہی شرک ہے جس کے ذمہ دار یہ لوگ خود ہیں
اللہ تعالیٰ نے ایسی تمام رسومات کا رد فرمایا ہے۔

بت پرستی کی ابتداء

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے لے کر تقریباً ڈیڑھ ہزار
سال تک عرب کے لوگ صحیح دینِ ابراہیمی پر قائم تھے۔ بت پرستی کی ابتداء
حضور علیہ السلام کی بعثت سے تقریباً چار سو سال قبل ہوئی۔ ایک شخص عمرو
ابن لحی کسی دوسرے ملک میں گیا۔ وہاں اس نے بت اور مجسمے دیکھے جو اُسے
پسند آئے وہ اُن میں سے کچھ اپنے ساتھ بھی لے آیا اور اس طرح اُس نے
عرب میں بُت پرستی کی ابتداء کی۔ معبودانِ باطلہ کے نام پر جانور وقف
کرنے کا کام بھی اسی شخص نے شروع کیا تھا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے
فرمایا کہ میں نے عمرو ابن لحی کو جہنم میں اس حالت میں دیکھا ہے کہ وہ اپنی
آنتوں کو اس طرح زمین پر گھسیٹتا جا رہا تھا جس طرح خراس کا جانور خراس کو
کھینچتا ہے آپ نے اپنے ایک صحابی حضرت اکثمؓ کو فرمایا کہ عمرو ابن لحی
کی شکل تمہارے ساتھ ملتی جلتی ہے۔ اُس شخص نے عرض کیا، کیا میرا اس

بدبخت کے ساتھ ہم شکل ہونا میرے لیے باعثِ وبال تو نہیں ؟ حضور نے فرمایا، یہ کوئی عیب کی بات نہیں ۔ فرمایا تم مومن ہو۔ اور کافر اور مومن ہم شکل تو ہو سکتے ہیں مگر ان دونوں کا انجام الگ الگ ہے۔ بہرحال بت پرستی شروع ہونے کے بعد اس کا رواج اس قدر بڑھا کہ حضور علیہ السلام کے زمانۂ مبارک میں فتح مکہ کے دن خانہ کعبہ کے اندر، اس کی دیواروں پر اور اس کے قریب تین سو ساٹھ ۳۶۰ بت موجود تھے جنہیں توڑ کر باہر پھینک دیا گیا اور اس طرح بیت اللہ شریف کو بتوں کی نجاست سے پاک کر دیا گیا۔

افترا علی اللہ

فرمایا اللہ تعالیٰ نے نہ کوئی بحیرہ بنایا ہے، نہ سائبہ، نہ وصیلہ اور نہ حام وَلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ بلکہ یہ کافر لوگ اللہ تعالیٰ پر افترا باندھتے ہیں جھوٹ۔ انہوں نے غیر اللہ کی نذر و نیاز کی سب جھوٹی کہانیاں بنا رکھی ہیں کہ ایسا کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے یہ سب غلط اور اللہ تعالیٰ پر بہتان ہے انہوں نے خود اپنے اوپر بعض جانور حرام قرار دے لیے ہیں حالانکہ اللہ نے انہیں حلال قرار دیا ہے۔ فرمایا وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ان میں سے اکثر لوگ بے عقل ہیں انہوں نے اپنی بے وقوفی اور حماقت کی وجہ سے خود ساختہ عقیدے اور رسمیں جاری کر رکھی ہیں یہ تو عقلِ سلیم کے بھی خلاف ہے اللہ تعالیٰ کا ان بیہودہ باتوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

محرمات کی کچھ تفصیل اگلی سورۃ انعام میں بھی آ رہی ہے۔ وہاں پر شرک کی تمام قسمیں تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۚ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ﴿۱۰۴﴾

ترجمہ :۔ اور جب کہا جاتا ہے اُن لوگوں سے کہ آؤ اُس چیز کی طرف جس کو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے اور آؤ رسُول کی طرف ، وہ کہتے ہیں ہمارے لیے کافی ہے وہ چیز جس پر پایا ہے ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو۔ اگرچہ اُن کے آباؤ اجداد نہ جانتے ہوں کسی چیز کو اور نہ ہدایت پاتے ہو ﴿۱۰۴﴾

ربطِ آیات

گذشتہ آیات میں فضول اور لایعنی باتوں کے متعلق سوال کرنے سے منع فرمایا گیا تھا ، کیونکہ اگر نزولِ قرآن کے زمانے میں ایسی باتوں کے متعلق پوچھا جائے تو ہو سکتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ اُن کا جواب قرآنِ پاک میں نازل کر دے اور پھر وہ تمہیں ناگوار گزرے اور تم اُس پر عمل نہ کر سکو ۔ اگر ایسا ہی ہوا تو تمہارے لیے سخت بدنامی کا باعث ہوگا ۔ فرمایا تم سے پہلی قوموں نے بھی بعض بیہودہ سوالات کیے اور پھر اُن پر عمل نہ کر سکے اور سخت مشکل میں مبتلا ہوئے ، لہٰذا تم بھی کہیں اُن کی روش پر نہ چل نکلنا پھر اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے خود ساختہ محرمات کی تردید بھی فرمائی کہ انہوں نے اپنے باطل خیالات کے ذریعے بعض حلال جانوروں کو اپنے اُوپر حرام ــــــــ

ٹھہرا لیا تھا اور اُن کو معبودانِ باطلہ کے نام پر چھوڑ دیتے تھے فرمایا کہ اللہ نے حرمت کا ایسا کوئی حکم انہیں نہیں دیا بلکہ وہ خود اللہ پر افترا باندھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام کا تذکرہ کر کے فرمایا کہ ان بدبختوں نے ازخود اپنے اُوپر ان جانوروں کا دودھ سواری اور دیگر خدمات حرام کر رکھے تھے اور اسے اللہ کی طرف منسوب کرتے تھے کہ اُس نے ایسا حکم دیا ہے فرمایا یہ محض جھوٹ اور شرکیہ باتیں ہیں ان میں سے اکثر عقل سے خالی لوگ ہیں کیونکہ ان کے باطل عقائد کو تو عقل بھی تسلیم نہیں کرتی۔

دعوت الی القرآن

اب آج کی آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے بعض دیگر باطل عقائد کا ذکر کیا ہے اور اُن مشرکانہ رسوم کا رد فرمایا ہے جو انہوں نے خود وضع کر رکھی تھیں مگر انہیں اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں ارشاد ہوتا ہے وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ جب ان سے کہا جاتا ہے تَعَالَوْا اِلٰی مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ آؤ اُس چیز کی طرف جس کو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے اور وہ ہے قرآن پاک جیسی عظیم الشان کتاب جو منجانب اللہ نازل ہوئی ہے اور جس میں ہدایت، روشنی اور بصیرت کی باتیں ہیں۔ اس میں اوّل سے آخر تک حق کے سوا کچھ نہیں۔ لہٰذا اس کی طرف رجوع کرو۔ تمہارے تمام بنیادی اور اُخروی مسائل کا حل اسی کتاب میں موجود ہے۔ اس کے برخلاف تم نے جو بحیرہ، سائبہ وغیرہ محرمات ٹھہرا رکھے ہیں۔ ان کی حقیقت کچھ نہیں ہے۔ بلکہ قرآن پاک سے پوچھو کہ کون سی چیز حلال ہے اور کون سی حرام ہے "وَنَزَّلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ" یہ اللہ کی نازل کردہ کتاب ہے اور اس میں ہر چیز کی وضاحت ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانونِ حلت و حرمت میں ازخود دخل اندازی نہ کرو کیونکہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ مِّنَ الْحَلَالِ وَالْحَرَامِ اس میں حلت و حرمت

کی مکمل وضاحت موجود ہے ۔ لہٰذا اسی کے احکام پر عمل کرنے میں تمہاری
نجات ہے اس میں جنت تک پہنچنے اور دوزخ سے بچنے کے لیے
مکمل لائحہ عمل موجود ہے ۔

رسول بحیثیت شارح قرآن

فرمایا پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن پاک کی طرف آؤ اور دوسری یہ
کہ وَاِلَی الرَّسُوْلِ اور رسول کی طرف آؤ۔ رسول حامل قرآن ہونے
کی حیثیت سے خود اس پر عمل کرتا ہے ، اس کی وضاحت کرتا ہے
اور اس کی جزئیات (BYE - LAWS) بتلاتا ہے ۔ لہٰذا رسول کی طرف
رجوع بھی ضروری ہے ۔ رسول کی وضاحت کے بغیر قرآن پاک پر من وعن
عمل کرنا تمہارے لیے ممکن نہیں ہے لہٰذا تم پہلے قرآن کو تسلیم کرو اور پھر اُس کی
تشریح حامل قرآن سے پوچھو۔ اللہ تعالیٰ نے یہ چیز رسول کے فرائض منصبی میں داخل
کر دی ہے "لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ" (نحل) کہ آپ
لوگوں کے سامنے نازل شدہ چیز کو واضح طور پر بیان کر دیں ۔ قرآن پاک کا خود
اپنے متعلق بیان ہے کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُهٗ اس کی آیات محکم ہیں۔
ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ (ہود) پھر ان
کی تشریح بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی زبان سے کر دی ہے ۔ فرمایا
"ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ (قیمہ)" یعنی قرآن کا نازل کرنا بھی ہمارے ذمے
ہے اور پھر اس کی تشریح و توضیح بھی ہمارے ذمہ ہی ہے ۔ اسکی حفاظت کے
بھی ہم خود ذمہ دار ہیں ۔ لہٰذا فرمایا آؤ قرآن پاک کی طرف اور اللہ کے رسول کی طرف

خدا اور رسول کی اطاعت

مخلوق میں سے ہر چیز پر اللہ تعالیٰ کی اطاعت اس لحاظ سے فرض عین ہے
کہ وہ خالق ، مالک ، آقا ، رب اور الٰہ ہے ۔ ترمذی شریف کی روایت
میں آتا ہے تُحِبُّ اللّٰہَ تم اللہ سے اس لیے محبت رکھو کہ وہ تمہیں
انعام دیتا ہے ، وہ تمہارا منعم حقیقی اور محسن حقیقی ہے لہٰذا تمام مخلوق خصوصاً انسان
پر لازم ہے کہ وہ اُس کا شکریہ ادا کرے اور اُس کی اطاعت بجا لائے اور

اس کے احکام سے سرتابی نہ کرے۔

اسی طرح رسول کی اطاعت اُس کی رسالت کی وجہ سے ہر انسان پر فرض ہے۔ خود قرآن نے فرمایا "مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ" (نساء) جس شخص نے رسُول کی اطاعت کی، اُس نے گویا خدا تعالےٰ کی اطاعت کی۔ رسول کے لفظ میں یہ ساری حقیقت پوشیدہ ہے کہ رسول کی اطاعت مرسل کی اطاعت کی مانند ہے۔ اسی سورۃ میں پہلے گزر چکا ہے "يٰاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ" اے رسول اپنے رب کی طرف سے نازل کردہ ہر چیز کو آگے پہنچا دیں۔ مطلب یہ کہ رسول اللہ ہی کا پیغام مخلوق تک پہنچاتا ہے لہذا اُس کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے مترادف ہی ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام کی وضاحت اولاً اپنے نبی کی زبان سے کرائی ہے اسی لیے امام شافعیؒ، شاہ ولی اللہؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور دیگر علماء محققین اور مفسرین فرماتے ہیں کہ صحیح سند کے ساتھ ثابت ہونے والی تمام احادیث قرآن کی شرح ہیں اور خود قرآن اُن کا متن ہے۔

بہر حال فرمایا کہ قرآن پاک کی طرف آؤ اور اللہ کے رسول کی طرف آؤ۔ دوسرے مقام پر فرمایا قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ کہ دیجئے خدا اور رسُول کی اطاعت کرو فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ (آل عمران) اگر تم روگردانی کروگے تو اللہ تعالیٰ کفر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ گویا اللہ اور رسول سے روگردانی کفر ہے، دوسرے مقام پر فرمایا وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا (سورۃ نور) اگر رسول کی اطاعت کروگے تو ہدایت پا جاؤ گے۔ وہ ہادیٔ برحق ہے۔ قرآن پاک کی تشریح کرتا ہے لہذا اُس کی بات کو مانو اور خود ساختہ رسوم کو ترک کر دو۔ یہ سب کفر، شرک، بدعت اور معصیت کی باتیں ہیں۔

فتنہ انکار حدیث

اب یہ بات واضح ہو چکی کہ رسول کی اطاعت بھی اُسی طرح فرض ہے جس طرح اللہ کی اطاعت کیونکہ رسول کی تشریح کے بغیر احکام الٰہی کا سمجھنا اور اُن پر عمل کرنا مشکل ہے۔ اور رسول کی اطاعت کے لیے رسول کی حدیث پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اب جو کوئی حدیث کا انکار کرتا ہے، وہ دماغی فتور میں مبتلا ہے۔ ایسا شخص منکرِ حدیث ہی نہیں منکرِ قرآن بھی ہے پرویز، چکڑالوی وغیرہم کا انکارِ حدیث سے مقصد یہ ہے کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام آپ کے صحابہ کرامؓ اور ائمہ دین کی بیان کردہ تشریح کو قرآن سے الگ کر دیا جائے اور اُس کی جگہ اپنی من مانی توضیح کو رائج کر دیا جائے۔ اسی مذموم مقصد کے تحت پرویز نے اللہ کا معنیٰ قانون کیا ہے۔ گویا اللہ کی اطاعت سے مراد قانون کی اطاعت ہے۔ یہ تو کفر اور الحاد ہے جو اُس کے دماغ میں بھرا ہوا ہے۔ اللہ کا معنیٰ اگر قانون کیا جائے تو پھر اللہ کی ذات کہاں گئی شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ ایک ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان بھی یہ تصور رکھتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی ایک ذات ہے۔ اس کا وجود ہے اور اُس کی صفات ہیں اسی لیے ہر مسلمان جب سبحان اللہ کہتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ کی ذات تمام عیوب و نقائص سے پاک ہے۔ بہر حال یہ حدیث کے انکار کی وجہ ہے کہ ذاتِ خداوندی کا تصور بھی مٹانے کی کوشش ہو رہی ہے اور پھر یہیں پر بس نہیں کی بلکہ خود ساختہ معنوں کو رواج دینے کے لیے لغات قرآن کے نام سے خود ساختہ لغت بھی بنا دی ہے تاکہ اپنی مرضی سے کانٹ چھانٹ کر جو معنیٰ اپنی دماغی اختراع کے مطابق ہو، اُسے لغت میں لکھ دیا جائے اور پھر اُسے قرآن پاک پہ چسپاں کر دیا جائے۔

اولی الامر شرط

یہاں پر قرآن اور حدیث کی طرف دعوت دی گئی ہے، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی دعوت دی گئی ہے اور سورۃ نساء میں اولی الامر کی اطاعت کا بھی حکم موجود ہے۔ امام ابوبکر جصاص فرماتے ہیں کہ اولی الامر

میں مسلمان حکام بھی آتے ہیں اور علما اور فقہا بھی۔ ان کی اطاعت تبلیغ سنت کی وجہ سے ضروری ہے۔ اور مسلمان حکام کی اطاعت اسی لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ کے دین کو نافذ کرنے والے ہیں۔ البتہ حکام وقت ہوں یا علما و فقہا بزرگ ہوں یا پیر و مرشد ان سب کی اطاعت مطلق نہیں بلکہ خدا اور اس کے رسول کے حکم کے ساتھ مشروط ہے۔ اگر ان کی بات خدا اور رسول کے حکم کے مطابق ہو گی تو تسلیم کی جائے گی ورنہ ٹھکرا دی جائے گی۔ کیونکہ ان سے غلطی کا امکان ہے برخلاف اس کے اللہ کی مطلق اطاعت اس لیے ہے کہ وہاں غلطی کا کوئی امکان نہیں اور رسول کی مطلق اطاعت اس لیے کہ وہ کوئی غلط حکم نہیں دیتا۔ اگر کسی معاملہ کے سمجھنے میں غلطی ہو جائے یا کوئی خطا یا لغزش ہو جائے تو اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے فوراً اصلاح کر دیتا ہے لہٰذا نبی کا ہر حکم بھی واجب التعمیل ہے۔

آباؤ اجداد کی اندھی تقلید

فرمایا کہ جب مشرکین کو کہا جاتا ہے کہ اس چیز کی طرف آؤ جو اللہ نے نازل کی ہے اور رسول کی طرف آؤ قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہمارے لیے وہی کچھ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا۔ دوسرے لفظوں میں ہمیں کسی کتاب یا شریعت کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم تو اپنے باپ دادا کے مذہب پر قائم رہیں گے۔ ان کا استدلال یہ ہوتا ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد بڑے بڑے چوہدری، دانا اور پنچ تھے۔ ان کی مجلسوں میں اہم فیصلے ہوتے تھے وہ کیا نالائق اور بے وقوف تھے جو ہم ان کے رسم و رواج اور طور طریقے کو ترک کر دیں؟ ہمارے لیے تو ان کا اتباع ہی کافی ہے اور یہی وہ دلیل ہے جو اکثر مشرکین اپنے جاہلانہ تصور کے حق میں دیتے رہے ہیں۔

امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ انسان اکثر تین قسم کے حجابات میں مبتلا ہوتے ہیں۔ یعنی حجاب طبع، حجاب رسم اور حجاب سوء معرفت

فرماتے ہیں کہ حجاب طبع سے مراد یہ ہے کہ انسان خواہشات نفسانیہ کے پیچھے لگ جائے اور وہی کرے جو اُس کا دل چاہے۔ نیز کھانے پینے اور آرام طلبی میں مصروف رہے۔ حجاب رسم یہ ہے کہ انسان اپنے آباؤ اجداد، برادری اور قبیلے کے رسم و رواج میں مبتلا رہے۔ ایسا شخص اپنی زندگی جیسی قیمتی پونجی انہی رسومات باطلہ کی نذر کر دیتا ہے اور حق کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتا۔ پھر جب اس دنیا سے جاتا ہے تو آنکھ کھلتی ہے۔ اُس وقت وہ اپنے آپ کو بالکل خالی دامن پاتا ہے۔ پھر اُسے احساس ہوتا ہے کہ جس چیز پر نجات کا دارومدار تھا اُس کی طرف تو اُس نے اپنی زندگی میں توجہ نہ دی۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں حجاب سوء معرفت یہ ہے کہ انسان خدا تعالیٰ کو مانے مگر غلط طریقے سے۔ یہود و نصاریٰ، ہندو وغیرہ سب خدا تعالیٰ کو کسی نہ کسی طریقے پر مانتے ہیں مگر ماننے کا وہ طریقہ غلط ہے جس کی وجہ سے اُن کا ماننا بھی انکار کے مترادف ہے۔

بعض لوگ شرک یا تشبیہ میں مبتلا ہوتے ہیں شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ مہلک بیماریاں ہیں۔ شرک تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات یا اُس کی صفات میں غیر اللہ کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔ یعنی اللہ کی صفات مختصہ غیروں میں بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اور تشبیہ یہ ہے کہ انسانوں کی صفات اللہ تعالیٰ میں ثابت کرتے ہیں۔ جیسے یہ عقیدہ رکھنا کہ اِتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا العیاذ باللہ اللہ نے بیٹا بنا لیا ہے۔ گویا اس بیماری میں مبتلا لوگ اللہ تعالیٰ کا مثیل یا مد مقابل یا بیٹا بنا لیتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ان تینوں حجابوں سے بہت کم لوگ بچ کر نکلتے ہیں۔ بہر حال کسی بھی کام کو دین کی طرف لوٹانے کی بجائے اپنے آباؤ اجداد ہی کو معیار بنا لینا جاہلانہ تقلید ہے۔ یہ انسان کو معصیت سے بڑھ کر شرک تک لے جاتی ہے۔

فرمایا یہ مشرک اور بدعتی لوگ اپنے خود ساختہ افعال کی دلیل صرف یہ پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے بڑوں کو اسی طریقے پر پایا ہے۔ اُن کے

پاس نہ کوئی عقلی دلیل ہوتی ہے نہ نقلی اور نہ ہی وہ مشاہدہ کی بنیاد پہ کوئی جواز پیش کرسکتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا یہ لوگ اپنے باپ دادا کو دلیل بناتے ہیں اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْئًا اگرچہ اُن کے آباؤ اجداد کچھ نہ جانتے ہوں یعنی جاہلِ مطلق ہوں وَلَا يَهْتَدُوْنَ اور نہ ہی وہ ہدایت کے راستے پہ ہوں۔ فرمایا کہ اس سے بڑھ کر گمراہی کیا ہوسکتی ہے کہ جاہل اور غیر ہدایت یافتہ آباؤ اجداد کی تقلید میں خود بھی اسی گڑھے میں جاگرے۔ شاہ عبدالقادر محدثؒ فرماتے ہیں۔ کہ اگر باپ دادا کے متعلق وثوق سے علم ہو کہ وہ حق کے تابع اور صاحبِ علم تھے تو پھر اُن کی راہ بچنے اگر ایسا نہیں ہے تو سراسر گمراہی میں مبتلا ہونیوالی بات ہے۔ یہی اندھی تقلید ہے جو ان کو بالآخر شرک اور کفر میں مبتلا کر کے جہنم میں جانے کا ذریعہ بن جانے گی آج بھی لوگ اپنی مبتدعانہ رسوم کے جواز میں خاندانی رسم و رواج اور بڑوں کے عمل کو پیش کرتے ہیں، وہ گمراہی میں مبتلا ہیں کسی بھی عمل کے لیے کتاب و سنت سے دلیل کی ضرورت ہے صحابہ کرامؓ کے عمل کو پیش کرو۔ اگر وہاں بھی نہ ملے تو ائمہ دین سے دریافت کرو۔ امام ابوحنیفہؒ کا فتویٰ لاؤ۔ محدثین کا قول پیش کرو، امام شافعیؒ، مالکؒ اور احمدؒ کیا کہتے ہیں۔ امام بخاریؒ، مسلمؒ، ترمذیؒ اور نسائیؒ کی کیا تحقیق ہے۔ اگر ان میں سے کوئی دلیل بھی نہیں ہے اور محض بڑوں کی دیکھا دیکھی کر رہے ہو تو سمجھ لو کہ صریح گمراہی میں مبتلا ہو۔ اگر فلاح چاہتے ہو تو اللہ اور اس کے رسول کے بتلائے ہوئے راستے پہ گامزن ہو جاؤ۔ یہی وہ شاہراہ ہے جو تمہیں جنت تک لے جائیگی۔

جائز تقلید

آباؤ اجداد کی اندھی تقلید کے برخلاف اگر اہلِ علم کی تقلید اس بنا پر کی جائے کہ وہ قرآن پاک اور شریعتِ مطہرہ کو بہتر طور پر جانتے ہیں تو ایسی تقلید کی اجازت ہے۔ ائمہ دین اور علما و فقہا کی تقلید محض اس لیے کی جاتی ہے کہ وہ قرآن و سنت کو بہتر جاننے والے ہیں۔ لہٰذا امام ابوحنیفہؒ کی تقلید ترک

تقلید نہیں ہے بلکہ بالکل جائز ہے۔ وہ ہم سے زیادہ صاحبِ علم تھے اور مسائل شرعیہ کا حل بہتر طور پر پیش کرتے تھے۔ مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ جاہلانہ تقلید میں بعض غلط کار صوفیوں کا بھی حصہ ہے جب انہیں قرآن و سنت کی بات بتائی جاتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اپنے بزرگوں کے طریقے پر چلیں گے۔ ہم تو مشائخ کے کہنے پر عمل کریں گے۔ یہ بھی مشرکانہ تقلید میں آتا ہے۔ صحیح تقلید یہ ہے کہ اللہ اور رسول کی بات کو مقدم رکھا جائے۔ جو چیز اس کے مطابق ہے اُسے قبول کر لیا جائے اور اگر کوئی شیخ قرآن و سنت کے خلاف کہتا ہے۔ تو وہ شیطانی اور گمراہی کی بات ہوگی۔ اُسے رد کر دیا جائے گا۔

شاہ اسماعیل شہیدؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص دیکھے کہ اُس کا پیر غلط بات کرتا ہے تو اس کی بیعت سے تو الگ نہ ہو بلکہ اس کی اصلاح کی کوشش کرے اور اس کی صورت یہ ہے کہ دوسروں سے کہلوائے کہ یہ بات غلط ہو رہی ہے اور اپنے پیر کے حق میں دعا بھی کرے کہ صراطِ مستقیم پر قائم رہے اور پیر صاحب کے کہنے پر غلط بات کو خود اختیار نہ کرے۔ ایک صاحب نے بتایا کہ ایک پیرزادہ صاحب گلے کی بیماری میں مبتلا ہو گئے حکیم صاحب نے مشورہ دیا کہ خضاب لگانے سے آپکی بیماری میں اضافہ ہوا ہے لہٰذا اسے ترک کر دیں۔ کہنے لگے یہ تو میں نہیں چھوڑ سکتا کیونکہ میرے حضرت صاحب نے حکم دے رکھا ہے کہ خضاب لگایا کروں۔ اب اگر شریعت بھی کالا خضاب لگانے سے منع کرے تو یہ صاحب اپنے شیخ کے حکم کی خلاف ورزی کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ یہی جاہلانہ تقلید ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔ تاہم آئمہ دین، علماء و فقہاء کی تقلید اس لحاظ سے جائز ہے کہ انہیں قرآن و سنت پر بہتر دسترس حاصل ہے اور وہ بہتر طریقے پر راہنمائی کرنے کے اہل ہیں۔

يَآيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۭ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

ترجمہ :- اے ایمان والو ! لازم پکڑو اپنے اوپر اپنے نفسوں کو ، تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا وہ جو گمراہ ہوا جبکہ تم ہدایت کی راہ پر قائم رہے ۔ اللہ ہی کی طرف تم سب کا لوٹ کر جانا ہے پھر وہ تم کو بتلا دے گا جو کام تم کیا کرتے تھے ﴿۱۰۵﴾

ربطِ آیات

گذشتہ سے پیوستہ درس میں اُن جاہل مشرکوں کا رد فرمایا تھا جنہوں نے محض رسم و رواج کی بناء پر بعض جانوروں کو خود پر حرام قرار دے رکھا تھا اور الٹا اللہ پر افترا باندھتے تھے اس کے بعد گذشتہ درس میں اس بات کا ذکر ہو چکا ہے ۔ کہ جب اِن لوگوں کو قرآنِ پاک اور پیغمبر علیہ السلام کی طرف دعوت دی جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہمارے لیے ہمارے آباؤ اجداد کا طریقہ ہی کافی ہے ہم اُسی پر قائم رہیں گے ۔ اللہ نے فرمایا کیا وہ اپنے اجداد ہی کی اتباع کرتے رہیں گے خواہ وہ بے علم اور گمراہ ہی کیوں نہ ہوں ؟ یہ بڑی بے سمجھی کی بات ہے اور اس سے ایمان والوں کو تقیناً صدمہ پہنچتا ہے وجہ یہ ہے کہ ایک گروہ کفر و شرک کا راستہ اختیار کرتے ہیں اور دوسرا اُس پر اصرار کرتے ہیں ۔ پھر جب انہیں اللہ اور اُس کے رسول کی طرف دعوت دی جاتی ہے ، حق کی طرف بلایا جاتا ہے تو وہ انکار کر دیتے ہیں ۔ اہلِ ایمان کے لیے یہ بھی تکلیف دہ بات ہے ۔ اب اگلی آیت میں ایمان والوں کو تسلی دی

گئی ہے کہ اگر لوگ شرک، کفر اور گمراہی پر اصرار کرتے ہیں اور حق کا راستہ قبول نہیں کرتے تو آپ اُن پر زیادہ افسوس نہ کریں بلکہ اپنا فریضہ ادا کرتے رہیں۔ ایسا کرنے سے کفار و مشرکین تمہیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے بلکہ وہ خود اپنے منطقی نتیجہ کو پہنچ جائیں گے۔

اصلاحِ نفس

ارشاد ہوتا ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اے ایمان والو! عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لازم پکڑو اپنے اوپر اپنی جانوں کو۔ یعنی اگر دوسرے لوگ تمہاری تبلیغ کا اثر قبول نہیں کرتے تو اس کی زیادہ فکر نہ کرو بلکہ اپنی اصلاح کی فکر کرو اور پھر اصلاحِ نفس کے ساتھ ساتھ بقدرِ ضرورت و ہمت دوسروں کی اصلاح کی بھی کوشش کرو۔ تاہم تمہارے حق میں زیادہ ضروری یہ بات ہے کہ اپنی اصلاح کو ملحوظ خاطر رکھو اگر ایسا کرو گے۔ تو لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ گمراہ ہونے والا شخص تمہیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ بعض اوقات اہل ایمان یہ خطرہ محسوس کرتے ہیں کہ اگر دوسرے لوگ ہدایت قبول نہیں کریں گے تو شاید ہم بھی گمراہ ہو کر انہی میں شامل ہو جائیں۔ تو اللہ نے فرمایا جو شخص خود گمراہ ہو چکا ہے وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا، مگر شرط یہ ہے اِذَا اھْتَدَیْتُمْ کہ تم خود ہدایت کے راستے پر قائم رہو۔ امام ابوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس تسلی کا یہ مطلب نہیں کہ غیر ہدایت یافتہ لوگوں کو تبلیغ کرنا ہی چھوڑ دیا جائے۔ بلکہ تمہارا فرض یہ ہے کہ حق کی بات دوسروں تک پہنچاتے رہو۔ ہاں، اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ تمہاری بات بالکل غیر مؤثر ثابت ہو رہی ہے، لوگ حق بات کو سننے تک کے لیے تیار نہیں اور تشدد پر اُتر آئے ہیں، تو پھر اُن کے زیادہ درپے نہ ہوں اور اصلاحِ نفس کی طرف توجہ دیں۔ تاہم اُن سے بالکل ہی کٹ کر نہ رہ جائیں بلکہ اُن کے ساتھ اس حد تک رابطہ رہنا چاہیئے کہ جب بھی

مناسب موقع ملے۔ تبلیغ دین کا کام پھر سے شروع کیا جا سکے۔

فریضۂ تبلیغ دین

اصلاحِ نفس سے مراد محض اپنی واحد ذات نہیں بلکہ اس سے تمام ہم قوم اور ہم مذہب لوگ مراد ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ جب تم اس قدر مجبور ہو جاؤ کہ اغیار تک تمہاری بات نہیں پہنچ جاتی تو پھر کلمہ حق کو اپنوں تک ہی پہنچاتے رہو تاکہ تم سب ہدایت کے رستے پر قائم رہ سکو۔ اور اغیار کی کسی سازش کا شکار نہ ہو جاؤ۔ دین کی بات کا آپس میں اعادہ کرنا دین پر پختگی کی ضمانت ہوگا اور اس طرح تم دوسروں کے مقابلہ میں اپنے آپ کو مزید مستحکم کر سکو گے۔ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ کا یہی مطلب ہے کہ جب تم خود اپنے دین پر مستحکم ہو گے تو دوسرے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ گویا ہدایت پر قائم رہنے میں دونوں باتیں آتی ہیں۔ ایک اپنی اصلاح اور دوسرے پیغام خداوندی کی دوسروں تک تبلیغ چنانچہ تبلیغ دین ہر مسلمان کا ایک اہم فریضہ ہے۔ پہلے بھی گزر چکا ہے۔ اے رسول! "بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ" جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے نازل ہوا ہے اُسے دوسروں تک پہنچا دیں۔ اِسی طرح ملت دین حق پر قائم رہ سکتی ہے۔ اگر تبلیغ دین کا فریضہ فراموش کر دیا جائے تو قوم و ملت کی بنیادیں کمزور ہو جائیں گی اور وہ روبہ زوال ہو کر اغیار کا شکار ہو سکتی ہے۔

امر بالمعروف نہی عن المنکر

اللہ تعالیٰ نے سورۃ لقمان میں حضرت لقمانؑ کی نصیحت نقل کی ہے جو انہوں نے اپنے بیٹے کو کی۔ "وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ" اے بیٹے! نیکی کا حکم کرتے رہو اور بُرائی سے روکتے رہو تبلیغ دین ایک ایماندار کا فرضِ منصبی ہے۔ سورۃ توبہ میں اللہ تعالےٰ نے ایمان والوں کی سات صفات بیان فرمائی ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" کہ وہ ہمیشہ نیکی کا حکم کرتے ہیں اور بُرائی سے منع کرتے ہیں۔ اسی سورۃ

میں بھی پہلے گذر چکا ہے۔ اللہ نے سابقہ اقوام خصوصاً یہود کے متعلق فرمایا کَانُوْا لَا یَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْکَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا کَانُوْا یَفْعَلُوْنَ کہ وہ برائی سے منع نہیں کرتے تھے اور اس طرح وہ بہت بُری بات کے مرتکب ہوتے تھے بُرائی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اس سے منع نہ کرنا بہت بُری کارگذاری تھی۔

مروان کی گورنری کا زمانہ تھا، عید کے دن وہ نمازِ عید کے لیے آیا تو نماز پڑھانے سے پہلے خطبہ شروع کر دیا۔ ایک مسلمان نے اٹھ کر کہا کہ پہلے نماز پڑھاؤ پھر خطبہ دینا۔ کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی طریقہ ہے۔ جمعہ اور عیدین کے خطبے ان ہی نمازوں سے متعلق ہیں مگر جمعہ کا خطبہ پہلے اور نماز بعد میں ہے جب کہ عیدین کی نماز میں نماز پہلے اور خطبہ بعد میں ہے۔ بہرحال اس مسلمان کے ٹوکنے پر صحابی رسول حضرت ابوسعید خدریؓ نے فرمایا کہ بیشک اس مسلمان نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کر دیا حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے کہ جہاں بُرائی کا ارتکاب ہو رہا ہو تم میں سے صاحب طاقت کو چاہیئے کہ وہ اس بُرائی کو بزورِ طاقت ہٹا دے۔ اگر ہاتھ سے ہٹانے کی طاقت نہیں رکھتا تو زبان سے روکے۔ اگر اتنی طاقت بھی نہیں پاتا فَبِقَلْبِهٖ تو اس کو دل سے ہی بُرا سمجھے۔ فرمایا ذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ یہ ایمان کا کمزور درجہ ہے۔ دوسری روایت میں آتا ہے کہ اس کے بعد تو ایک رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان کا درجہ نہیں ہے۔

حضرت جریر ابن عبداللہؓ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے کہ کوئی شخص ایسے لوگوں میں رہتا ہو یُعْمَلُ فِیْهِمْ بِالْمَعَاصِیْ جن میں گناہ کا ارتکاب ہوتا ہے، پھر جو لوگ اس کو روکنے پر قادر ہیں، وہ اس کو روکنے کی کوشش بھی نہیں کرتے، اُن کے متعلق فرمایا اَصَابَهُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ قَبْلَ اَنْ یَّمُوْتُوْا۔ یہ لوگ مرنے سے پہلے خدا کی طرف

سے عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ اس سے عمومی عذاب مراد نہیں ہے تاہم کوئی کسی سزا میں مبتلا ہو جائے گا کوئی کسی تکلیف میں۔ ہو سکتا ہے کہ غلام بنا لیے جائیں یا اُن سے دین چھین لیا جائے یا اُن پر غربت طاری کر دی جائے یا وہ طوفان اور زلزلے کی زد میں آجائیں۔ بہرحال وہ کسی نہ کسی سزا میں ضرور مبتلا ہوں گے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے بھی منبر پر یہ بات فرمائی تھی، اے لوگو! تم عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ والی آیت پڑھتے ہو مگر اس سے غلط مطلب نہ اخذ کریں۔ ایسا نہ ہو کہ تم تبلیغ دین کا کام چھوڑ بیٹھو اور صرف اپنی فکر میں لگے رہو۔ کیونکہ اِنَّ النَّاسَ اِذَا عُمِلَ فِيْهِمْ بِالْمَعَاصِيْ وَلَمْ يُغَيِّرُوْا اَوْشَكَ اَنْ يَّعُمَّهُمُ اللّٰهُ بِعِقَابٍ جب لوگوں میں گناہ کیے جا رہے ہوں اور وہ اس کو تبدیل نہ کریں۔ تو قریب ہے کہ خدا تعالیٰ سب کو سزا میں مبتلا کر دے۔

تبلیغ کب ساقط ہے

ایک مسلمان سے تبلیغ صرف اس وقت ساقط ہوتی ہے جب اس کو ادا کرنے کا کوئی طریقہ باقی نہ رہے حالات اس قدر دگرگوں ہو جائیں کہ تبلیغ بالکل مؤثر نہ ہو رہی ہو یا ایسا کرنے سے کسی تکلیف میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہو تو ایسی صورت میں تبلیغ کو مؤخر کرنے اور اصلاح نفس کی طرف زیادہ توجہ دے۔ حضور علیہ السلام کے صحابی ابو ثعلبہؓ بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بَلِ ائْتَمِرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنَاهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ یعنی نیکی کی باتوں کی ہمیشہ تلقین کرتے رہو اور برائی سے روکتے رہو۔ ہاں جب دیکھو کہ ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں کہ بخل کی اطاعت کی جاتی ہے یعنی لوگوں میں بخل پیدا ہو گیا ہے اور فیاضی ختم ہو گئی ہے اور خواہشات کی پیروی کی جا رہی ہے، قرآن و سنت اور دین کو کوئی پوچھتا نہیں۔ ہر طرف آخرت کے مقابلے میں دنیا کو ترجیح دی جا رہی ہے۔ ہر آدمی اپنی ہی رائے کو صحیح سمجھتا ہے اور دوسرے کی بات کو سننے کے لیے تیار

نہیں ہوتا خواہ وہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو۔ فرمایا اگر ایسا وقت آ جائے فَعَلَیْکَ نَفْسَکَ پھر اپنی فکر کر اور دوسروں کی فکر چھوڑ دے، ایسے حالات میں اپنے آپ کو بچانا بھی غنیمت ہے کہ کہیں گمراہی میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔ کیونکہ آگے ایسے دن بھی آنے والے ہیں کہ صبر کرنا اتنا دشوار ہو جائیگا جیسے جلتے ہوئے کوئلے کو ہاتھ میں پکڑنا۔ فرمایا اس دور میں تم میں سے جو شخص نیک اعمال انجام دے گا اس کو پچاس آدمیوں کے عمل کے برابر اجر دیا جائیگا۔ کیونکہ یہ فتنہ و فساد کا زمانہ ہوگا۔

ظلم کی داستانیں

فرمایا جب ظلم و ستم بڑھ جائے تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ساقط ہو جاتا ہے۔ مثلاً حجاج بن یوسف کے زمانے کے ظلم و جور تاریخ میں محفوظ ہیں۔ یہ ظالم شخص مروانیوں کے تحت بیس سال تک عراق کا گورنر رہا۔ حضرت امیر معاویہؓ تو صحابی رسول تھے، آپ کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے سوا سب مشتبہ لوگ تھے اچھے کام بھی کرتے تھے مگر ظلم و ستم اور دیگر برائیاں بھی انجام دیتے تھے جب حجاج مرا تو حسن بصریؒ نے کہا تھا، اے اللہ! تو نے اس کو مارا ہے تو اس کی سنت کو مٹا دے۔ یہ اتنا ظالم شخص تھا چھوٹی چھوٹی اور خراب آنکھوں والا آدمی اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو پھیلاتا رہتا تھا۔ بخدا اگر جہاد میں جاتا تھا تو گھوڑے کی باگ پکڑنے سے کبھی اس کے ہاتھوں میں پسینہ نہیں آیا ہوگا یعنی اسے کبھی جہاد میں حصہ لینے کا موقع نہیں ملا۔ کنگھی پھیرتا تھا، اکڑ کر چلتا تھا اور پھر بکواس شروع کر دیتا تھا، کبھی کوئی بات کبھی کوئی بات، یہاں تک کہ حسنؒ کہتے ہیں کہ کوئی آدمی اٹھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ حضرت! وقت جا رہا ہے۔ نماز ادا کر لیں۔ اگر کوئی ایسی جرأت کرتا تو اس پر کوڑے برستے یا تلوار سے سر قلم کر دیا جاتا۔ ایک دفعہ تقریر کر رہا تھا کہ کسی شخص نے کہہ دیا اَیُّھَا الْاَمِیْرُ اے امیر! وقت تنگ ہو رہا ہے الصلوٰۃ نماز پڑھا لیں کہنے لگا، تم کون ہو، اس نے کہا، ایک

مسلمان ہوں۔ کس قبیلے سے تعلق ہے، عرض کیا، فلاں سے، کہا تم بڑے نیک آدمی ہو، بڑی نیکی کی بات کرتے ہو۔ اُدھر اپنے فوجی سے کہا کہ اسے فوراً جنت میں پہنچا دو۔ بس اتنی سی بات پر اُس کا سر قلم کروا دیا۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں عبدالملک بن عمیر جمعہ کے دن دوپہر کے وقت آکر منبر پر بیٹھ گیا۔ کبھی کسی کی مدح بیان کی، کسی کی مذمت کی یہاں تک کہ مسجد کے میناروں پر سورج کی ہلکی سی سُرخی باقی رہ گئی۔ پھر اُس نے اذان کہلوائی اور جمعہ کی نماز پڑھی، پھر عصر کی اذان کہلوائی اور عصر کی نماز پڑھی گئی اس کے ساتھ ہی مغرب کا وقت ہو گیا۔ پھر مغرب کی اذان ہوئی اور نماز ادا کی گئی کہتے ہیں کہ اِن حالات میں بھی کوئی شخص زبان کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا، ورنہ جان جاتی تھی اگر اس قسم کا دَور آجائے تو پھر آدمی تبلیغ دین کے معاملہ میں مجبور سمجھا جائے گا۔

ملوکیت کی تاریخ میں ظلم و ستم کی بڑی بڑی داستانیں ملتی ہیں مگر اہلِ حق پھر بھی وقتاً فوقتاً قائم ہوتے رہے ہیں ہندوستان میں بھی بعض بڑے جابر بادشاہ گزرے ہیں ایسے واقعات بھی ملتے ہیں کہ تغلق کے زمانے میں کسی بزرگ نے امر بالمعروف کیا تو بادشاہ نے حکم دیا کہ اِس کے دانت اکھاڑ کر اس کے سر میں میخوں کی طرح ٹھونک دیے جائیں۔ اس کے باوجود حق پرست لوگ شہادت قبول کر لیتے تھے مگر اعلائے کلمہ حق سے باز نہیں آتے تھے۔ البتہ اس قسم کے حالات میں جب انسان کو جان کا خطرہ ہو تو وہ امر بالمعروف کے فریضہ سے معذور سمجھا جائے گا، ورنہ عام حالات میں اپنی اصلاح بھی ضروری ہے اور دوسروں کی اصلاح بھی لازم ہے روحانی ترقی کے لیے اصلاح نفس بھی ضروری ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ حق کی حمایت میں سعی کرتا ہے۔ اِنَّا اَعْتَدْنَا ... میں یہ بات بھی پائی جاتی ہے کہ اپنی اصلاح کے ساتھ ساتھ جہان کی اصلاح بھی مدنظر ہو۔

عدم ادائیگی فریضہ کا وبال

حضرت حذیفہؓ کی روایت میں آتا ہے۔ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا وَالَّذِی نَفْسِی بِیَدِہٖ اللہ کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ اے لوگو نیکی کا حکم ضرور کرتے رہو اور برائی سے ضرور روکتے رہو، ورنہ لَيَعُمَّنَّكُمُ اللّٰهُ بِعِقَابٍ مِنْ عِنْدِهٖ اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے تمہیں کسی عذاب میں مبتلا کر دے گا۔ ثُمَّ لَتَدْعُنَّ فَلَا يَسْتَجِيبُ لَكُمْ پھر تم دعائیں مانگتے رہو گے مگر قبول نہیں ہوں گی کیونکہ تم اپنے فریضہ کو ترک کر چکے ہو گے۔

ایک شخص حضرت عمرؓ کے پاس آیا اور عرض کیا، امیر المومنین اَعْمَلُ بِاَعْمَالِ الْخَيْرِ اِلَّا خَصْلَتَيْنِ میں سارے نیکی کے کام کرتا ہوں مگر دو کام کرنے سے عاجز ہوں۔ فرمایا، وہ دو کام کون سے ہیں کہنے لگا اَلْاَمْرُ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّهْيُ عَنِ الْمُنْكَرِ یعنی نیکی کا حکم برائی کی ممانعت، یہ دو کام میں نہیں کرتا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا لقد طمست سهمين من سهام الاسلام تو نے اسلام کے دو حصے مٹا دیے ہیں اور خدا کی گرفت میں آ گئے ہو لہٰذا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اتنے ضروری امور ہیں کہ ان کو ترک کرنے سے خود اسلام کو نقصان پہنچانے والی بات ہے۔

قرآن مرکزِ فکر

بہر حال اجتماعی طور پر اصلاحِ نفس اور اصلاحِ ناس کا فریضہ اسی صورت میں کامیاب ہو سکتا ہے جب قرآن پاک کو اپنی فکر کا مرکز بنا لیا جائے۔ جب لوگ قرآن حکیم کی باریکیوں کو سمجھنے لگیں گے تو پھر اپنی اصلاح بھی کر سکیں گے اور دوسرے لوگوں کی اصلاح کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے اسی سورۃ میں پہلے آ چکا ہے فَاتَّقُونِ يٰۤاُولِی الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ اے عقلمند لوگو! اگر مجھ سے ڈرتے

رہو گے تو تمہیں فلاح نصیب ہو جائیگی، پھر دوسری قومیں تمہارا مقابلہ نہیں کر سکیں گی۔ جب تمہاری عقلوں کو اتنی ترقی نصیب ہو جائے کہ قرآن پاک کی باریکیاں سمجھنے لگو تو پھر کامیابی تمہارے قدم چوم لے گی۔

فرمایا، یاد رکھو! اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا تم سب کو لوٹ کر خدا کے ہاں جانا ہے فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ پھر وہ تمہیں بتائے گا جو کچھ تم کرتے رہے اُس کے پاس تمہاری زندگی کا پورا ریکارڈ موجود ہے۔ وہ ظاہر کر دے گا کہ فلاں فلاں وقت میں تم فلاں فلاں کام انجام دیتے رہے۔ اچھا یا بُرا جو کچھ بھی اس دنیا میں کیا ہے، سب کچھ سامنے آ جائیگا۔ پھر یا تو اچھے کام کی جزا پاؤ گے یا بُرے کام کی سزا بھگتنا ہو گی، کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے محاسبے سے بچ نہیں سکے گا لہٰذا تمہاری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ناسازگار حالات میں بھی اپنی اصلاح کرو اور ہدایت کے رستے پر قائم رہو۔ اگر ایسا کرو گے تو دوسروں کا کفر، شرک اور اغلاط تم پر اثر انداز نہیں ہو سکے گا۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمان کا فریضہ بھی سمجھا دیا اور پھر اُسے تسلی بھی دے دی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ
اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ
ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ
اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ
مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ ؕ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْ بَعْدِ
الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِيْ
بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ
اللّٰهِ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ فَاِنْ عُثِرَ عَلٰٓى
اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّآ اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ
مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ
الْاَوْلَيٰنِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَآ اَحَقُّ مِنْ
شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَآ ۖ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ
الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى
وَجْهِهَآ اَوْ يَخَافُوْٓا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌ بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ
وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
ع ۱۴ ۸ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

ترجمہ :- اے ایمان والو ! گواہی تمہارے درمیان جس
وقت کہ آجائے تم میں سے کسی کے پاس موت ، وصیت
کے وقت دو شخص انصاف والے ہوں تم میں سے یا
دو اور ہوں تمہارے سوا دوسروں سے اگر تم سفر کرو زمین
میں اور پہنچ جائے تم کو موت کی مصیبت ۔ اُن دونوں
گواہوں کو روک رکھو نماز کے بعد ، پس وہ قسم اٹھائیں اللہ
کی اگر تم کو شک ہو ، کہ ہم اس (قسم) کے بدلے کوئی
قیمت نہیں خریدنا چاہتے ۔ اگرچہ قرابتدار ہی کیوں نہ ہوں ،
اور ہم نہیں چھپاتے اللہ کی گواہی کو ۔ بیشک ہم اُس وقت
البتہ گنہگاروں میں سے ہوں گے (۱۰۶) اگر اطلاع ہو جائے
اس بات پر کہ یہ دونوں گناہ کے مستحق ہوئے ہیں ، پس
دوسرے دو کھڑے ہو جائیں اُن کی جگہ پر اُن میں سے کہ
جن پر یہ پہلے دو شخص گناہ کے مستحق ہوئے ہیں ۔ وہ اللہ
کے نام پر قسم اٹھائیں اور یہ کہیں کہ ہماری گواہی زیادہ
تحقیق ہے اُن کی گواہی سے اور ہم نے تعدی نہیں کی ،
بیشک اُس وقت ہم ظلم کرنے والوں میں سے ہونگے (۱۰۷)
یہ بات (جو تمیں تبلائی گئی ہے) زیادہ قریب ہے کہ
یہ لوگ گواہی کو اس کے صحیح طریقے پر قائم کریں یا پھر
خوف کھائیں کہ رد کر دی جائینگی قسمیں ، اُن کی قسموں کے
بعد اور ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور سنو ، اور اللہ نہیں
راہنمائی کرتا اُس قوم کی جو نافرمانی کرنے والی ہو (۱۰۸)

ربط: پہلی آیت میں اللہ نے کثرتِ سوال سے منع فرمایا ۔ پھر مشرکین کے

عقائدِ باطلہ کا رد فرمایا کہ جب انہیں کہا جاتا ہے کہ اللہ اور رسول کی طرف آؤ تو وہ اپنے آباؤ اجداد کے راستے کو ہی پسند کرتے ہیں، اللہ نے اسے گمراہی سے تعبیر فرمایا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو نصیحت فرمائی اور تسلی بھی دی کہ ایسی باتوں سے یقیناً ایمان والوں کو تکلیف ہوتی ہے ظاہر ہے کہ شرکیہ اور جہالت والی باتوں کو سن کر ایمان والوں کا دل دکھتا ہے۔ اس ضمن میں اللہ نے تسلی دی کہ اگر تم ہدایت کے راستے پر قائم رہے تو کفار و مشرکین تمہیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے، پھر فرمایا جب دوسرے لوگ تمہاری دعوت کی طرف توجہ ہی نہ کریں تو پھر ان کے درپئے ہونے کی بجائے اصلاحِ نفس کی طرف متوجہ ہو۔ ہدایت کے راستے کو لازم پکڑو اور اپنا فریضہ ادا کرتے رہو، پھر فرمایا کہ سب نے اللہ کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔ وہ ان سب کے اعمال نامے ان کے سامنے رکھ دے گا اور ان کے مطابق جزا اور سزا دیگا۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کی دینی اور اعتقادی مصلحت بیان فرمائی ہے کہ ہمیں ہدایت کے راستے پر صحیح طریقے سے قائم رہنا چاہیئے اور بے دین اور غلط کار لوگوں کا طریقہ نہیں اپنانا چاہیئے اور اب آج کی آیات میں دنیاوی مصلحت کا تذکرہ فرمایا ہے کہ اگر اس قسم کے حالات پیدا ہو جائیں تو ان احکام پر عمل پیرا ہو جاؤ گذشتہ آیات کے ساتھ یہی ربط ہے۔

شانِ نزول

ان آیات کی شانِ نزول میں مفسرین کرام یہ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ مبارک میں مکے مدینے کے لوگ تجارت کے لیے شام کا سفر اختیار کرتے تھے۔ یہ بڑے بڑے تجارتی مراکز تھے درمیان میں ایک ہزار میل فاصلہ تھا مگر موجودہ زمانے کی طرح رسل و رسائل کی سہولت حاصل نہ تھی، لوگ اونٹوں پر تجارتی مال لاد کر قافلوں کی شکل میں

سفر کرتے تھے بعض اوقات سواری کے لیے گھوڑے اور بار برداری کے لیے خچر اور گدھے بھی استعمال ہوتے تھے کہتے ہیں کہ حضرت عمرو بن عاصؓ کا آزاد کردہ غلام بدیلؓ ابن ورقا سہمی جو کہ مسلمان تھا۔ تجارت کی غرض سے ملک شام گیا۔ راستے میں دو غیر مسلم بھی اس کے ہم سفر بن گئے جو اسی علاقہ کے باشندے تھے، ان میں ایک آدمی تمیم داریؓ تھا جو اس وقت عیسائی تھا مگر بعد میں مسلمان ہو گیا، اور دوسرا شخص عدی بن بدا بھی عیسائی یا مشرک تھا۔ جب شام میں پہنچے تو اتفاق ایسا ہوا کہ بدیل سہمیؓ بیمار ہو گیا۔ جب اس میں زندگی کی امید باقی نہ رہی تو اس نے اپنا سامان باندھا اور سارے سامان کی فہرست بھی اسی سامان میں خفیہ طور پر رکھ دی، پھر اپنا سامان اپنے غیر مسلم ساتھیوں کے سپرد کر دیا کہ وہ اس کے وارثوں تک پہنچا دیں۔ مسلمان فوت ہو گیا اور اس کے ساتھی اس کا سامان لے کر واپس آ گئے۔

اس سامان میں چاندی کا ایک قیمتی پیالہ بھی تھا جس پر سنہری کام کیا گیا تھا۔ ایسے ظروف بڑے حکام، امرا یا بادشاہ ہی استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ اس پیالے کی قیمت ایک ہزار درہم سے کم نہ تھی۔ واپس پہنچ کر ان دونوں ساتھیوں نے پیالہ نکال کر بیچ لیا اور اس کی رقم باہم تقسیم کر لی اور باقی سامان متوفی کے وارثوں تک پہنچا دیا جب انہوں نے سامان کھولا تو اس میں سے سامان کی فہرست بھی برآمد ہوئی۔ پھر جب انہوں نے فہرست کے ساتھ سامان کا موازنہ کیا تو وہ قیمتی پیالہ نہ پایا۔ ان دو آدمیوں سے دریافت کیا تو انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ متوفی کے ورثا کی تسلی نہ ہوئی۔ چنانچہ معاملہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ سامان لانے والے دونوں آدمیوں کو طلب کیا گیا تو انہوں نے قسم اٹھائی کہ ان کے پاس متوفی کا کوئی سامان نہیں ہے، چنانچہ انہیں چھوڑ دیا گیا۔

پیالہ مکے کے ایک سنار کے پاس فروخت کیا گیا تھا، وہ برآمد ہو گیا۔

اور اس نے بتایا کہ یہ پیالہ اُس نے تمیم اور عدی سے خریدا تھا اس پر وہی مقدمہ نظر ثانی کے لیے دوبارہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ ملزمان کو دوبارہ طلب کیا گیا اور انہیں بتایا گیا کہ متنازعہ پیالہ فلاں سنار سے ملا ہے جس کے پاس تم نے بیچا تھا تو اُن دونوں نے اپنا بیان یوں بدل لیا کہ یہ پیالہ انہوں نے متوفی بدیل سے زر نقد کے عوض خرید لیا تھا پھر اپنی مرضی سے آگے فروخت کر دیا، کہنے لگے چونکہ اس خرید و فروخت پر کوئی گواہ نہیں تھا اس لیے ہم نے پہلی مرتبہ اُسے ظاہر کرنے سے احتراز کیا۔

معاملہ واضح ہو چکا تھا۔ بدیل کے ورثا کا شک یقین میں بدل گیا اور اُن میں سے دو آدمیوں نے اُٹھ کر قسم اٹھائی کہ یہ پیالہ متوفی نے ان کے پاس فروخت نہیں کیا تھا، یہ غلط بیانی کر رہے۔ لہٰذا یہ پیالہ انہیں ملنا چاہیئے۔ اس پر فیصلہ ورثاء کے حق میں ہو گیا۔ یہ آیات اسی واقعہ کے حق میں نازل ہوئیں اور اس طرح ایک شہادت کو رد کر کے دوسری شہادت کو قبول کرنے کا قانون بھی ثابت ہو گیا۔

وصی کا تقرر

ارشاد ہوتا ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اے ایمان والو! شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِينَ الْوَصِيَّةِ اثْنَانِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنكُمْ شہادت قائم کرو۔ جب تم میں سے کسی کو موت آجائے وصیت کے وقت تم میں سے دو عادل گواہ۔ أَوْ آخَرَانِ مِنْ غَيْرِكُمْ یا دو دوسرے گواہ غیروں میں سے إِنْ أَنتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ جب کہ تم زمین میں سفر کرو فَأَصَابَتْكُم مُّصِيبَةُ الْمَوْتِ اور تمہیں موت کی مصیبت آ پہنچے۔ جیسا کہ شانِ نزول کے واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے، اس آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی مسلمان سفر پر ہو اور اُس کی موت کا وقت قریب آجائے تو اپنے میں سے دو عادل

گواہ بنائے یعنی دو وصی مقرر کرے جن کے سامنے مرنے سے پہلے وصیت کرے تاکہ وہ گواہان اس کی وصیت کے متعلق متوفی کے وارثان کو مطلع کر سکیں۔

گواہوں کے تقرر کے متعلق ایک عام قانون سورۃ بقرہ میں گزر چکا ہے، وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ کہ تم میں سے دو مرد گواہ ہونے چاہئیں۔ اور اگر دو مرد موجود نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہونی چاہئیں۔ مگر یہ چونکہ سفر کا معاملہ ہے، یہاں پر قدرے آسانی پیدا کی گئی ہے کہ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ تم میں سے دو صاحبِ عدل ہوں۔ بعض فقہا فرماتے ہیں کہ یہاں پر مِنْكُمْ سے مراد اقربا ہیں جو مسلمان ہوں اور غیرِکُمْ سے مراد غیر رشتہ دار ہیں، اُن کی دلیل یہ ہے کہ کسی مسلمان کے حق میں یا اُس کے خلاف کسی غیر مسلم کی گواہی معتبر نہیں ہوتی۔ مگر امام ابُوحنیفہؒ اور دیگر فقہا فرماتے ہیں کہ سفر کے دوران مسلمان گواہوں کا ہونا لازمی نہیں ہے۔ اگر مسلمان گواہ موجود نہ ہوں تو ایسے موقع پر غیر مسلموں کی شہادت اور حلفیہ بیان بھی قابلِ قبول ہے آپ کا استدلال یہ ہے کہ غَيْرِكُمْ کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے ہم مذہب نہ ہوں تب بھی اُن کی شہادت پر مقدمہ کا فیصلہ ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ مذکورہ واقعہ میں ہوا، دو گواہوں میں سے ایک عیسائی اور دوسرا مشرک تھا مگر اُن کی شہادت پر حضور علیہ السلام نے مقدمہ کا فیصلہ صادر فرمایا۔ بہر حال یہاں پر گواہ بنانے سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص مرنے سے قبل انہیں اپنا وصی بنالے جو اُس کی وصیت کی گواہی دیں۔

وصی کی شہادت

فرمایا جب تمہیں سفر کے دوران موت کی مصیبت آ پہنچے۔ ظاہر ہے کہ موت انسان کے حق میں اس دنیا میں سب سے آخری مصیبت ہے زندگی میں انسان کو کئی طرح کی مصیبتیں پیش آتی رہتی ہیں مگر موت ایک ایسی مصیبت ہے جس کے بعد اور کوئی مصیبت نہیں آتی۔ جیسے غالب نے کہا ہے

"ہو چکے قصے تمام ایک مرگِ ناگہانی اور ہے"

اس مصیبت سے کسی کو مفر نہیں، یہ ہر صورت آکر رہیگی۔ تو ایسی صورت میں دو گواہ مقرر کر لو اور پھر تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْ بَعْدِ الصَّلٰوةِ انہیں روک لو نماز کے بعد۔ یہاں پر نماز سے مراد نمازِ عصر ہے جسے صلوٰۃِ وسطیٰ بھی کہا جاتا ہے یہ وقت سود وزیاں کا وقت ہوتا ہے اور تاجر لوگ اپنا حساب کتاب عموماً اسی وقت میں کیا کرتے ہیں۔ اسی وقت انہیں اپنے نفع نقصان کے متعلق علم ہوتا ہے، اس لحاظ سے یہ بڑا نازک اور اہم وقت ہوتا ہے، اس لیے ایسے وقت میں شہادت لینے کا حکم دیا گیا ہے۔ نمازِ عصر کی ویسے بھی بڑی تاکید آئی ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشادِ مبارک ہے مَنْ فَاتَتْهُ صَلٰوةُ الْعَصْرِ فَكَاَنَّمَا وُتِرَ اَهْلُهٗ وَمَالُهٗ جس کی عصر کی نماز ضائع ہو گئی اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کا سارا مال اور اولاد تباہ ہو جائے اور وہ شخص دنیا میں تنہا رہ جائے، نمازِ عصر کی فوتیدگی کا اتنا بڑا نقصان ہے۔

فرمایا نمازِ عصر کے بعد ان دو گواہوں کو روک لو فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ پھر وہ اللہ کی قسم اٹھائیں اِنِ ارْتَبْتُمْ اگر تمہیں شک ہو مقصد یہ کہ اگر گواہان کے بیان میں شک پڑ جائے کہ یہ جھوٹ کہہ رہے ہیں تو نمازِ عصر کے بعد ان سے حلفیہ بیان لو کہ لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا کہ اس گواہی کے بدلے ہم کوئی مالی مفاد نہیں حاصل کرنا چاہتے۔ بلکہ ہم ٹھیک ٹھیک حقیقت حال واضح کرنا چاہتے ہیں وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى اگرچہ اس گواہی سے متعلق ہمارے اقربا ہی کیوں نہ ہوں، ہم اپنے کسی رشتہ دار کا لحاظ کیے بغیر ٹھیک ٹھیک شہادت دیں گے وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللّٰهِ اور ہم اللہ کی گواہی کو چھپائیں گے بھی نہیں۔ بعض اوقات جتنی گواہی دی جاتی ہے وہ بالکل ٹھیک ہوتی ہے مگر کسی اہم معاملہ کو چھپا لیا جاتا ہے جس سے مقدمہ پر غلط اثر مرتب ہو سکتا ہے، لہٰذا گواہ یہ بھی حلفاً کہیں کہ وہ شہادت میں سے کسی بات کو نہیں چھپائیں گے اور مکمل

گواہی دیں گے۔ اور اگر ہم ایسا کریں گے تو اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ
ہم گنہگاروں میں ہو جائیں گے۔ مقصد یہ ہے کہ ایسے معاملات میں اس بنا
پر شہادت لی جائے گی۔

تبادل شہادت

اب اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایسے معاملہ میں دوسری صورت
بھی بیان فرمائی ہے فَاِنْ عُثِرَ عَلٰٓى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّآ اِثْمًا
اگر یہ ظاہر ہو جائے کہ مذکورہ گواہ گناہ کے مستحق ہوئے ہیں یعنی انہوں نے جھوٹی گواہی
دی ہے جیسا کہ شانِ نزول کے واقعہ میں ہوا۔ متنازعہ پیالہ برآمد ہونے پر گواہان
کی شہادت جھوٹی ثابت ہوگئی۔ فرمایا اگر وارثان کو یقین ہو کہ گواہوں نے جھوٹی
گواہی دی ہے فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا تو اُن کی جگہ پر دو دوسرے
آدمی کھڑے ہو جائیں مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ
اور وہ ایسے آدمی ہونے چاہئیں جن پر پہلے گواہوں نے گناہ کا استحقاق حاصل
کیا ہے۔ یعنی متوفی کے وارثان سے دو آدمی پہلی شہادت کے مقابلہ دوسری
شہادت پیش کریں فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ وہ بھی اللہ کی قسم اٹھا کر کہیں لَشَهَادَتُنَآ
اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا کہ ہماری شہادت پہلوں کی شہادت سے
زیادہ مبنی بر تحقیق ہے وَمَا اعْتَدَيْنَآ اور ہم نے کوئی زیادتی نہیں کی۔
ہمارا مقصد کسی کو نقصان پہنچانا نہیں۔ اور اگر ہم کسی شخص کی حق تلفی کریں گے
اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ تو ہم ظالموں میں سے ہو جائیں گے۔ گویا دوسرے
گواہ بھی اپنی گواہی کا اُسی طرح یقین دلائیں جس طرح پہلے گواہوں نے دلایا تھا۔

تبادل گواہی کی حکمت

تبادل شہادت کے متعلق فرمایا ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ
عَلٰى وَجْهِهَآ یہ اس بات کے زیادہ قریب ہے کہ گواہ ٹھیک ٹھیک گواہی
دیں۔ اَوْ يَخَافُوْٓا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌۢ بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ
یا پھر انہیں خوف ہوگا کہ ان کی قسمیں دوسرے آدمیوں کی قسموں کے بعد رد
کر دی جائیں گی۔ یعنی وہ اس خوف سے غلط بیانی نہیں کر سکیں گے کہ اُنکی

گواہی بھی غلط ثابت ہوسکتی ہے اور اس کی بجائے متبادل شہادت پر فیصلہ ہوسکتا ہے۔ اس طرح انہیں لوگوں کے سامنے رسوا ہونا پڑے گا اور سوسائٹی میں ان کا وقار گر جائے گا۔

قانون پر عملدرآمد

آخر میں خلاصہ کلام یہ ہے وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوا اللہ سے ڈرتے رہو اور قانونِ خداوندی اور ارشاداتِ نبوی کو سنو، ان باتوں کو سمجھو اور پھر ان پر عمل پیرا ہو جاؤ۔ اگر اس کے خلاف کرو گے تو فسق میں مبتلا ہو جاؤ گے اور اگر انکار کرو گے تو کفر میں قدم رکھو گے اللہ نے یہ بات صاف صاف تبلادی کہ کفر، فسق یا نفاق سے بچ جاؤ اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی کرو۔ اور جو شخص فسق پر اصرار کرتا ہے وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ اللہ تعالیٰ فسق کرنے والوں کو ہدایت نہیں دیتا، ہدایت کے لیے شرط یہ ہے کہ انسان حق کی طرف رجوع کرے اور اس کا طلبگار بنے۔ پہلے سے اختیار کردہ فسق وفجور کو ترک کر دے اور صحیح بات حاصل کرنے کی تڑپ پیدا کرے۔ ایسے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ ہدایت کا راستہ واضح کر دیتا ہے اور فسق کرنیوالوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۱۰۹﴾ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۟ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۚ

ترجمہ :- (اس دن کو یاد کرو) جس دن اللہ سارے رسولوں کو اکٹھا کریگا ، پس فرمائیگا (اُن سے) کہ تم کو کیا جواب دیا گیا (تمہاری اُمتوں کی طرف سے) وہ (رسول) کہیں گے ، ہم کو کچھ علم نہیں ، پس پوشیدہ باتوں کو جاننے والا تو ہی ہے ﴿۱۰۹﴾ جب فرمائے گا اللہ ، اے عیسیٰ مریم کے فرزند ! یاد کر میری نعمتیں جو میں نے تم پر کیں اور تیری والدہ پر ۔ جب میں نے تیری تائید کی پاک روح کے ساتھ ، تو کلام کرتا تھا لوگوں کے ساتھ گہوارے میں اور ادھیڑ عمر میں ، اور جب میں نے سکھائی تمہیں کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل

ربطِ آیات

گذشتہ درس میں اللہ تعالیٰ نے وصیت کے متعلق احکام صادر فرمائے اور اس سے پہلے اہلِ کتاب اور مشرکین کی خود ساختہ نیازوں کا رد تھا قسم

کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے ارشادات اور احرام کی حالت میں شکار کی ممانعت کا بیان بھی ہو چکا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اور محاسبے کے عمل سے متعلق ارشاد فرما رہا ہے۔ اس ضمن میں یہ پہلا رکوع تمہیدی ہے اور اگلے رکوع میں اس بات چیت کا ذکر ہے جو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اور عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان ہوگی۔ یہاں پر مسیح علیہ السلام کا خاص طور پر اس لیے ذکر ہے کہ دنیا میں لوگ آپ کو الٰہ تسلیم کرتے تھے۔ بہر حال یہاں پر اللہ تعالیٰ نے رسولوں کا اجمالی طور پر ذکر فرمایا ہے، قیامت کے محاسبے سے خبردار کیا ہے اور اس دن کی کیفیت کو ظاہر کیا ہے۔

تمام انبیاء سے سوال

ارشاد ہوتا ہے يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ اُس دن کو تصور میں لاؤ جس دن اللہ تعالیٰ تمام رسولوں کو اکٹھا کرے گا اور محاسبہ ہوگا رُسُل رسول کی جمع ہے اور مطلب یہ ہے کہ اللہ نے جتنے بھی نبی اور رسول انسانوں کی راہنمائی کے لیے اپنا حکم اور شریعت دے کر مبعوث فرمائے، سب کو جمع فرما کر محاسبے کا عمل شروع کریگا فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ اور کہے گا، تم کو کیا جواب دیا گیا۔ یعنی جس قوم کی طرف تمہیں مبعوث کیا گیا تھا۔ اور جس کو تم نے دین کی دعوت دی تھی، اُس قوم نے اُس دعوت کا کیا جواب دیا۔ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا رسول جواب دیں گے ہمیں کچھ علم نہیں اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ تمام پوشیدہ باتوں کو جاننے والا تو ہی ہے۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کے دریافت کرنے پر انبیاء کا مطلق لاعلمی کا اظہار قابلِ توجہ ہے، کیونکہ دوسرے مقام پر قرآن پاک میں موجود ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ ہر امت میں سے رسول کو اٹھائے گا اور وہ اپنی اپنی امت کے حق میں گواہی بھی دینگے مگر یہاں پر کسی چیز کے علم سے مطلقاً انکار کر دیا گیا ہے۔ اس کی توجیہ میں مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ میدان محشر کی کارروائی بڑی وسیع ہوگی اور اس کی مختلف کیفیتیں ہوں گی، وہاں پر ایک وقت

ایسا بھی ہوگا جب ہر طرف دہشت طاری ہوگی اور جیسا کہ مسلم شریف کی روایت[1] میں موجود ہے دعویٰ الرسل یومئذ نفسی نفسی رب سلم اس وقت تمام انبیار بھی نفسی نفسی پکار رہے ہوں گا اور کہیں گے۔ اے پروردگار! آج بچا لے۔ اس آیت میں جس لاعلمی کا ذکر کیا گیا ہے وہ ایسے ہی موقع کی بات ہے کہ کسی کو کچھ پتہ نہیں چلے گا۔ ہر شخص خوف میں مبتلا ہوگا، حتیٰ کہ جب انبیار سے اللہ تعالیٰ ان کی اُمتوں کے متعلق سوال کریں گے تو وہ لاعلمی کا اظہار کر دیں گے۔ پھر جب سکون ہو جائے گا، تو انبیار علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے سوالات کا جواب بھی دیں گے اور اپنی اپنی امت کے حق میں گواہی بھی دیں گے اور عرض معروض بھی کریں گے

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس اظہار لاعلمی کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مولا کریم! تیرے علم کے مقابلے میں ہمارا علم تو محدود ہے اور نہ ہونے کے برابر ہے۔ تمام پوشیدہ باتوں کو تو ہی جاننے والا ہے۔ اسی بنا پر وہ کہیں گے کہ لَا عِلْمَ لَنَا ہمیں کچھ علم نہیں یعنی بہت ہی قلیل علم ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کی عظمت اور جلال کے سامنے اپنے علم کو نفی پر محمول کریں گے اور اس لاعلمی کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم جب تک دنیا میں رہے ہمارا علم تو ظاہری چیزوں تک ہی محدود تھا پوشیدہ باتوں تک تو ہماری علمی رسائی نہیں تھی۔ ہم نہیں جانتے تھے کہ کس شخص کے دل میں صحیح ایمان اور سچی تصدیق موجود ہے اور کون شخص حقیقی ایمان سے محروم ہے۔

علم غیب خاصہ خداوندی ہے

علم غیب خاصہ خداوندی ہے اور یہ مخلوق میں سے کسی دوسری ہستی کو حاصل نہیں۔ حتیٰ کہ انبیار علیہم السلام بھی ہر چیز کو نہیں جانتے جب تک کہ اللہ تعالیٰ الہام کشف یا وحی کے ذریعے ظاہر نہ کر دے۔ ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں ایک مقدمہ پیش ہوا آپ نے فرمایا عالم الغیب اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ

[1] مسلم صفحہ ۱۰۱ ج ۱ (فیاض)

میں ایک انسان ہوں اور انسان عالم الغیب نہیں ہوا کرتے۔ میں تو فریقین کے ظاہری بیانات اور گواہان کی شہادت پر فیصلہ کرتا ہوں ہوسکتا ہے کہ کوئی آدمی چرب زبان ہو اور اپنے معاملے کو اچھے طریقے سے پیش کرسکتا ہو جب کہ دوسرا آدمی اپنا موقف بہتر طور پر پیش نہ کرسکے۔ ظاہری حالات کے مطابق اگر میرا فیصلہ غیر مستحق آدمی کے حق میں ہو جائے تو فرمایا اُس شخص کو وہ چیز نہیں لینی چاہیئے اگر ایسا کرے گا تو وہ چیز اُس کے حق میں جہنم کا ٹکڑا ہوگی۔

احادیث میں یہ بھی آتا ہے کہ قیامت کے دن کچھ لوگ حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ آپ اُن کی نشانیوں سے سمجھیں گے کہ آپ کی امت کے لوگ ہیں مگر فرشتے اُن کو ہانک کر دور لے جائیں گے۔ آپ فرمائیں گے کہ فرشتو! یہ تو میرے ساتھی معلوم ہوتے ہیں، تو فرشتے جواب دیں گے اِنَّكَ لَا تَدْرِیْ مَا اَحْدَثُوْا بَعْدَكَ حضور! بیشک آپ نہیں جانتے کہ ان لوگوں نے آپ کے بعد کون کونسی نئی باتیں دین میں نکال لی تھیں۔ انہوں نے بدعات ایجاد کیں اور نئے نئے شوشے چھوڑے۔ اس پر نبی علیہ السلام فرمائیں گے سُحْقًا سُحْقًا لِّمَنْ غَیَّرَ بَعْدِیْ ان کو دُور لے جاؤ جنہوں نے میرے بعد دین کو تبدیل کر دیا گویا جب تک آپ دنیا میں تشریف فرما رہے معلوم تھا کہ یہ لوگ کیا کرتے تھے مگر بعد میں اِن لوگوں نے دین کے چشمہ کو صاف نہیں رہنے دیا۔

اگلے رکوع میں مسیح علیہ السلام کے متعلق بھی آرہا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کو سوال کریں گے اے عیسیٰ ابن مریم کیا تم نے لوگوں کو کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو معبود بنالو۔ تو عیسیٰ علیہ السلام یہی جواب دیں گے۔ مولا کریم! مجھے ایسی ناحق بات کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا، اگر میں نے کوئی ایسی بات کی ہے تو تُو اُسے جانتا ہے کیونکہ تو علام الغیوب

رہے ۔ میں تو اپنی زندگی میں انہیں تیری توحید کی طرف ہی دعوت دیتا رہا ہوں ۔ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ "جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو پھر تو ہی اُن کا نگران تھا ، مجھے کیا علم کہ انہوں نے میرے بعد کیا کیا ۔

بہرحال جب اللہ تعالیٰ تمام انبیاء سے دریافت کریں گے کہ تمہاری امتوں نے میری دعوت کا کیا جواب دیا تو سب متفقہ طور پر اپنی عاجزی کا اظہار کریں گے اور اپنے محدود علم کے پیش نظر عرض کریں گے کہ مولا کریم ! تمام مخفی چیزوں کا علم تیرے پاس ہے ۔ تیرے سوا کوئی غیب دان نہیں ۔ یہ تو ہی جانتا ہے کہ ہماری امتوں کے لوگوں نے ہمارے بعد کیا کیا گل کھلائے یہ تو ہی جانتا ہے کہ ان لوگوں کے دلوں میں ایمان کس حد تک راسخ تھا ان میں سے کون صحیح معنوں میں ایماندار تھا اور کون منافق تھا ۔ غرضیکہ علم غیب کے خاصہ خداوندی ہونے کی تصریح قرآن پاک میں تین سو سے زیادہ آیات میں موجود ہے ۔ جو شخص علم غیب کی صفت کسی مخلوق میں مانے گا وہ مشرک ہو جائے گا ۔

ہر شخص کا محاسبہ

انبیاء علیہم السلام کے ساتھ سوال و جواب کا تذکرہ کر کے اللہ تعالیٰ نے تمام امتوں کو بھی بات سمجھائی ہے کہ ہر شخص کا فرداً فرداً محاسبہ ہونے والا ہے سورۃ اعراف میں موجود ہے "فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِينَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِينَ" ہم ان لوگوں سے بھی بازپرس کریں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے اور خود رسولوں سے پوچھ گچھ ہوگی بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے کہ وہ وقت آرہا ہے جب اللہ تعالیٰ ہر شخص سے براہ راست سوال کریگا اور درمیان میں کوئی ترجمان نہیں ہوگا ۔ سورۃ نحل میں ہے يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَفْسِهَا "ہر شخص خود آ کر اپنے معاملات کا جواب دیگا ۔ وہاں کوئی وکیل پیش ہو کر جواب دعوے داخل نہیں کرے گا ، بلکہ ہر بات کا خود ہی جواب دینا ہوگا ۔ صحیح حدیث میں یہ بھی آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کسی انسان کا قدم نہیں ہٹنے

پائے گا جب تک کہ چند باتوں کے متعلق اُس سے پوچھ گچھ نہ کر لی جائے گی انسان سے اُس کے وجود کے متعلق سوال ہو گا۔ کہ تجھے وجود جیسی نعمت دے کر دنیا میں بھیجا گیا تھا، تو نے اس کا کیا کیا۔ پھر عمر جیسی قیمتی نعمت کے متعلق پوچھا جائے گا، خاص طور پہ جوانی کی عمر کے متعلق سوال ہو گا کہ اسے کہاں خرچ کیا۔ شباب کا زمانہ بڑا قیمتی زمانہ ہوتا ہے بچپن اور بڑھاپا تو ناقص ہوتے ہیں مگر جوانی کے دوران انسان سب کچھ کر سکتا ہے زندگی کا لطف بھی اسی دور میں حاصل ہوتا ہے۔ اسی لیے روایت میں آتا ہے کہ جنتی لوگ ہمیشہ شباب کی حالت میں رہیں گے کیونکہ یہ بہترین زمانہ ہوتا ہے، تو شباب کے متعلق پوچھا جائے گا کہ اسے کہاں برباد کیا۔ اسی طرح مال کے متعلق بھی سوال ہو گا کہ دنیا میں تو نے اسے کہاں سے حاصل کیا تھا اور کہاں خرچ کیا تھا۔ اِن سب باتوں کے متعلق فرداً فرداً اور براہ راست سوالات ہوں گے۔

مسیح علیہ السلام کی بشریت

اب اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اُن انعامات کا تذکرہ کیا ہے۔ جو اُس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پہ کیے۔ چونکہ دنیا میں بہت سے لوگ عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کے قائل ہیں اس لیے انہیں یہ بتلانا مقصود ہے کہ مسیح علیہ السلام بھی اللہ کے عاجز بندے ہیں، انہیں بھی اللہ تعالیٰ کے انعامات کی ضرورت ہے اور وہ خود الٰہ نہیں ہے ارشاد ہوتا ہے۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ جب اللہ تعالیٰ مسیح علیہ السلام سے خطاب کریں گے اے عیسیٰ مریم کے فرزند! یعنی اللہ تعالیٰ آپ کو ابن مریم کہہ کر پکاریں گے۔ اور آگے انہی آیات میں جہاں آپ کے حواریوں نے مائدہ کے نزول کی درخواست کی تو وہاں بھی انہوں نے آپ کو مریم کے فرزند ہی کہہ کر پکارا، مریم عورت ہے۔ پہلے اسی سورۃ میں گزر چکا ہے۔ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ آپ کی والدہ بڑی راست باز خاتون تھیں۔ سورۃ آل عمران میں گزر چکا ہے وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ

یعنی فرشتوں نے حضرت مریمؑ سے کہا کہ اللہ نے تمہیں جہاں بھر کی عورتوں میں منتخب کیا ہے۔ اور تمہیں فضیلت بخشی مقصد یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام ابن اللہ نہیں بلکہ ابن مریم ہیں۔ مگر عیسائیوں نے کس قدر ظلم کیا ہے جو عیسیٰ علیہ السلام کو الوہیت کے درجے تک پہنچا دیا ہے۔ زیادتی کی حد یہ ہے کہ عیسائیوں نے اپنی لغات میں عیسیٰ کا معنی ابن اللہ کیا ہے۔ حالانکہ ایسا کہنا خالص شرکیہ بات ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام ایک خاتون کے بطن سے پیدا ہوئے۔ آپ حوائج بشری رکھتے تھے، کھاتے پیتے تھے، موت اور زندگی آپ کے ساتھ ساتھ ہے مگر اس کے باوجود لوگوں نے آپ کو انسانیت کی صف سے نکال کر الوہیت کی مسند پر بٹھا دیا۔ امام بخاریؒ نے لکھا ہے کہ قیامت کے دن تمام لوگوں کو اُن کے باپ کی نسبت سے پکارا جائے گا۔ صرف مسیح علیہ السلام کو ماں کی نسبت سے پکارا جائے گا مسیح ابن مریم اور پھر سب کے اعمال نامے اُن کے سامنے رکھ کر محاسبے کا عمل شروع ہو گا۔ ویسے عام قانون بھی یہی ہے اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ کہ لوگوں کو باپوں کی نسبت سے پکارو۔ فلاں ابن فلاں۔ الغرض! اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح ابن مریم کہ کر اُن کی الوہیت کی نفی فرما دی ہے۔

انعامات الٰہی

فرمایا اے عیسیٰ ابن مریم اُذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ میری اُن نعمتوں کو یاد کرو جو میں نے تم پر اور تمہاری والدہ پر کیں۔ یہ بھی فرمایا اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ مسیح علیہ السلام خدا کے بندے اور رسول ہیں اُن پر ہم نے اپنے احسانات کیے۔ سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اُن کو اپنا منتخب بندہ یعنی رسول بنایا۔ معجزانہ طور پر بغیر باپ کے پیدا کرنا بھی اللہ کا احسان ہے۔ آپ کو بچپن میں ہی نبوت عطا کی گئی۔ دیگر معجزات دیے گئے اور پھر سب سے آخر میں دشمنانِ جان کے ہاتھوں سے محفوظ رکھا گیا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے انعام اور احسانات ہیں۔

فرمایا تیری والدہ پر یہ احسان کیا کہ اُسے برگزیدہ بنایا اور بغیر خاوند کے بچہ عطا کیا۔ لوگوں کی تذلیل و توہین سے محفوظ رکھا، اُس کی عزت اور عصمت کو دنی کے ذریعے کتابوں میں نازل فرمایا۔ تیری والدہ پر یہ بھی احسان کیا کہ اُس کی پرورش غیر معمولی طریقے سے ہوئی۔ بے موسم پھل اور خورد و نوش کی دیگر چیزیں غیر معمولی طریقے سے مہیا کیں، یہ سب کچھ قرآن پاک میں موجود ہے۔

آگے عیسٰی علیہ السلام پر کیے گئے احسانات کی مزید تفصیل بیان فرمائی۔

اِذْ اَیَّدْتُّکَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ جب میں نے تیری تائید پاک روح کے ساتھ کی۔ روح القدس کا عام معنیٰ جبرائیل علیہ السلام کیا جاتا ہے۔ اللہ نے اُسے تائید کے لیے مقرر کیا۔ عیسٰی علیہ السلام کی پیدائش کے لیے بھی جبرائیل ہی نے حضرت مریم کے گریبان میں پھونک ماری تھی۔ بَشَرًا سَوِيًّا جبرائیل ہی بن کر آئے تھے حضرت عیسٰی علیہ السلام کو ہر موقع پر جبرائیل علیہ السلام کی تائید حاصل رہی۔ البتہ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی روح القدس کی تائید سے مراد ملاء اعلیٰ کی مسلسل توجہ اور دُعا لیتے ہیں۔ ملاء اعلیٰ کے فرائض میں سے یہ بھی ہے کہ وہ بعض اچھی چیزوں کی اچھائی پر اتفاق کرتے ہیں اور اچھے کام انجام دینے والوں کے حق میں دعائیں کرتے ہیں۔ اسی طرح بُرے کاموں کو بھی اپنے پیش نظر رکھتے ہیں اور اُن کے مرتکبین کے لیے بددُعا کرتے ہیں۔ تو شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ملاء اعلیٰ کی دُعا یا بددعا کو روح القدس کی تائید سے تعبیر کیا گیا ہے

بچپن اور ادھیڑ عمر میں کلام

فرمایا۔ اے مسیح علیہ السلام تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا آپ لوگوں سے کلام کرتے تھے گہوارے میں اور ادھیڑ عمر میں۔ عیسٰی علیہ السلام کے بچپن کے کلام کا ذکر تو سورۃ مریم میں موجود ہے۔ قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا آپ نے پیدائش کے پہلے دن ہی اعلان کر دیا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں، مجھے کتاب دی گئی ہے اور نبی بنایا گیا ہے۔ یہ عیسٰی علیہ السلام کا پہلا معجزہ تھا جو اُن کے ہاتھ پر ظاہر ہوا، وگرنہ

چند گھنٹے عمر کا بچہ کیسے کلام کر سکتا ہے۔ تاہم معجزانہ طور پر کلام کرنے والے دنیا میں چند اور بچے بھی ہوئے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے بچپن میں قوت گویائی عطا فرمائی۔ مسیح علیہ السلام بھی انہی میں شامل ہیں۔

ادھیڑ عمر میں کلام کرنے سے متعلق اشکال پیدا ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام تو ابھی ادھیڑ عمر کو پہنچے بھی نہیں تھے کہ عین شباب کے عالم میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو آسمان پر اٹھا لیا۔ بعض فرماتے ہیں کہ ادھیڑ عمر تیس سال بعد شروع ہو جاتی ہے جب کہ عیسیٰ علیہ السلام کا رفع الی السماء ۳۲ سال کی عمر میں ہوا۔ لہٰذا ادھیڑ عمر کا کلام بھی ثابت ہوتا ہے۔ بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ادھیڑ عمر چالیس سال کے بعد شروع ہوتی ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کو اس عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی اٹھا لیا گیا۔ لہٰذا ادھیڑ عمر میں اُن کا کلام ثابت نہیں ہوتا۔ البتہ یہ آپ کے دوبارہ نزول کی طرف اشارہ ہے کہ جب آپ دوبارہ زمین پر آئیں گے تو نکاح بھی کریں گے، بچے بھی ہوں گے اور اس دوران آپ ادھیڑ عمر کو بھی پہنچیں گے اور اس عمر میں آپ کا کلام دوبارہ نزول کے بعد ہوگا۔ بہرحال مفسرین فرماتے ہیں کہ جس طرح آپ ادھیڑ عمر میں نبوت و رسالت کا کلام کرتے تھے اسی طرح اللہ نے گہوارے میں بھی اعلان نبوت فرما دیا۔ لہٰذا یہاں پر اللہ تعالیٰ نے ان دونوں زمانوں کا اکٹھا ذکر کیا ہے۔

کتاب و حکمت کی تعلیم

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اے عیسیٰ (علیہ السلام) میرا یہ انعام بھی یاد کرو۔ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ جب میں نے تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دی۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ کتاب سے مراد لکھنا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے بغیر استاد کے عیسیٰ علیہ السلام کو تحریر کرنا سکھایا اور بعض فرماتے ہیں کہ کتاب سے مراد تمام کتب سماویہ ہیں جن کا علم اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو دیا اور ان کتابوں میں قرآن پاک بھی آتا ہے۔ جب عیسیٰ علیہ السلام کا نزول

ہوگا تو وہ قرآن کی تعلیم کسی اُستاذ سے حاصل نہیں کریں گے بلکہ اللہ تعالےٰ
خود انہیں سکھا دے گا اور حکمت سے مراد حضور علیہ السلام کی سنت ہے۔
دوبارہ نزول پر عیسٰی علیہ السلام حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب کی حیثیت
سے آپ کی سنت اور قرآن پاک کے مطابق فیصلے کریں گے اور قرآن کے
علاوہ سنت کا علم بھی اللہ تعالیٰ براہ راست عیسٰی علیہ السلام کو سکھائیں گے
بہر حال بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ کتاب سے مراد مطلقاً لکھنا ہے۔
اور حکمت سے مراد دانشمندی کی باتیں ہیں۔ ان دونوں چیزوں کا ذکر اللہ تعالےٰ
نے عیسٰی علیہ السلام پر احسان کے طور پر کیا ہے۔

فرمایا تمہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دی وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ اور
تورات اور انجیل کی تعلیم بھی دی۔ تورات تو عیسٰی علیہ السلام سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام
پر نازل ہوئی۔ تاہم آپ کا فرمان ہے کہ میں تورات کے بعض احکام منسوخ
کرتا ہوں اور تورات کی بعض حرام کردہ چیزوں کو حلال قرار دیتا ہوں۔ مقصد
یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تورات کا مکمل علم عطا فرمایا تھا۔ جہاں تک انجیل
کا تعلق ہے، وہ تو خود حضرت عیسٰی علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ اس کی اصل زبان آرامی
سریانی یا عبرانی تھی مگر اب وہ اصل انجیل موجود نہیں، البتہ اس کے تراجم
دنیا کی ہر زبان میں دستیاب ہیں۔ انجیل میں تغیر و تبدل کا اندازہ اس
حقیقت سے ہوتا ہے کہ اللہ کی نازل کردہ ایک کتاب کو اکیس [۲۱]
انجیلوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اب بھی پانچ مشہور انجیلیں تو دنیا میں موجود ہیں۔ اگرچہ
ان میں اصل انجیل کے کچھ احکام بھی موجود ہیں تاہم اس کا اکثر حصہ تحریف و
تغیر کا شکار ہو چکا ہے۔

انجیل بمعنی بشارت

تورات کا معنیٰ قانون ہے جب کہ انجیل کا معنیٰ بشارت ہے۔ اسی طرح
زبور کا معنیٰ صحیفہ اور قرآن کا معنیٰ پڑھی جانے والی کتاب ہے انجیل اللہ تعالیٰ
نے عیسٰی علیہ السلام پر نازل فرمائی اور اس کا نام بشارت اس لحاظ سے ہے

کہ آپ کے فرائض میں داخل تھا کہ آپ بنی اسرائیل کو دین اور شریعت
کی تعلیم دیں۔ نیز جہاں بھی جائیں نبی آخرالزمان علیہ السلام کی بشارت لوگوں
کو سنائیں، چنانچہ سورۃ صف میں آپ کا اعلان موجود ہے "وَمُبَشِّرًا
بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْ بَعْدِی اسْمُهٗ اَحْمَدُ" میں اپنے بعد
آنے والے عظیم الشان رسول کی بشارت سُنانے والا ہوں جس کا نام احمد ہوگا۔
انجیل میں اسے فارقلیط کے لفظ سے تعبیر کیا گیا اور سریانی زبان میں اس
کا معنی ستودہ جہاں ہے جو کہ احمد کا ہم معنی لفظ ہے۔ مگر افسوس کا مقام ہے
کہ سینٹ پال کی اولاد عیسائیوں نے انجیل سے فارقلیط کا لفظ بھی تبدیل
کر دیا تاکہ آخری رسول اور آخری امت کے متعلق انجیل میں موجود پیش گوئیوں
کو چھپایا جا سکے۔

بہرحال اللہ تعالیٰ نے عیسٰی علیہ السلام پہ کیے گیے بعض احسانات کا
تذکرہ کیا ہے۔ آگے آپ کے بعض معجزات کا تذکرہ آرہا ہے، وہ
بھی اللہ کا انعام ہے۔ اس کے بعد اگلے رکوع میں عیسٰے علیہ السلام
سے سوال وجواب کا ذکر آئیگا۔

وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِإِذْنِي فَتَنْفُخُ فِيهَا فَتَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِي وَتُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ بِإِذْنِي وَإِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِي ۖ وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَنْكَ إِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُبِينٌ ﴿١١٠﴾ وَإِذْ أَوْحَيْتُ إِلَى الْحَوَارِيِّينَ أَنْ آمِنُوا بِي وَبِرَسُولِي ۚ قَالُوا آمَنَّا وَاشْهَدْ بِأَنَّنَا مُسْلِمُونَ ﴿١١١﴾

ترجمہ :- اور جب تم بناتے تھے مٹی سے ایک پرندے کی شکل میرے حکم سے، پھر اس میں پھونکتے تھے، پس وہ ہو جاتا تھا پرندہ اڑنے والا میرے حکم سے اور جب کہ تم تندرست کرتے تھے مادرزاد اندھوں کوڑھی مریضوں کو میرے حکم سے اور جب تم نکالتے (زندہ کرتے) تھے مردوں کو میرے حکم سے اور جب میں نے روکا بنی اسرائیل کو تم سے جب کہ تم گئے اُن کے پاس کھلی نشانیاں لے کر، پس کہا اُن لوگوں نے جنہوں نے کفر کیا تھا اُن میں سے، نہیں ہے یہ مگر کھلا جادو (۱۱۰) اور جب کہ میں نے وحی کی تھی حواریوں کی طرف کہ ایمان لاؤ مجھ پہ اور میرے رسول پہ، تو کہا انہوں نے ایمان لائے ہم اور تو گواہ رہ بیشک ہم فرمانبرداری کرنے والوں میں سے ہیں (۱۱۱)

ربط آیات

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے، اُسے ایک مدت تک دنیا میں بھیج کر اپنے احکام کی تعمیل کا حکم دیا ہے۔ اب یہ ایک فطری امر ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان سے اُن اعمال کی باز پرس بھی کرے جو وہ دنیا میں انجام دیتا رہا۔ یہی محاسبہ ہے جو اللہ جل جلالہٗ قیامت کے دن ہر شخص کے بارے میں کریں گے۔ جس طرح کسی انسان کا اس دنیا میں آنا ایک قطعی امر ہے۔ اسی طرح اُس کا محاسبہ بھی لازمی ہے۔ چنانچہ گذشتہ درس میں گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام رسولوں کو جمع فرمائے گا پھر اُن سے پوچھا جائے گا کہ جس قوم کی طرف تمہیں مبعوث کیا گیا، انہوں نے تمہاری دعوت کا کیا جواب دیا۔ رسولوں کے اس اجمالی ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ نے بطورِ مثال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر فرمایا ہے اور سورۃ کے آخر تک یہی مضمون چلے گا۔ مسیح علیہ السلام سے امت کے متعلق خصوصی سوال ہو گا مگر اُس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے مسیح علیہ السلام کو اپنے انعامات یاد دلائے ہیں کہ اے ابن مریم! میں نے تم پر کتنے بڑے بڑے انعامات کیے اور تمہاری والدہ پر۔ جس کو جبرائیل اور ملاء اعلیٰ کی تائید حاصل ہو جائے کس قدر مرتبے والا شخص ہو سکتا ہے۔ آپ کا گہوارے اور ادھیڑ عمر میں یکساں پیغمبرانہ کلام کرنا بھی غیر معمولی انعام تھا۔ پھر تحریر کا علم، کتاب، حکمت کی تعلیم، قرآن و سنت کا علم خود بخود دے دینا کتنا بڑا انعام ہے۔ اِن سب کا ذکر گذشتہ درس میں ہو چکا ہے۔

معجزاتِ انبیاء

اب آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے مسیح علیہ السلام کو عطا کیے گئے بعض نمایاں معجزات کا ذکر کیا ہے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا خاص انعام ہے۔ مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی اور رسول کو کوئی نہ کوئی معجزہ عطا کیا ہے۔ معجزہ سے مراد خلافِ عادت ایسا فعل ہے جو بنی نوع انسان کو عاجز کر دے۔ چونکہ معجزہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے۔ اس لیے کوئی حکیم، فلاسفر، سائنس دان یا ساحر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ

نے مجھے جو خصوصی معجزہ عطا فرمایا ہے وہ قرآن کریم ہے۔ اس لیے مجھے امید ہے کہ قیامت والے دن میرے پیروکار سب سے زیادہ ہوں گے آپ نے یہ بھی فرمایا کہ باقی انبیاء کے معجزات عارضی ہیں۔ معجزہ ظاہر ہوا، دیکھنے والے لوگوں نے دیکھ لیا اور اس کے بعد ختم ہوگیا مگر میرا معجزہ قرآن پاک دائمی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ خاص نشانی مجھے وحی کے ذریعے عطا فرمائی ہے۔ مفسرِ قرآن امام بیضاویؒ اور دوسرے محققین فرماتے ہیں کہ کسی نبی کے لیے معجزہ نبوت کی علت نہیں ہوتا بلکہ یہ نبوت کی محض ایک علامت ہوتی ہے۔ لہذا ضروری نہیں کہ ہر نبی لازماً معجزہ پیش کرے۔ بہرحال انبیاء کے معجزات اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کی عزت افزائی ہوتی ہے۔ بلکہ رومی صاحب تو فرماتے ہیں "روئے و آوازِ پیغمبر معجز است" یعنی پیغمبر علیہ السلام کی آواز اور اُس کا رُخِ مبارک بھی معجزہ ہوتا ہے۔ صداقت شعار لوگ پیغمبر کا چہرہ مبارک دیکھ کر ہی ایمان قبول کر لیتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ کے متعلق آتا ہے کہ حضور علیہ السلام کا چہرہ انور دیکھا تو کہنے لگے وَاللّٰہِ مَا ھٰذَا الْوَجْهُ بِوَجْهِ کَذَّابٍ بخدا یہ چہرہ کسی جھوٹے انسان کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔ آپ نے پہلی ہی مجلس میں ایمان قبول کر لیا۔

تکمیل وتہذیب نفس

جیسا کہ عرض کیا معجزات پیش کرنا انبیاء کے فرائضِ منصبی میں شامل نہیں البتہ جو چیز اُن کے ذمے ہے وہ نفوسِ انسانیہ کی تکمیل و تہذیب ہے قرآن پاک نے اس کو "یُزَکِّیْھِمْ" سے تعبیر فرمایا ہے۔ یعنی لوگوں کا تزکیہ کرتا ہے اور اس کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جب انسان سے تمام رذیل خصائل گندے اخلاق اور بُرے عقیدے نکل جائیں اور اُن کی جگہ پاکیزہ اخلاق و عقاید پیدا ہو جائیں۔ جب یہ چیز پیدا ہو جائے تو انسان مہذب بن جاتا ہے آجکل کی اصطلاح میں تو مہذب (CULTURED) وہ آدمی ہوتا ہے جو بالکل نئی وضع قطع اور انگریزی تہذیب کا دلدادہ ہو مگر اسلام کی نظر میں

مہذب وہ شخص ہے جس کے قلب و ذہن کا تزکیہ ہو جائے۔ بہر حال نبوت کا موضوع (SUBJECT) نفوس انسانیہ کی تکمیل و تہذیب ہے۔

معجزہ کیا ہے

معجزے کا ظہور نبی کا ذاتی فعل نہیں ہوتا بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ اکثر لوگ اس مقام پر آکر گمراہ ہو جاتے ہیں۔ وہ معجزہ یا کرامت کو نبی یا ولی کا ذاتی فعل سمجھ بیٹھتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ سورۃ مومن میں موجود ہے "وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ" کسی نبی یا رسول کے اختیار میں نہیں کہ وہ کوئی نشانی یا معجزہ پیش کر سکے جب تک کہ اللہ کا حکم نہ ہو۔ اسی طرح کسی مومن کے ہاتھ پر خرقِ عادت چیز کا ظہور اُس مومن کے لیے اعزاز ہوتا ہے اور اُسے کرامت کہتے ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ نے اپنی کتاب فقہ اکبر میں اس عقیدے کا اظہار کیا ہے کہ انبیاء کے معجزات اور اولیاء اللہ کی کرامات برحق ہیں، جو اِن کو صحیح نہیں مانتا، وہ اہل سنت کی جماعت سے خارج ہے۔ بڑے بڑے فلسفی معتزلہ، نیچری، سرسید، پرویزی، چکڑالوی وغیرہ اسی نکتے پر آکر گمراہ ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ عقل کے خلاف ہے۔ ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنا ہی ان کی بے عقلی کی دلیل ہے۔

بعض اوقات اللہ تعالیٰ آزمائش کے طور پر کسی خرقِ عادت چیز کو کسی کافر کے ہاتھ پر بھی ظاہر فرما دیتا ہے، یہ معجزہ یا کرامت نہیں، بلکہ استدراج ہوتا ہے۔ یہ خدا کی عطا کردہ مہلت ہوتی ہے۔ جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ آزمائش میں مبتلا کر دیتا ہے۔ جیسے دجال کے ہاتھ پر بہت سے کرشمے ظاہر ہوں گے۔ بہر حال معجزہ یا کرامت کے لیے ایمان کا ہونا شرط ہے اور پھر یہ کہ معجزہ یا کرامت نبی یا ولی کا ذاتی فعل نہیں ہوتا۔ اسے ذاتی فعل سمجھ کر ہی لوگ انہیں حاجت روا اور مشکل کشا سمجھنے لگتے ہیں اور پھر شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

خالق صرف خدا ہے

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر ظاہر ہونے والے بعض معجزات کا ذکر فرمایا ہے ارشاد ہوتا ہے وَاِذْ تَخْلُقُ اور جب تم بناتے تھے خلق کا معنیٰ بنانا، پیدا کرنا گھڑنا وغیرہ آتا ہے۔ تاہم اصطلاحی طور پر خالق کا اطلاق صرف خدا تعالیٰ پہ ہوتا ہے۔ کیونکہ حقیقت میں ہر چیز کو پیدا کرنے والا اور بنانے والا وہی ہے۔ "اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ" قرآن میں صراحت موجود ہے۔ مگر ہمارے ہاں اس معاملہ میں احتیاط سے کام نہیں لیا جاتا اور مخلوق کو بھی خالق کہا جانے لگا ہے مثلاً مسٹر جناح کو خالقِ پاکستان کہا جاتا ہے حالانکہ خالق صرف خدا کی ذات ہے۔ آپ اُن کو بانیٔ پاکستان یا معمارِ پاکستان تو کہہ سکتے ہیں، خالق نہیں کہہ سکتے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی صفت خاصہ ہے۔ اسی طرح ایک دوسرے کا نام بلانے میں بھی بے احتیاطی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ بعض لوگ غنی، صمد، رشید یا مجید وغیرہ کہہ کر پکارتے ہیں حالانکہ یہ سب اللہ تعالیٰ کے نام ہیں۔ بھائی! اپنے ساتھیوں کو بلانا ہے۔ تو عبدالغنی، عبدالصمد، عبدالرشید یا عبدالمجید کہہ کر آواز دو، کیونکہ یہ سب اُس مالک الملک کے عاجز بندے ہیں اِن کو اللہ کا صفاتی نام لے کر پکارنا سوءِ ادب ہے۔ اسی طرح کسی ملک، پارٹی، بلڈنگ، کارخانے وغیرہ کا بانی تو ہو سکتا ہے، خالق نہیں ہو سکتا خالق صرف ذاتِ خداوندی ہے۔

معجزات عیسیٰ علیہ السلام

اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے عیسیٰ (علیہ السلام) جب آپ بناتے تھے۔ مِنَ الطِّیْنِ کَھَیْـَٔۃِ الطَّیْرِ مٹی سے پرندے کی شکل۔ بِاِذْنِیْ میرے حکم سے۔ فَتَنْفُخُ فِیْھَا پھر اس میں پھونک مارتے تھے فَتَکُوْنُ طَیْرًاۢ بِاِذْنِیْ پھر وہ ہو جاتا تھا اڑنے والا پرندہ میرے حکم سے۔ حضرت عیسیٰ کو یہ معجزہ عطا ہوا کہ وہ مٹی کا پرندہ بناتے تھے پھر اُس میں پھونک مارتے تھے اور وہ جاندار پرندہ بن کر اڑ جاتا تھا۔

یہاں پر دو دفعہ بِاِذْنِیْ کا لفظ آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مٹی کے بنے ہوئے پرندے کو جاندار بنا دینا عیسیٰ علیہ السلام کا ذاتی فعل نہیں تھا بلکہ یہ سب کچھ میرے حکم سے ہوتا تھا۔ سورۃ آل عمران میں بِاِذْنِ اللّٰہِ کا لفظ گزر چکا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ معجزہ یا کرامت کا ظہور اللہ کے حکم سے ہوتا ہے نہ کہ نبی یا ولی کے ذاتی فعل سے۔

پھر فرمایا۔ اے عیسیٰ (علیہ السلام) وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِیْ آپ مادرزاد اندھے کو اچھا کر دیتے تھے حالانکہ عام حالات میں اس کی بینائی کا لوٹنا نہایت مشکل ہوتا ہے۔ مگر اللہ کے حکم سے عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر ایسا ہو جاتا تھا آپ آنکھوں پر ہاتھ پھیرتے تھے تو وہ روشن ہو جاتی تھیں۔ اسی طرح کوڑھی مریض پر ہاتھ پھیرتے تو وہ شفایاب ہو جاتا۔ یہ بھی اللہ کے حکم سے ہوتا تھا۔ پھر چوتھا معجزہ یہ فرمایا وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰی بِاِذْنِیْ جب آپ مردہ کو (قبر سے) نکال لیتے تھے میرے حکم سے۔ آپ کہتے قُمْ بِاِذْنِ اللّٰہِ یعنی اللہ کے حکم سے اُٹھ بیٹھو تو وہ مردہ زندہ ہو کر نکل آتا۔ آپ اُس سے بات چیت کرتے اور کچھ عرصہ بعد وہ جسم ختم ہو جاتا۔ عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات میں اس قسم کے چار واقعات کا تذکرہ ملتا ہے جن میں آپ نے مُردوں کو زندہ کیا۔ یہ سب آپ کے نمایاں معجزات تھے

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام کے زمانے میں طبابت کا بڑا چرچا تھا۔ بڑے بڑے اطبا موجود تھے جو مہلک سے مہلک بیماریوں کا علاج کرتے تھے۔ بقراط جسے اطبا کا جدامجد مانا جاتا ہے، اسی زمانہ میں ہوا ہے ارسطو اور فیثاغورث اسی دور کے حکما ہیں۔ ذی مقراطیس جس نے سب سے پہلے ایٹمی ذرات پر تحقیق کی تھی، اسی دور کا ہے یہ لوگ اپنے اپنے زمانے میں سائنسی ایجادات کے ذریعے علاج معالجے کے حیرت انگیز کارنامے انجام دیتے تھے مگر یونان کے قابل ترین ڈاکٹر بھی نہ مادرزاد اندھے کو بینائی

دلا سکتے تھے، اور نہ کوڑھی کو شفا دلا سکتے تھے اور نہ مُردے کو زندہ کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اس زمانے میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ نے یہ تینوں معجزات ظاہر کردیے جس کی وجہ سے اُن لوگوں کے تمام کارنامے ہیچ ہوگئے۔

معجزات مطابق ضرورت

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جادوگروں کا بڑا زور تھا۔ وہ جادو کے زور سے عجیب و غریب کارنامے انجام دیتے تھے۔ اس زمانے میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو عصا کا معجزہ عطا کیا۔ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے کے لیے پندرہ ہزار جادوگروں کو جمع کیا۔ جب انھوں نے اپنی رسیاں ڈالیں تو وہ سانپ بن گئے۔ اللہ نے فرمایا اے موسیٰ گھبراؤ نہیں، تم اپنی لاٹھی پھینک دو۔ پھر وہ اژدھا بن گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے جادوگروں کے تمام سانپوں کو نگل گیا۔ اس کے نتیجے میں جادوگر تو ایمان لے آئے مگر فرعون نے پھر بھی تسلیم نہ کیا۔ وہ بدبخت ہی رہا۔ شقی لوگ معجزات کو دیکھ کر بھی ایمان نہیں لاتے۔

اسی طرح حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں فصاحت و بلاغت کو بڑا عروج حاصل تھا۔ عربی زبان ترقی کی اعلیٰ منازل پر تھی۔ عربوں کا فصیح و بلیغ اور بلند پایہ کلام آج بھی محفوظ ہے۔ اپنی اسی زبان دانی کی وجہ سے وہ دوسری قوموں کو عجمی یعنی گونگا کہتے تھے۔ عرب بڑے بڑے اعلیٰ قصیدے اور خطبے پڑھتے تھے جن کو سن کر لوگ دنگ رہ جاتے تھے۔ فصاحت و بلاغت کے اس دور میں اللہ تعالیٰ نے حضور ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن پاک کا معجزہ عطا فرمایا اور پوری دنیا کو چیلنج کردیا کہ قرآن کی ایک آیت کے برابر کلام بنا کر لاؤ مگر کوئی عرب اس چیلنج کو قبول نہ کرسکا کیونکہ یہ کسی انسان کا فعل نہیں تھا بلکہ اللہ کی طرف سے معجزہ تھا۔

آگے پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام پر کیے گئے احسان کا ذکر فرمایا ہے وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ اور جب میں نے

بنی اسرائیل کو تم سے روک دیا۔ انہوں نے آپ کا انکار کیا، مخالف ہو گئے، تذلیل و توہین کی، آپ کو دجال کہا، آپ کی والدہ پر زنا کی تہمت لگائی اور آپ کی جان کے درپے ہو گئے۔ کہتے تھے یہ شخص ہمارے آباؤ اجداد کی رسوم کو ختم کرنا چاہتا ہے اور ہمیں ہمارے ذرائع آمدن سے محروم کرنا چاہتا ہے۔ اللہ نے فرمایا یہ اُس وقت کی بات ہے اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ جب آپ اُن کے پاس کھلی اور واضح نشانیاں اور معجزات لے کر آئے۔ مگر اُن کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی، میں نے آپ کی اُن بدبختوں سے حفاظت کی اور اُن کے ناپاک ہاتھوں کو آپ تک نہیں پہنچنے دیا۔ سورۃ آلِ عمران میں گزر چکا ہے کہ اللہ نے فرمایا، اے عیسیٰ علیہ السلام گھبراؤ نہیں، میں اُن کے ناپاک ہاتھ تم تک نہیں پہنچنے دوں گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بحفاظت آسمان پر اٹھا لیا۔

فرمایا اتنی واضح نشانیاں دیکھنے کے باوجود فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اُن میں سے کفر کرنے والوں نے کہا اِنْ هٰذَا اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ یہ تو کھلا جادو ہے۔ اُن لوگوں نے اپنی آنکھوں سے مٹی کے بنائے ہوئے پرندوں کو اڑتے دیکھا، مادرزاد اندھوں اور کوڑھیوں کو شفایاب ہوتے پایا۔ اور مردوں کو زندہ ہوتے دیکھا مگر پکار اُٹھے یہ تو صریح جادو ہے اور کافروں نے ہمیشہ ایسا ہی کہا ہے۔ حضور علیہ السلام کا شق القمر کا معجزہ دیکھ کر کہہ دیا۔ "سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ" یہ تو چلتا ہوا جادو ہے۔ پہلے بھی ہوتا تھا اور اب بھی موجود ہے۔

حواریوں کا قبولِ ایمان

اللہ نے فرمایا، ذرا اس بات کو بھی یاد کرو وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ جب میں نے حواریوں کی طرف وحی کی۔ حواریوں کی طرف وحی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اُن کے دل میں یہ بات ڈال دی۔ اَوْحَيْتُ کا یہ معنیٰ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ نے عیسیٰ علیہ السلام کو وحی کی کہ یہ بات اپنے حواریوں تک پہنچا دیں۔ حواری مخلص ساتھی کو کہا جاتا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے

فرمایا ہر نبی کا کوئی نہ کوئی حواری ہوتا ہے اور میرا حواری زبیر ہے جو جنت میں بھی میرا پڑوسی ہوگا۔ تو فرمایا میں نے عیسٰی علیہ السلام کے حواریوں کے دلوں میں ڈال دی اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ وَبِرَسُوْلِیْ کہ مجھ پر ایمان لاؤ اور میرے رسول پر ایمان لاؤ۔ اس کے جواب میں حواریوں نے کہا قَالُوْآ اٰمَنَّا اے اللہ! ہم ایمان لے آئے، تیری وحدانیت اور مسیح علیہ السلام کی رسالت کو قبول کر لیا۔ اور ساتھ یہ بھی عرض کیا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ کہ اے عیسٰی علیہ السلام، آپ گواہ ہو جائیں کہ ہم اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری کرنے والے ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ پر اور آپ کی رسالت پر ایمان لے آئے ہیں لہٰذا آپ ہمارے ایمان کے گواہ بن جائیں۔

بہر حال حواریوں کے دلوں میں اچھی بات ڈال دینا، اُن کا ایمان قبول کرنا، مسیح علیہ السلام کی رفاقت اختیار کرنا اور آپ کے حکم کے مطابق تبلیغ کا فریضہ انجام دینا، یہ سب اللہ کا احسان اور انعام تھا جو عیسٰی علیہ السلام کو عطا کیا گیا۔ اس کے بعد کچھ مزید معجزات کا تذکرہ ہوگا اور پھر محاسبے کے ضمن میں سوال و جواب کا بیان آئے گا۔

اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ؕ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَ تَطْمَىِٕنَّ قُلُوْبُنَا وَ نَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۱۱۳﴾

ترجمہ :- جب کہا عیسٰی (علیہ السلام) کے حواریوں نے ، اے بیٹے مریم کے فرزند ! کیا تیرا پروردگار ایسا کر سکتا ہے کہ وہ اُتارے ہمارے اُوپر دسترخوان آسمان کی طرف سے ۔ کہا عیسٰی (علیہ السلام) نے ڈرو اللہ سے اگر تم ایمان والے ہو ﴿۱۱۲﴾ انہوں نے کہا ہم چاہتے ہیں کہ کھائیں اس سے اور ہمارے دل مطمئن ہوں ، اور ہم جان لیں کہ تو نے سچ کہا ہے ہم سے ، اور ہو جائیں ہم اس پر گواہی دینے والوں میں سے ﴿۱۱۳﴾

ربطِ آیات گذشتہ سے پیوستہ درس میں اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کو اکٹھا کرنے کا ذکر فرمایا کہ اللہ اُن سے سوال کریگا کہ تمہاری دعوت کے نتیجے میں تمہاری قوموں نے کیا جواب دیا ۔ تو انبیاء عاجزی کا اظہار کریں گے کہ مولا کریم ! ہمیں کچھ علم نہیں ۔ اس کے بعد حضرت عیسٰی علیہ السلام کے تذکرے میں اُن پر ہونے والے انعامات کا ذکر کیا ۔ اللہ تعالیٰ نے اُن معجزات کو بیان فرمایا جو اُن کے ہاتھ پر ظاہر ہوئے ۔ یہ اللہ تعالیٰ کے انعامات تھے جو آپ پر اور آپ کی

والدہ پر ہوئے۔ ان احسانات میں سے ایک بڑا احسان تھا کہ اللہ نے آپ کو بنی اسرائیل کے شر سے محفوظ رکھا اور ان کی ناپاک سازشوں کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ یہ بھی ایک بہت بڑا احسان تھا کہ اللہ نے عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کے دل میں ایمان کی بات ڈال دی جس کی وجہ سے انہوں نے آپ کی تائید کی۔ سورۃ صف میں ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے کہا مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَى اللّٰهِ یعنی اللہ کے راستے میں میرے ساتھ کون تعاون کرے گا، تو حواریوں نے کہا نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ہم اللہ کے راستے میں آپ کے مددگار ہیں۔ ہم آپ کے ہر حکم کی تعمیل کریں گے۔ اللہ نے حواریوں کے انصار اللہ بن جانے کو بھی بطور احسان شمار کیا۔ اب آج کے درس میں حواریوں کی طرف سے نزولِ مائدہ کی درخواست اور عیسیٰ علیہ السلام کے ابتدائی جواب کا ذکر ہے نزولِ مائدہ کو بھی اللہ نے اپنا ایک احسان جتلایا ہے۔

نزولِ مائدہ کی درخواست

ارشاد ہوتا ہے اِذْ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ جب عیسیٰ علیہ السلام سے حواریوں نے کہا یٰعِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ اے عیسیٰ مریم کے بیٹے! هَلْ یَسْتَطِیْعُ رَبُّكَ کیا تیرا پروردگار طاقت رکھتا ہے۔ اَنْ یُّنَزِّلَ عَلَیْنَا مَآىِٕدَةً مِّنَ السَّمَآءِ کہ ہم پر نازل کرے طعام کا چُنا چُنایا دسترخوان آسمان سے۔ یہ ہے وہ درخواست، جو عیسیٰ علیہ السلام کے مخلص متبعین نے آپ کی معرفت اللہ تعالیٰ سے کی۔ اس کے جواب میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ، اللہ سے ڈر جاؤ اور اس قسم کے سوال نہ کرو اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ اگر تم صحیح معنوں میں ایمان والے ہو۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کے حواریوں کے درمیان اس مکالمے میں کئی نکات پیدا ہوتے ہیں، جن کی تفصیل پیش کی جاتی ہے

ابن اللہ یا ابن مریم

عیسائیوں کا ایک فرقہ مسیح علیہ السلام کے ابن اللہ ہونے کا قائل ہے مگر اس آیت کریمہ میں یٰعِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ کے الفاظ سے واضح ہو

رہا ہے۔ کہ عیسیٰ علیہ السلام کے اصل پیروکاروں نے آپ کو عیسیٰ ابن مریم کہہ کر پکارا نہ کہ ابن اللہ۔ اگلی آیات میں آرہا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بھی آپ کو اسی نام سے پکاریں گے اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ جب اللہ تعالیٰ فرمائے گا، اے عیسیٰ ابن مریم۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے مسیح علیہ السلام کو ایک مقدس خاتون کے بطن سے باپ کے واسطہ کے بغیر اپنی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کے ساتھ پیدا کیا۔ لہذا یہ ہر صاحب عقل کا جزوِ ایمان ہے کہ آپ کی نسبت باپ کی طرف نہ کی جائے بلکہ آپ کو حضرت مریمؑ کا بیٹا تسلیم کیا جائے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور میری نبوت کی گواہی دے گا اور اس بات کی بھی گواہی دے گا کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے، اس کے رسول اور اس کا کلمہ ہیں جسے اللہ نے فرشتے کے ذریعے حضرت مریمؑ کے گریبان میں ڈالا، نیز جو شخص یہ بھی گواہی دے گا کہ جنت اور دوزخ برحق ہیں، اللہ تعالیٰ اُسے نجات عطا فرمائیں گے

اس کے برخلاف عیسائیوں کا عقیدہ ابنیت سینٹ پال جیسے پادریوں اور غلط کار عیسائیوں کا وضع کردہ ہے جو عیسیٰ علیہ السلام سے بہت بعد کی پیداوار ہے۔ عیسائیوں کے مختلف فرقوں کی تفصیل اسی سورۃ میں پہلے گذر چکی ہے۔ بعض لوگوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو بعینہٖ خدا کہہ کر عینیت کا عقیدہ ایجاد کیا، کسی نے ابن اللہ کہا۔ اس میں بھی کوئی فرقہ آپ کے خدا کا حقیقی بیٹا ہونے کا قائل ہے اور کوئی بناوٹی بیٹے کا۔ قرآن پاک کے الفاظ میں انہوں نے کہا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا یعنی اللہ نے بیٹا بنا لیا ہے پھر کسی فرقہ نے آپ کو تین خداؤں میں سے تیسرا تسلیم کیا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ غرضیکہ یہ سب باطل عقائد ہیں اور انہی کی بنا پر عیسیٰ علیہ السلام کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا گیا۔ یہ عقائد نہ صرف عقل و نقل کے خلاف ہیں بلکہ خود انجیل

کی تعلیم کے بھی منافی ہیں۔ تمام انبیاء کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ وحدہٗ لاشریک ہے، اس آیت سے بھی یہی بات واضح ہو رہی ہے۔ کہ عیسیٰ علیہ السلام مریمؑ کے بیٹے ہیں مگر عیسائیوں کی ہٹ دھرمی کی انتہا ہے کہ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا بنا دیا ہے اور اسی عقیدے کی تبلیغ دنیا بھر میں کر رہے ہیں۔ بہرحال اس آیت سے ایک بات تو واضح ہوتی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم ہیں، نہ کہ ابن اللہ۔

لفظ یستطیع پر اشکال

اس آیت کے الفاظ هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ کا معنیٰ یہ ہے کہ اے عیسیٰ (علیہ السلام) کیا آپ کا پروردگار اس بات کی طاقت رکھتا ہے کہ ہم پہ مائدہ نازل فرمائے۔ یہاں پہ اللہ تعالیٰ کی قدرت پہ اشکال پیدا ہوتا ہے۔ کہ کیا عیسےٰ علیہ السلام کے حواریوں کو شک تھا کہ اللہ تعالےٰ مائدہ کے نزول پہ قادر ہے۔ حالانکہ "إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ" وہ تو ہر چیز پہ قادر ہے۔ وہ متصرف فی الامور ہے مدبر ہے لِمَا يَشَاءُ ہے "فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ" ہے، وہ جو چاہے کر سکتا ہے تو پھر اس کی ذات میں شک کرنے کا کیا مقصد؟ اس کے جواب میں مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہاں پر تستطیع کو لازم بول کر ملزوم مراد لیا گیا ہے اور يَسْتَطِيعُ کا مقصد يَفْعَلُ ہے۔ اس طرح معنیٰ یہ ہوگا۔ کہ اے عیسیٰ علیہ السلام! کیا تیرا پروردگار ایسا کرے گا کہ ہم پہ آسمان سے مائدہ نازل فرما دے۔ یہ بالکل اس قسم کا محاورہ ہے جس طرح کوئی شخص کسی بڑے آدمی امیر، حاکم یا وزیر کو یوں کہے کہ کیا آپ مجھے دو لاکھ روپیہ دینے کی استطاعت رکھتے ہیں یعنی کیا آپ مجھے اتنی رقم ادا کریں گے۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ اس لفظ سے اللہ تعالیٰ کی قدرت میں شک والی بات نہیں ہے بلکہ درخواست پیش کرنے کا ایک انداز ہے جس سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ اس لفظ کی دوسری قرأت بھی ہے۔

حضرت معاذؓ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مجھے اس آیت کی تعلیم یوں دی ھَلْ تَسْتَطِیْعُ رَبَّکَ یعنی اس قرأت میں لفظ رب کو مفعول بنایا گیا ہے۔ جب کہ پہلی قرأت میں فاعل ہے۔ اب اس کا معنی یہ ہے۔ کہ اے عیسیٰ علیہ السلام آ کیا تو استطاعت رکھتا ہے یعنی کیا تیرا یہ حوصلہ ہے کہ تو اپنے رب سے نزولِ مائدہ کی درخواست کرے۔ ظاہر ہے کہ اس قرأت سے اشکال باقی نہیں رہتا کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کو مخاطب کرکے استطاعت کا اطلاق اُن پر کیا گیا ہے۔

مائدہ اور انجیل

اس سورۃ مبارکہ کا نام اسی مائدۃ کے لفظ پر ہے۔ مائدہ ایسے دسترخوان کو کہا جاتا ہے جس پر کھانا چنا ہوا ہو اور وہ زمین پر بچھایا گیا ہو۔ اس کے برخلاف جس چھوٹی میز پر کھانا رکھ کر کھایا جاتا ہے اسے خوان کہتے ہیں۔ یہاں پر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جس مائدہ کا ذکر قرآن پاک میں اس آیت میں کیا گیا ہے، اس کا ذکر انجیل میں نہیں ملتا۔ ظاہر ہے کہ جس طرح عیسائیوں نے انجیل میں تحریف کرکے دیگر بہت سے احکام کو خارج کر دیا ہے اسی طرح نزولِ مائدہ کے اس واقعہ کو بھی اڑا دیا ہے۔ البتہ انجیل لوقا میں مسیح علیہ السلام کے ساتھ یہ معجزہ منسوب ہے۔ کہ آپ کسی جگہ پر موجود تھے۔ وہاں پر پانچ ہزار آدمی جمع ہو گئے تو آپ کو تشویش ہوئی کہ اتنے آدمیوں کو کھانا کہاں سے کھلائیں گے۔ اس پر کسی شخص نے بتایا کہ یہاں پر ایک لڑکا ہے جس کے پاس جَو کی پانچ روٹیاں اور دو تلی ہوئی مچھلیاں ہیں۔ آپ نے وہ روٹیاں حاصل کرکے سب لوگوں سے بیٹھ جانے کو کہا اور پھر روٹیاں اور مچھلی لوگوں میں تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ سب نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور اس کھانے سے اتنے ٹکڑے بھی بچ گئے۔ جس سے بارہ ٹوکرے بھر گئے۔ عیسیٰ علیہ السلام نے اُن ٹکڑوں کو بھی محفوظ کرا لیا۔ بہرحال قرآن کے بیان کردہ مائدہ کا ذکر انجیل میں کہیں نہیں ملتا۔

روزی کے جائز ذرائع

بہر حال حواریوں کی فرمائش کے جواب میں عیسٰی علیہ السلام نے ان سے دو باتیں کیں۔ ایک یہ کہ خدا تعالیٰ سے ڈرو اور دوسری یہ کہ اگر تم ایماندار ہو۔ خدا تعالیٰ سے ڈرانے سے مقصود یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے وہ جو چاہے کر سکتا ہے لہٰذا اس کی قدرت اور طاقت میں شک کرنے سے ڈرو کیونکہ یہ بالکل غلط بات ہے۔ عیسٰی علیہ السلام نے دوسری بات میں حواریوں کے ایمان کا جائزہ لیا کہ کسی ایماندار آدمی کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ غیر معمولی فرمائش کرے یا نبی سے معجزات طلب کرے۔ شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ اپنے ترجمۂ قرآن کے حاشیئے میں لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کتنا ہی مہربان کیوں نہ ہو، بندے کو اس کی آزمائش نہیں کرنی چاہیئے کہ آیا وہ میری بات مانتا ہے یا نہیں کیونکہ یہ چیز ادب کے سراسر خلاف ہے۔ شاہ صاحب دوسری بات یہ فرماتے ہیں کہ ہر انسان کو روزی ہمیشہ جائز ذرائع سے ہی طلب کرنی چاہیئے، نزولِ مائدہ کی فرمائش جائز اور درست ذرائع روزی میں سے نہیں ہے، یہ تو فرمائش اور امتحان کا راستہ ہے، اللہ تعالیٰ نے تجارت، زراعت، ملازمت، محنت مزدوری وغیرہ کو جائز ذرائع روزی میں شمار کیا ہے لہٰذا روزی انہی ذرائع سے حاصل کرنی چاہیئے۔ فرمایا فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَجْمِلُوْا فِى الطَّلَبِ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور روزی کے لیے جائز ذرائع اختیار کرو۔ انسان کو یہ چیز اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ روزی اتنی ہی میسر آئیگی جتنی اللہ کے علم میں مقدر ہے۔ انسان کتنی ہی کوشش کرے اُسے اپنے مقدر سے ایک حبہ بھی زیادہ نہیں مل سکتا۔ فرمایا اِنَّ الرِّزْقَ لَيَطْلُبُ الْاِنْسَانَ كَمَا يَطْلُبُهٗ اَجَلُهٗ[1] ہر انسان کو روزی اسی طرح تلاش کرتی پھرتی ہے جس طرح موت اُس کی تلاش میں رہتی ہے۔ جس طرح انسان کو موت ایسی جگہ پر آجاتی ہے جو اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتی، اسی طرح اللہ تعالیٰ

---

[1] کنز العمال ص ۱۴۰۱۳۰۱۲ ج ۴ (فیاض)

اُسے روزی بھی ایسے ذرائع سے دیتا ہے "مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ" جہاں اُس کا گمان بھی نہیں ہوتا کسی شخص کی روزی کا ایک دانہ بھی دوسرا شخص حاصل نہیں کر سکتا، لہٰذا روزی حلال اور جائز ذرائع سے ہی تلاش کرنی چاہیے یہ سب باتیں عیسیٰ علیہ السلام کے اس فرمان میں آجاتی ہیں کہ اللہ سے ڈرو، اگر تم ایماندار ہو۔

مائدہ بطور متبرک کھانا

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اِس تنبیہ کے بعد حواریوں نے اپنی فرمائش کی وضاحت کرتے ہوئے قَالُوا انہوں نے عرض کیا کہ حضرت! ہماری یہ فرمائش کسی قسم کی آزمائش کے لیے نہیں بلکہ نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا ہماری خواہش ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہ راست نازل کردہ متبرک کھانا کھائیں آپ کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ معجزات کا اظہار فرماتا ہے، تو ہم بھی اِس قسم کا غیر معمولی کھانا چاہتے ہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُس وقت حواریوں کے پاس خوراک کا ذخیرہ ختم ہو چکا ہو اور کھانا حاصل کرنے کی بظاہر کوئی صورت بھی نظر نہ آتی ہو تو اِن حالات میں انہوں نے آسمانی کھانے کی فرمائش کی ہو اور عیسیٰ علیہ السلام سے اس کے لیے دُعا کی درخواست کی ہو۔

کھانے میں برکت کے بعض واقعات حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں بھی پیش آئے۔ دورانِ سفر بعض اوقات کھانا ختم ہو گیا اور صحابہ کرامؓ کو سخت پریشانی لاحق ہوئی۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جس کے پاس جس قدر توشہ ہے وہ سب لا کر ایک جگہ جمع کر دو۔ ہر ایک کے پاس جو کچھ تھا کھجور کا دانہ یا روٹی کا ٹکڑا لایا گیا۔ تو کل جمع شدہ اشیا کا ڈھیر ایک بکری کے وجود کے برابر بنا۔ حضور علیہ السلام نے دُعا فرمائی تو اللہ نے اُس کھانے میں اتنی برکت عطا فرمائی کہ ہزاروں کے لشکر نے اپنے اپنے برتن بھر لیے۔ ایسے ہی عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے بھی بابرکت کھانے کی درخواست کی اور یہ بھی کہا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا یہ کھانا کھا کر ہم اطمینانِ قلب کی دولت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جو کھانا اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہ راست نازل ہوگا۔ اس کے کھانے سے انسان کس قدر مطمئن ہوں گے۔

اس کے علاوہ حواریوں نے اپنی فرمائش کے حق میں یہ بھی دلیل پیش کی۔ وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا ایسا متبرک کھانا کھا کر ہم جان لیں گے کہ آپ ہم سے سچ فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جنت میں بے شمار نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جن کا ایک نمونہ مائدہ کی صورت میں ہم استعمال کریں گے اس طرح گویا آپ کی صداقت کا مشاہدہ بھی ہو جائے گا۔ اس قسم کے مشاہدہ کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی رب العزت سے درخواست کی تھی رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی اے اللہ! مجھے مشاہدہ کرا دے کہ تو مُردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے۔ اللہ نے فرمایا کیا تمہیں یقین نہیں ہے عرض کیا، یقین تو ہے وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ مگر میں آنکھوں سے مشاہدہ کر کے اطمینانِ قلب حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ تو یہاں پر حواریوں نے بھی طلب مائدہ کی علت یہ بیان کی کہ وہ اطمینان قلب حاصل کرنا چاہتے ہیں اور عیسٰی علیہ السلام کی صداقت کا مشاہدہ کرنا چاہتے ہیں۔ حواریوں نے یہ بھی کہا کہ ہماری خواہش کے مطابق اگر اللہ تعالیٰ مائدہ نازل فرمائے گا وَنَکُوْنَ عَلَیْہَا مِنَ الشّٰہِدِیْنَ تو ہم اس پر گواہی دینے والے بن جائیں گے گویا ہم اس بات کی شہادت دیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کے ہاتھ پر ایسا غیر معمولی واقعہ ظاہر فرمایا ہے۔

حضرت عیسٰی علیہ السلام کے حواریوں نے نزولِ مائدہ کا مطالبہ کر کے حلال و آ حلال طیب اور بابرکت روزی حاصل کرنے کی خواہش کی تاکہ انہیں سکونِ قلب کی تمنا حاصل ہو۔ اس کے برخلاف مشکوک، حرام اور ناجائز خوراک سے کسی کو سکون قلب حاصل نہیں ہو سکتا، بلکہ اُس کی خواہش میں اضافہ ہی ہوگا۔ ایسے شخص کو بُرے وسوسے آئیں گے اور وہ ایمانی کاموں کی بجائے شیطانی امور پر

توجہ مبذول کرنے گا۔ اکثر لوگ عبادت کی لذت سے محض اس لیے محروم ہوتے ہیں کہ ان کی خوراک درست نہیں ہوتی۔ عبادت کیسے مقبول ہو جب کہ پیٹ حرام مال سے بھرا ہوا ہو۔ جب خون میں حرام اجزا سرایت کر چکے ہوں گے تو دل کیسے لگے گا۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ انسانی اخلاق پر غذا کا خاص اثر ہوتا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے مضرِ اخلاق چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔ نذر لغیر اللہ کا کھانا کھانے میں یہی خرابی ہے، بظاہر تو وہ چاول، مٹھائی یا دودھ جیسی پاک چیز ہوتی ہے، مگر اس میں ایسی روحانی خباثت اور بیماری ہے جس سے انسان کی روح پلید ہو جاتی ہے۔ پوری ملتِ ابراہیمیہ اس بات پر متفق ہے کہ نذر لغیر اللہ میں روحانی نجاست پائی جاتی ہے، کتا، بلی، خنزیر وغیرہ اور بدبودار اور گندی چیزیں مضرِ اخلاق ہونے کی بنا پر ہی حرام ہیں اس کے برخلاف حلال اور طیب چیزیں کھانے سے اطمینانِ قلب حاصل ہوگا۔ عبادت میں دل لگے گا اور وہ مقبول ہوگی۔ نیکی کے کام انجام دینے کی طرف دل میں تڑپ پیدا ہوگی اور اس طرح انسان اخلاق کے بلند ترین مقام پہنچ جائے گا۔

الغرض! اس گفتگو سے عیسٰی علیہ السلام کو یقین ہو گیا کہ اُن کے حواری نزول مائدہ کا مطالبہ کسی شک و شبہ کی بنا پر نہیں کر رہے ہیں بلکہ وہ اس کا مشاہدہ کر کے سکونِ قلب حاصل کرنا چاہتے ہیں اور یہ کوئی غلط مطالبہ نہیں ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مشاہدہ اور اطمینانِ قلب کی درخواست کو رد نہیں فرمایا تھا، بلکہ آپ کی خواہش کو پورا کر دیا تھا اب جب کہ عیسٰی علیہ السلام اپنے حواریوں کے جائز مطالبہ سے مطمئن ہو گئے تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں نزولِ مائدہ کے لیے ہاتھ بلند کر دیے اس کا ذکر اگلی آیت میں آئے گا۔

قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ ع ۱۵

ترجمہ :- عیسیٰ ابن مریم نے کہا اے اللہ ، اے ہمارے پروردگار ! اُتار دے ہم پر ایک بھرا ہوا دسترخوان آسمان کی طرف سے کہ ہو جائے وہ ہمارے لیے عید ہمارے پہلوں کے لیے اور ہمارے پچھلوں کے لیے اور نشان ہو خاص تیری طرف سے اور رزق دے ہمیں اور بیشک تو بہتر روزی دینے والا ہے ﴿۱۱۴﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا بیشک میں اتارنے والا ہوں اُس کو تم پر ، پس جو شخص ناشکری کرے گا تم میں سے پس میں اُس کو سزا دوں گا کہ نہیں سزا دوں گا میں ایسی کسی کو بھی جہان والوں میں سے ﴿۱۱۵﴾

ربط آیات

مسیح علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کے ہونے والے انعامات کا ذکر ہو رہا ہے گذشتہ درس میں آپ کے حواریوں کا تذکرہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے دلوں کو عیسیٰ علیہ السلام کی طرف پھیر دیا ، وہ ایمان لائے اور آپ کے معاون

بن گئے۔ پھر انہوں نے آپ سے درخواست کی کہ آپ نزول مائدہ کے لیے اللہ تعالیٰ سے دُعا کریں۔ عیسیٰ علیہ السلام نے اُن کو سمجھایا اور تنبیہ کی کہ اہلِ ایمان کو اس قسم کی فرمائش نہیں کرنی چاہیئے۔ حواریوں نے اپنے مطالبہ کی وضاحت کرتے ہوئے عرض کیا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی قدرت میں کوئی شک و شبہ نہیں اور نہ ہی ہم اللہ تعالیٰ کو آزمانا چاہتے ہیں بلکہ ہم تو متبرک کھانا اس لیے کھانا چاہتے ہیں کہ ہمیں اطمینانِ قلب حاصل ہو۔ ہم آپ کی صداقت کا مشاہدہ کر لیں اور آپ کی نبوت و رسالت کے گواہ بن جائیں۔

دعائے مسیح علیہ السلام

جب مسیح علیہ السلام کو اطمینان ہوگیا کہ حواریوں کی فرمائش جائز ہے، اور اس میں کوئی فاسد غرض کارفرما نہیں ہے تو انہوں نے بارگاہ ربّ العزت میں یوں دُعا کی قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ عیسیٰ ابن مریم نے عرض کیا اَللّٰهُمَّ یہ لفظ یا اللہ کا ہم معنی ہے۔ عربی لغت کے مطابق اللہ سے پہلے یا کو اڑا کر بعد میں مَّ بڑھا دیا جائے تو اَللّٰهُمَّ بن جاتا ہے، تاہم معنی وہی ہے اے اللہ! جب اللہ کا ذاتی نام لے کر اُسے پکارا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ نہایت عاجزی کے ساتھ دعا کی جارہی ہے اس کے ساتھ مسیح علیہ السلام نے رَبَّنَا بھی کہا، یعنی اے ہمارے پروردگار! ربوبیت اللہ ہی کی صفت ہے وہ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ہے وہ رَبَّ كُلِّ شَيْءٍ ہے۔ رب کا معنی کسی چیز کو بتدریج حد کمال تک پہنچانا ہے۔ تو ہر چیز کا مربی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ یہاں پر ہنا ہے کہ دو ناموں یعنی اللہ اور رب کہہ کر پکارا گیا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس قسم کی تکرار نہایت عاجزی اور التجا کی علامت ہوتی ہے اور اس سے دُعا کنندہ کو قبولیتِ دُعا کی زیادہ اُمید ہوتی ہے۔ تو عیسٰے علیہ السلام نے کہا کہ اے ہمارے پروردگار! ہم تیرے سامنے درخواست کرتے ہیں کہ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ آسمان کی طرف

سے ہم پر بھرا بھرا یا دسترخوان نازل فرمائے، جس میں کھانا ہو۔ اور نزول کا دِن تَكُونُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا ہمارے اگلوں اور پچھلوں کے لیے عید کا دن ہو۔ یعنی ہم بھی اسے خوشی کے دِن کے طور پر منا سکیں اور ہمارے بعد آنے والے بھی اس کا تذکرہ عید کے دِن کے طور پر کریں۔

یوم عید

عربی زبان میں خوشی کے ساتھ لوٹ کر آنے والی چیز کو عید کہتے ہیں۔ ہر سال لوٹ کر آنے والی عید کا یہی مفہوم ہے۔ چنانچہ عیسٰی علیہ السلام کے حواریوں نے بھی اِسی خواہش کا اظہار کیا کہ ہم پر مائدہ نازل فرما اور یوم نزول کو ہمارے لیے عید کا دِن بنا دے تاکہ اِس دِن کے پلٹ کر بار بار آنے پر ہمیں ہر بار خوشی اور سرور حاصل ہو۔ عید کا تصور تمام اقوام میں پایا جاتا ہے اور اس کے لیے زیادہ موزوں دِن وہ ہوتا ہے جس دِن کوئی نعمت میسر آئے۔ مسلمانوں کے لیے جمعہ کا دِن بھی عید کا دِن ہے کیونکہ اس روز اللہ تعالیٰ کے انعامات میں اضافہ ہو جاتا ہے اور اہلِ ایمان کی عبادت کی فضیلت بڑھ جاتی ہے اسی لیے جمعہ کو سید الایام یعنی تمام دنوں کا سردار دِن کہا گیا ہے۔ اسی طرح سال بھر میں عید کے دو دِن اللہ تعالیٰ کے انعام و اکرام کے دِن ہیں۔ عید الفطر مسلمانوں کے لیے تکمیل رمضان کا دِن ہوتا ہے۔ پورے ایک مہینہ کے روزے رکھنے کے بعد روزہ دار کو لازماً خوشی حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ عید کا دِن کہلاتا ہے اِسی طرح عید الاضحیٰ کے دِن دنیا بھر کے مسلمانوں کو اللہ کی بارگاہ میں نہایت اخلاص کے ساتھ جانوروں کی قربانی پیش کرنے کا موقع ملتا ہے، جو کہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے۔ حجاج کرام یہ قربانی وقوفِ عرفہ سے اگلے دِن کرتے ہیں جو کہ تکمیلِ حج کی علامت ہے اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے۔ بہرحال یہ دِن اہل ایمان کے لیے خوشی کے دِن یعنی عید کے دِن ہوتے ہیں۔ البتہ حضرت علیؓ سے یہ بات بھی منقول ہے كُلَّ يَوْمٍ لَا يُعْصَى اللّٰهُ فِيْهِ فَهُوَ عِيْدٌ لَّنَا ہمارے لیے

ہر وہ دن عید کا دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ ہو۔ لہٰذا عید کی خوشی مناتے وقت ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ کہیں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ ہو جائے۔ عید کے روز لہو و لعب، نشہ آور اشیا کا استعمال اور بُرائی کا ارتکاب عید کے شایانِ شان نہیں ہے بلکہ اس روز تو اللہ کی عبادت کرنی چاہیئے اور وہ امور انجام دینے چاہئیں جن سے اللہ کی خوشنودی حاصل ہو جائے اور معصیت سے بچ جائیں۔ اہلِ ایمان کی عید کا یہی تصور ہے۔

عید کا دن عام طور پر خوشی کا دن ہوتا ہے مگر بعض اوقات اس میں غم بھی لاحق ہو جاتا ہے۔ جو شخص کسی تکلیف اور پریشانی میں مبتلا ہو اُس کے لیے عید کا دن مزید پریشانی کا سبب بن جاتا ہے۔ فارسی کا مقولہ ہے "ماتم زدہ را عید بود ماتم دیگر" خدانخواستہ کسی کے ہاں موت واقع ہو جائے تو ظاہر ہے کہ اُس کے لیے یومِ عید دگنی پریشانی کا باعث ہوگا۔ ایسا شخص کسی خوشی کے کام میں شریک ہونے کا جذبہ ہی کھو بیٹھتا ہے۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم نے بھی کہا ہے ؎

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دین
عیدِ محکوماں ہجومِ مومنین

آزاد لوگوں کی عید ملک اور دین کے لیے باعثِ عزت و شرف ہوتی ہے۔ جب کہ غلاموں کی عید تو محض ایک ہجوم ہوتا ہے کہ مل کر شور و غل برپا کر لیا۔ وگرنہ غلامی کی زندگی میں عید کا وہ تصور قائم نہیں ہو سکتا جو آزادی کی فضا میں قائم ہوتا ہے۔ بہرحال عید کا مفہوم خوشی کے ساتھ وابستہ ہے جو دن خوشی کے ساتھ پلٹ کر آئے وہ عید کا دن ہوتا ہے اور وہ دن عید کا دن کہلانے کا زیادہ مستحق ہے جس دن کوئی نعمت نصیب ہو۔

مائدہ بطور ثانی

جس دن عیسیٰ علیہ السلام نے مائدہ کے لیے دُعا کی تھی وہ اتوار کا دن تھا اسی لیے عیسائی اتوار کو ہمارے جمعہ کی طرح مقدس خیال کرتے ہیں۔ بہرحال

اس دن انہوں نے یہی دعا کی کہ مولا کریم! ہمارے لیے آسمان سے مائدہ نازل فرما جو پہلے اور بعد میں آنے والوں کے لیے عید کا دن ہو وَاٰيَةً مِّنْكَ اور تیری جانب سے ایک خاص نشانی ہو۔ ظاہر ہے کہ آسمان کی طرف سے جو دسترخوان آجائے تو وہ معجزہ یا نشانی ہوگا۔ پھر مسیح علیہ السلام نے یہ بھی عرض کیا، مولا کریم! وَارْزُقْنَا اور ہمیں روزی عطا فرما کہ ہم اس کے ضرورت مند اور خواہش مند ہیں وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ اور تو بہترین روزی عطا کرنے والا ہے۔ ہر جاندار کو تو ہی روزی پہنچاتا ہے "اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ" (الذاریات) خدا ہی روزی رساں اور مضبوط ہے۔ روزی کے تمام اسباب بھی اللہ تعالیٰ ہی کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ اس لیے مسیح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ ہی سے روزی بہم پہنچانے کی دعا کی اور مائدہ کو بطور خاص نشانی ظاہر کرنے کی درخواست کی۔

نزول مائدہ

اس کے جواب میں قَالَ اللّٰهُ اللہ نے فرمایا اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ میں اسے اتارنے والا ہوں تم پر فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ پھر اگر اس کے بعد کسی نے ناشکرگزاری کی فَاِنِّيْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ تو اسے ایسی سخت سزا دوں گا، جو اور کسی کو نہ دوں گا۔ یہ اتوار کا دن تھا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تو آسمان پر بادل نمودار ہوئے اور ان کے درمیان فرشتے دسترخوان اٹھائے ہوئے تھے، وہ نازل ہوا۔ اس میں پانچ یا سات روٹیاں اور اتنی ہی تلی ہوئی مچھلیاں تھیں، اس کے علاوہ سرکہ، نمک مختلف سبزیاں اور زیتون کا تیل بھی تھا۔ عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ کا نام لے کر دسترخوان کھولا اور لوگوں کو کھانے کی اجازت دی۔ تاہم اس کی لذت تو کھانے والے ہی جانتے ہوں گے۔ یہ دسترخوان ایک ایک دن کے وقفے سے چالیس دن تک نازل ہوتا رہا۔ بعض فرماتے ہیں

کہ مائدہ صبح کے وقت نازل ہوتا تھا اور پچھلے پہر خود بخود اُٹھ جاتا تھا۔

یہاں پر نزولِ مائدہ کے لیے دُعا کا ذکر تو موجود ہے مگر اُس کے فی الحقیقت نزول کا صریحاً ذکر نہیں ہے۔ مفسرین کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ دُعا کے نتیجے میں مائدہ نازل ہوا بھی تھا یا نہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے شاگرد حضرت مجاہدؒ کہتے ہیں کہ مائدہ نازل نہیں ہوا تھا کیونکہ اللہ تعالےٰ نے جس سخت سزا کی وعید سنائی تھی، حواری اُس سے ڈر کر خاموش ہو گئے۔ اور انہوں نے اِس کے نزول پر اصرار نہ کیا۔ شاہ عبدالقادرؒ اور دیگر مفسرین فرماتے ہیں کہ مائدہ فی الواقع نازل ہوا تھا۔ ان کے مطابق قرآن پاک کے الفاظ اِنِّیْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ حکمت سے خالی نہیں۔ لہذا مائدہ یقیناً نازل ہوا ہے۔ ترمذی شریف میں سورۃ مائدۃ کی تفسیر میں حضرت عمار بن یاسرؓ کی ایک ضعیف روایت موجود ہے جس کے مطابق دسترخوان آسمان سے نازل ہوا اور اس میں گوشت اور روٹیاں تھیں یہ روایت مُنَزِّلُهَا کے ساتھ کچھ مناسبت رکھتی ہے۔ امام بیضاویؒ بھی نزول مائدہ کے قائل ہیں۔ بہرحال نزول کے متعلق نہ تو قرآن کی کسی آیت میں صراحت ہے اور نہ ہی کسی صحیح حدیث میں ذکر ملتا ہے لہذا یقین سے نہیں بلکہ قرینے سے کہا جاتا ہے کہ مائدہ نازل ہوا تھا۔ تاہم اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے وہ اپنی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ سے جو چاہے کر سکتا ہے۔

شرائط مائدہ کی خلاف ورزی

تفسیری روایات میں آتا ہے کہ نزولِ مائدہ کے ابتدائی ایام میں تو اس میں ہر شخص کو کھانے کی اجازت تھی۔ اور اِس غذا کا خاصہ یہ تھا کہ جو غریب آدمی کھاتا تھا، وہ امیر ہو جاتا اور جو مریض کھاتا وہ شفایاب ہو جاتا پھر کچھ روز بعد اُس کا حکم بدل گیا اور حضرت عیسٰی علیہ السلام نے اعلان کر دیا کہ اسے نہ تو غنی آدمی کھائے اور نہ ہی اس کا ذخیرہ بنا کر رکھا جائے مگر لوگوں نے اس حکم پر عمل نہ کیا اور محتاجوں کے ساتھ اغنیاء نے بھی کھانا شروع

کر دیا اور اُسے بچا کر بھی رکھنے لگے۔ جس روز مائدہ نازل ہوتا اس میں سے کچھ کھا لیتے اور کچھ اگلے دن کے لیے ذخیرہ کر لیتے۔ اس طرح یہ لوگ شرائط کی پابندی نہ کر سکے بلکہ اس بہت بڑی نعمت کی ناشکری کے مرتکب ہوئے، اور پھر نتیجہ وہی نکلا جس کی خبر دی جا چکی تھی کہ جو کوئی ناشکری کرے گا میں اس کو سخت سزا میں مبتلا کر دوں گا۔ چنانچہ اُن میں سے ۸۰ یا ۸۲ آدمی ایسے نکلے جنہوں نے مائدہ کی شرائط کو توڑا اور اس عظیم نعمت کی ناقدر دانی کے مرتکب ہوئے اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب بھڑکا اور ان لوگوں کو بندروں اور خنزیروں کی شکل میں تبدیل کر دیا مُسِخُوْا قِرَدَةً وَّخَنَازِیْرَ اور پھر ایسے لوگوں کے لیے خدائی قانون یہ ہے کہ مسخ شدہ انسانوں کو تین دن سے زیادہ زندہ نہیں رکھا جاتا حدیث شریف میں آتا ہے کہ تین دن کے بعد انکو صفحۂ ہستی سے ناپید کر دیا گیا شاہ عبدالقادرؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی قوم نے مائدہ کا خود مطالبہ کیا اور اس کے جواب میں مطلوبہ نعمت انہیں حاصل ہو گئی۔ فرماتے ہیں اس کے بعد جو شخص اُس نعمت کی ناقدر دانی کرتا ہے، وہ سزا کا مستحق ہوتا ہے، چنانچہ احکام الٰہی کی خلاف ورزی کرنے والوں کو اس کی سزا بھگتنا پڑی۔

نعمت کی ناقدر دانی

نعمت کی ناقدر دانی کی پاداش میں ہم پاکستانی بھی سزا بھگت رہے ہیں۔ ہندو اور انگریز کی غلامی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے اس برصغیر کے مسلمانوں نے ڈیڑھ دو سو سال تک جدوجہد کی اور اس کے لیے بڑی بڑی قربانیاں پیش کیں۔ مقصد یہ تھا کہ ہم اس خطہ ارضی میں اللہ کے احکام اور اس کے نبی کے فرمان کے مطابق زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ خدا خدا کر کے ہمیں آزادی جیسی عظیم نعمت نصیب ہوئی مگر افسوس کا مقام ہے کہ ہم اس نعمت کی قدر نہیں کر سکے، ملک پاکستان میں اسلامی نظام رائج کرنے کے کتنے وعدے ہوئے ہیں مگر کوئی بھی اس وعدے کو وفا نہ کر سکا اور یہاں پر یا تو انگریز کا طاغوتی نظام جاری رہا یا مارشل لاء کے جابرانہ احکام

کو ماننا پڑا۔ حق تو یہ تھا کہ اس سرزمین پر فوراً اسلامی نظام جاری کر دیا جاتا
مگر ہر نئے آنے والے نے کٹھیاں بنانے پر ہی اکتفا کیا اسلام کو نافذ کرنے
کی کسی کو توفیق نہ ہوئی۔ اِس وقت اس ملک میں تین متوازی نظام چل
رہے ہیں۔ اصل قانون انگریز کا ہے جو ہمیں ورثے میں ملا ہے، اُس کے
ساتھ مارشل لا کے ضابطے ہیں اور پھر بعض معاملات میں برائے نام اسلامی
قانون بھی رائج ہے مگر بالادستی انگریزی قانون ہی کو حاصل ہے۔ اگر کوئی
جج اسلامی قانون کے مطابق فیصلہ کرتا ہے تو اس سے بڑا جج انگریزی قانون
کی آڑ میں اُسے کالعدم قرار دے دیتا ہے اور اس طرح اسلامی قانون
عملی طور پر نہ ہونے کے برابر ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ آدھا ملک تو چھن چکا
ہے اور باقی آدھے ملک میں جھگڑے فساد کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔
کہیں سندھی اور پنجابی کا جھگڑا ہے، کہیں افغان اور بلوچی کا تنازعہ ہے
کہیں شیعہ سنی جھگڑ رہے ہیں تو کہیں دیوبندی بریلوی الجھ رہے ہیں۔ کہیں
مقلد اور غیر مقلد کی بحثیں چھڑی ہوئی ہیں، کہیں سرمایہ داری نظام کو ہی وحی
الٰہی سمجھ لیا گیا ہے اور کہیں اشتراکیت کے لیے راہ ہموار کی جا رہی ہے۔
چاہیے تو یہ تھا کہ اللہ کی عطا کردہ نعمتِ آزادی کی قدر کرتے اور اس ملک
میں اُس کے احکام کو نافذ کرنے کی جدوجہد کرتے مگر باہمی اختلافات کی
وجہ سے ہم خود اسلام کے راستے میں رکاوٹ بن چکے ہیں۔ یہ تو اللہ کے
غضب کو دعوت دینے والی بات ہے۔ اگر حضرت عیسٰی علیہ السلام کی قوم
مائدہ جیسی نعمت کی ناقدری کر کے اللہ کی ناراضگی کا شکار ہو سکتی ہے تو ہمیں بھی سوچنا
چاہیے کہ آزادی جیسی عظیم نعمت کی قدر نہ کر کے ہم کس طرف جا رہے ہیں۔
بہر حال اللہ نے فرمایا کہ میں فرمائش کو قبول کرتے ہوئے مائدہ اتارنے
والا ہوں، اب جو شخص ناشکری کا ارتکاب کرے گا تو میں ایسا عذاب دوں گا
جو کسی دوسرے کو نہ دیا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اصول کے طور پر سمجھا دیا کہ خود کسی چیز
کو طلب کر کے پھر اس پر کاربند نہ رہنا کتنا بڑا جرم ہے۔

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ
لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ
قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ
لِيْ ۤ بِحَقٍّ ڲ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ۭ
تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ۭ
اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۱۱۶﴾ مَا قُلْتُ
لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ
اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ
شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ
كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۭ وَاَنْتَ عَلٰي كُلِّ
شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۱۱۷﴾

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

ترجمہ: اور جب فرمائے گا اللہ تعالیٰ، اے عیسیٰ ابن مریم
کیا تم نے کہا تھا لوگوں کے لیے کہ مجھے اور میری ماں کو دو
معبود ٹھہراؤ اللہ کے سوا۔ کہیں گے (عیسیٰ علیہ السلام) پاک ہے
تیری ذات اے اللہ! نہیں لائق میرے لیے کہ میں کہوں وہ
بات جس کا مجھے حق نہیں پہنچتا۔ اگر میں نے کہی ہو تو تو
ضرور اُس کو جانتا ہے، تو جانتا ہے جو کچھ میرے جی میں ہے

اور میں نہیں جانتا جو تیرے جی میں ہے۔ بیشک تو ہی سب غیبوں کا جاننے والا ہے (۱۱۶) میں نے نہیں کہی اُن لوگوں سے مگر وہی بات جس کا تو نے مجھے حکم دیا کہ عبادت کرو اللہ کی جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی۔ اور میں اِن کی خبر رکھتا تھا جب تک میں اِن کے اندر تھا، جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو تو ہی ان پر نگران تھا؛ بیشک تو ہر چیز کی خبر رکھنے والا ہے (۱۱۷)

ربطِ آیات

گذشتہ رکوع قیامت کے دن محاسبے کے عمل کی تمہید پر مشتمل تھا، اللہ تعالیٰ نے تمام رسولوں کو جمع کرنے کا ذکر فرمایا کہ اُن سے پوچھا جائے گا کہ تمہاری اُمتوں نے تمہاری دعوت کا کیا جواب دیا، تو تمام انبیاء اور رُسل عاجزی کا اظہار کریں گے۔ پھر مثال کے طور پر مسیح علیہ السلام کا ذکر کیا جو دراصل اُن کو معبود ماننے والوں کے لیے سخت ڈانٹ ہے کہ جب قیامت کو محاسبے کا وقت آئیگا تو مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا ماننے والے ذلیل و خوار ہو کر رہ جائیں گے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ یہ لوگ اسی دُنیا میں اپنے عقیدہ کی درستگی کر لیں اور مسیح علیہ السلام کو ابن اللہ کہہ کر شرک میں مبتلا نہ ہوں۔

اسی سابقہ رکوع میں اللہ تعالیٰ نے اُن نعمتوں کا تذکرہ بھی کیا جو اُس نے عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کی والدہ پر کیں۔ اِن انعامات میں عیسیٰ علیہ السلام کو تحریر کا علم، کتاب و حکمت کی تعلیم بنی اسرائیل سے آپ کی حفاظت، حواریوں کی طرف سے آپ کی تائید وغیرہ شامل ہیں آپ کی والدہ پر بھی بڑے احسانات فرمائے، آپ کو جہاں بھر کی عورتوں میں اعلیٰ مقام عطا کیا، آپ کی پرورش غیر معمولی طریقے سے ہوئی اور پھر بغیر خاوند کے آپ کے بطن سے عیسیٰ علیہ السلام کو پیدا فرمایا، بنی اسرائیل کے الزامات سے آپ کو پاک فرمایا وغیرہ وغیرہ انعامات ہی کے سلسلے کی آخری کڑی کے طور پر حواریوں کے مطالبہ پر نزولِ مائدہ کا ذکر فرمایا۔ اور اب اس تمہید کے بعد قیامت کے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے جو مثالی طور پر

سوال وجواب ہوگا، اُس کا ذکر آ رہا ہے۔

ماضی بمعنی مستقبل

ارشاد ہوتا ہے اُس بات کو دھیان میں لاؤ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ جب اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ اے عیسٰی مریم کے فرزند! یہاں پہ لفظ قَالَ استعمال ہوا جس کا اطلاق زمانہ ماضی پر ہوتا ہے اور اس لحاظ سے معنی یہ ہوتا ہے جب اللہ نے فرمایا۔ حالانکہ بات محاسبے کی ہو رہی ہے جو آنے والا زمانہ ہے۔ اس ضمن میں مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ قرآن پاک کا یہ اسلوب بیان ہے کہ قیامت، جنت، دوزخ اور متعلقہ واقعات کو زمانہ ماضی کے ذریعے بیان کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح گذرا ہوا کوئی واقعہ شک و شبہ سے بالا ہوتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کا بتلایا ہوا محاسبے کا عمل قطعی اور یقینی ہے لہذا مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کو ماضی میں بیان کرکے اس کی قطعیت پر مہر تصدیق ثبت کی گئی ہے اس کے علاوہ ایک اور توجیہہ یہ بھی ہے کہ ماضی حال اور مستقبل کا تعلق مخلوق کے ساتھ ہے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام زمانے برابر ہیں لہذا اگر وہ کسی مستقبل کے واقعہ کو ماضی کے لفظ سے بیان فرماتا ہے تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ اس کے لیے تو ہر چیز حاضر ہے اس کی ذات سے کوئی چیز غائب نہیں۔ سورۃ سبا میں موجود ہے عٰلِمِ الْغَيْبِ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ "وہ غیب کا جاننے والا ہے اس سے زمین و آسمان میں ذرہ کے برابر بھی کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔ چنانچہ اس لحاظ سے بھی مستقبل کا اطلاق ماضی پہ کیا گیا ہے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ جس طرح اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے عیسٰی ابن مریم کہہ کر خطاب کیا۔ اسی طرح آخرت کی منزل میں بھی اسی نام سے خطاب کرے گا۔ لہذا مسیح علیہ السلام کو الٰہ ماننا یا آپ کا کوئی باپ ثابت کرنا دونوں باتیں غلط ہیں اور قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے۔

مسیح علیہ السلام سے سوال

اللہ تعالیٰ فرمائے گا اے عیسیٰ ابن مریم! ءَ اَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰھَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا دو معبود بنا لو؟ ظاہر ہے کہ دنیا میں ماں بیٹا دونوں کی پرستش ہوتی رہی۔ امہات المومنین حضرت ام حبیبہؓ اور حضرت ام سلمہؓ نے حضور علیہ السلام کے سامنے بیان کیا کہ ہم نے حبشہ کے گرجا میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریمؑ کی تصاویر دیکھیں، وہ لوگ ان تصویروں کو سلام کرتے تھے اور ان کی تعظیم اور پوجا کرتے تھے حضور علیہ السلام نے فرمایا اولٰئک شرار خلق اللہ یہ اللہ کی مخلوق میں بدترین لوگ ہیں۔ جب ان میں سے کوئی نیک آدمی فوت ہو جاتا تو یہ اُسکی تصویر یا مجسمہ بنا کر رکھ لیتے اور پھر اُس کی پوجا کرنے لگتے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ کفر کا راستہ ہموار کرنے والے بدترین لوگ ہیں عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا اللہ نے بیٹا بنا لیا ہے اور اُسے اختیار دے دیا ہے کہ جو چاہے کرے، جس کا چاہے بیڑا پار کر دے اور جس کو چاہے گرفتار کر لے۔ کہتے ہیں کہ وہ ہماری مرادیں پوری کرتا ہے اور ہماری بگڑی بناتا ہے۔ اسی طرح حضرت مریمؑ کو مادرِ خدا کہا جاتا ہے۔ پھر اُن کا باپ، بیٹا اور روح القدس کا تثلیث والا عقیدہ بھی موجود ہے۔ یہ سب شرکیہ اور کفریہ عقائد ہیں۔ انہی عقائد کے ذریعے انہوں نے مسیح اور ان کی والدہ کو دو الٰہ بنا دیا ہے اور اسی کے متعلق قیامت کو عیسیٰ علیہ السلام سے سوال ہو گا کہ کیا تو نے ان لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو دو الٰہ بنا لو۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سوال ہونے پر حضرت مسیح علیہ السلام پر جو کیفیت طاری ہو گی، اُس کے متعلق مفسرین نے کئی باتیں لکھی ہیں۔ ان میں تفسیر کبیر، تفسیر ابن جریر اور تفسیر روح المعانی قابل ذکر ہیں۔ تفسیری روایات میں سو فیصدی درست باتیں نہیں ہوتیں بلکہ ان میں اکثر قصے کہانیاں ہوتی ہیں۔ بعض اسرائیلی روایات بھی شامل کر لی جاتی ہیں مگر ان کی صحت کے متعلق یقین سے کچھ نہیں

کہا جاسکتا۔ جس طرح وعظ یا تقریر میں کوئی چیز سمجھانے کے لیے کوئی قصہ، کہانی، مثال یا تشبیہ وغیرہ بیان کر دی جاتی ہے اسی طرح تفسیر میں بھی ان چیزوں کو جگہ دے دی جاتی ہے مختلف تفاسیر میں سے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی تفسیر عزیزی سب سے عمدہ ہے مگر مکمل نہیں۔ اس کے دو آخری پارے ہیں اور پھر ابتداء سے صرف ڈیڑھ پارہ ہے۔ یہ تفسیر آپ نے عمر کے آخری حصہ میں لکھوانا شروع کی مگر عمر نے وفا نہ کی۔ حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ اگر تفسیر عزیزی مکمل ہو جاتی تو کہا جاسکتا تھا کہ امت کے ذمے جو حق تفسیر تھا، وہ کسی حد تک ادا ہو گیا ہے۔ یہ اتنی عظیم تفسیر ہے۔ اللہ کے احکامات کو سمجھانے کے لیے شاہ صاحب نے جو حکیمانہ طریقہ اختیار کیا ہے۔ وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اسی طرح آپ کے ہم عصر سید محمود آلوسی شکری بغدادیؒ نے روح المعانی جیسی عظیم تفسیر لکھی ہے۔ آپ بہت بڑے فقیہ اور عالم تھے۔ صرف نحو، علم کلام، تاریخ اور جدید معلومات پر عبور حاصل تھا۔ آپ نے جوانی کے عالم میں ہر پارے کی علیحدہ علیحدہ تفسیر لکھ کر بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے غرضیکہ تفسیری روایات میں بہت سی ایسی باتیں بھی آجاتی ہیں جن کی صحت کے متعلق مکمل ثبوت نہیں مہیا کیا جاسکتا، تاہم ایسی روایات سے بات کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام کی حالت

بہرحال صاحب تفسیر روح المعانی نے لکھا ہے کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ مسیح علیہ السلام سے خطاب فرمائیگا۔ کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو معبود بنا لو، تو آپ پر کپکپی طاری ہو جائیگی۔ دہشت کی وجہ سے آپکے بال کھڑے ہو جائیں گے اور ان کے نیچے سے خون نکلنے لگے گا۔ علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں۔ کہ بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ مسیح علیہ السلام پر یہ حالت پانچ سو سال تک طاری رہے گی اور وہ زبان سے کچھ نہیں بول سکیں گے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ ان

کے دل میں القا کریں گے تو وہ سوال کا جواب دیں گے۔

قیامت کی سختیوں اور مشکل گھاٹیوں کو عبور کرنے کے لیے حضور علیہ السلام نے یہ تعلیم دی ہے کہ ایسے موقع پر یوں کہو حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ یعنی ایسے مواقع پر ہمارے لیے اللہ ہی کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق کے بغیر کوئی شخص زبان نہیں کھول سکیگا۔ سب اس کے عاجز بندے ہیں۔ قبر میں، حشر میں، میزان پر اور سوال و جواب کے وقت اللہ تعالیٰ کی امداد کے بغیر کچھ نہیں ہو سکے گا، جب صور پھونکا جائے گا اور ہر طرف دہشت طاری ہو جائیگی تو فرمایا اس وقت یہی کہو حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ فرمایا یہ بھی کہو عَلَی اللّٰہِ تَوَکَّلْنَا اللہ تعالیٰ پر ہی ہمارا بھروسہ ہے وہی ہمارا کارساز ہے۔ تمام مشکلات کو وہی آسان کرنے والا ہے۔ پل صراط پر سے وہی گزر سکے گا جس کے لیے اللہ تعالیٰ یہ منزل آسان فرمادیگا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا عاجزانہ جواب

جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے دہشت کی کیفیت دُور ہو گی تو وہ اللہ تعالیٰ کے سوال کا نہایت عاجزی کے ساتھ جواب دیں گے قَالَ سُبْحٰنَکَ عرض کریں گے۔ اے مولا کریم! تیری ذات پاک ہے۔ تو ہر عیب، نقص اور کمزوری سے پاک ہے یہ بڑا پاکیزہ کلمہ ہے اور اسی سے نماز کی ابتدا کی جاتی ہے سُبْحٰنَکَ اللّٰھُمَّ تو مسیح علیہ السلام اللہ کی پاکیزگی بیان کر کے عرض کریں گے مَا یَکُوْنُ لِیْ میرے لیے یہ لائق نہیں ہے اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ بِحَقٍّ کہ میں ایسی بات کروں جس کا مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا۔ یعنی مجھے کیا حق ہے کہ میں لوگوں سے اپنی الوہیت کا اقرار کراؤں۔ مخلوق میں سے کسی کا یہ حق نہیں کہ وہ خدائی اختیارات اپنے لیے ثابت کرنے لگے۔ یہ تو بہت بڑی تکبر کی بات ہے جو اللہ تعالیٰ کو ہرگز پسند نہیں۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ اللہ فرماتا ہے العظمۃ ازاری والکبریاء ردائی یعنی عظمت میرا تہ بند ہے اور تکبر میری چادر ہے

جو اس کو اوڑھنا چاہیگا، میں اس کو ذلیل کر کے جہنم میں داخل کروں گا سورۃ مومن میں موجود ہے اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہاں عِبَادَتِیْ سے مراد دعائی ہے یعنی جو لوگ میرے سامنے دستِ دُعا اٹھانے سے تکبر کرتے ہیں سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِیْنَ انہیں ذلیل کر کے جہنم میں داخل کروں گا۔
بہر حال مخلوق میں سے یہ کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے اوپر غرور و تکبر اور الوہیت کی چادر اوڑھے بلکہ اس کا فرض تو یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور بڑائی بیان کرے۔ سورۃ مدثر میں یہی تعلیم دی گئی ہے "وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ" اپنے رب کی بڑائی بیان کرو۔

تو فرمایا عیسیٰ علیہ السلام عرض کریں گے، پروردگار! تیری ذات پاک ہے میرے لیے یہ ہرگز لائق نہیں کہ میں ایسی بات کروں جس کا مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اے مولا کریم! اِنْ کُنْتُ قُلْتُہٗ فَقَدْ عَلِمْتَہٗ اگر میں نے کوئی ایسی بات کی ہوگی تو تو اُسے جانتا ہے۔ کیونکہ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ میرے جی کی بات کو تو جانتا ہے وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِکَ اور تیرے جی کی بات کو میں نہیں جانتا۔ مطلب یہ ہے کہ تو ہر چیز کو جانتا ہے اگر میں نے کوئی ایسی بات کی ہوگی تو تیرے علم سے تو باہر نہیں ہے، میرا ظاہر باطن سب تیرے سامنے ہے مگر خالق کا باطن مخلوق نہیں جانتی سوائے اس کے جو تو خود بتلائے۔

یہاں پر لفظ نفس کا اطلاق کیا گیا ہے۔ نفس انسانی بھی ہوتا ہے۔ اور حیوانی بھی۔ یہ مخلوق تو عارضی چیز ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے لیے قرآن پاک میں جہاں جہاں نفس کا لفظ استعمال ہوا اُس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے مثلاً کَتَبَ عَلٰی نَفْسِہِ الرَّحْمَۃَ اُس نے اپنی ذات پر رحمت کو لکھ لیا ہے اس نے یہ بات اپنے ذمے لی کہ وہ اپنی مخلوق پر

رحم فرمائے گا۔ اسی طرح "یُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفۡسَہٗ" اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی ذات سے ہوشیار کرتا ہے لہذا کوئی غلط کام نہ کر بیٹھنا۔ بہرحال نفس کا معنیٰ ذات ہوتا ہے۔

اس کے بعد مسیح علیہ السلام نے عرض کیا، اے مولا کریم! اِنَّکَ اَنۡتَ عَلَّامُ الۡغُیُوۡبِ تمام پوشیدہ باتوں کو جاننے والا تو ہی ہے۔ لہذا تو میرے کسی فعل سے غافل نہیں۔ یہ بیان پہلے بھی گزر چکا ہے کہ تمام انبیاء اس بات پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک ہے۔ وہ علام الغیوب ہے وہ عالم الغیب والشہادت ہے۔ وہ مخلوق کی ہر حاضر اور غائب چیز کو جاننے والا ہے۔ علم غیب اس کی صفت مختصہ ہے اس کے سوا کوئی عالم الغیب نہیں۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ انبیاء کے متعلق قدرت تامہ اور علم غیب کی نفی کرنا واجب ہے۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے جو مخلوق میں سے کسی میں نہیں پائی جاتی۔ اسی لیے عیسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اے اللہ! تمام غیبوں کو جاننے والا تو ہی ہے۔

توحید کی دعوت

عیسیٰ علیہ السلام نے دربار خداوندی میں مزید عرض کیا مَا قُلۡتُ لَھُمۡ اِلَّا مَاۤ اَمَرۡتَنِیۡ بِہٖۤ میں نے اپنی قوم سے تیرے حکم کے سوا کچھ نہیں کہا۔ اور وہ یہ ہے اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ رَبِّیۡ وَرَبَّکُمۡ کہ اس اللہ کی عبادت کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے حاجت روا، مشکل کشا، قادر مطلق، نافع اور ضار سوائے خدا تعالیٰ کے اور کوئی نہیں ہے لہذا قولی فعلی، اعتقادی عملی ہر قسم کی عبادت کے لائق وہی ذات ہے میں بھی تمہاری طرح خدا کا عاجز بندہ ہوں پہلے گزر چکا ہے "مَا الۡمَسِیۡحُ ابۡنُ مَرۡیَمَ اِلَّا رَسُوۡلٌ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِہِ الرُّسُلُ" مسیح ابن مریم اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں جس طرح کہ ان سے پہلے رسول گزر چکے ہیں۔ رسول نسل آدم سے ہونے کی بنا پر انسان

ہوتے ہیں۔ وہ عالم الغیب، حاجت روا اور مشکل کشا نہیں ہوتے۔ اُن میں تو عاجزی اور انکساری پائی جاتی ہے۔ وہ اپنی الوہیت کا اعلان کیسے کر سکتے ہیں۔

فرمایا میں نے تو انہیں اُسی بات کی تلقین کی تھی جس کا تو نے مجھے حکم دیا وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ جب تک میں اُن کے درمیان رہا اُس وقت تک اُن کی خبر رکھتا تھا۔ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي پھر جب تو نے مجھے اٹھا لیا كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ تو تو ہی اُن کا نگران تھا وَأَنْتَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ اور تو ہر چیز کی خبر رکھنے والا ہے۔ میرے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد مجھے معلوم نہیں کہ یہ لوگ کیا کرتے رہے ہیں۔ میں انہیں اپنی زندگی میں توحید کی دعوت دیتا رہا۔ مگر میرے بعد پھر تو ہی اُن کا نگران تھا اور تو ہر چیز سے واقف ہے

تفسیر کبیر والے تَوَفَّيْتَنِي کا معنی کرتے ہیں کہ مجھے آسمان کی طرف اٹھا لیا چنانچہ معراج والی حدیث میں آتا ہے کہ دوسرے آسمان پر حضور علیہ السلام کی ملاقات حضرت یحییٰ علیہ السلام اور عیسےٰ علیہ السلام سے ہوئی۔ باقی سب لوگ تو اپنی دنیا کی زندگی پوری کر چکے ہیں مگر مسیح علیہ السلام دنیا کا دور ابھی کچھ باقی ہے۔ وہ زمین پر دوبارہ آئیں گے۔ دجال کو قتل کریں گے حضور علیہ السلام کے نائب کی حیثیت سے آپ کی شریعت کو جاری کریں گے۔ اسی لیے مولانا شیخ الہندؒ بھی یہاں پر توفی کا معنی اٹھا لینا ہی کرتے ہیں۔

تَوَفّی کا لغوی معنی اخذ الشیء وافیا یعنی کسی چیز کو مکمل طور قبض یا وصول کر لینا۔ یہ لفظ موت کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اس مقام پر اس لفظ سے مراد موت نہیں بلکہ اٹھا لینا ہے۔ موت کا عام قانون یہ ہے "اللّٰهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ" اللہ تعالیٰ موت کے وقت جانوں کو کھینچ لیتا ہے۔ مگر مسیح علیہ السلام کے متعلق فرمایا "إِنِّي

مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ "حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ میں تجھے اٹھا لینے والا ہوں پھر اپنے وقت پر وفات دوں گا۔ یہ لوگ تمہیں آج سولی پر چڑھا کر موت سے ہمکنار کرنا چاہتے ہیں مگر میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ بلکہ مقررہ وقت پر موت دوں گا۔ قادیانیوں نے بھی اس لفظ سے غلط معنیٰ لیے ہیں۔ وہ اس سے عیسیٰ علیہ السلام کی موت ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہے۔

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۱۸﴾ قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ۚ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۚ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۚ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۹﴾ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۲۰﴾ ع۵

ترجمہ: اگر تو اُن کو سزا دے تو بیشک وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو اُن کو بخشش دے تو زبردست اور حکمت والا ہے ﴿۱۱۸﴾ اللہ تعالیٰ فرمائے گا یہ وہ دن ہے کہ نفع دیگا سچوں کو اُن کا سچ اُن کے لیے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اِن میں۔ اللہ تعالیٰ اُن سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔ یہ ہے کامیابی سب سے بڑی ﴿۱۱۹﴾ اللہ ہی کے لیے ہے سلطنت آسمانوں کی اور زمینوں کی اور جو کچھ اُن کے اندر ہے۔ اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ﴿۱۲۰﴾

ربط آیات

قیامت کے دن عیسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کے خطاب کا ذکر ہو رہا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ محاسبہ کرتے ہوئے پوچھے گا اے عیسیٰ (علیہ السلام)! کیا تو نے لوگوں

کو کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو معبود بنا لینا اللہ کے علاوہ، تو عیسٰی علیہ السلام
بیزاری کا اظہار کریں گے اور عرض کریں گے۔ اے پروردگار! تیری ذات
پاک ہے۔ میرے لائق یہ ہرگز نہیں کہ میں ایسی بات کروں جس کا مجھے حق
نہیں پہنچا۔ اور اگر بالفرض میں نے ایسی بات کی ہوگی تو تیرے علم میں
ہے کیونکہ تو میرے دل کی بات کو جانتا ہے مگر میں تیرے دل کی بات کو
نہیں جانتا۔ نیز یہ بھی کہ تمام پوشیدہ باتوں کو تو ہی جانتا ہے۔ عیسٰی علیہ السلام
نے اس طرح اپنی انکساری کا اظہار کیا ہے اور اُن کی طرف منسوب شدہ غلط
بات کا رد بھی کیا ہے۔ آپ یہ بھی عرض کریں گے کہ اے پروردگار! میں
نے تو وہی بات کہی تھی جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا کہ عبادت صرف اللہ
کی کرو جو میرا اور تمہارا سب کا رب ہے۔ اس کے علاوہ میں نے
اُن سے کوئی بات نہیں کی۔ الٰہ العالمین! جب تک میں اُن کے
درمیان موجود رہا۔ میں اُن کی خبر رکھتا تھا مگر جب تو نے مجھے اٹھا لیا
تو پھر تو ہی ان کا نگران تھا اور تو ہر چیز کی خبر رکھنے والا ہے یعنی تو ہر
چیز پر گواہ ہے۔

اسلوبِ دُعا

اللہ تعالیٰ کے سوال کا جواب دینے کے بعد حضرت عیسٰی علیہ السلام
اپنی قوم کے حق میں خاص اسلوب کے ساتھ دُعا کریں گے۔ اے مولا کریم!
إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ اگر تو اُن کو سزا دے تو
بیشک وہ تیرے بندے ہیں وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ اور اگر تو ان کو
معاف کر دے فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ تو تو عزیز یعنی
کمال قوت کا مالک اور زبردست ہے اور حکیم یعنی حکمت والا ہے
دُعا کے یہ الفاظ نہایت لطیف اور پُر از معانی ہیں اور اکثر انبیاء نے
اپنی اپنی قوم کے حق میں دُعا کے لیے اسی قسم کا اسلوب اختیار کیا ہے
حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی بتوں اور معبودانِ باطلہ کے متعلق سی

قسم کی دعا کی تھی رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِىْ فَاِنَّهٗ مِنِّىْ وَمَنْ عَصَانِىْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ
(ابراہیم) اے پروردگار! یہ بہت سے لوگوں کی گمراہی کا سبب بنے ہیں۔ پس جس نے میری پیروی کی وہ یقیناً فلاح پائیگا اور جس نے میری نافرمانی کی تو تو غفور اور رحیم ہے۔

ذرا غور فرمایئے کہ مذکورہ بالا دونوں دعاؤں کے آخر میں اللہ تعالیٰ کی دو صفات کا ذکر کیا گیا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعا میں عزیز اور حکیم ہے، جب کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں غفور اور رحیم ہے۔ اللہ تعالیٰ کے صفاتی اسماء میں یہ اختلاف زمان و مکان کے اختلاف اور ہر مقام پر مطلوبہ مقصود کے اختلاف کی وجہ سے ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا اس دنیا میں تھی اور ان لوگوں کے لیے تھی جو اس وقت دنیا میں موجود تھے۔ لہذا آپ کا غفور اور رحیم کی صفت کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا بایں معنیٰ تھا کہ مولا کریم! ان لوگوں کو توفیق دے تاکہ یہ تیرے حضور توبہ کر کے مغفرت کے مستحق بن جائیں اور تیرے رحم کے قابل ہو جائیں اس کے برخلاف حضرت مسیح علیہ السلام کی دعا کا تعلق آخرت کے دن سے ہے جب عمل کی دنیا ختم ہو چکی ہوگی اور صرف محاسبے کا عمل ہی باقی ہوگا۔ تو ایسے وقت میں کسی کا توبہ کرنا کچھ فائدہ نہ دے گا۔ لہذا عیسیٰ علیہ السلام اسی انداز میں دعا کریں گے کہ مولا کریم تو عزیز ہے یعنی کمال قدرت کا مالک اور زبردست ہے تو جو چاہے کر گزرنے پر قادر ہے۔ لہذا اگر تو ان کو سزا میں مبتلا کر دے تو یہ تو تیرے قبضہ قدرت میں ہے۔ تو سزا دینے پر قادر ہے، اس میں کسی کو دخل کی مجال نہیں اور اگر تو معاف فرمائے تو تو اس پر بھی قادر ہے اور تیرا کوئی بھی فیصلہ حکمت سے خالی نہیں ہوگا کیونکہ تو [illegible] بھی ہے۔ اس طرح گویا نہایت لطیف

اور محتاط انداز میں دعا کریں گے۔

خلفِ وعید

ظاہر ہے کہ یہ دُعا اُن لوگوں کے لیے ہوگی جو عیسٰی علیہ السلام اور آپ کی والدہ کو معبود ٹھہرا کر شرک کے مرتکب ہو چکے ہیں۔ کیا اُن کی دُعا کے نتیجہ میں ایسے مشرکین کی معافی کا امکان ہے؟ اس کے جواب میں مفسرین قرآن امام رازیؒ اور امام بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ وعدے کی خلاف ورزی تو نہیں کرتا کیونکہ اس کا فرمان ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَاد بلاشبہ ایسا کرنے میں اللہ تعالیٰ کی ذات میں نقصان پایا جاتا ہے، البتہ وعید کی خلاف ورزی میں کوئی نقصان نہیں، کیونکہ اگر وہ سخت سے سخت وعید کے بعد بھی کسی کو معاف کر دے تو یہ اُس کے اختیار میں ہے اور اس کا کرم ہے وہ ایسا کر سکتا ہے، مگر کریگا نہیں کیونکہ اُس کا فیصلہ یہ ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ یعنی اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں کریگا، دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اُس کے قانون کو توڑیگا وہ اُسے معاف نہیں کرے گا۔ یہی وہ مسئلہ ہے جسے متکلمین کی اصطلاح میں خُلفِ وعید کہا جاتا ہے۔

امکانِ کذب اور امکانِ نظیر

امکانِ کذب اور امکانِ نظیر جیسے مسائل بھی اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ یہی وہ مسائل ہیں جو مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ اور مولانا فضل حق خیرآبادیؒ کے درمیان اختلاف کا باعث ہیں اور بعد والوں نے انہیں شاہ صاحب کے خلاف غلط رنگ میں پیش کیا اور کہا کہ دیوبندیوں کا خدا جھوٹ بھی بولتا ہے مولانا خیرآبادیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نظیر پیدا نہیں کر سکتا کیونکہ ایسا کرنے سے آپ کے ساتھ ختمِ نبوت کی خصوصیت باقی نہیں رہتی، برخلاف اس کے شاہ صاحبؒ کا موقف یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظیر پیدا کرنا بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے نیچے ہے مگر وہ ایسا نہیں کریگا کیونکہ اس طرح آپ کے علاوہ کوئی

خاتم النبیین بھی ہو سکتا ہے۔ تاہم ایسا کرنا اسکی قدرت سے خارج نہیں
کیونکہ سورۃ یٰس میں موجود ہے "اَوَلَیْسَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ؕ بَلٰی ٭
وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ" خدا چاہے تو اس پوری کائنات یا
کسی چیز کی مثل پیدا کر دے، وہ خلاق علیم ہے۔ اسے مکمل قدرت حاصل ہے
سورۃ لہب میں ابولہب کے متعلق آتا ہے "سَیَصْلٰی نَارًا
ذَاتَ لَهَبٍ" یعنی ابولہب بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوگا۔ اب سوال
یہ ہے کہ کیا اللہ اس کے خلاف نہیں کر سکتا؟ وہ قادرِ مطلق ہے، چاہے
تو ابولہب اور تمام کفار و مشرکین کو جنت میں داخل کر دے۔ شاہ صاحبؒ
فرماتے ہیں کہ ایسا کرنا خدا تعالیٰ کی قدرت میں داخل ہے پھر وہ ایسا کیوں نہیں
کیونکہ یہ اس کی حکمت اور سنت کے خلاف ہے۔ حکمت کا تقاضا یہی
ہے کہ مجرمین کو سزا دی جائے اور نیکوکاروں کو اچھا بدلہ دیا جائے مجدد صاحبؒ
بھی فرماتے ہیں "اگر ہمہ را بجہنم فرستد جائے اعتراض نیست" اگر اللہ تعالیٰ
تمام لوگوں حتیٰ کہ نیک، متقی اور زاہدوں کو بھی جہنم میں داخل کر دے تو کوئی
اعتراض نہیں کر سکتا کہ ایسا کیوں کیا مگر وہ ایسا نہیں کریگا کیونکہ نیکوں کو
جہنم میں اور بدوں کو جنت میں داخل کرنا اسکی حکمت کے خلاف ہے
البتہ قدرت کا ہونا الگ بات ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

شاہ صاحبؒ ایک اور مثال بھی پیش کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کہے
زَیْدٌ قَائِمٌ یعنی زید کھڑا ہے اور زید فی الواقع کھڑا بھی ہو، تو
خداوند تعالیٰ اس کے خلاف کر سکتا ہے؟ فرماتے ہیں کہ کر سکتا ہے
کیونکہ یہ اس کی قدرت میں داخل ہے۔ اگر اسے قدرت سے خارج
کر دیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ انسان جیسی قدرت بھی نہیں
رکھتا (نعوذ باللہ) کیونکہ انسان ایک بات کر سکتا ہے مگر اللہ تعالیٰ نے

نہیں کر سکتا، امکانِ کذب اور امکانِ نظیر کا یہی مطلب ہے۔

بہرحال عیسیٰ علیہ السلام عرض کریں گے، مولا کریم! اگر تو ان کو سزا دے تو یہ تیرے بندے ہیں، اور وہ تیرے حکم کی خلاف ورزی کر کے سزا کے مستحق ہو چکے ہیں، تاہم اگر تو معاف کر دے تو تو عزیز اور حکیم ہے یعنی معاف کرنا تیری قدرت میں داخل ہے کیونکہ تو کمال قدرت کا مالک ہے اور تو حکیم بھی ہے اور ہر کام حکمتِ بالغہ کے ساتھ کرتا ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی تھیں کہ جب بادل اٹھتے تھے تو حضور علیہ السلام پریشانی کے عالم میں کبھی اندر جاتے اور کبھی باہر آتے، میں نے عرض کیا حضور! ایسے مواقع پر تو بادلوں کو دیکھ کر لوگ خوش ہو گئے ہیں مگر آپ کی پریشانی کی کیا وجہ ہے؟ تو فرمایا مجھے اس بات کا خطرہ ہے کہ کہیں یہ بادل ہمارے لیے ویسے ہی نہ بن جائیں جیسے قوم عاد پر آئے تھے اور ان میں سے آگ برسی تھی۔ قرآن پاک میں موجود ہے وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ (انفال) جب تک حضور علیہ السلام اپنی قوم کے درمیان موجود رہیں اللہ تعالیٰ انہیں سزا نہیں دے گا اور جب تک وہ استغفار کرتے رہیں اللہ سزا نہیں دے گا۔ اس واضح فرمان کے باوجود حضور علیہ السلام کا بادلوں کو دیکھ کر پریشان ہو جانا اس وجہ سے تھا کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے سزا نہ دینے کا وعدہ کر رکھا ہے مگر وہ سزا دینے پر قادر تو ہے۔ یہی ہے وہ خلفِ وعید، امکانِ کذب یا امکانِ نظیر۔

سچائی کا بدلہ

اللہ تعالیٰ کی طرف سے سوال اور عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے عاجزانہ جواب کے بعد اللہ تعالیٰ فرمائے گا قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ۚ یہ وہ دن ہے جس دن سچوں کو ان کا سچ نفع دیگا۔ جنہوں نے دنیا میں سچا عقیدہ، سچا عمل اور سچا اخلاص اختیار کیا، آج ان کا احترام ہو گا، عزت ہو گی یہاں پر صدق سے مراد قیامت والے دن کا صدق نہیں کیونکہ اس دن تو

کفار بھی سچ بولیں گے اور صاف کہیں گے کہ ہم کفر کرنے والے تھے اور ہم نے غلط کام کیا مگر اس دن کا سچ بولنا کچھ مفید نہیں ہوگا۔ اُس دن وہ سچ کام آئے گا جو لوگوں نے اِس دُنیا میں اختیار کیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سچے تھے، لہٰذا قیامت کے دن اُن کی عزت افزائی ہوگی۔ اور ان کے متعلق غلط اعتقاد رکھنے والے عذاب میں مبتلا ہوں گے سچوں کی سچائی کا یہی مطلب ہے۔

پھر آگے اللہ تعالیٰ نے اُس نفع کا ذکر کیا جو سچوں کو اس دن حاصل ہوگا فرمایا لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ اُن کے لیے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اللہ تعالیٰ اُن کے قول و فعل سے راضی ہوا وَرَضُوْا عَنْهُ اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہو گئے۔ وہ کیوں راضی نہ ہوں گے؟ اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا میں نیکی کی توفیق عطا فرمائی، نورِ ایمان بخشا اور اپنے انعام و اکرام سے نوازا۔ وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہو جائیں گے۔ فرمایا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ یہ بہت بڑی کامیابی ہے کہ انسان جنت میں پہنچ جائے۔ جو خدا کی رحمت کا مقام ہے اور پھر اُسے رضائے الٰہی حاصل ہو جائے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا، اے اہلِ جنت! کیا میں تمہیں کچھ اور بھی دوں؟ تو جنتی عرض کریں گے مولا کریم! تو نے ہر قسم کی نعمتیں عطا کر دی ہیں، اب اور کیا ہو سکتا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا اُحِلُّ عَلَيْكُمْ رِضْوَانِيْ فَلَآ اَسْخَطُ بَعْدَهٗ اَبَدًا میں اپنی خوشنودی کا اعلان کرتا ہوں، اب اس کے بعد کبھی بھی تم سے ناراض نہیں ہونگا۔ تمہیں میری ابدی رضا حاصل ہوگی۔ اس سے بڑھ کر کیا کامیابی ہو سکتی ہے!

تکمیلِ احکام کی تاکید

قرآن پاک کا یہ اسلوبِ بیان ہے کہ مختلف احکامات بیان کرنے کے بعد آخر میں ایسے الفاظ لائے جاتے ہیں جن سے سابقہ مضامین کی

تاکید مقصود ہو۔ سورۃ مائدہ میں شکار اور اس کی حلت وحرمت کے مسائل بیان ہوئے ہیں، یہود و نصاریٰ کے باطل عقائد کا رد ہوا ہے اور ان کے ساتھ بحث مباحثہ کا بیان ہوا ہے، قانون شہادت اور محرمات الٰہیہ کا ذکر آیا ہے شراب اور جوئے کی حرمت، طہارت اور قسم کے مسائل آئے ہیں، مشرکین کے شرک کی مختلف صورتوں کا ذکر آیا ہے اس کے علاوہ کئی قسم کے مسائل بیان ہوئے ہیں اور اب اس آخری آیت میں ان احکامات پر عمل درآمد کی تاکید کے طور پر ارشاد ہوا ہے لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے زمین و آسمان کی بادشاہی اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔ یہ تمام کی تمام چیزیں اللہ کی پیدا کردہ ہیں، اُسی کی ملکیت ہیں اور اُسی کا حکم ان پر نافذ ہے۔ تمام امور کا متصرف اللہ تعالیٰ ہے، وہ جس قسم کا حکم چاہے اپنے بندوں کے لیے نازل فرمائے بندوں کا حق ہے کہ وہ اس کے احکام کی تعمیل کریں۔ چونکہ بادشاہی اُس کی ہے۔ لہٰذا اس کے ہر حکم پر اٰمنّا وصدّقنا ہی کہنا ہوگا۔ اگر اُس کے کسی حکم کی خلاف ورزی ہوگی تو نتیجہ برا نکلے گا۔ پھر فرمایا یاد رکھو! وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ وہ اللہ کمال قدرت کا مالک ہے۔ کوئی چیز اُس کے قبضۂ قدرت سے باہر نہیں۔ کوئی شخص اُس کی نافرمانی کر کے اُس کی سلطنت سے بھاگ نہیں سکتا۔ وہ ایک ایک چیز کا حساب لے گا۔ اُس کے علاوہ کوئی متصرف بھی نہیں اس سے عیسائیوں کے باطل عقیدہ کا بھی رد ہو گیا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو الوہیت کا درجہ دیتے ہیں اور متصرف فی الامور مانتے ہیں۔ فرمایا ہر چیز پر وہی قادر ہے اور کوئی ہستی قادر مطلق نہیں ہے۔

واللہ اعلم بالصواب وصلی اللہ علیٰ خیر خلقہٖ محمد والہٖ وصحبہٖ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین

قرآن مجید مترجم

ترجمہ

مفسر قرآن حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی مدظلہ

بانی مدرسہ نصرۃ العلوم جامع مسجد نور گوجرانوالہ

قرآن مجید کے صحیح ترجموں میں حضرت مولانا شاہ عبد القادر محدث دہلویؒ۔ حضرت مولانا شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ۔ حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیو بندیؒ۔ حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانویؒ۔ حضرت مولانا احمد سعید دہلویؒ۔ حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے تراجم مشہور اور مقبول ہیں۔ حضرت صوفی صاحب مدظلہ نے بھی موجودہ دور کے مطابق جدید اردو زبان میں یہ ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ پہلے حضرت صوفی صاحب مدظلہ کی تفسیر معالم العرفان فی دروس القرآن کی بیس جلدوں میں بھی شائع ہوچکا ہے اور حال ہی میں عمدہ کتابت و طباعت اور معیاری جلد بندی کے ساتھ ۷۰۴ صفحات پر مشتمل شائع ہو کر منظر عام پر آچکا ہے۔ قیمت ۲۵۰

ناشر مکتبہ دروس القرآن فاروق گنج گوجرانوالہ